بیادِ سلیم احمد

روایت

۳

مکتبۂ روایت

بیادِ سلیم احمد

روایت

سلسلۂ مطبوعات (۳)

۱۴۰۶ھ — ۱۹۸۶ء

۱۰۰۰

ناشر : مکتبہ روایت ص-ب ۵۰۸۴، لاہور ۴
فون : ۸۱۰۲۹ ۷

اہتمام : محمد سہیل عمر
مطبع : میٹرو پرنٹرز - لاہور
قیمت : پیپر بیک ——— ۶۵ روپے
مجلد ——— ۷۵ روپے

تقسیم کنندگان

سہیل اکیڈمی - محمد علی امین مارکیٹ
چوک اُردو بازار، لاہور — ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

HaSnain Sialvi

خطوط

مکالمہ

تقاریر

کالم

حلقۂ سلیم احمد

سہ سالہ سالو سمر سالو سہ

"**روایت**" نمبر ۱ نکلا تو خدا بخشے سلیم بھائی ابھی زندہ تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ وہ اس زمانے میں روزنامہ "حریت" میں کالم لکھا کرتے تھے۔ کئی ستائشی کالم لکھے، ایک خط میں شاباش بھی دی، اور لوگ بتاتے ہیں کہ ان کی روزانہ کی مجلسوں میں بھی ایک دو دن نہیں بلکہ ہفتوں روایت کا تذکرہ رہا۔ عسکری صاحب تو اب رہے نہیں تھے جن کے دکھائے ہوئے راستے پر پہلا قدم اٹھانے کی کد کے نتیجے میں روایت وجود میں آیا لیکن سلیم بھائی کے اس مشفقانہ ردِعمل سے میری اور میرے رفقاء کی محنت وصول ہو گئی۔ اس سے پہلے ان کے ساتھ میری بس گنتی کی چند ملاقاتیں تھیں جنھیں رسمی تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ، ہمہ وقت تعلق کی جس سطح پر رہتے تھے، وہاں رسمیات کا کوئی گزر نہ تھا؛ البتہ اسے پرانے وقتوں کے وضعدار شرفاء کی زبان میں تعارفی ضرور کہہ سکتے ہیں ـــــ یعنی ایک دل دوسرے دل سے متعارف ہوا ـــــ وہ خوش نصیب جنھیں سلیم بھائی کی قربت کی سعادت حاصل رہی ہے، اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلیم بھائی تو چڑیا کے بچے سے بھی کسی پیش بندی کے بغیر ملتے تھے۔ ان کے یہاں آج کل کا مروجہ غیر انسانی رکھ رکھاؤ سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہ تو تعلق کے پورے کرّے پر محیط ہوا کی طرح تھے۔ دو قدم چلو تو بھی ساتھ، کوسوں دوڑو تو بھی سنگ۔ ان کا معاملہ تو یوں تھا کہ جو میرے گھر میں آیا، وہ میرے دل میں آیا!

۱۹۷۹ء میں جھلکیاں مرتب کرتے ہوئے تلاش اور تدوین کے سلسلے میں مجھے بھی سلیم بھائی کے گھر جانے کا شرف نصیب ہوا۔ اقبال ایک شاعر بھی انہی دنوں چھپی تھی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، گفتگو زیادہ تر میری ہی دلچسپی کے موضوعات پر ہوتی رہی۔ مخاطب کی ایسی رعایت وہیں دیکھی۔ روح میں ایک انوکھی کشادگی لے کر واپس ہوا۔ پھر جب جھلکیاں کی پہلی جلد طباعت کے لیے جانے لگی تو اس پر انھوں نے بڑی محبت سے دیباچہ لکھا۔ اس وقت تک میں نے سلیم بھائی کو کچھ یونہی سا پڑھ رکھا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے سلسلے میں ایک چیز ہمیشہ محسوس ہوئی کہ موجودہ صورتحال میں عسکری صاحب کے بعد اگر کسی نے حقائق

انسانیہ کے تمام مدارج کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ادب و شعر پر کلام کیا ہے تو وہ یقیناً سلیم بھائی ہیں۔

روایت اوّل کی اشاعت تک پھر میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خط و کتابت، تبادلۂ خیال اور تبادلۂ کتب برابر جاری رہا۔ روایت اوّل کے چھپنے کے بعد سلیم بھائی کی شفقت نے ایک اور رنگ اختیار کیا۔ اب ان کے ہاں مجھے ایک ایسے معتبر دوست کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی جسے اس کی کم عمری اور کم علمی کے باوجود مستقبل کے تحریری منصوبوں کے سلسلے میں شریکِ مشورہ کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہماری گفتگو کا محور یہی رہتا تھا کہ پاکستان کی موجودہ فکری صورتِ حال میں روایتی اسلامی فکر کے نمائندوں کے طور پر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ۱۹۸۳ء میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں ایک لمبے سفر پر کمر بستہ تھا اور کراچی صرف ایک دو روز دم لینے کے لیے رکا تھا۔ ان دو دنوں اور دو راتوں میں سلیم بھائی بار بار یہی کہتے تھے: "سہیل عمر! تم آجاؤ تو یہ شروع کریں گے۔ تم لوٹ آؤ تو فلاں کام شروع کریں گے۔" اب میں یہ سب لکھ دینا چاہتا ہوں "مجھے خبر تھی کہ میں تو بادیہ مسافرت سے صحیح سلامت لوٹ آؤں گا مگر وہ اس جگہ پہنچ چکے ہوں گے جہاں سے کب کوئی لوٹ کر آیا ہے!" ان کی سناؤنی ملی تو میں دیارِ غیر میں تھا۔ رنج اور بھی تھے مگر سلیم بھائی کا یوں چلا جانا کسی سے کم نہ تھا۔ ان کا غم تو جان کے ساتھ ہے، لیکن ان سے ادھوری ملاقات کا قرض اگر روایت سوم اور چہارم سے ادا ہو سکا تو یاری اور وفاداری پر استواری کی مہر بھی ثبت ہو جائے گی۔

سلیم بھائی کی شخصیت، شاعری اور نثر، افکار، تنقیدات اور آراء پر روایت کی ان دو مجلدات میں ہر طرح کے مباحث شامل ہیں۔ ان کا احاطہ اس جگہ دشوار بھی ہے اور تحصیلِ حاصل بھی۔ میں صرف دو اساسی نکات کی طرف اشارہ کروں گا جو ان کے فکر و فن کی تفہیم کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں بطور مقدمات پیشِ نظر رکھنے سے بکھرے ہوئے افکار و آثار کو ایک لڑی میں پرونا آسان ہو جائیگا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ کا ایک بہت مشہور قول ہے کہ الحق محسوس والخلق معقول۔ حس کا موضوع وہ حقیقت الحقائق ہے جو کوئی مفہومِ کلی یا وجودِ ذہنی نہیں بلکہ ایک صاحبِ ارادہ موجود فی الخارج ہستی ہے یعنی الحق۔ کیونکہ وہ ہستی واحد ہے ـــــ لہٰذا اس کی طرف کوئی پیش رفت کثرت کے اعتبارات اور تعینات سے بلند ہوئے بغیر محال ہے۔ عقل کا موضوع یہی اعتبارات اور تعینات ہیں اور وہ اپنے احکامات کو برقرار رکھتے ہوئے یہ راہ سر

نہیں کر سکتی، اور کسی نہ کسی درجے میں ان کے اثبات پر مجبور ہے۔ یہ اوگھٹ گھاٹی بذریعہ سلب پار کی جا سکتی ہے مگر یہاں بھی عقل کا اختتامِ سفر الواحد کے بجائے وحدت پر ہوگا جو ایک مفہوم ہے، ایک تصور ہے۔ اس کا مصداق اور اس تصور کی تصدیق بہرحال غائب ہی رہے گی جو اصل مقصود ہے۔ مقصود ایسے کلیات تک پہنچنا نہیں ہے جو ایک مفہوم کے طور پر وجود کے ہر مرتبے میں ثابت ہوں بلکہ مقصود ذات تک پہنچنا ہے جو امورِ کلی کے برعکس موجود فی الخارج ہوتی ہے اور اس کا یہ وجود خارجی حقائق کے لق و دق میدان میں انسان کی سمتِ سفر متعین کرتا ہے۔ اگر عقل کو اس کے اصلی مقصد سے ہٹا کر معرفتِ حقائق کا مطالبہ پورا کرنے کا ذریعہ سمجھ لیا جائے تو یہ ساری گڑبڑ ہوتی ہے۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ حق محسوس کو وجود کے تمام تعینات خارجی میں کارفرما دیکھے۔ گویا عقل حق کی نزولی جہت ہے۔ اس کے برعکس حس چونکہ ذاتِ حق سے واسطہ رکھتی ہے، لہٰذا وہ کثرت کو قبول ہی نہیں کرتی اس کا رخ اسی لیے عروجی ہے، کثرت سے وحدت کی طرف نہیں کیونکہ یہ سیرِ معکوس ہے بلکہ کثیر سے واحد کی طرف۔

عسکری صاحب اور سلیم بھائی، دونوں کا بنیادی مسئلہ ہی یہ ہے کہ انسانی تعینات میں کارفرما حقائق، خاص طور پر ادب میں، کس کس رنگ میں اور کون کون سی سطح پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ہاں، اتنا فرق ضرور ہے کہ عسکری صاحب کا طریقِ کار تصوف کی زبان میں حسی یعنی عروجی ہے اور سلیم بھائی کا عقلی یعنی نزولی۔ دونوں کو پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ایک الفاظ کے تمام تعینات کو زائل کر کے، نہایت علوِ خیال کے ساتھ، انہیں واحد المعنیٰ بتا رہا ہے اور دوسرا اس مافوق وحدتِ معنی کو، الفاظ کے تعینات قائم رکھتے ہوئے اور ان کے درجہ بدرجہ احکام کو مؤثر مانتے ہوئے، ظاہر کر رہا ہے۔ پہلے، صاف محمد حسن عسکری ہیں اور دوسرے، ہمارے سلیم بھائی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میں نے اول الذکر کے طریقِ کار کو حسی اور عروجی اور مؤخر الذکر کے طریقِ کار کو عقلی اور نزولی کیوں قرار دیا ——— عقل کا کام تعمیم ہے، حس کا وظیفہ تخصیص ہے۔ عقل کا موضوع وجود ہے، حس کا موجود۔ اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ سلیم احمد کا اسمِ اعظم یعنی "پورا آدمی" جسم پر منتج ہوتا ہے۔ اب شیخ اکبرؒ کا وہ قول پھر دیکھ لیجیے کہ **الحق محسوس والخلق معلوم**۔

یہ تو ہوا حقیقت کی جانب ان حضرات کی پیش قدمی کا انداز یا ان کا تعلق بالحقیقت ———

اب کچھ گفتگو تصورِ انسان پر بھی ہو جائے۔ مشکل یہ ہے کہ اس زمانے میں جب تک بنیادی باتوں کو خوب ہندی کی چندی کر کے نہ بیان کیا جائے تو یہ دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں سامنے والا کیا سمجھے گا، لہٰذا میں انسان کی تعریف متعین کرنے کے لیے چند باتیں بطور مقدمات عرض کروں گا۔ انسان کی وصفی تعریف میں تو متعدد اقوال ملتے ہیں مگر یہاں ہمیں انسان کی تعریف بحیثیت ذات سے سروکار ہے۔

انسان اپنی ذات میں مجموعہ ہے جسم، نفس اور روح کا۔ جسم جمودِ محض کا مظہر ہے (یہاں جمود سے مراد ہے عدم حرکت) — نفس اصولِ حرکت و تغیّر ہے۔ روح اصولِ سکون ہے اور غیر متغیر ہے۔ نفس کو ان میں ایک متصرف برزخیت حاصل ہے۔ یہ جسم سے میل پیدا کرتا ہے تو حسِ محض یا حسِ حیوانی اور جبلّت پیدا ہوتی ہے۔ روح سے تعلق پیدا کرے تو عقلِ جزئی یا خرد، آدمیت اور تہذیب جنم لیتی ہے۔ جسم سے اس کا واسطہ ہمیشہ فاعلی جہت سے ہوتا ہے۔ روح سے یہ دوہرا تعلق رکھتا ہے۔ یا تو روح سے اخذ کردہ چیزوں میں تصرف کرتا ہے، ان پر حکم لگاتا ہے یا ان سے متاثر ہوتا ہے اور انفعالی قبولیت کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ روح کا تعلق نفس کی فاعلی جہت سے ہو تو خرد پیدا ہوتی ہے، اور اگر انفعالی جہت بروئے کار آئے تو عقل پیدا ہوتی ہے کیونکہ روح فی اصلہٖ العقل کا محل ہے۔ اسی چیز کو دوسری طرح دیکھیے۔ ماسوائے ذاتِ حق دو مراتب ثابت ہیں: امر اور خلق۔ روح امرِ محض ہے اور جسم خلقِ محض۔ نفس دونوں کے درمیان پل ہے۔ سلیم بھائی کے تصورِ انسان میں تدریج کا رخ روح سے نفس اور نفس سے جسم کی طرف ہے۔ عسکری صاحب کے ہاں یہ تدریج برعکس ہے۔ عسکری صاحب اور سلیم بھائی میں ایک طرح کا تکمیلی تعلق ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں شاید ایسے باہم تکمیلی عناصر کی کوئی اور مثال نہ مل سکے۔ یہ تکمیلی تعلق ایک اور جہت میں بھی کارفرما ہے۔ عسکری صاحب خلوت کے آدمی تھے اور سلیم بھائی جلوت کے۔ لیکن عسکری صاحب کی پسندیدہ زندگی وہ تھی جو سلیم بھائی نے گزاری، اور سلیم بھائی کی پسندیدہ زندگی وہ تھی جو عسکری صاحب بسر کر گئے۔ یوں فکری اعتبار ہی سے نہیں، عملی زندگی میں بھی ان میں ایک باہمی تکمیلی ربط تھا۔

پھر اردو ادب میں کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ذوطرفین ہوں، یعنی مخاطبین کے دو متضاد طبقوں تک بیک وقت پہنچ رکھتے ہوں اور بطور برزخ دونوں طبقوں کے درمیان رابطے کا کام کر سکیں۔ سلیم بھائی اور عسکری صاحب اس لحاظ سے بھی منفرد رہیں۔ مگر یہاں بھی ان دونوں کے

طریق میں فرق ہے۔ عسکری صاحب مخاطب کو اپنی سطح تک کھینچ لاتے ہیں، سلیم بھائی اس کی سطح تک اتر کر کلام کرتے ہیں۔ یہ فرق بھی ایک سبب سے پیدا ہوا۔ عسکری صاحب کے خیال میں معنی کے لیے لفظ متعین ہے، اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ سلیم بھائی کی رائے میں اگر معنی مستحضر ہیں تو انہیں کسی بھی لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ دکھائی یہ دیتا ہے کہ مختلف طبقوں کے لیے دونوں ہی کے طریقِ کار مفید ثابت ہوئے۔

روایت سوم اور چہارم مرتب کرنے میں ہم نے، بساط بھر، دونوں طبقات کو نمائندگی دینے کی کوشش کی ہے۔ کسی تحریر میں کسی بھی اعتبار سے کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ مضامین اور مقالات میں اٹھائے گئے سوالات اور مباحث پر ہماری رائے محفوظ ہے اور اس کی تفصیل کے لیے مستقبل کی مجلدات کا میدانِ عمل کھلا ہوا ہے۔

روایت سوم اور چہارم کی ترتیب و تدوین کی فردِ عمل پر نظر کرتا ہوں تو ایک جگہ نہیں، بہت سی جگہ شمیم بھائی (شمیم احمد) کی مہر لگی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا مسلسل تعاون، حوصلہ افزائی اور سرپرستی شاملِ کار نہ ہوتی تو یہ مجلدات ہرگز موجودہ صورت میں پیش نہ کی جا سکتیں۔ نہاں خانۂ دل ان کے لیے تشکر سے معمور ہے اور زبانِ قلم ان کی محبت کی معترف اور سپاس گزار۔ ہفتوں ان تدوین کو تر کرنے میں احمد جاوید اور انور جاوید قدم بقدم میری کمک کو آتے رہے ہیں۔ حبابِ دوستاں در دل۔ ان کی محنت، محبت اور رفاقت میرے لیے نشاطِ کار کا سبب بھی رہی اور تدوین و ترتیب کے معیار کی ضمانت بھی۔ ان کی دوستی میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ خدا انہیں خوش رکھے!

وما توفیقی الا باللہ

محمد سہیل عمر

سوانحی خاکہ

نام : سید سلیم احمد

قلمی نام : سلیم احمد

والد کا نام : سید شرافت علی مرحوم

سنِ پیدائش : نومبر، ۱۹۲۷ء

مقامِ پیدائش : کھیولی۔ ضلع بارہ بنکی یو۔پی

تعلیم : (ابتدائی) لکھنؤ۔ بعد ازاں فیضِ عام انٹر کالج میرٹھ کالج۔ ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں تھے کہ پاکستان آ گئے۔

ملازمت : (ابتدائی) کلرک، ۱۹۴۷ء سندھ رائس سنڈیکیٹ، کیشیئر ریفیوجیز ری ہیبی لیٹیشن فنانس کارپوریشن۔ بعد ازاں، ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹر ہو گئے اور باقی زندگی یہیں ملازمت کی۔ ۱۹۷۰ء میں کچھ عرصہ کے لیے وزارتِ اطلاعات کے مشیر بھی رہے۔

تاریخِ وفات : یکم ستمبر ۱۹۸۳ء۔ کراچی

تصانیف : ادبی اقدار : مضامین کا پہلا مجموعہ۔ بیاض : غزلیات کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۶ء نئی نظم اور پورا آدمی مضامین کا مجموعہ ۱۹۶۲ء۔ غالب کون؟ (تنقید) ۱۹۷۱ء۔ ادھوری جدیدیت : مضامین کا مجموعہ ۱۹۷۷ء۔ اقبال ایک شاعر (تنقید) ۱۹۷۸ء۔ محمد حسن عسکری، انسان یا آدمی : (تنقید) ۱۹۸۲ء۔ اکائی : شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء۔ اسلامی نظام، مسائل اور تجزیے (بعض اہم کالموں کا انتخاب) ۱۹۸۴ء۔ چراغِ نیم شب : غزلیات کا مجموعہ ۱۹۸۵ء۔

غیر مطبوعہ : مشرق : طویل نظم۔ نئی شاعری نامقبول شاعری : ۸ مضامین کا مجموعہ۔ اقبال ایک شاعر : دوسرا ایڈیشن (ترمیم و اضافے کے ساتھ)۔ نئی نظم پورا آدمی : دوسرا ایڈیشن (۱۲ مضامین کے اضافے کے ساتھ)

زیرِ ترتیب : منتخب کالم : ۲ مجموعے۔ باقیاتِ سلیم : جس میں ابتدائی غزلیات، منظومات اور قطعات کے علاوہ کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہوگا۔ مضامین کا مجموعہ : وہ مضامین جو کسی مجموعہ میں نہ آ سکے۔ منتخب ڈرامے

شخصیّت
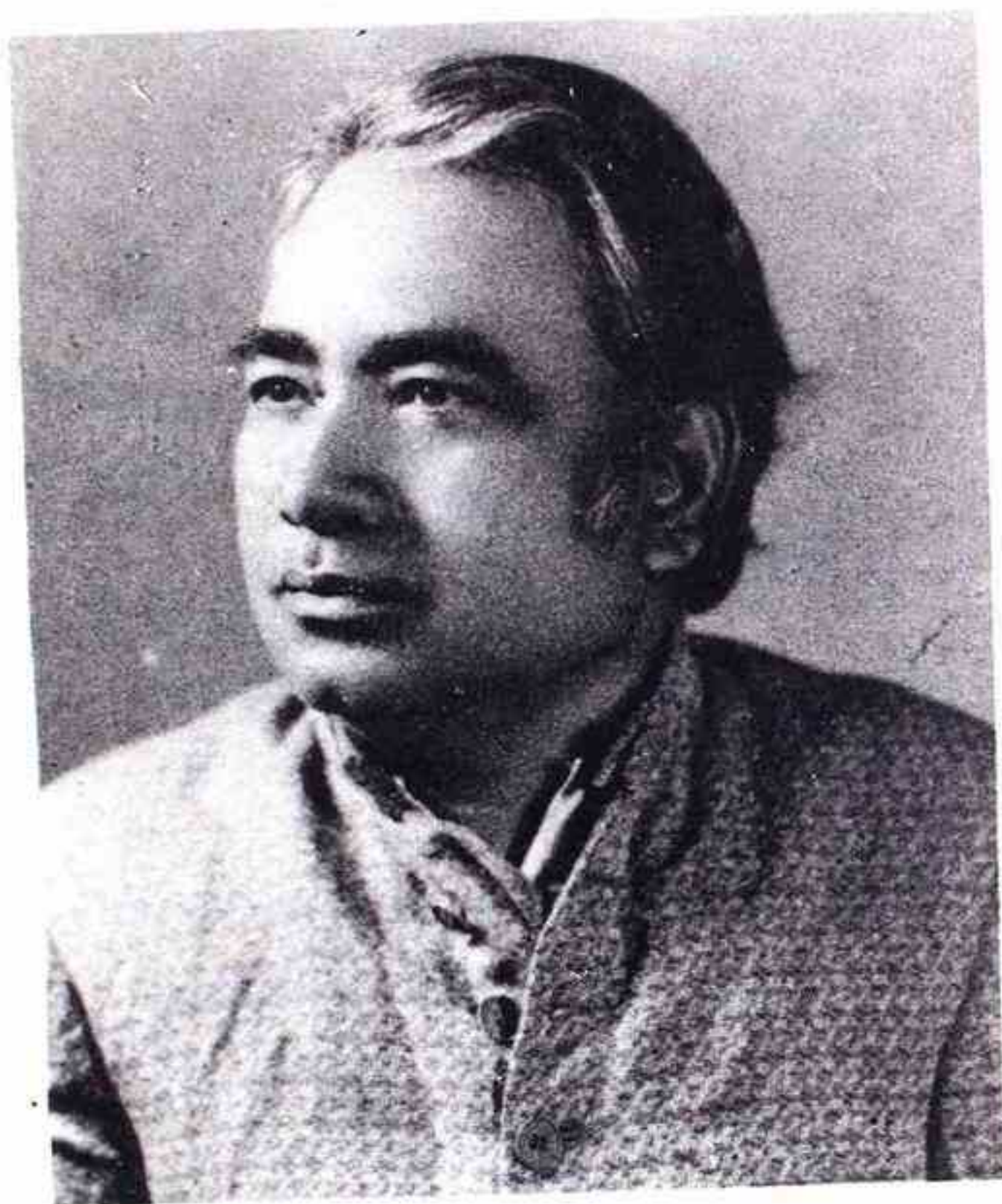
اب اس کے سوگ میں کچھ اور کیا کہیں، ہم لوگ
کہ مرنے والا تو ہم سے زیادہ زندہ تھا

شمیم احمد

بھائی صاحب

سائے اور پروں کے نیچے[1]
(نیند کی وادی میں پہلا خواب)

میں نے دیکھا ایک خوفناک جنگل ہے۔ تنہائی کے خوف نے میرے بدن میں لرزہ پیدا کر دیا ہے، کوئی نہیں ہے جو مجھے دیکھے، جو اپنے پروں میں مجھے سمیٹ لے۔ میرا دل جیسے حلق تک آگیا ہے۔ پسینے پسینے میں چلتا جا رہا ہوں، جنگل کی تاریکی، تنہائی، ان دیکھے خوف میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ زور سے بادل کی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے اور بجلی کی ایک لکیر پورے آسمان کو درکرتی ہوئی قریب ہی جنگل میں کہیں جا گرتی ہے۔ عین اس خوف، جسم کے زلزلے کے دوران بجلی کی دوبارہ چمک میں مجھے احساس ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ ملائم نرم ہاتھ نے مضبوطی سے مجھے تھام لیا ہے۔ یہ میرے وجود کا حصہ ہے یا شاید مجھی میں سے نکلا ہے مجھے اندر سے ایک اطمینان اور سکون حاصل ہے، میری تنہائی کا احساس اب اپنے وجود کی تنہائی کا نہیں رہا، یہ میرا ہمزاد ہے، یہ میرا بھائی ہے۔ یہ میری قوت اور طاقت ہے۔ یہ تو میرا سایہ ہے!

کتنا سکون ہے، کتنی راحت ہے، میں ایک ہری پوشاک پہنے ہوئے ہوں اوپر سے نیچے تک جیسے میں نے فرغل پہن رکھا ہو۔ اور جس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے وہ بھی سبز پوشاک پہنے ہوئے ہے، اسی طرح فرغل نما لباس بالکل ایک جیسا ہے، ہم دونوں ایک جیسے ہیں مگر ہم دونوں ایک جنگل میں ہیں، ہم دونوں تنہا ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم جنگل میں ہیں، تنہا ہیں۔ سائے اور روشنی کے اس سفر میں جنگل کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک خوف اور سردی کی لہر مجھے آلیتی ہے، بدن کپکپا جاتا ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرا بھائی

---

[1] میرے حافظے میں جو سب سے پہلی یادیں محفوظ ہیں وہ دو خواب ہیں (مؤلف)

لہاں ہیں۔ میرا ہمزاد کہاں چلا گیا وہ کہاں ہے۔ میں پھر تنہا ہو گیا۔ وہ خوفزدہ ہوں، میرا گلا رندھا ہوا ہے وہ کہاں ہے کہاں ہے بین بلک بلک کر رونے لگتا ہوں (کوئی مجھے اپنے سینے سے لگا کر سسکنے لگتا ہے) میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

(نیند کی وادی میں دوسرا خواب)

میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں، میرے سرہانے کوئی آرام کرسی Arm chair پر بیٹھا ہوا ہے اور کرسی کے لمبے بازو سے ایک بہت لمبا ہاتھ لٹکا ہوا ہے۔ بڑی بڑی انگلیاں، پتلی پتلی سانولی انگلیاں، میں اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں، کیسی ہمک ہے مجھ میں یہ انگلیاں کتنی پرکشش ہیں۔ میں ان تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میرے دل پہ ایک ناقابل بیان بوجھ بڑھ رہا ہے۔ کرسی پر کسی کا وجود ہے۔ میں اس وجود تک پہنچنا چاہتا ہوں اس سے لپٹ جانا چاہتا ہوں، مگر اس سائے کا مجھے صرف ہاتھ کیوں دکھائی دے رہا ہے، نہ چہرہ، نہ بدن، میں اس وجود کو پہچان نہیں پاتا مگر میرا وجود اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ایک سفید سایہ کرسی پہ ہے اور ایک لمبا ہاتھ اور لمبی انگلیاں میرے سرہانے موجود رہیں کیسے ان تک پہنچوں، میرا پورا وجود آنسو بن گیا ہے، غم و اندوہ سے میرا دل ٹکڑے ہو رہا ہے۔ میرا گلا بری طرح رندھ گیا ہے۔ ابو۔ ابو ابو۔ میں روتا ہوں۔ میں چلاتا ہوں (شمیم۔ شمیم۔ بیٹے، بیٹے) کوئی مجھے اپنے سینے پر لٹا لیتا ہے۔ مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیتا ہے۔ میرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر کوئی پیار کر رہا ہے۔ منہ پر منہ رکھ کر۔ گالوں، آنکھوں، آنکھوں پر گال رکھ کر مجھے چوم رہا ہے۔ خود بھی رو رہا ہے "شمیم۔ شمیم۔ بیٹے بیٹے، تم نے کوئی خواب دیکھا ہے"۔ اس کے آنسو میرے آنسوؤں میں مل کر میرے ہونٹوں پر آجاتے ہیں۔ کیسا نمکین سا مزہ ہے ابو۔ ابو۔ میں اس کے سینے سے لپٹ جاتا ہوں۔ قریب کے بستر سے ایک آواز آتی ہے "سلیم کیا شمیم ڈر گیا ہے؟ ہاں آپا! اس نے خواب دیکھا ہے اس نے ابو کو دیکھا ہے"۔ ہم دونوں کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ پھر تیسری آواز بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ ہچکیاں میرے پورے وجود کی تسکین بن جاتی ہیں۔ شدید کرب شدید آسودگی ــــــ اور میں پھر سو جاتا ہوں۔

○

میں لاشعور کے دھندلکوں میں اور نامعلوم شعور کے درمیان آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں۔ میں

راویوں اور روایات کے ایک لامتناہی جنگل میں گھرا ہوا ہوں۔ سایوں اور خوابوں کے درمیان مختلف آوازیں میرے چاروں طرف گونج رہی ہیں۔ یہ سب آوازیں ایک ہی بات کر رہی ہیں بارہ بنکی، بارہ بنکی۔ بارہ بنکی ہمارا وطن ہے۔ ہم کھیولی کے رہنے والے ہیں جہاں کوڑیالے ناگوں (لوہاری سانپ) کو ہرا جاتا ہے یعنی تسخیر کیا جاتا ہے۔ بارہ بنکی اور کھیولی نے ہمیں "ہر" رکھا ہے اور ہم حضرت علیؓ کی اولاد میں عرب اور ترکستان کی کتنی ہی مسافتیں طے کر کے محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے ——— ہم سالار مسعود غازی کے اہل خاندان ہیں وہ ہمارا چچا زاد ہے۔ ہم ہندوستان میں وارد ہوئے ہیں۔ ہم نے بارہ بنکی اور کھیولی کو گھر لیا ہے۔ بارہ بنکی اور کھیولی ہمارے ماضی کے سب سے بڑے کردار ہیں جو ہمارے خون میں رچ بس گئے ہیں ——— آوازیں ——— راوی، روایات۔ قصے۔ جن کے سچ، تقدس اور اسرار سے ہمارے وجود کی تاریخ عبارت ہے۔

روایت ہے کہ ویسے تو بارہ بنکی، بارہ باغیوں کی سرزمین رہی ہے جو کسی کی حاکمیت کو کبھی سے تسلیم ہی نہیں کرتے تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ضلع بارہ بنکی کے حریت پسندوں نے اودھ کے علاقے سے سب سے نمایاں حصہ لیا تھا اور جب یہ جنگ ختم ہو گئی تو پھر بھی طویل عرصے تک انہوں نے انگریزوں کی عملداری کو عملاً قبول کر کے نہیں دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ہمارا خاندان بہت زیادہ فعال اور سرگرم رہا تھا۔ مدد علی، پیر علی اور سید حسین علی خصوصیت سے بہت نمایاں کارنامے انجام دے رہے تھے۔ سید حسین علی تو اسی جنگ میں شہید ہوئے تھے اور وہ بیلی گارد کے مقابلے میں حضرت محل کے لشکر میں شریک تھے اور یہیں کہیں گولہ لگنے سے انہوں نے شہادت پائی تھی۔ مخبروں کی مخبری پر انگریزوں نے مدد علی کو گرفتار کر لیا تھا اور مکان میں دوسرے مجاہدین کا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے مدد علی کو طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا اور ناکام ہو کر مکان کی چھت کی کڑیوں میں، ان کے چاروں ہاتھوں پیروں میں بڑی بڑی میخیں ٹھونک دی تھیں۔ مگر پیر علی اور دوسرے مجاہدوں نے پتہ چلا لیا اور اس مکان پر حملہ کر کے ان کو رہا کرا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب میخوں کے زخم جراح کو دکھائے گئے تو اس نے کہا ان کے ہاتھوں میں زہر باد ہو گیا ہے یا تو ہاتھ کاٹے جائیں گے یا پھر گرم کھولتے تیل میں ان کو ڈالا جائے تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ مدد علی نے کہا اللہ مالک ہے۔ تیل گرم کرو اور جب تیل خوب کڑکڑا دیا گیا تو آپ نے کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اپنے

دونوں ہاتھ اس میں ڈال دیے۔

روایت ہے کہ یہ مدد علی اہیر علی اور سید حسین علی ہی تھے کہ جب نواب اودھ کے سالے نے ایک بار بر سر دربار تبرّا کہا تو ان لوگوں نے تلواریں سونت لی تھیں اور نواب نے اپنے سالے کو یہ کہہ کر سرزنش کی تھی کہ جس چیز کو تم اپنا ایمان سمجھتے ہو اس کو یہ اپنے ایمان کے خلاف سمجھتے ہیں تو پھر محفل میں ایسی بات کیوں کرتے ہو جو نزاع کا باعث بنے۔

انگریزوں نے بارہ بنکی کو شورش پسند علاقہ قرار دے رکھا تھا۔ روایت ہے کہ ۱۹۲۵ء تک انگریزوں کی پولیس، انتظامیہ اور عدلیہ یہاں بالکل غیر مؤثر رہی تھی۔ اور جب بھی آپس کی چپقلش سے کسی بھی دو متحارب زمینداروں، خاندانوں اور حریفوں کے درمیان معرکہ آرائی میں کوئی قتل ہو جاتا اور پولیس کا انسپکٹر اپنی گارد کرکے تفتیش کے لیے آتا تو گاؤں یا علاقے کے سرکردہ افراد ان کو ڈرا دھمکا کر چلتا کر دیتے اور اگر وہ زیادہ چیں چپڑ کرتے تو ان کے منہ باندھ کر ان کو درختوں پر رسیوں سے باندھ دیتے اور ان کے پیچھے اپنی عوامی عدالت گرم کرتے اور آپس میں کوئی فیصلہ کر لیتے جس کو فریقین تسلیم کر لیتے تھے۔ مگر وہ انگریز پولیس یا انتظامیہ کی مداخلت اپنی حدود میں پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بارہ بنکی یوپی کا وہ علاقہ ہے جو انگریزوں کی عملداری میں سب سے آخر میں شریک ہوا۔

قدیم روایتوں کے مطابق بارہ بنکی کی سرزمین بودھ مذہب کے ماننے والوں کے لیے ایک مقدس سرزمین کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ مہاتما بدھ کی بیوی یشودھرا[1] یعنی راہل کی ماں اسی بارہ بنکی کی رہنے والی تھی اور بارہ بنکی ہی سے وہ اژدھا جو بعد میں چینی روایت میں ایک مقدس علامت بنا، چین پہنچا تھا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بارہ بنکی کی سرزمین پر سانپوں اور اژدھوں کی کثرت اور ان کی طرح طرح کی اقسام کی روایات بہت پرانی ہیں۔ اسی لیے سانپوں کے زہر اتارنے کے جیسے ماہر اور منتروں کے ذریعے زہریلے سے زہریلے سانپ کے کاٹے کا علاج جاننے والے یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس کا مقابلہ پورے ہندوستان میں شاید بنگال کو چھوڑ کر کوئی اور علاقہ نہیں کر سکتا۔

ہمارے علاقے میں ہندوؤں کا ایک قدیم تیرتھ ہے جہاں ان کی روایت کے مطابق مہادیو کا سنگھاسن زمین میں گڑا ہوا ہے اور اس کے دو پائے زمین کے اوپر ہیں اور وہ مہاکال یعنی قیامت میں باہر نکلیں گے۔ یہاں ہندوؤں کا ایک مقدس میلہ لگتا ہے جس میں شرکت کرنے کے لیے

---

[1] یشودھرا نام کی کئی عورتیں ہندو تاریخ میں احترام کی حامل ہیں۔ راہل کی ماں کا نام بھی ایک روایت میں یہی ملتا ہے۔

ہندوستان کے ہر علاقے سے ہندو جوق در جوق اپنے قدم سے زمین ناپتے آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مہاکال میں کتنی مدت باقی ہے۔

اسی بارہ بنکی میں ایک زبردست قوم آباد رہی ہے جسے "بھر" قوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کو راجپوتوں کی ایک دلیر نسل کا سا درجہ حاصل ہے۔ کبھی یہاں اہیروں کی بھی حکومت رہی ہے۔ بھر قوم بہت ہی جیوٹ، لڑاکا اور آن پر مرنے والی قوم تھی جس کا اقتدار تقریباً تمام بارہ بنکی پر قائم تھا۔ اس قوم کا مرکز بھُولی تھا جو اب دیوہ شریف اور کھیولی کے درمیان ایک چھوٹی سی بستی رہ گئی ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل بھر قوم کے راجہ کے دو لڑکوں نے جن کا نام کھیول سنگھ اور دیول سنگھ تھا باپ کی جاگیر کو دو حصوں میں منقسم کر لیا تھا۔ کھیول سنگھ نے کھیول گڑھ بسایا اور دیول سنگھ نے دیول گڑھ بسایا جو امتداد زمانہ اور ناموں کی کتر بیونت کے باعث بعد میں کھیولی اور دیوہ بن گئے۔ دیوہ بیسویں صدی کے مشہور صوفی حضرت وارث علی شاہ اور ان کے مزار کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ جو پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کی وجہ سے جو وارث علی شاہ کا مرید تھا اور ہندوستان کے دورے میں وہ خاص طور سے وارث علی شاہ کے عرس میں شریک ہونے کے لیے بارہ بنکی سے پاپیادہ دیوہ گیا تھا، ایک بین الاقوامی خبر کا موضوع بن چکا ہے۔

اسی کھیول گڑھ کے علاقے میں کھیول سنگھ اور دیول سنگھ اور ہمارے جدِ امجد حضرت شاہ نعمت اللہ کے درمیان ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۲ء کے قریب ایک زبردست اور خونریز جنگ ہوئی تھی جس میں بھر قوم کو مکمل شکست نصیب ہوئی۔ کھیول سنگھ اور دیول سنگھ مارے گئے اور خود شاہ نعمت اللہ کو بھی بھروں نے شہید کر دیا۔ ان کا مزار کھیولی میں آج بھی موجود ہے اور اس پر سالانہ عرس ہوتا تھا۔ شاہ نعمت اللہ نے کھیول گڑھ پر بارہ بنکی کے ایک اور علاقے ستر کھ سے آ کر حملہ کیا تھا۔ یہ زمانہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب دلی پر خلجی خاندان حکمران تھا جنگ کے بعد اس پورے علاقے پر شاہ نعمت اللہ کے خاندان اور ان کے فرزند شاہ امانت اللہ کا اقتدار مستحکم ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر یونائیٹڈ پراونس آگرہ اودھ میں اس طرح آیا ہے۔

"سادات کی ایک اور پرانی آبادی موضع کھیولی ہے جو دیوہ سے کرسی جانے والی سڑک پر آباد ہے۔ یہ بھی تیرہویں صدی کی نمود معلوم ہوتی ہے۔ ان کی خاندانی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام قوم بھر جس کا صدر مقام قریبی موضع بھُولی میں تھا، پر فتح پا کر حاصل کیا گیا تھا۔ گمان غالب

ہے کہ سادات ستر کھ سے یہاں آئے تھے اور حضرت شاہ نعمت اللہ کا مزار یہیں ہے جن کو بھروں نے شہید کر دیا تھا۔ یہ نو آبادی بجائے خود مختار تھی اور بروقت الحاق (یعنی برطانوی سلطنت میں الحاق کے وقت۔ مؤلف) اس ریاست میں گیارہ موضعات تھے۔ سادات کا مصدقہ بیان ہے کہ ان کا ابتدائی مقبوضہ رقبہ ۴۲ موضعات پر مشتمل تھا۔ اور ماضی میں (یعنی مسلمانوں کی حکومت کی عملداری میں۔ مؤلف) کھیولی کے پٹے کے نام سے مشہور تھا اب بھی انکے پاس اکثر آبائی مواضعات ہیں اور اس پرانے قصبے میں سکونت پذیر ہیں جن کے نام سے یہ جائداد موسوم ہے"۔ (ترجمہ)

صاحب مظہر الانساب نے پٹے کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ "پٹہ اصطلاحاً ان جائدادوں کو کہا جاتا تھا جو بلا قید شرائط خراج شاہی، گذر معاش کے لیے امرائے دولت اور اکثر صوفیا کو پیش کی جاتی تھیں"۔

یہی شاہ نعمت اللہ ہمارے جدامجد تھے اور ہمارے والد سید شرافت علی ان کی دسویں پشت میں تھے۔ خاندانی شجرے کے مطابق اس کا پورا سلسلہ یوں بنتا ہے۔ سید شرافت علی پسر سید عباس علی ہنر پسر سید مدد علی پسر سید معین اشرف عرف نظر دل۔[۴] (ان کا مزار مبارک ہمارے خاندانی قبرستان میں جو سنجھلیا کہلاتا تھا، موجود ہے) پسر سید محمد اشرف پسر سید محمد ماہ پسر سید رحمت اللہ عرف براتی میاں پسر سید نعمت اللہ، پسر خواجہ سید اللہ داد پسر سید امانت اللہ پسر سید نعمت اللہ شہید فاتح کھیول گڑھ۔

روایت ہے کہ اس علاقے پر شاہ نعمت اللہ کے خاندان کا اقتدار سات سو برس تک قائم رہا۔ ابتدائی چار پشتوں تک تو یہ ریاست بڑی مستحکم رہی مگر سید محمد ماہ ابن سید رحمت اللہ عرف براتی میاں کے زمانے میں ملا منقطع نامی ایک شخص مدارالمہام مقرر کیا گیا تو اس نے خاندان میں فتنہ وفساد کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے ریاست کے حصے بخرے ہو گئے اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔

سید عباس علی ہنر کے انتقال کے بعد جب ان کی اولاد لکھنؤ منتقل ہو گئی۔ تب بھی کھیولی کے آس پاس کے قصبات میں شاہ نعمت اللہ کے خاندان کی مختلف شاخوں کے لوگ یہاں زمیندار تھے۔ خواہ وہ بڑی زمینداریاں ہوں یا معمولی اراضیوں کے مالک۔ ہمارے سب سے بڑے آبائی اور خاندانی شجرے کے مطابق (مملوکہ سید فرید احمد ولد سید

---

[۴] یہ زمانہ غالباً وہ رہا ہو گا جب صوفیا کا اثر پورے برصغیر میں بہت نمایاں تھا۔ غالباً سب رس مصنفہ ملا وجہی کے علامتی قصے میں دل اور نظر کی علامتیں اسی تعلق سے ملتی ہیں (مؤلف)

عشرت علی) شاہ نعمت اللہ شہید کا سلسلہ نسب نویں پشت میں مشرقی یوپی کے مشہور فاتح سید مسعود غازی شہید کے دادا سید محمد طاہر غازی سے اس طرح مل جاتا ہے۔ شاہ نعمت اللہ پسر سید فرحت اللہ پسر سید امین پسر سید وحید اللہ پسر سید کلیم اللہ پسر سید رفعت اللہ پسر شاہ نجابت اللہ پسر شاہ حیات اللہ پسر سید محمد طاہر غازی۔ سید محمد طاہر غازی کے دو فرزند تھے۔ ایک سید شاہ عطاء اللہ غازی دوسرے شاہ حیات اللہ غازی۔ سید شاہ عطاء اللہ غازی کے فرزند تھے سید محمود جو محمود غزنوی کے سپہ سالار اور بہنوئی ساہو غازی کے نام سے تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہیں اور انہیں کے فرزند مشرقی یوپی کے فاتح سید سالار مسعود غازی تھے جو غازی میاں کے نام سے اودھ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ سید محمود ساہو غازی کے والد کے سگے بھائی سید شاہ حیات اللہ غازی تھے جو شاہ نعمت اللہ شہید کے جدِّ امجد تھے۔

تاریخ ہند اس بات کی گواہ ہے کہ محمود غزنوی کے ایک سپہ سالار سید محمود ساہو غازی محمود غزنوی کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے اور ان کے فرزند سپہ سالار مسعود غازی نے ۱۰۲۰ھ میں اودھ پر حملہ کیا اور اس تمام علاقے کو فتح کرتے ہوئے مشہور مقام بہرائچ تک جا پہنچے جو نیپال کی ترائی سے متصل ہے۔ وہاں ایک گھمسان کے رن میں آپ شہید ہوگئے۔ آپ کا مزار مبارک بہرائچ میں مرجع خاص وعام ہے۔ وہاں آپ کا عرس بڑے زوروں میں منایا جاتا ہے جس میں ہندو مسلمان سب بڑی عقیدت سے حصہ لیتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ غازی میاں نے شادی نہیں کی تھی۔ چنانچہ ہندوؤں کی رسوم کے زیر اثر ہندو مسلمان سب مل کر آپ کی بارات اور چوتھی کی تقریب مناتے تھے جس کے پیچھے ایک حکایت ہے کہ آپ کا نکاح جن خاتون سے طے ہوا تھا۔ وہ آپ کی جہادی مصروفیات اور پھر شہادت کی بنا پر پائے تکمیل کو نہ پہنچ سکا اس لیے عوام فرط محبت اور عقیدت میں اس بارات اور چوتھی کو ہر سال مناتے ہیں۔ یہ بارات اور چوتھی ضلع بارہ بنکی کے ایک مشہور قصبے رودولی میں تقسیم ہند تک بہرائچ سے بڑی دھوم سے آتی تھی۔ تاریخ میں مرقوم ہے کہ جس زمانے میں سالار مسعود غازی نے کڑا مانک پور کی فتح کے بعد بہرائچ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اس زمانے میں ان کے والد سید محمود سپہ سالار ساہو غازی نے ستر کھ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور یہیں ان کے بعض اخلاف قیام پذیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ جیسا بیان کیا جا چکا ہے۔ کافی عرصہ کے بعد

سترکھ ہی سے شاہ نعمت اللہ نے آگے بڑھ کر کھیول گڑھ پر حملہ کیا تھا۔ سترکھ بارہ بنکی کا مشہور قصبہ ہے۔ شجرے کے مطابق سید عباس علی ہنر کا سلسلۂ نسب بائیسویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے جا ملتا ہے۔ شاہ نعمت اللہ سے ملنے والا ہمارا شجرۂ نسب ایک نظر میں، مندرجہ ذیل ہے:

سید شاہ نعمت اللہ شہید، فاتح کھیول گڑھ

سید امانت اللہ

خواجہ سید اللہ داد

سید نعمت اللہ

سید رحمت اللہ عرف باراتی میاں

سید محمد ماہ

سید محمد اشرف

سید معین الدین اشرف عرف خواجہ نظر ولی

- بی بی مستقیم النساء
- بی بی خیر النساء
- سید مدد علی
  - سید عباس علی ہنر
    - سید سخاوت علی (ایس اے حکیم)
    - سید شجاعت علی شجاع
    - سید لیاقت علی
    - سید لطافت علی
    - سید رفاقت علی سحر
    - سیدہ شمس النساء
    - سید شرافت علی
      - سلیم احمد
      - شمیم احمد
      - زاہدہ حریر
- سید بہر علی
- سید مراد علی
- سید نجابت علی
- سید حسین علی

○

آپا کا کہنا تھا کہ جب میں کھیولی، اپنے نو تعمیر مکان میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے آئی تو میں تمہارے خاندان کے ایک دوسرے سے تعلقات اور معاملات کی نوعیت سے چکرا کر رہ گئی۔ شاید میرا اپنا گھرانہ اس مخصوص قبائلی فضا اور حالات سے بہت زمانہ ہوا نکل چکا تھا جس میں

میری سسرال گھری ہوئی تھی۔ میرے تجربے میں تو خیر یہ سارے معاملات کیا آتے۔ میں نے تو ایسی باتیں سنی بھی نہیں تھیں جو کھیولی میں زندگی کا معمول ہی نہیں بلکہ افتخار اور ناز کا باعث تھیں۔

میں تو یہ سوچ کر خوش تھی کہ کھیولی میں دیہاتی ماحول کے باوجود میرے سسرالی عزیزوں کی خاصی بڑی تعداد آباد ہے اور ان میں سے کچھ علاقے کے بڑے زمیندار ہیں۔ ان میں اور ھ کی تہذیب اور تعلیم بھی موجود ہے لہٰذا میں سب سے خوب مل جل کر رہوں گی اور ابتدا ہی سے خود کو ہرگز اجنبی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔ ان سسرالی عزیزوں میں تقریباً سب تمہارے ابو کے قریبی عزیز، ایک ہی خاندان اور نسل کے افراد تھے۔ قریب کے اور دور کے سبھی عزیز مل جل کر رہتے ہوں گے۔ مگر مجھے کھیولی پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ ان میں سوائے تمہارے ابّو کے سگے بھائی یعنی منجھلے بھائی بھتیجے اور تمہارے ابو کے ماموں کی اولاد کے، سب میں ایسی رقابتیں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش، حد یہ ہے کہ دشمنیاں تک موجود ہیں کہ میں تو سن کر ہی پریشان ہو گئی۔

ان میں کچھ تو اس قسم کی رقابتیں اور دشمنیاں موجود تھیں جو زمینداری ذہنیت پیدا کر دیتی ہے اور جو سارے ہندوستان میں مسلمان زمینداروں کی خاصیت تھی خود کو دوسرے سے بڑا زمیندار سمجھنا، سب کے مقابلے پر ہر معاملے میں مونچھیں اونچی رکھنا، زمینوں پر جھگڑے اور اس کے لیے ملازموں کے جتھے رکھنا جو لڑائی جھگڑوں میں استعمال ہوتے تھے اور ان کے ذریعے قتل تک کرا دینا ایک معمولی بات تھی۔ ذرا اور اسی بات پر لاٹھی پونگا ہو جاتا تھا، مخالفین کے یہاں ڈاکے ڈلوانا اور ڈرانا، دھمکانا زندگی کا معمول تھا۔ ویسے بھی سنا تھا کہ پوری بارہ بنکی کا ضلع ایک سرزمین بے آئین تھا جس میں انگریزوں کا قانون بھی نہیں چلتا تھا اور اس پر فخر کیا جاتا تھا لیکن میرے پہنچتے پہنچتے گورنمنٹ نے خاصی سختی کر کے حالات پر قابو پا لیا تھا۔ جب قانون کی عملداری ہوئی تو آپس میں مقدمہ بازیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ ایک دوسرے کو کسی طرح بھی جیل میں بند کرا دینا بڑے کارنامے کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس کے لیے پولیس کو رشوتیں دی جاتی تھیں اور پولیس دونوں طرف سے ہاتھ رنگتی تھی۔ کہیں پانی زیادہ لینے پر جھگڑا کہیں پانی بند کر دینے اور زمین سے گزرنے پر لاٹھیاں اور بندوقیں چل جاتی تھیں۔

یہ ماحول تو ہندوستان کے اکثر علاقوں میں نظر آتا تھا اور شاید اب بھی ہے مگر میں نے کھیولی میں یہ بھی دیکھا کہ وہاں اپنی ذاتی نام و نمود کی خواہش اور عزیزوں کو نیچا دکھانے، ان کے

دکھ درد میں بجائے شریک ہونے کے ظاہری طور پر ہمدردی کا اظہار تو کیا جاتا تھا مگر کسی گھرانے کے بگڑ جانے یا کسی سانحے میں گرفتار ہو جانے کی وجہ سے اگر عزت یا افلاس کا سامنا ہوتا تو یہ لوگ اس کو جگہ جگہ بیان کرتے پھرتے اور یہ ٹوہ لیتے کہ ان کے یہاں پک کیا رہا ہے، پہن کیا رہے ہیں۔ اور تاسف کے پردے میں اندر ہی اندر خوش ہوتے تھے کہ چلو ایک حریف تو کم ہوا یا ایک کی تو مونچھیں نیچی ہوئیں۔ کسی خوشی کے موقع پر کوئی کھنڈت ڈال دینا اور غم کے موقع پر طرح طرح کی باتیں بنانا ایک عام سی بات تھی۔ اس میں ایک بات سلیم کے لیے بڑی حیرت اور تکلیف کا باعث ہوئی تھی کہ جب ان کے ابو کو دفن کیا جا رہا تھا تو ایک عزیز جو مرحوم کے بڑے دوست سمجھے جاتے تھے اس وقت بھی سنس رہے تھے۔ گو ان اکڑ اکڑ چلنا اور اس میں بھی یہ مسرت حاصل کرنا کہ کسی عزیز کو ہم کتنی آسانی سے نظر کر سکتے ہیں کتنی ہی عجیب باتیں تھیں۔ البتہ تمہارا اپنا گھرانا اس قبائلی نفرت، حسد اور خباثت سے محفوظ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ تمہارے خاندان نے کھیولی کی سکونت ترک کر دی تھیں اور شہر میں اجنبیوں اور غیروں کے درمیان اس ذہنیت کے پروان چڑھنے کا امکان بہت کم ہو گیا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ تم سب میں صاف گوئی، سچ بولنے اور منافقت سے شدید نفرت کی خاندانی روایت موجود تھی۔ بعض اوقات تو اس کے لیے اپنے نفع نقصان کی بھی کوئی پرواہ نہ کی جاتی۔ تمہارے چچاؤں میں دو ایک بھائی اگر اس روایت کے حامل نہ تھے تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کا مزاج مختلف تھا۔ ان کی افتادِ طبع میں صلح پسندی، سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا شامل تھا۔ وہ ہر قسم کی چپقلش سے بچنا چاہتے تھے ورنہ حق گوئی میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔

تمہارے ابو جان باوجود اپنی نرمیٔ مزاج اور شوخی کے اشتعال میں آ جاتے تھے۔ جب بھی زمینداری کے کسی معاملے میں یا کوئی ان کا اپنا ملازم جان بوجھ کر کوئی گڑبڑ کرتا تو اتنی سختی سے پیش آتے اور اس طرح مارتے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ مگر مزاج میں کوئی چیز ایسی بھی تھی کہ پھر اپنے ہاتھ سے اس کی دوا دارو اور ہلدی چونا کرتے۔ گھر میں آ کر پچھتاتے اور روتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے حریفوں اور مخالفوں کے ساتھ اچانک کوئی ایسی بات کر جاتے جو تمہارے علاقے کے لیے غیر متوقع ہوتی، اور سب حیران رہ جاتے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ تمہارے ایک نسبتاً دور کے چچا جو کھیولی کے بڑے روایتی قسم کے اور تیوروں کے زمیندار تھے ان سے تمہارے ابو کی ہمیشہ چلتی رہتی تھی۔ وہ جتھے دار قسم کے ہر کام کر گزرنے والے زمیندار تھے۔ میں ان سے ہمیشہ ڈرتی رہتی تھی کہ کہیں دشمنی میں جان سے نہ مروا دیں یا ڈاکہ نہ ڈلوا دیں مگر خیر

ایسی نوبت نہ آئی۔ ایک بار ایک قتل میں ان کے ملوث ہونے کے خاصے ثبوت مل گئے۔ فریق مخالف اس بات پر تلا ہوا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میاں کو ایک رات جیل میں ضرور بند کرانا ہے۔ جو وہاں ناک کٹ جانے اور عزت اتر جانے کے مترادف تھی۔

غرض کہ دونوں طرف حوالات میں بند کرانے اور اس سے بچنے کے لیے پانی کی طرح روپیہ بہایا جا رہا تھا۔ تمہارے ابو اس دوران لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ اچانک گھوڑے پر آئے۔ گھوڑا کھولا نہیں اور مجھ سے کہنے لگے کہ زمین کے تمام کاغذات، نقد روپیہ، اپنے زیورات اور جو بھی قیمتی چیز ہو نورا دے دو۔ جب وہ حکماً کوئی بات کہتے تو مجھے پوچھنے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی کہ خیر تو ہے۔ میں نے فوراً جو کچھ تھا سب دے دیا۔ اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ پھر اگلی صبح آئے تو بہت خوش آئے۔ میں نے موڈ اچھا دیکھ کر پوچھ لیا کیا کر آئے۔ پوری تفصیل سے قصہ بتایا کہ فلانے میاں (مذکورہ بالا زمیندار) کی ضمانت دے کر آیا ہوں۔ اس کے لیے پانچ سو روپے رشوت دینی پڑی۔ میں حیران کہ ضمانت میں رشوت کیسی۔ کہنے لگے تم کیا جانو اس وقت کیا پالا مار کر آیا ہوں۔ ضمانت دراصل میں سب سے پہلے دینا چاہتا تھا کوئی ضروری نہیں تھا کہ میری ضمانت قبول کر لی جاتی۔ ان کے عزیز ہرگز ایسا نہ کرنے دیتے وہ تو اور معاملات میں ذرا پھنس گئے تھے۔ اس کے لیے مجھے رشوت دینی پڑی اور میری ضمانت قبول ہو گئی۔ میری سمجھ میں یہ باتیں نہ آتی تھیں۔ خیر جب وہ تمہارے چچا (زمیندار) چھوٹے تو ان کا جملہ تھا کہ کاش شرافت علی مجھے گولی سے مار دیتا مگر ایسی چوٹ نہ دیتا۔ میں تو ساری زندگی اس کے احسان تلے دب گیا اور اس کا بدلہ بھی نہیں چکا سکتا۔ البتہ تمہارے بھائی جان بڑے گھر سے اور اپنے مزاج کے ایک سخت آدمی تھے۔ وہ خود کبھی کسی کے معاملے میں ٹانگ نہ اڑاتے اور اپنے کام سے کام رکھتے لیکن دوسروں کی ذرا سی ٹیڑھی بات برداشت نہ کر پاتے۔ بات بڑی کڑوی کرتے اور فوراً ہی بات پر عمر بھر کے لیے شکل دیکھنی چھوڑ دیتے۔ وہ کسی جھگڑے میں اول تو پڑتے نہیں تھے مگر جب پڑتے تو پھر اللہ کی پناہ۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے سامنے ان کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا مگر سب ان سے ڈرتے تھے۔ جس کو وہ ناپسند کرتے خواہ کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہوتا۔ ان کی زندگی میں گھر آنے کی ہمت نہ کر پاتا تھا۔ وہ تمہارے بڑے تایا سید سخاوت علی کے بڑے فرزند تھے۔ شرافت علی ایس۔ اے حکیم کہلاتے تھے۔ وہ لکھنؤ کے بہت مشہور حکیم تھے۔ پیچیدہ امراض کا علاج خوب کرتے اور ان کے دواخانہ فیض عام کی دوائیں بھی خوب بکتی تھیں۔ ان کے مریضوں میں بڑے بڑے

تک شامل تھے۔ ان کی بعض باتیں عجیب و غریب تھیں۔ امین آباد لکھنؤ میں جہاں وہ رہتے تھے
ان کو تیس برس کسی نے دن میں مکان سے باہر آتے یا زینہ اترتے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ جب ان
کو تمہاری چھوٹی تائی کے طلاق کے سلسلے میں ان کے ایک عزیز نے جو پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ
تھے، پولیس بھیج کر بلایا تو محلے کے لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کس کو لے گئی۔ وہ ہمیشہ گھر سے
مغرب کے بعد نکلتے تھے۔ ایک بند فٹن زینے کے سامنے آ کر رکتی اور وہ اس میں بیٹھ جاتے
اور پھر رات گئے واپس آتے۔

یہ تمہارے خاندان کے پہلے شخص تھے جنہوں نے اس وقت بینک میں روپیہ رکھوایا جب
لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ بینک ہوتا کیا ہے۔ آٹھ آنے کا منی آرڈر بھی منگواتے تو چیک کے ذریعے رقم
منگواتے۔ کہا جاتا تھا کہ انہوں نے صرف ڈیڑھ روپیہ سے اپنا اکاؤنٹ کھولا تھا اور اچھے دنوں
میں اس میں ایک لاکھ روپیہ تک رقم رہتی تھی۔ رؤسا کا سا انداز تھا۔ منشی نول کشور، مشہور
زمانہ نول کشور پریس کے مالک سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ لکھنؤ کے تمام شعراء سے
ان کی صحبتیں رہتی تھیں۔ صفی لکھنوی سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔ انہوں نے ان کی تعریف
میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ [اس کے چند اشعار بھائی صاحب کو یاد تھے جو وہ سناتے تھے، ملاحظہ]

کرتا ہے زندہ ایسے مریضوں کو اک مسیحا
ایس۔ اے حکیم جس کے نسخے ہیں امتحانی

جو نسخہ سوال پڑھ کر ان کا جواب لکھے
یا حال اپنا آ کر کہہ دیجئے زبانی

پیش طبیب جا کر شرمائیے نہ ہرگز
نا قابل بیاں ہو ہر چند یہ کہانی

نظم صفی کو جام ماء الحیات سمجھو
ہر گھونٹ میں ہے اس کے اک عمر جاودانی

شراب بڑی کثرت سے پیتے تھے۔ سارا روپیہ شراب کباب میں اڑا دیا۔ تمہارے عزیزوں
میں یہ واحد آدمی تھے جو شراب کی طرف گئے۔ ان کی پہلی شادی برادری میں ہوئی تھی۔ بیوی بیچاری
بے حد سادہ، خدمت گزار، محبت کرنے والی تھیں مگر صورت شکل بہت معمولی تھی اور رہن سہن
قصباتی شریف عورتوں کا تھا مگر ایسے میاں سے ان کی کیا بنتی جن کے کپڑے دھوبی کے یہاں

جاتے تو خوشبوؤں کی لپٹوں سے الگ پہچانے جاتے۔ ان سے چھوٹا لاڈلا ہوتا تھا میں تمہارے بھائی جان جمیل اور ایک لڑکی وجیہہ النساء تھیں یعنی تمہاری اپنی تمہاری بڑی اماں جمیل کے پاس رہتی تھیں۔ بعد میں جمیل تمہارے ابو جان کے پاس کھیولی آگر رہنے لگے تھے۔ چچا بھتیجے میں عمر کا زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ سلیم سے جیسی محبت تمہاری اماں کرتی تھیں میں بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ سلیم کے بغیر کھانا تو کیا پانی بھی نہیں پیتی تھیں۔ سلیم کو آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو دروازے پر کھڑی ہو جاتیں۔ ہر سانس میں سلیم ہی سلیم تھے۔

تمہارے بڑے ابا نے دوسری شادی میری ایک رشتے کی چچازاد بہن ساجدہ سے کی تھی۔ یہ میرے خاندان کی دوسری لڑکی تھیں جو تمہارے ننھیال میں بیاہ کر آئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شادی تھی۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ ساجدہ ظاہر ہے بالکل مختلف ماحول اور اطوار رکھتی تھیں۔ میں نے تو کھیولی آکر یہ بھلا ہی دیا تھا کہ میں کہاں کی رہنے والی ہوں۔ ساجدہ اور تمہارے بڑے ابا کے مزاجوں میں بڑا فرق تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساجدہ گھر بیٹھ رہیں۔ ایک لڑکا شکیل ان سے ہوا۔ جب ساجدہ کسی طرح واپسی کے لیے تیار نہیں ہوئیں تو یہ طے ہوا کہ ان کو طلاق دلوا دی جائے۔ مگر تمہارے بڑے ابا طلاق کے قائل نہ تھے۔ اتفاق سے ساجدہ کے ایک عزیز جو پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے، لکھنؤ میں تعینات ہوئے تو انہوں نے طلاق دلانے کے لیے ایس۔ اے حکیم کو ڈرانے دھمکانے کے واسطے پولیس کے ذریعے دن دہاڑے اغوا کرالیا۔ محلے والے چونکہ ان کو پہچانتے ہی نہ تھے لہٰذا ان کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کس کو لے جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ پستول دکھا کر لے گئے تھے اور مطب میں عطاری کا کام کرنے والے بھی ڈر کے مارے دم بخود رہے۔ جب پولیس چلی گئی تو عطاروں کو ہوش آیا اور ان میں سے ایک بھاگا یعنی سید لطافت علی کے یہاں پہنچا، اتفاق سے وہاں تمہارے ابو جان بھی موجود تھے جو کھیولی سے اسی وقت پہنچے تھے۔ یہ بات سنتے ہی وہ تمہارے چچا جان سے یہ کہہ کر بھیا آپ سب کو اطلاع کرتے ہوئے کوتوالی پہنچیے خود فوراً روانہ ہو گئے اور کوتوالی پہنچ کر باہر ہی سے نعرہ لگایا کہ بھائی جان گھبرائیے گا نہیں میں آن پہنچا۔ اور تمہارے کا بیان ہے کہ میری آواز سن کر ان کا چہرہ فرط مسرت سے سُرخ ہو گیا۔ وہ ایک کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ میرے بھائی آ پہنچے۔ شرافت علی آن پہنچے اور آکر مجھے گلے لگا لیا۔ پھر تو تانتا بندھ گیا۔ یکے بعد دیگرے باقی چاروں بھائی جو پہنچے تو کوتوالی میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ ساجدہ کے عزیز نے بھی مصلحت دیکھ کر ان سب کی بڑی پذیرائی کی اور

کہا میں نے تو اِبس۔ اے حکیم صاحب کو بات چیت کے لیے بلایا تھا۔ خاصی گرما گرم بحث کے بعد بالآخر خلع پر معاملہ طے ہو گیا۔ تمہارے بڑے ابا کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا تھا۔

تو خیر میں کھیولی میں آئی تو اس ماحول اور ایک دوسرے سے کٹا چھنی میں میرا تو دم گھٹنے لگا معلوم ہوا کہ تمہارے ابو جان نے بھی ایک معمولی سے واقعہ پر اپنے چچا کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ اور ان سے بات چیت بالکل بند ہے جبکہ ان کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ان کا چبوترا اور ہمارا چبوترہ قریب تھا۔ ان کے چبوترے پر بھوسہ اور پیال پڑا ہوا تھا۔ ہماری بھینسیں دھیتا (تالاب میں نہا کر ان کے چبوترے پر چڑھ جاتیں اور بھوسہ کھا لیتیں۔ ان کو شکایت پیدا ہوئی۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ ایسا نہ ہو۔ مگر بھینسیں تو بھینسیں ہوتی ہیں ذرا نظر چوکی اور وہ بھوسے پر ہوتی تھیں۔ بھینسیں جو چڑھیں پھر چبوترے پر۔ تمہارے ابو جان کے چچا کو جو بہت ضعیف تھے بڑا غصہ آیا۔ آخر وہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے جھٹ دونوں بھینسوں کی دُمیں ٹاٹ اور رسی سے خوب کس کر باندھ دیں اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ بھینسیں جلن کی تکلیف سے ڈکراتی ہوئی دھیا میں جا کر کود گئیں۔ اتفاق سے یہ گھر پر تھے اور لوگوں نے جو آ کر خوب نمک مرچ لگا کر واقعہ بتایا تو یہ کہاں رکتے لاٹھی لے کر جا پہنچے۔ انہوں نے بھی بجائے شرمندہ ہونے کے الٹے بے نقط سنائی۔ بس ان کا ہاتھ چل گیا اور ان کی ٹانگ پر خاصی ضرب آئی۔ وہ بیچارے بوڑھے صاحب فراش ہو گئے۔ اس واقعہ کے سبب ان دونوں گھرانوں میں بول چال بالکل بند تھی۔ غرض کہ میرا تو کھیولی میں دم گھٹنے لگا۔ یا اللہ اس گاؤں میں، اس ماحول میں بغیر ملے جلے زندگی کیسے بسر ہو گی؟ آخر میں نے ہمت کر کے تمہارے ابو جان سے بات کی۔ دیکھیے میں آپ کے خاندان سے تو تعلق رکھتی نہیں۔ میرا میکہ بھی بہت دور ہے۔ آپ کے اپنے قرابت داروں میں ایسی دشمنیاں ہیں کہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار نہیں۔ میں تو یہاں اکیلی مر جاؤں گی۔ لہٰذا آپ چاہے اپنے عزیزوں سے ملیے چاہے نہ ملیے۔ میرے لیے تو وہ آپ کے عزیز ہیں۔ میں تو شادی غمی میں بھی شرکت کروں گی اور سب سے ملوں گی۔ انہوں نے میری بات غور سے سنی اور خوش بھی ہوئے اور مجھے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے تمام قریب کے عزیزوں سے میل جول بڑھانا شروع کیا اور ان سے بھی کہا کہ میں تو آپ کی بہو ہوں اور غیر ہوں۔ لہٰذا آپ لوگ چاہے میرے یہاں آئیں یا نہ آئیں۔ میں سب کے یہاں آؤں گی۔ میری اس بات کا اثر سارے خاندان پر بڑا خوشگوار پڑا۔ چاہے مردوں سے زیادہ ملنا ملانا ہوا یا نہیں۔ مگر میں سب کے یہاں

آنے جانے لگی اور عورتیں میرے یہاں آنے لگیں۔ میل جول کے اس عمل میں سب سے پہلے میں نے تمہارے ابّو اور ان کے نشر رب چچا کے درمیان صلح صفائی کرائی۔ میں نے انہیں شرم دلائی کہ آپ کے چچا ہیں ضعیف اور بیمار ہیں چلیے میرے ساتھ جا کر معافی مانگیے۔ اس میں آپ کی کوئی ہیٹی نہیں۔ اس طرح جا کر کھیوولی میرے لیے زندگی بسر کرنے کے قابل ہوئی۔

تمہارے ابو اپنی ذات کی حد تک بڑے نرم، بڑے خلیق، بامروّت اور بڑی محبتوں کے آدمی تھے اس معاملے میں سب ان کی تعریف کرتے تھے۔ میرے خاندان میں سے جب بھی کوئی کھیوولی آتا تو ساری عمر کے لیے ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو کر جاتا۔ میرا بہت خیال رکھتے۔ طبیعت میں بھی بڑی شوخی تھی۔ انہیں کھیوولی سے واقعی بڑی محبت تھی۔ وہ مجھے اکثر اس علاقے کے دوہے، کبت اور گیت اس وقت خاص طور سے سناتے تھے جب میں کھیوولی میں رہتے رہتے اوب جاتی۔ مجھے بہلانے اور خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی خود بھی لوربی میں کچھ کہتے۔ اکثر یہ کبت پڑھتے

ہو بھیا، ہو بھیا
ہو رانی، ہو رانی
ہو راجا، ہو راجا
گولر گدیا کھیّا راجا
گولر گدیا کھیّا بھیا

پیبا دھیا کا پانی
ہو رانی ہائے جوانی!
ہائے جوانی کٹ گئی رانی
پیتے دھیّا کا پانی
پیہ پیبا دھیّا کا پانی
اور گولر گدیا کھیّا
کھیولی چھوڑ کہیں نہ جیّا

اور کبھی موج میں گنگناتے

ہو کھیوولی سہر البیلا
چلو گوری دکھا لاؤں میلا

کیبولی سہر البیلا
اوراگر میرا موڈ زیادہ خراب ہوتا تو مجھے چھیڑتے
او دیّا ، او دیّا
کیسی مہریا سے پالا پڑا !
میں نے جو کہا چلو دکھا لاؤں میلا
کپڑوں کو پھاڑ پھوڑ
بالوں کو نوچ ناچ
گنجی کھڑی ہے
او دیّا کیسی مہریا سے پالا پڑا
میں نے جو کہا کہ چلو سیر کرا لاؤں
سرے کو پھینک پھانک
آنکھوں کو پھوڑ پھاڑ
اندھی کھڑی ہے
او دیّا کیسی مہریا سے پالا پڑا

اور کبھی مزیدار قصے سناتے کہ ایک زمیندار صاحب اپنے چبوترے پر بیٹھے شام کو سیر کر رہے تھے کہ اتفاق سے قسمت کے مارے ایک پاسی اور پاسن (ایک نچلے ذات کی ہندو نسل) کا ادھر سے گزر ہوا ، زمیندار صاحب تو حاکم تھے دونوں کو بلایا اور کہا ناچو ۔ حکم حاکم مرگ مفاجات بیچارے دونوں ٹھمکے لگانے لگے ۔ ٹھمکا لگاتے لگاتے پاسی بولا

کو سُسرا ، ناچت جانیں ، کو سُسرا نچوا وت ہے
(یعنی کون سُسر ناچ جانتا ہے اور کون سُسرا نچوا رہا ہے)

عورت ہمیشہ بڑی حقیقت پسند ہوتی ہے اس نے ٹھمکا لگا کر اسے تنبیہ کی

ایہہ بانی مت بولیو ، ایہہ بانی پٹوا وت ہے
(یعنی یہ بات نہ کرنا ورنہ اس بات پہ پٹائی ہو جاتی ہے)

پاسی نے اس سے ایک اور رُخ نکال لیا جو مرد کی فطرت ہوتا ہے

او سُسرا تو سمجھت ناہیں تو سُسری سمجھاوت ہے

بڑے زمیندار تھے۔ بڑی حویلیاں بھی گاؤں میں موجود تھیں۔ مگر جدید قسم کا اگر کوئی مکان کھیولی میں پہلی بار بنا تو وہ ہمارا ہی تھا۔ آپا کہتی تھیں کہ تمہارے ابّو جان مجھ سے کہتے تھے کہ انشاء اللہ تمہاری اور تمہاری اولاد کے لیے وہ سب کچھ اس کھیولی میں مہیا کر دوں گا کہ کوئی حسرت نہیں رہے گی۔ چنانچہ مکان سے فراغت کے بعد انھوں نے ملا آبار کے قریب اپنے ایک قطعہ زمین پر قلمی آموں کا باغ تیار کرانا شروع کر دیا تھا۔ اور بڑے چاؤ سے جگہ جگہ سے عمدہ عمدہ قلمی آموں کی پود منگوا کر دسہری، سفیدہ، مالدہ، فجری کی عمدہ اقسام منگوا کر لگائی تھیں اور اس میں طرح طرح کے اور پھل بھی تھے۔ [مجھے اس باغ کا نقشہ بھی کل کی طرح یاد ہے۔ اس کے تین اطراف کیلوں کے درخت تھے۔ آموں کی روشوں کے درمیان بیچ، آڑو، فالسہ، لیموں، چکوترہ اور کٹھل کے پیڑ تھے۔ اتنے بہت سے پھلوں کے پودوں اور درختوں کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہیں دیکھا تھا۔ مؤلف] کھیولی میں یہ قلمی آموں کا سب سے بڑا باغ تھا۔ آپا کا کہنا ہے کہ تمہارے ابّو جان کے انتقال کے ایک سال قبل قلمی آم فصل کے لیے بالکل تیار تھے۔ مگر ان کو اپنے باغ کے آم کھانے نصیب نہ ہو سکے۔ بھائی صاحب کا بیان ہے کہ جب آموں میں پہلی بار بور آیا اور چھوٹی چھوٹی امیاں لگیں تو ابّو جان بہت خوش ہو ہو کر اس کا حال بیان کرتے تھے۔ آم معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زمین کی طرف بور اور امیوں کی کثرت سے جھکے جا رہے ہیں مگر بچپن کی شرارت، میں اپنے ساتھیوں کو لے کر باغ گیا تو سارے درخت جھنجوڑ ڈالے، تمام بور اور امیاں زمین پر بچھ گئے۔ اور جب شام کو ابّو جان ہمیشہ کی طرح باغ کی طرف سے ہو کر گھر آنے کے لیے پہنچے تو مالی نے سارا قصہ سنایا۔ اپنی ہونے والی پہلی فصل کا یہ حال دیکھ کر ابّو جان کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے باوجود مجھ سے انتہائی محبت کے ایک زور کا چانٹا گھر آتے ہی میرے منہ پر مارا۔ ایسا چانٹا کہ میرے گال پر انگلیوں کے نشان بن گئے۔ بھائی صاحب کہتے ہیں کہ اس چانٹے کا صدمہ میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

○

آپا کی روایت ہے کہ سلیم جب پیدا ہوئے تو وہ تمہارے گاؤں کی تاریخ کا ایک قابل ذکر واقعہ تھا کیونکہ ۲۵ سال بعد تمہارے تمام نانے کھیولی میں اکٹھا ہوئے تھے اور شاید آخری بار بھی۔ تمہارے باپ، تمہارے دادا کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ سب سے بڑے نثار علی پھر نجابت علی پھر لیاقت علی پھر لطافت علی پھر رفاقت علی پھر شمس النسا اور پھر شرافت علی۔ تقریباً تمام بھائیوں کی اولاد نرینہ

تھی سوائے سید لیاقت علی کے جن کی صرف تین لڑکیاں تھیں۔ اچھن، امتن اور مومنہ۔ گو کہ سب بھائیوں کی اولاد بہت کم تھی۔ مگر سلیم کی پیدائش اس اعتبار سے قابلِ ذکر تھی کہ کسی بھائی کے کسی لڑکے یا لڑکی کی پیدائش پر خاص طور پر پورا خاندان ۲۵ سال سے اکٹھا نہیں ہوا تھا اور وہ بھی کھیولی میں۔ اس بات کی دھوم پورے علاقے میں تھی۔

سلیم ۳ رمضان، ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے تھے اور یہ سب بہن بھائی پھر عید کر کے واپس گئے۔ جب عید کی نماز کے لیے چھیئوں بھائی ایک ساتھ گھر سے نکلے تو نظروں میں نہیں سما رہے تھے ہر ایک کی آنکھ رشک سے اُن پر پڑ رہی تھی۔ پتہ نہیں کون سی گھڑی تھی اور کس حاسد کی نظر تھی کہ چار سال میں دیکھتے دیکھتے چار بھائی چٹ پٹ ہو گئے۔ جب زاہدہ پیدا ہوئی تو تین بھائی اور ایک بہن موجود تھے اور پھر چھ ماہ کے بعد چچا تھے یعنی تمہارے ابو بھی نہیں رہے۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ سلیم کو دیکھ دیکھ کر تمہارے سارے تائے نہال ہوئے جا رہے تھے۔ سلیم کا سر تو ماشاءاللہ تھا ہی غیر معمولی طور پر بڑا اور خوبصورت۔ ہر ایک سب سے پہلے ان کے سر کو دیکھتا تھا۔ ایک بولے شیر کا سر ہے ماشاءاللہ، دوسرے کی آواز آئی سر بڑا سردار کا پاؤں بڑا گنوار کا۔ تیسرے نے ہمنوائی کی نظر دل پر لگا ہے۔ سلیم کا سر شرافت تمہارے بچے کا سر بڑے وار اپر گیا ہے۔ ایک اور آواز آئی تم دیکھنا یہ خاندان کا نام روشن کرے گا۔ اگلے ہی دن ان آوازوں سے پورا گاؤں گونج رہا تھا۔ عید کے بعد باری باری تمام بھائی رخصت ہونے لگے۔ سب سے آخر میں بھیّا لطافت علی گئے۔ وہ سلیم کو دیکھ کر بار بار کہتے، شرافت علی سلیم کو کچھ عرصے بعد میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے انشاءاللہ بہت اچھی اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ تم دیکھنا یہ بڑا عالی دماغ ہوگا۔ اس کا سر ماشاءاللہ پورے خاندان میں سب سے بڑا ہے۔ اپنے بھورا کا سر تو بالکل گری سا ہے (ابو بھائی سید عرفان احمد ان کے لڑکے جو بھائی صاحب سے تقریباً ۱۵ سال بڑے تھے۔ مؤلف)

تمہارے سارے خاندان نے تمہارے دادا عباس علی کے انتقال کے بعد کھیولی کی سکونت ترک کر دی تھی۔ ان میں سے کوئی ایک بھائی صرف اپنی زمین کی دیکھ بھال اور ہر سال تحصیل وصولی کے لیے کھیولی آ جاتا تھا۔ مگر تمہارے ابو کو اپنی زمین اور گاؤں سے فطری طور پر بڑی محبت تھی۔ انھوں نے شادی کے بعد ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کھیولی میں رہوں گا۔ اُن کے اس اس ارادے میں اگر کوئی دوسرا بھائی شریک تھا تو وہ تمہارے منجھلے ابا سید لیاقت علی تھے۔ دونوں بھائیوں نے آمنے سامنے مکان بنایا تھا، دونوں کے صحن ملے ہوئے تھے۔ منجھلے بھائی لو

تمہارے ابو جان ہیں جیسی محبت تھی ویسی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ویسے تو تمہارے ابو جان سب ہی بھائیوں پر جان چھڑکتے تھے۔ مگر منجھلے بھائی سے تو وہ باپ کی طرح محبت کرتے تھے۔ اُن کے بعد تمہارے ابو کسی اور سے سب سے زیادہ قریب تھے تو وہ بھتیا سید لطافت علی تھے۔ اتفاق سے منجھلے بھائی کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اللہ نے اُن پر بہت سی آزمائشیں ڈال رکھی تھیں۔ ان کی بیوی اور ایک لڑکی کو گٹھیا کا مرض تھا جس کی وجہ سے ان کے اعضاء مفلوج سے ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ صابر آدمی نہیں دیکھا۔ اور اتنے ہی متقی۔ ان کی پوری زندگی قرآن اور سنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ولیوں جیسی زندگی، تہجد گزار۔ سب بھائیوں میں دینی تعلیم اگر کسی نے باقاعدہ حاصل کی تھی تو وہی تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید تھے۔ ان کے گھر کا ایک ایک فرد تسلیم کا عاشق تھا۔ تمہارے ابو اور منجھلے بھائی میں جیسا سلوک تھا۔ زندگی میں تو ویسا نظر آنا مشکل تھا مگر موت بھی دونوں کی آگے پیچھے صرف چھ ماہ کے اندر اندر ہو گئی تھی۔ اللہ مغفرت کرے۔ ایسی مثالی محبت کم نظر آتی ہے۔

منجھلے بھائی کی موت ایک شہید کی موت تھی۔ ایک مومن کی موت تھی۔ اور تمہارے دادا مدد علی کی شخصیت ان میں سما گئی تھی۔ وہ لکھنؤ سے اپنا کوئی کام کر کے کھیولی جا رہے تھے کہ ایک لاری میں سوار ہونے لگے۔ لاری والے نے ایک دم سے لاری چلا دی۔ ان کا پیر پائیدان سے پھسل گیا اور ان کی ایک ٹانگ لاری کے پہیے کے اندر آ گئی۔ اور جب تک لاری رکے وہ پہیے کے ساتھ گھسٹتے رہے۔ جب اس میں سوار لوگوں نے شور مچایا تو لاری رکی اور اس کو جائے حادثہ پر واپس لایا گیا۔ اتفاق سے جائے حادثہ کے قریب ہی تمہارے ابو اور تمہارے منجھلے ابا حکیم سید شجاعت علی بھی کہیں سے آ کر کھڑے تھے۔ انھوں نے جب مجمع لگا دیکھا اور معلوم ہوا کہ کوئی لاری کے نیچے کچل گیا ہے تو بھیڑ کو ہٹاتے ہوئے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حادثہ تو اُن کے اپنے بھائی کے ساتھ ہوا ہے۔ مگر ذرا استقامت کا حال سنو، تمہارے ابو جان بتاتے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ وہ بیٹھے ہوئے اپنی چیتھڑا ٹانگ کے مختلف ٹکڑے اٹھا کر اپنے مفلر کے ساتھ ٹانگ سے باندھ رہے ہیں اور کیا مجال کہ زبان پر اُف بھی آئی ہو۔ فوراً دونوں بھائی زخمی بھائی کو اسی لاری سے لے کر بارہ بنکی کے سول اسپتال پہنچے۔ سول سرجن نے فوراً آپریشن تجویز کیا کہ جب تک ران تک ٹانگ نہیں کاٹی جائے گی۔ ان کا بچنا محال ہے۔ مگر منجھلے بھائی کسی طرح کلوروفارم سونگھنے کے لیے تیار نہ تھے وہ اسے شرعاً حرام سمجھتے تھے۔ اور

سول سرجن سے کہا آپ ٹانگ بے شک کاٹ دیجیے ، فکر نہ کیجیے ۔ بس جس وقت کاٹنے لگیے مجھے بتا دیجیے گا ۔ یہی ہوا کہ جب اُن کو بتایا گیا تو آپ نے زور زور سے کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا ۔ دوران آپریشن پورا اسپتال اُن کے کلمے کی آواز سے گونج رہا تھا ۔ آپریشن کے بعد تین روز زندہ رہے ۔ بدن میں زہر پھیل گیا تھا ۔ مگر تسبیح تو تسبیح ایک گراہ بھی نہیں نکلی ۔ ہر سانس کے ساتھ بس اللہ ہو اللہ تھا ۔ سلیم کو لکھنؤ ان کے پیارے چچا کے سانحہ کی اطلاع دے کر بلا لیا گیا تھا وہ بھی تین روز اپنے ابّو کے ساتھ اسپتال میں رہے ۔

تمہارے ابّو پر اپنے ولی صفت بھائی کی شہادت نے عجیب اثر کیا ۔ جب وہ بھائی کی موت کے بعد ان کے قریب سے اٹھے ہیں اور گھر آئے ہیں تو اُن کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے ۔ اس واقعہ نے ان کا دل دنیا سے پھیر دیا تھا صرف چھ ماہ خود بھی زندہ رہے ۔ مگر مسکرانا اور بات کرنا تو الگ رہا ، ہونٹ سے ہونٹ لگ گیا ۔ ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے ۔ لاری والے پر مقدمہ قائم کر دیا تھا اس کی پیشی سے جب واپس آئے تو خود بیمار پڑ گئے ۔ منگل کا دن تھا ۔ نماز سے واپس آئے تو تیز بخار تھا ۔ دوسرے روز زبان بند ہو گئی ۔ جمعہ کے روز ذرا سی دیر کے لیے زبان اور آنکھ شاید اس لیے کھلی تھی کہ اللہ اللہ کہہ سکیں اور اسی شام کو انتالیس کی عمر میں انتقال ہو گیا ۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون ۔ جب انتقال ہوا تو اسی وقت ایک زبردست آندھی آئی ۔ لوگ سمجھے قیامت آ گئی ۔ مسجدوں اور گھروں میں اذانیں دی جانے لگیں ۔ شوالوں میں گھنٹے بجنے لگے اور مویشی زور زور سے ڈکرانے لگے ۔ یا اللہ میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے جن کے سر سے سایہ اُٹھ گیا سوائے تیرے کون ہے جو میری اور ان یتیموں کی دستگیری کرے گا ۔ اس وقت سلیم ۹ برس سے کچھ زیادہ کے شمیم تین سال کے اور زاہد چھ ماہ کی تھی ۔

بھائی صاحب کی روایت ہے جس روز یعنی منگل کے روز ابّو جان پیشی سے واپس ہوئے تو خود بیمار پڑ گئے ۔ ان دنوں ہمارے گاؤں میں بھادیو کا میلہ ہو رہا تھا ۔ میں بھاگ بھاگ کر میلے جاتا اور پھر واپس آ جاتا ۔ ابّو جان اس وقت ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہے تھے انھوں نے جو مجھے دوڑتے بھاگتے دیکھا تو ڈانٹا اور کہا بس اب کہیں نہ جاؤ ۔ میلہ دیکھ چکے میرے ساتھ نماز پڑھو ۔ میں چپ چاپ ان کے پیچھے ہو لیا ۔ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اذان کا وقت تھا ۔ انھوں نے اذان دینی شروع کر دی ، جوں ہی کلمہ شہادت پر پہنچے آواز بیٹھ گئی ۔ اذان پوری نہ کر سکے ۔ مسجد کے فرش پر لیٹ گئے ۔ حاجی ارشاد صاحب جو مسجد کے مؤذن اور امام تھے

(یعنی وہ سُسر تو میری بات سمجھ نہیں رہا تو سُسری اُسے یہ سمجھا نا چاہ رہی ہے)
غرض کہ مجھے طرح طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑے خوش الحان تھے اور رامائن اتنی خوش الحانی سے پڑھتے تھے کہ لوگوں کو وجد آجاتا تھا۔ جوانی میں جب رامائن کی فرمائش ہوتی تو نہا کر اور باقاعدہ دھوتی باندھ کر (مسلمان جو ایا زیر بند پہنتے ہیں وہ تہمد یا لنگی کہلاتا تھا کیونکہ وہ ساری ٹانگوں کو ڈھانکتا تھا۔ لیکن ہندو دھوتی پہنتے تھے جس میں ٹانگیں کھلی رہتی ہیں۔ مؤلف) خوب لہک لہک کر رامائن پڑھتے لیکن جب اپنے مذہب کی طرف طبیعت زیادہ راغب ہوئی تو اسی خوش الحانی سے سورۃ رحمٰن پڑھنے لگے تھے۔ رامائن پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ سورۃ رحمٰن پڑھتے پڑھتے خود بھی اور سننے والے بھی عجیب کیفیت میں آجاتے تھے۔

○

آپا کا کہنا تھا، تمہاری ابّو جان سے میری شادی ان تقدیری امور میں گنی جا سکتی ہے۔ جو تقدیر پر ایمان پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ورنہ کہاں میں اور میرا خاندان، مغربی یوپی کے آخری کونے کے ضلع مظفر نگر کے قصبے کیرانہ میں آباد اور کہاں تمہارا خاندان جو مشرقی یوپی کے ایک دوسرے سرے پر آباد۔ بس ہوا یہ کہ میرے چچا جان خان صاحب حکیم سید حسن صدیقی جوانی میں خفیہ پولیس کے انسپکٹر تھے۔ ان کا تبادلہ لکھنؤ کا ہو گیا، انہوں نے جو مکان لیا وہ تمہارے چچا جان سید لطافت علی امین معاونہ کے پڑوس میں تھا۔ اور ان دونوں کے درمیان بڑے تعلقات ہو گئے۔ اس طرح ان دونوں نے مل کر میری شادی تمہارے ابّو سے کرا دی۔ شادی کے بعد ہی تمہارے ابّو جان نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گاؤں میں جا کر دوبارہ رہائش اختیار کریں گے۔ تم لوگوں کا آبائی مکان تو تمہارے دادا کے انتقال کے بعد سب خاندان کے لکھنؤ چلے جانے کے باعث بے نام و نشان ہو چکا تھا لہٰذا تمہارے ابّو نے اپنی زمین کے اس قطعے پر اپنا مکان تعمیر کرانا شروع کر دیا تھا جو دھیا کے بالمقابل تھا۔

دھیّا دراصل ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ اتنا بڑا کہ برصغیر کی بڑی سے بڑی جھیلوں کا اس سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ تالاب عام دنوں میں ۲ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔ ایک بڑا حصہ جو دو فرلانگ کے مربع حصے پر محیط تھا اور دوسرا عام تالابوں کی طرح تھا۔ ان دونوں حصوں کے درمیان ایک راستہ سا بن جاتا تھا جو ہمارے گھر سے ملا ہار جانے کے لیے ایک شارٹ کٹ بناتا تھا۔ اور

اس راستے کے سامنے ہی املی کا وہ عظیم الشان درخت تھا جو کسی بڑے سے بڑے برگد کے پیڑ کو شرماتا تھا اور اس کا تنا اتنا بڑا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی اور شاید اسی وجہ سے اس کو بجائے املی کے املا کا نام دیا گیا تھا۔ یہ املا خشک تھا اور اس کے تنے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک غار کی مانند منہ کھولے ہوئے ایک بڑا سوراخ نظر آتا تھا اور رات کو اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے آدمی خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ اس کے بارے میں دو روایات بیان کی جاتی تھیں۔ ایک تو عام سیدھی سادی روایت تھی کہ اس املے پر بجلی گری تھی جس کی وجہ سے یہ سوراخ بھی ہو گیا تھا اور درخت بھی سوکھ گیا تھا۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بجلی صرف تنے پر کیسے گری تھی۔ باقی درخت اس سے کیوں محفوظ رہ گیا تھا۔ البتہ دوسری روایت زیادہ قرین قیاس اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی کہ اس املے کے تنے کے ایک معمولی سے سوراخ میں ایک اژدھے کے بچے نے بسیرا کر لیا تھا۔ اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا۔ اس کی آتشیں سانس نے تنے کو جلانا شروع کر دیا۔ اور یہ اس کی زہریلی سانسوں کا اثر تھا جس کی وجہ سے یہ عظیم الشان درخت سوکھ کر رہ گیا۔ مگر جب برسات کا زمانہ آتا تو دھیا کے بیچ کا راستہ غائب ہو جاتا تھا اور دونوں تالاب مل کر ایک ہو جاتے تھے اور برسات کے شباب کے زمانے میں تو اس میں پانی اس قدر بڑھ جاتا کہ ہمارے مکان کے نچلے چبوترے سے آ کر ٹکرانے لگتا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارا مکان تین کرسیوں یا تین ڈاٹوں پر قائم کیا گیا تھا اور مکان کے اوپر والے حصے سے ایک نشست کے ذریعے تالاب سے براہِ راست مچھلی کا شکار کھیلا جاتا تھا اور اس وقت ہمیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی دریا کے کنارے آباد ہیں۔

اس تالاب کو جو بارہ مہینے پانی سے بھرا رہتا تھا دھیا کیوں کہا جاتا تھا۔ اس کی ایک بڑی دلچسپ روایت اور وجہ تسمیہ بیان کی جاتی تھی۔ ایک گھوسنی (دودھ بیچنے والی) کے دہی کے مٹکے میں کسی طرح گولر کا پھول گر گیا تھا اور اودھ کی ہندو روایت کے مطابق یہ پھول گویا برکت اور نعمت کی نشانی تھا (اپنی نایابی اور برکات کے لحاظ سے اسے ہما کی روایت کے برابر سمجھئے مؤلف) چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس گھوسنی کا دہی لاکھ بیچنے پر بھی کم نہیں ہوتا تھا۔ اور چونکہ اہیروں کا پورا کنبہ اس کی دوسری سمت آباد تھا جس سے اس گھوسنی کا بھی تعلق تھا۔ اور اس تالاب سے اہیروں کی تمام بنیادی ضروریات پوری ہوتیں۔ اسی کے پانی سے وہ پیاس بجھاتے، کھانا پکاتے، برتن اور کپڑے دھوتے، نہاتے اور ان کے جانور اسی تالاب سے پانی پیتے اور زمین بھرتے۔ اس

لیے اس اندیشے سے کہ کبھی کہیں گرمی کے شدید موسم میں اس تالاب کا پانی کم نہ ہو جائے۔ اس گھوسی نے اپنا دہی اس تالاب میں گرا دیا تھا۔ اس کے بعد ہی سے اس کا نام دہیا پڑ گیا تھا اور تب سے بڑا اور الا حصہ جہاں یہ دہی گرایا گیا تھا ہمیشہ پانی سے لبالب بھرا رہتا تھا۔

ہمارے مکان کا نقشہ: میں نے ہی تمہارے ابو کو بنایا تھا (جو اس وقت بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ مؤلف) پہلے ایک بہت بڑا صحن جس کے اندر کوئی ۲۰ پلنگ برابر بچھ سکتے تھے اور اس صحن کے تین اطراف باقی مکانیت پھیلی ہوئی تھی صحن کی چوڑائی کے مقابل ایک بڑا برآمدہ اور اس کی چوڑائی کے مقابل ایک بڑا کمرہ جس میں دو بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے۔ اسے ڈرائینگ روم سمجھ لیجیے۔ برآمدے کی لمبائی کے مقابل دونوں اطراف دو نسبتاً چھوٹے کمرے جنہیں بغلی کمرے کہا جاتا تھا۔ صحن کی لمبائی کے مقابل داہنی طرف ایک چھوٹا برآمدہ جہاں ابو جان نے کپڑے کی تجارت کی غرض سے ۲ بڑے بڑے جہازی لکڑی کے صندوق بنوا کر رکھے تھے صندوق کی لمبائی اتنی بڑی تھی کہ اس میں پورا آدمی بخوبی آرام سے لیٹ سکتا تھا۔ اس برآمدے کے مقابل بائیں طرف کی سمت باورچی خانہ تھا۔ چھوٹے برآمدے سے اوپری منزل کی طرف زینہ جاتا تھا۔ جس کے نیچے باہر کی طرف حوائج ضروریہ کا انتظام تھا۔ اوپر کوٹھے پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک صحن جس میں ایک کھڑکی دوسری طرف ہمارے چچا حضرت علی کے مکان کے چبوترے کی طرف کھلتی تھی۔ مکان کا دروازہ ہمارے منجھلے چچا کے صحن سے باہر کی طرف کھلتا تھا جہاں سامنے ایک بہت بڑا چبوترہ اور چبوترے کی چوڑائی کے مقابل ایک بڑا برآمدہ اور اس کے بالمقابل چوڑائی میں بڑا کمرہ تھا۔ اسے بیٹھک اور مہمان خانے دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا باہر کے چبوترے کے سامنے، نیچے کی طرف ایک اور چبوترہ تھا اور اس پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا، اس چبوترے پر ابو جان کا گھوڑا، بھینسیں اور بکری بندتی تھی۔ اور سامنے کے کمرے میں بھینس کا رکھوالا سائیس مع جانوروں کے ساز و سامان کے رہتے تھے۔ یہ مکان پورا پختہ تھا۔ ہمارے گھر کے اندر کے بڑے صحن کے مقابل ہمارے منجھلے چچا سید لیاقت علی کا مکان اس طرح بنا ہوا تھا کہ دونوں مکانوں کے صحن ایک تھے اور ان کے مکان کا نقشہ بھی تقریباً وہی تھا سوائے برآمدوں کے جو ہمارے مکان کا۔ البتہ یہ مکان سارا کچا تھا جس میں ہمارے تائے جان کی اس زندگی کا عکس تھا جو وہ اتباع شریعت میں گزارتے تھے۔

آپا کا کہنا تھا کہ جب ہمارا یہ مکان تیار ہوا تو اس سے قبل کھیولی میں دو ایک عزیزوں کی جو

اور وہ بھی مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے۔ ابوجان کو اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے۔ خیر جوں توں نماز ہوئی اس کے بعد بس ابوجان کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ ابوجان نے تھوڑے عرصے سے کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی تھی۔ ہمارے ایک رشتہ کے پھوپھا کپڑا لینے آئے۔ ابوجان نے انہیں بٹھا دیا اور آ کر بستر پر لیٹ گئے۔ اتنا تیز بخار چڑھا کہ بیہوش ہو گئے۔ رات کو کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میں پانی پینے کے لیے اٹھا۔ ابوجان نے مجھے آواز دی کہ بیٹے مجھے رضائی اڑھا دو۔ میں نے رضائی اڑھا دی اگلی صبح مجھے معلوم ہوا کہ ان کی زبان بند ہو چکی ہے۔ جمعہ کو تقریباً ساڑھے چار بجے شام انتقال ہو گیا۔ جب انہیں غسل دیا جا رہا تھا اس وقت ایک آندھی آئی کہ طرح طرح کے رنگ بدلتی تھی۔ لوگ سمجھے قیامت آ گئی۔ گاؤں والے اذانیں دینے لگے، ہندو گھنٹے بجا رہے تھے۔ غسل کے وقت ۱۷۔۱۸ لالٹینیں جل رہی تھیں مگر اندھیرا دور نہیں ہوتا تھا حالانکہ دن ابھی غروب نہیں ہوا تھا میں نے ان کو کفن میں دیکھا اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ جب رات گئے انہیں دفن کیا گیا، اس وقت بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ تدفین کے وقت سب کے ساتھ ہمارے ایک عزیز ایسے بھی موجود تھے جو ابوجان کے سب سے گہرے دوست سمجھے جاتے تھے جب ابو کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو میں نے انہیں ہنستے سنا۔ وہ ہنسی اب بھی کانٹے کی طرح میری روح میں اتری ہوئی ہے۔ میں جب کبھی قبرستان جاتا ہوں وہ ہنسی مجھے سنائی دیتی ہے۔ انسان قبر پر بھی ہنس سکتا ہے۔ اللہ اکبر۔ ابوجان کا انتقال ۱۵ مئی ۱۹۲۶ء کو ہوا تھا۔

⭕

آپا بیان کرتی تھیں کہ کھیولی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد تمہارے ابوجان نے ایک طرف تو زمینداری کی طرف توجہ دینی شروع کی کیونکہ ان کے پاس معمولی اراضی تھی۔ جتنے پیسے جمع جتھا تھا وہ مکان بنانے میں لگا دیا تھا۔ کچھ رقم باغ میں۔ اس لیے وہ اپنی آمدنی بڑھانے کیلئے کافی کوشاں رہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ایک چھوٹی سی ریاست "اسائے نگر" میں نوکری بھی کر لی اور ضلع داری شروع کر دی۔ انتقال سے کچھ قبل کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی تھی۔ جب شمیم پیدا ہوئے گھر میں اللہ کے فضل سے ہر قسم کی آسائش اور آرام کا دور دورہ تھا۔ بھینسیں، بچوں کے لیے بکری، گھوڑا۔ سلیم نے یہ سب چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں بھی اور برتا بھی۔

تمہارے ابو ویسے تو بڑے چونچال تھے اور اپنے حال میں مست رہنے والے شخص تھے مگر بھائیوں، بہن اور ان کی اولاد سے قلبی محبت کرتے تھے۔ کوئی بھی بات ہو جاتی، دل سے چاہتے کہ

جو بھی ہو سکے۔ کر گزریں۔ اپنے بڑے بھائی سخاوت علی کے انتقال کے بعد وہ اپنی بڑی بھاوج جمیل اور وجیہا کو مجبور کر کے اپنے پاس لے آئے تھے۔ اسی طرح اپنی اکلوتی بہن انتہا۔ ی پھوپھی یعنی بجیا کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ بجیا کے تعلقات تمہارے پھوپھا سے اچھے نہیں رہتے تھے۔ بیچاری اس کے لیے وظیفے پڑھا کرتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ ان ہی عملیات کے دوران کوئی وظیفہ الٹ گیا اس کا اثر ان کے دماغ پر پڑا تھا۔ ان کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ وہ اوپر کمرے میں رہتی تھیں۔ ہر وقت ایک رٹ سی لگائے رہتی تھیں۔ دماغ کی خرابی کی وجہ سے ہر ایک کے لیے حرامی کا پلہ استعمال کرتی تھیں گویا وہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ عزیز، زبیر۔

جب تک دماغ خراب نہ ہوا تھا۔ ان کی ذہانت، سلیقہ، سلائی کڑھائی ضرب المثل تھی۔ واقعی سلائی اور کڑھائی ایسی کرتی تھیں کہ جی خوش ہو جاتا تھا شعر بھی کہتی تھیں تمر تخلص تھا۔ تاریخ نکالنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ خاندان کے ہر بچے کی تاریخ فی البدیہہ کہتی تھیں۔ مگر قسمت کے کھیل عجیب ہیں۔ دماغ کی خرابی کے بعد سب کام عادتاً کرتی تھیں مگر ہر کام میں کوئی گڑبڑ کر دیتی تھیں۔ نہایت عمدہ سویٹر کستی تھیں۔ فیزائن اور صفائی دیکھ کر واہ کہنے کو جی چاہتا مگر سویٹر کی دو آستینوں کے بجائے تین آستینیں نکال دیتیں۔ اپنے تکیہ کلام حرامی کا پلا اولاد، شوہر اور غیروں کو تو چھوڑ دیجئے وہ تو اپنے پانچ بڑے بھائیوں اور باپ دادا کو بھی اسی خطاب سے یاد کرتیں۔ دماغ کی خرابی کے بعد بھی شعر کہنا نہ چھوڑے۔ خصوصیت سے بچوں کی تاریخ پیدائش ضرور نکالتیں اور ہر ایک میں اپنے تکیہ کلام کی رعایت ضرور رکھتیں۔ خدا جانے کس پوتے کی تاریخ کہی۔

بروز دوشنبہ بوقت سحر

جو پیدا ہوا یہ حرام الدھر

نوشمہ نے "تاریخ ہجری" لکھی

بآواز کہہ دو، ہے لخت جگر

ایک قصیدہ نظام حیدرآباد دکن کا لکھا تھا، چونکہ ان کے شوہر عبدالرحمٰن حیدرآباد دکن میں رہتے تھے، قصیدہ میں مدعا یہ بیان کیا تھا کہ یا تو انہیں اورنگ آباد بلا لیں یا ان کے شوہر کو لکھنؤ بھجوا دیں۔ اس قصیدہ کا ایک مصرعہ بہت دہراتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے خوب ہنستیں۔

جس کو دیکھا رکھ دیا سر پر مسلمانی کا تاج

ہر وقت منت کا ذکر کرتیں اور ساری دنیا کو منتی قرار دیتیں۔ ان کی دماغ کی خرابی کی وجہ سے تمہارے

ابّو جان ان کی بڑی نگہداشت کرتے تھے کہ کہیں گھر سے باہر نکل کر کسی طرف نہ چل دیں۔ زیادہ تر اوپر ہی رہتیں اور کوٹھے سے نیچے کے صحن کی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی۔ اس میں سے اکثر نیچے دیکھا کرتیں۔ سب پر نظر رکھتیں اور نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہتیں۔ جب جی چاہتا وہیں سے مخاطب بھی ہوتی تھیں ایک بار نہ جانے ان کو کیا لہر آئی رات کو اس کھڑکی سے باہر کود گئیں جو کوٹھے کے صحن سے تمہارے چچا عزت علی کے چبوترے کی طرف کھلتی تھی۔ اور جہاں پیال اور بھوسہ پڑا ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُن کے چوٹ نہیں آئی اور بارہ بنکی پیدل پہنچ کر ٹرین کے ذریعے لکھنؤ پہنچ گئیں۔ جمیل کا بیان ہے کہ میں صبح کو سو کر اٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تو دیکھا بجیا "تانگے پر آئی تھیں۔ میں نے تانگے والے کو پیسے دے کر چلتا کیا اور پوچھا بجیا کیسے آگئیں۔ تو سارا قصہ ہنس ہنس کر سنایا۔ اور جب میں نے پوچھا کہ ریلوے اسٹیشن پر گیٹ سے کیسے باہر آگئیں ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ کو نہیں پوچھا؟ تو خوب ہنسیں اور کہا ہم نے اس حرامی کے پلّے سے کہا کہ سب حرامیاں ان عبدالرحمٰن، عزیز، زبیر، شرافت، لیاقت، شجاعت، سخاوت سب ابھی اور اسی وقت آتے ہیں تجھے بھی اور تیرے ریلوے اسٹیشن کو ابھی الٹ دیں گے سب منتی آیا چاہتے ہیں، وہ بیچارہ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے میری شکل دیکھا کیا اور میں جلدی سے باہر نکل آئی۔ اور خوب ہنسیں۔

تمہارے ابّو کو اپنی بہن اور بھانجوں سے بڑی محبت تھی، وہ ان پہ جان چھڑکتے تھے۔ بھائی صاحب کا بیان ہے کہ وہ مجھ سے اکثر پوچھتی رہتی تھیں کہ عزیز حیدرآباد دکن سے کب آئیں گے۔ ایک بار بار یہی پوچھ رہی تھیں۔ میرے منہ سے نکل گیا آج رات کو۔ رات کو میں سو رہا تھا کہ انہوں نے میرا پلنگ الٹ دیا۔ میں گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا تو دیکھا کہ بجیا مارے خوشی کے نعرے مار رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ "اٹھ حرامی کے پلّے! تو مادر زاد ولی ہے۔ تو ولی تیرا باپ ولی تیرا دادا ولی۔ سات پشت سے تو ولی ہے۔ تو جو کچھ کہتا ہے وہی ہو جاتا ہے"۔ ہوا یہ تھا کہ میرے کہنے کے مطابق عزیز بھائی رات کو اورنگ آباد سے آگئے تھے۔

آپا کہتی تھیں کہ جب تمہارے ابّو کا انتقال ہوا تو انھوں نے قیامت برپا کر دی تھی۔ کسی طرح جنازہ اُٹھنے نہیں دیتی تھیں۔ ان کا جنون کمال اپنے پورے عروج پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ یہ ماننے سے انکاری تھیں کہ ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہو سکتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں "کوئی نہیں مرا ہے، سب حرامی کے پلّے زندہ ہیں، سب ابھی آتے ہیں۔ محمد علی، عباس علی سب ابھی آتے

ہیں کون حرامی کا پلہ کہتا ہے کہ شرافت علی مرگیا۔ وہ زندہ ہے۔ ہم نے سب کی منتیں کاٹ دی ہیں" اور پچھاڑیں کھا کھا کر بھائی کی لاش پہ گر رہی تھیں۔ کیسی محبت تھی ان بہن بھائیوں میں، بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سامنے کے مکان میں منجھلے بھائی، ان کی بیوی اور بچیاں رہتی تھیں۔ یہ سب خاندان سلیم پر جان دیتا تھا۔ جیسی محبت سلیم کو اپنے خاندان میں حاصل ہوئی شاید ہی کوئی بچہ ایسا خوش نصیب ہو۔ ان کے سارے ناز نخرے برداشت کیے جاتے تھے۔ ہر ایک ان پہ جان چھڑکتا تھا۔ سلیم کو بہت چھوٹی سی عمر سے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ گاؤں میں ہم لوگوں کی سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ ان کی تعلیم کیسے ہو۔ ان کو عربی پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا اور قرآن شریف پڑھنے کا بھی۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی باقاعدہ اور معقول انتظام نہ تھا اس لیے سلیم کی تعلیم پرائمری سکول سے شروع ہوئی۔ بالکل ابتدا میں کھیولی پھر منئی اور پھر کرسی۔ اسی زمانے میں بھیا سید لطافت علی نے تمہارے ابو کو لکھا کہ اب سلیم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہیے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کی تعلیم میری نگرانی میں لکھنؤ میں ہو گی۔ اس لیے اسے میرے پاس پہنچا دو۔ تمہارے ابو نے انہیں بتایا کہ وہ تو کرسی کے اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ انہوں نے حکم دیا نہیں اور خود آکر سلیم کو ساتھ لے گئے۔

سلیم اس وقت کرسی کے ایک مڈل اسکول کی پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ بھیا لطافت علی امین الدولہ کچہری میں امین معاوضہ تھے اور گھسیاری منڈی میں نواب صاحب نان پارہ کے شیش محل کے قریب ان کی کوٹھی تھی۔ ایک بے حد نفیس مزاج، صاحب ذوق اور علم کے رسیا تھے۔ اس مزاج کا کوئی آدمی ہمارے خاندان میں نہ تھا۔ تقابل ادیان کے مطالعے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے ان کی کوٹھی کے لان میں دنیا جہان کے پھول اور پودے تھے۔ اس زمانے میں وہ بیمار رہنے لگے تھے، مگر اپنے لان کی خود نگہداشت کرتے تھے۔ انہوں نے سلیم کا داخلہ کرسچین مشن اسکول لال باغ" میں کرا دیا تھا۔ یہ عیسائیوں کا ایک مشہور اسکول تھا (بھائی صاحب کہتے تھے کہ غالباً اس سکول میں قرۃ العین حیدر بھی میرے ساتھ ہی ہوں گی، کیونکہ انہوں نے بھی اسی اسکول میں ابتدائی تعلیم پائی تھی اور میرا اور ان کا سن پیدائش ایک ہی ہے۔ مؤلف) خاندان میں بڑا شور ہوا کہ بچہ عیسائی ہو جائے گا۔ تمہارے ابو ویسے تو بڑے لاابالی مزاج کے آدمی تھے، مگر دین کے معاملے میں بڑے حساس تھے۔ بہت پریشان ہوئے اور تمہارے منجھلے چچا سید لیاقت علی سے اپنی اس الجھن کا ذکر کیا۔ وہ ویسے تو ولی کامل تھے، مگر ہنس کر تمہارے والد سے کہا "سلیم ہمارا بیٹا ہے،

وہ حجۃ الاسلام ہے۔ مشن اسکول سے اس کا کچھ نہیں بگڑ پائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔" چنانچہ سلیم کا داخلہ اس اسکول میں ہو گیا۔

بھائی صاحب کا بیان ہے کہ لکھنؤ میں ان دنوں شیعہ سُنّی قضیہ بہت زوروں پر چلا ہوا تھا۔ سُنّیوں کے قائد مولوی عبد الشکور تھے جو امام شیر پاٹا نالہ کے نام سے مشہور تھے اور رسالہ "النجم" نکالتے تھے۔ رسالے کی پیشانی پر وہ حدیث درج تھی جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میرے صحابہؓ ستاروں کے مانند ہیں، جس کسی کی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔ شیعوں کا اخبار "تازیانہ" کے نام سے نکلتا تھا جس کی لوح پر ایک شعر لکھا رہتا تھا (یہ شعر مجھے پورا یاد نہیں، پہلے مصرع کا مضمون یہ تھا کہ پشت پر تبرّے کا تازیانہ جو لگا۔ دوسرا مصرع تھا "خر مدح صحابہ بھاگا"۔ مؤلف) ان دنوں لکھنؤ میں بڑی چہل پہل تھی۔ بڑے دھوم کے جلسے ہوتے اور پوری پوری رات واعظ ہوتے تھے۔ میں اپنے سنجھلے چچا کے ساتھ یہ وعظ سننے جاتا اور جب نیند آتی تو ان کی گود میں لیٹ کر سو جاتا۔

مشن اسکول کی یونیفارم خاکی قمیض اور خاکی نکر تھا۔ میں روز اس یونیفارم میں اسکول جاتا۔ اسکول کی تقریباً تمام استانیاں مجھ سے شدید محبت کرتی تھیں کیونکہ میں نے متی کی انجیل کی تلخیص پوری یاد کر لی تھی۔ ایک مرتبہ اسکول میں ڈرامہ "سلومی" کھیلا گیا۔ میں نے اس میں پارٹ بھی ادا کیا۔ میری کلاس ٹیچر تو مجھ سے اتنی محبت کرتیں کہ مجھے اکثر سکول سے گھر چھوڑنے آتیں۔ گھر آکر میری دلچسپی کا واحد کام چچا جان کے لان میں تتلیاں پکڑنا تھا۔ میں چچا جان کی خوبصورت پھلواری میں شام تک تتلیوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا اور جب تھک جاتا تو گلاب اور لالہ کے تختوں کے درمیان بیٹھ کر پھولوں کی بہار کا نظارہ کرتا۔ ایک خوشگوار اداسی کی کیفیت ان دنوں مجھ پر طاری رہتی۔ ہماری چچی کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر میں ان کے واحد اکلوتے لڑکے اور نوکر کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ عورتوں کے گھر میں نہ ہونے کے سبب سے گھر میں بھی ایک عجیب تنہائی کا عالم رہتا۔ مگر مجھے یہ تنہائی اچھی بھی لگتی تھی۔ دن کا وقت تو اسکول میں کٹ جاتا اور سہ پہر کا کھیلنے کودنے میں مگر شام کو کچھ پڑھائی کی جاتی اور میرے چچا زاد بھائی عرفان احمد، جن کو میں بابو بھائی کہتا تھا، پڑھاتے ہوئے ڈانٹ ڈانٹ کر میرا برا حال کر دیتے۔ ادھر ادھر انہوں نے ڈانٹنا شروع کیا، ادھر چچا جان کی آواز آتی "چلو سلیم میرے پاس۔" بابو بھائی مجھ سے اپنے والد کا یہ لاڈ دیکھ کر جل بھن کر رہ جاتے، مگر گھورنے کے سوا کچھ نہ کر پاتے۔ میں چچا جان کے پاس پہنچتا تو وہ پوچھتے "کھانا کھا لیا؟" میں کہتا "جی ہاں کھا لیا۔" وہ پوچھتے "سبق یاد کر لیا؟" میں کہتا "جی چچا جان۔" اور جھٹ بابو بھائی کی شکایت جڑ دیتا

کر وہ مجھے ڈانٹ رہے تھے۔ چچا جان اپنے اکلوتے بیٹے سے بیحد محبت کرتے تھے مگر بزرگوں کی کیسی شفقت تھی کہ میری شکایت سن کر جھنجھلا جاتے اور چلا کر کہتے "ارے او ببوا، تو سلیم کو کیوں ڈانٹ رہا تھا۔ کمبخت کیوں اس کے پیچھے پڑا گیا ہے۔" بابو بھائی کچھ نہ کچھ منہ میں بڑبڑا کر رہ جاتے اور چچا جان کی نظر بچا کر مجھے گھونسہ دکھاتے کہ اکیلے میں کچومر نکالوں گا۔ افسوس کہ بیچارے بابو بھائی کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہوتی اور کچومر ہمیشہ انہیں کا بنایا جاتا۔

میری تعلیم چونکہ زیادہ تر گاؤں اور قصبے کے اسکولوں میں ہوئی تھی جہاں انگریزی کا چلن نہ ہونے کے برابر تھا جبکہ مشن اسکول میں انگریزی ہی انگریزی تھی۔ اس لیے بابو بھائی مجھے انگریزی خاص طور سے پڑھاتے تھے۔ مگر کمبخت انگریزی ایک ایسی چیز تھی جو میرے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی اور اس میں بڑے بڑے لطیفے ہو جاتے تھے۔ ایک بار بابو بھائی مجھے سبق پڑھا رہے تھے انہوں نے مجھ سے To Eat کے معنی پوچھے۔ میں انگریزی میں اتنا پھسڈی تھا کہ اس کے معنی بھی نہ بتا سکا۔ بابو بھائی جھنجھلا رہے تھے اور نوبت ایک آدھ چانٹے تک پہنچنے والی تھی کیونکہ اسی طرح وہ اپنی دلی جلن کا بدلہ اتار لیتے تھے کہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی زبیر بھائی آ گئے۔ وہ میرے سامنے کے رخ پر تھے اور بابو بھائی کی پیٹھ ان کی طرف تھی۔ انہوں نے جو میرا یہ حال دیکھا تو اپنے ہاتھوں سے ایسا اشارہ کیا جیسے کوئی کھانا کھاتا ہو۔ وہ مجھے To Eat کے معنی سمجھا رہے تھے مگر انگریزی کی کمبختی اور بابو بھائی کے ڈر سے میں کچھ بھی نہ سمجھا اور بات ٹالنے کے لیے بابو بھائی سے کہنے لگا دیکھیے، زبیر بھائی آئے ہیں اور کھانا مانگ رہے ہیں۔ بابو بھائی سمجھ گئے، بولے "بے وقوف وہ تمہیں اس لفظ کے معنی بتا رہا ہے۔" بابو بھائی مجھے اکثر بے وقوف کہتے تھے اور ان کے والد انہیں بے وقوف کہتے تھے "ببوا تجھ میں بالکل عقل نہیں۔ عقل ہوتی کہاں سے تیرا سر تو گولی کے برابر ہے۔ سلیم کا سر دیکھ، شیر کا سر ہے۔" زبیر بھائی بڑے آفت کے پرکالے تھے۔ سائیکل ایسی چلاتے تھے کہ سرکس والے بھی کیا چلاتے ہوں گے۔ گھڑسواری کا بھی بڑا شوق تھا بلا کے تیر تھے، جہاں چلے جاتے، ان کی شرارتوں کے افسانے بن جاتے۔ جب بھی کمیولی آتے تو ایک اودھم مچ جاتی۔ کبھی لوگ دیکھتے کہ کسی گدھے کی پونچھ پکڑے، اس کے کولھوں پر قدم جمائے کھڑے ہوئے گدھے کو بھگائے لیے جا رہے ہیں۔ کبھی گاؤں کے ایک بزرگ جو بیکہ چلاتے تھے، پڑھے لکھے مطلق نہ تھے مگر انیس کا مرثیہ تحت میں اس طرح گرج کر پڑھتے کہ لوگ سانس روک لیتے تھے۔ دور دور سے بلائے جاتے۔ کمال یہ تھا کہ حرف شناس نہ ہونے کے

باوجود ممبر پر بیٹھتے تو مرثیے کی کتاب سامنے رکھ لیتے اور اوراق کی پہچان ایسی کر رکھی تھی کہ مرثیوں کے بندوں کے حساب سے صفحات پلٹتے جاتے۔ نہ جاننے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ تمام مرثیے کی نذر کے سلسلے میں حسین کے لڈو ضرور طلب کرتے تھے۔ زبیر بھائی اگر کسی ایسے جلسے میں ہوتے تو ان کے عروج پر پہنچنے پر ایک نعرہ لگاتے "امبین کے لڈو!" وہ مرثیہ چھوڑ چھاڑ بے نقط سنانے لگتے۔۔۔ بڑھاپے میں سٹھیا سے گئے تھے لہذا لڑکوں بالوں کے لیے تماشا بن گئے تھے۔ زبیر بھائی بیچ گرمیوں کی دوپہر میں جا کر ان کی کوٹھڑی کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑا دیتے۔ وہ اندر سے پوچھتے "کون ہے؟" یہ جواب دیتے "شاماتمل!" اور بھاگ لیتے۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے "تیری شاماتمل کی ......" اور باہر نکل کر دھوپ میں اِدھر اُدھر جھانکتے اور بعد میں سب سے پوچھتے کہ "یہ سُسر شاماتمل کون ہے؟"

زبیر بھائی ذہین بھی بلا کے تھے۔ ایک مرتبہ شمیم چھوٹا سا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال کا ہوگا۔ بچھونے پر لیٹا تھا۔ معلوم نہیں بچھونے کے نیچے آگ کیسے لگ گئی۔ جلنے کی بو جو پھیلی تو گھر کے لوگ آگ آگ کہتے ہوئے بھاگے۔ شمیم کو جیسے ہی گدے سے اٹھایا گیا۔ اس کے نیچے سے آگ کا شعلہ بھڑک کر اوپر آ گیا۔ سب لوگ پانی لینے دوڑ پڑے اور جب تک پانی لے کر آئے اس وقت تک آگ بجھ چکی تھی۔ دیکھا گیا کہ زبیر بھائی نے تھوک تھوک کر آگ بجھا دی تھی۔

ان کے بڑے بھائی عزیز بھائی ان کے مقابلے پر بڑے سنجیدہ اور بُردبار تھے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ زبیر بھائی جا نماز بچھائے دعا مانگ رہے تھے، کہ اللہ میاں چونی دے۔ خوب زور زور سے اور ہل ہل کر اللہ میاں سے چونی مانگی جا رہی تھی۔ عزیز بھائی باہر سے آئے تو بھائی کو چونی مانگتے دیکھا۔ بولے "بے وقوف اللہ میاں سے کیا مانگتا ہے، باجی سے مانگ ابھی چونی ملے گی۔ (وہ اپنی والدہ کو باجی کہتے تھے) بھیانے یہ مکالمہ اوپر سے سنا تو ہنسیں اور کہنے لگیں "ہاں حرامی کے پلّے، ہم سے کیوں نہیں مانگتا، ہم چونی، اٹھنی، روپیہ سب دیں گے۔ ابھی دیں گے۔ اسی پل دیں گے۔ اسی دم دیں گے۔ عبدالرحمٰن، عزیز، زبیر سب حرامی کے پلّے اللہ میاں سے مانگتے ہیں۔ اے حرامی کے پلّو! ہم سے مانگو۔" یہ کہتی جاتیں اور خوب ہنستی جاتیں، مگر زبیر بھائی بغیر دم لیے اللہ میاں ہی سے مانگنے میں لگے رہے اور اس وقت تک مانگتے رہے جب تک کہ بھیانے چونی جا نماز پر نہ پھینک دی۔ عزیز بھائی کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ جس روز الوجان

کا انتقال ہوا وہ شدید موسلا دھار بارش میں اچانک کھیولی پہنچ گئے تھے اور تدفین میں شریک ہوئے تھے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ جب چچا جان بابو بھائی سے سنتے کہ سلیم کو انگریزی بالکل نہیں آتی تو کہنے لگتے :"ہاں بھئی وہ مسلمان ہے، انگریزی کرسٹانوں کی زبان ہے، وہ کیوں سیکھے"۔ بابو بھائی جل کر کہتے ۔"آپ نے اسے داخل تو کرسٹانوں کے اسکول میں کرایا ہے پھر ایسے داخلے سے کیا فائدہ"؟ چچا جان مسکرانے لگتے اور کوئی جواب نہ دیتے ۔ چچا جان رات کو مجھے اپنے پاس بلاتے اور کہتے کہ"ہاں بھئی اب زیٹیں اڑیں گی"۔ زیٹوں میں اجازت تھی کہ میں بلحاظ ادب جو میرے منہ میں آئے کہوں ۔ میں بھی خوب اچھل اچھل کر باتیں کرتا اور دنیا جہان کے قصے انہیں سناتا ۔ اسکول میں کیا ہوا تھا ۔ استانیوں نے کیا کہا ۔ میں نے کیا جواب دیا مگر میری گفتگو کا زیادہ تر موضوع بابو بھائی کی شکایت ہوتی ۔ بابو بھائی بھی ایک ہی جل ککڑے تھے ۔ میرے چاو بے جا لاڈ دیکھ کر اور سلگ جاتے ۔ مجھے ستاتے بھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ابو سے ڈرتے بھی جاتے ۔ ایک مرتبہ بابو بھائی پڑھ رہے تھے اور میں بار بار ان کے کمرے میں آجا رہا تھا ۔ وہ ہر بار مجھے ٹوکتے "یہاں کیوں آئے ہو، جاؤ میں پڑھ رہا ہوں" مگر میں کہاں ماننے والا تھا ۔ ہر بار ان کی خفگی کو نظر انداز کر دیتا ۔ جب میں آخری بار ان کے کمرے میں آیا تو انہوں نے پوچھا ۔ "اب کیوں آئے ہو؟" میں نے کہا گھڑی دیکھنے"۔ بابو بھائی غصے سے بولے "اچھا تو بیٹھ جاؤ اور گھڑی کی طرف دیکھتے رہو، خبردار جو منہ پھیرا، ورنہ بہت مار لگاؤں گا"۔ میں چار و ناچار بیٹھ گیا اور گھڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ اتنے میں چچا جان کی آواز آئی ۔ میں اٹھنے لگا تو بابو بھائی نے گھڑک کر بٹھا دیا ۔ چچا جان نے دوبارہ پکارا تو میں نے کہا "یہ بابو بھائی مجھے نہیں آنے دیتے"۔ یہ سنتے ہی چچا جان نے "بھورے" کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور میں ہنستا ہوا اٹھ کر اپنے چچا جان کے پاس چلا گیا۔

چچا جان کی ہدایت تھی کہ جب نوکر جانے لگے تو میں سارے کمروں میں اپنے سامنے تالا لگواؤں ۔ میں اس ذمہ داری کے بوجھ سے زندگی کی آئندہ منزلوں کا سبق سیکھ رہا تھا ۔ کھانا کھانے اور زیٹیں اڑانے کے بعد میں نوکر سے تقاضا شروع کرتا کہ تالے لگا دو ۔ ورنہ میں سو جاؤں گا ۔ چچا جان میرے اس احساس ذمہ داری سے بہت خوش ہوتے ۔ ہر ایک کو فخر سے سناتے کہ ہمارا بیٹا ایسا ہے ۔ وہ میری ہر ضد پوری کرتے ۔ اس زمانے میں گراموفون نیا

نیا چلا تھا۔ ایک روز میں نے کسی دکان پر گراموفون بجتے دیکھ لیا اور بابو بھائی سے کہا کہ میں گراموفون لوں گا۔ بابو بھائی بھڑک اُٹھے اور ڈانٹ ڈپٹ کر گھر لے گئے۔ گھر پہنچ کر زبدھوں کے وقت میں نے سارا قصہ چچا جان کو سُنایا۔ "ارے ہوئے! چل یہاں آ، تو نے سلیم کی فرمائش کیوں پوری نہیں کی" غرض کہ چچا جان نے بابو بھائی کو خوب ڈانٹ ڈپٹا اور اس کے بعد مجھ سے کہا "بیٹے باجا آجائے گا، تم سو جاؤ" میں جا کر بستر پر لیٹ گیا اور غافل سو گیا۔ رات کو نہ جانے میری کس وقت آنکھ کھلی دیکھا گراموفون میرے سرہانے رکھا بج رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا اور پوچھا "باجا کون لایا؟" چچا جان بولے "ارے بیٹے ہم خود لے کر آئے ہیں تم سے وعدہ کیا تھا نا" پھر ایک ریکارڈ سننے کے بعد میں خوش خوش سو گیا۔ یہ معصوم خوشیوں کا زمانہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت زمانہ تھا۔

اسی زمانے میں میری ٹانگ پر کتے نے کاٹ لیا۔ چچا جان کی کوٹھی کے قریب والی کوٹھی میں ایک خطرناک کتا پلا ہوا تھا جو مغرب کے بعد کھول دیا جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز میں مغرب کے بعد گھر آ رہا تھا میں نے کتے کو نہیں دیکھا جو اپنی کوٹھی کے دروازے کے سامنے سو رہا تھا۔ میں اس پر چڑھ گیا۔ اس پر اچانک جو اس ڈپٹی ظالم نے میری ٹانگ بھنبھوڑ ڈالی۔ چچا جان بڑے پریشان ہوئے کتے کے کاٹے کے ۱۴ انجکشن لگے۔ زخم خراب بھی ہوا مگر پھر ٹھیک ہو گیا جس کا نشان پنڈلی پر موجود تھا۔ مگر اس زمانے میں میرے بڑے مزے رہے جو فرمائش کرتا وہ پوری ہوتی تھی۔

ایک روز میں بابو بھائی کے ساتھ بھائی جان سے ملنے نظیر آباد گیا۔ بھائی جان نے کچھ خاطر تواضع کی اور پھر ہماری واپسی کے وقت خود بھی شیروانی پہن کر اپنے ایک ہم نام دوست جمیل صاحب کے یہاں چلے گئے۔ میں بابو بھائی کے ساتھ گھر کی طرف واپس آ رہا تھا کہ یکایک میرا ٹٹو بپھر گیا اور میں نے کہا کہ میں تو بھائی جان کے پاس جاؤں گا۔ بابو بھائی نے پہلے تو مجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر میں جب نہیں مانا تو غصے سے مجھے کھینچتے ہوئے بھائی جان کے گھر لے گئے وہاں دروازے میں تالا لگا ہوا تھا۔ بابو بھائی نے غصے سے میری منڈیا پکڑ کر دروازے سے رگڑ دی اور کہا "اب دیکھو وہ کہاں ہیں؟" میں رونے لگا۔ بابو بھائی میرے رونے سے بہت ڈرتے تھے، کیونکہ اس کے معنی یہ تھے کہ ان کی شامت قریب ہے۔ چنانچہ وہ میرے رونے سے ڈر گئے اور مجھے خوش کرنے کے لئے "ٹیلر پارک" لے گئے اور وہاں مجھے خوب کھلایا پلایا اور خوشامد کی کہ "ابو سے کچھ مت کہنا" جس کا میں نے وعدہ کر لیا۔

''بٹلر پارک'' لکھنؤ کی مشہور تفریح گاہ تھی۔ شام سے وہاں لوگوں کا میلہ لگ جاتا اور طرح طرح کے لوگ تفریح کے لیے جمع ہو جاتے۔ اس پارک میں ''بٹلر'' کا مجسمہ سنگ مرمر کا بنا ہوا، گھوڑے پر سوار نصب تھا اور بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ میں اس مجسمے کے سامنے بیٹھا گھنٹوں اس کے بانکپن کو دیکھتا رہتا۔ بٹلر پارک کے ایک حصے میں سفید رنگ کی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ میں وہاں خوب دوڑتا پھرتا اور اودھم مچاتا مگر اس پارک میں میری سب سے بڑی دلچسپی کی چیز کچھ اور تھی۔ اس کے حوضوں میں رنگ برنگ مچھلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ کھیلیں اور سنو پانی میں پھینکتے اور مچھلیاں اوپر آجاتیں اور سطح آب پر طرح طرح کے رنگ تھرکتے تیرتے نظر آتے۔ مجھے یہ منظر بہت اچھا لگتا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہتا اور کبھی کبھی خود بھی مچھلیوں کو کھیلیں اور سنو کھلاتا۔ اس زمانے میں مجھے چڑیا گھر Zoo اور عجائب گھر دیکھنے کا بڑا انبساط تھا۔ اسکول سے چھٹی ملتے ہی چڑیا گھر پہنچ جاتا اور ہزاروں رنگ کے طوطے، سفید مور، تیتر، اودھ بلاؤ، بھیڑیے، شیر اور دوسرے جانور دیکھا کرتا۔ شیر مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور ان کی رہائش گاہ کے چاروں طرف پانی کا بہت بڑا قطعہ تھا جس کے نصف حصے تک پانی بھرا رہتا تھا۔ یہ پانی شیروں کا زنداں تھا۔ ورنہ شیر کھلے پھرتے تھے۔ میں انہیں شیرنیوں اور بچوں کے ساتھ خوش فعلیاں کرتے دیکھتا اور بابو بھائی سے کہتا کہ ''شیر چھلانگ لگا کر باہر کیوں نہیں آجاتے۔'' وہ کہتے ''بے وقوف حوض بہت بڑے ہے، شیر اتنی لمبی جست نہیں لگا سکتے۔'' میں کہتا ''تو پانی میں تیر کر آجائیں۔'' بابو بھائی بگڑ کر کہتے ''تمہارا دماغ خراب ہے، دیکھتے نہیں ہو کہ پانی کتنا گہرا ہے۔'' میں ان کے ان جوابوں سے مطمئن نہ ہوتا اور شیروں کو باہر نکلنے کی طرح طرح کی ترکیبیں اس وقت تک بتاتا رہتا جب تک بابو بھائی مجھے ڈانٹ کر خاموش نہ کر دیتے۔ اس وقت تک شیروں کے حوض کے گرد جنگلا نہیں تھا، لیکن بعد میں لگا دیا گیا اور اس کا قصہ یوں بتایا جاتا ہے کہ ایک انگریز عورت اپنے بچے کو لیے اسی پانی کے قطعے کے کنارے کھڑی شیروں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ یکایک بچہ جو بہت شوخ و شنگ تھا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا اور حوض میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر شیر بھی پانی میں کود گئے اور ماں کے سامنے اس کے معصوم بچے کو چیر پھاڑ ڈالا۔ شیر انگریز اور غیر انگریز میں تمیز نہیں کرتے مگر اس کے بعد اس پانی کے قطعے کے گرد جنگلا لگا دیا گیا۔

چڑیا گھر میں میری ہرنوں اور خرگوشوں سے بہت دوستی تھی ایک ہرن تو میرا ایسا چہیتا

بن گیا تھا کہ میری آواز پر دوڑ کر آتا۔ اس کا نام موتی تھا۔ میں اس کی ضیافت کرنے کے لیے گھر سے چنے کی دال اور مختلف چیزیں لے جاتا تھا اور اسے کھلا کر بھولا نہیں سماتا تھا۔ چڑیا گھر میں طرح طرح کے بندر موجود تھے جن سے میری دلچسپی شاید فطری تھی۔ دیسی بندر، ولایتی بندر، لنگور، بن مانس۔ لنگور کالے رنگ کے تھے اور مجھے ان کی ریشمی کھال اور بال بہت اچھے لگتے تھے وہ ہر وقت اُوں اُوں کی آوازیں نکالتے رہتے تھے۔ بن مانس بھی مجھے بہت دلچسپ لگتے تھے، مگر ان سے ڈر بھی بہت لگتا تھا۔ ایک دفعہ کچھ لڑکے بن مانسوں کو چھیڑ رہے تھے۔ ایک لڑکا بہت شریر تھا۔ وہ بن مانسوں کو پتھر مار رہا تھا۔ بندر اچھل اچھل کر اور کود کود کر بہت شور مچا رہے تھے ایک بن مانس جس نے سب سے زیادہ پتھر کھائے تھے چپ چاپ بیٹھ گیا جیسے تھک گیا ہو لڑکے بھی پتھر مار مار کر بالآخر تھک گئے اور وہ شریر لڑکا تھوڑی دیر کے لیے بے خبر سا ہو کر بن مانسوں کے کٹہرے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے زیادہ پٹنے والا بن مانس جو بالکل بے سُدھ بیٹھا ہوا تھا ایک دم بجلی کی تیزی سے چھلانگ مار کر اس جگہ آیا جہاں شریر لڑکا کھڑا تھا اور اس کا بازو چبانے لگا۔ جب لڑکے نے زور لگایا تو اس نے اس کا بازو توڑ دیا۔ شریر لڑکے کو اس کی بے جا شرارت کی سزا مل چکی تھی۔

میں تقریباً دوسرے تیسرے روز شام کو کئی لڑکوں کے ساتھ مل کر عجائب گھر دیکھنے جاتا تھا۔ وہاں طرح طرح کے سانپ، اجگر، اژدہے، ناکے، گھڑیال، سوسمار اور طرح طرح کے جانور حنوط کیے ہوئے رکھے تھے۔ ایک طرف ایک دریائی گھوڑے کا کٹا ہوا سر رکھا تھا جس کا منہ بھاڑ کی طرح ہر وقت کھلا رہتا تھا مگر مجھے سب سے زیادہ دلچسپی اس شیشے کی الماری سے تھی جس میں ایک پورا منظر جیسوں کا تیسوں وقت کی گود میں محفوظ تھا۔ یہ ایک اژدھا تھا جو درخت کی نصف شاخ سے لپٹا ہوا تھا اور اس کا باقی نصف ایک موٹے رسے کی طرح جھولتا ہوا، ایک ہرن کو اپنے بلوں کے درمیان بے بس کیے ہوئے تھا۔ ہرن کی پیٹھ اژدھے کے بوجھ سے خم کھا گئی تھی اور وہ اپنی جان کنی کے پورے کرب کے ساتھ ابدیت سے ہم کنار ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے ہزاروں بار اپنی آنکھوں کے سامنے اژدھے کو ہرن کا شکار کرتے دیکھا اور کبھی کبھی خواب میں بھی یہ منظر دیکھتا تھا۔ یہاں ایک اور دلچسپ چیز چڑیوں اور پرندوں کے انڈے تھے۔ بئے کے ننھے انڈے سے لے کر شتر مرغ کے انڈے تک ہزاروں قسم کے انڈے الماریوں میں سجے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ لکھنؤ میں وائسرائے کی آمد پر طرح طرح کی تقریبات ہوئیں۔ ان میں آتش بازی دکھانے کا بھی ایک پروگرام رکھا گیا۔ بٹلر پارک کے سامنے میدان میں آتش بازی چھوڑنے کا انتظام کیا گیا۔ وائسرے، عمائدین شہر اور حکام بالا کے لیے بارہ دری میں نشستیں لگائی گئیں۔ چچا جان نے فوراً اس کے پاس منگوائے اور بابو بھائی کو حکم دیا کہ سلیم کو آتش بازی دکھالاؤ۔ بابو بھائی نہیں جانا چاہتے تھے۔ بہت بور ہوئے۔ ابو جان نے بھانپ لیا کہ وہ نہیں جانا چاہتے۔ اتفاقاً ابو جان اس روز وہاں موجود تھے۔ وہ کہنے لگے "جانے دیجیے بھائی جان، سلیم بچہ ہے سو جائے گا اور بابو کو پریشانی ہوگی۔" مگر چچا جان کہاں ماننے والے تھے بولے، "واہ! ہم نے اس کے لیے پاس منگوائے ہیں۔ وہ ضرور آتش بازی دیکھے گا اور بالکل نہیں سوئے گا۔" اب بابو بھائی کے لیے کوئی چارہ نہ تھا —— وہ آتش بازی تھی کہ ہندوستان کی ہنرمندی کا معجزہ۔ ایسے ایسے تماشے آتش بازی کے دکھائے گئے کہ لوگوں کی عقل حیران ہوگئی اور ساری زندگی کے لیے ان کی یادداشت کا حصہ بن گئی۔ ایک گولہ پھٹا اس کے ساتھ ہی فضا میں چار پریاں نمودار ہوئیں جو مختلف سمتوں سے اڑتی ہوئی آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے اور ان کے لباس اور پھولوں کے رنگ دم بدم بدلتے جاتے تھے۔ وہ یہ ہار لیے نیچے اُتر آئیں اور بارہ دری کی طرف اس طرح بڑھیں جیسے وہ وائسرائے کو ہار پہنانے آ رہی ہوں۔ ایک اور تماشا اژدہوں کی لڑائی کا تھا۔ دو بانسوں میں آگ لگائی گئی اور وہ فوراً اژدہے بن گئے۔ ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکلنے لگے جو وہ ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے یہاں تک کہ دونوں لڑتے لڑتے ختم ہو گئے۔ سب سے زوردار آئٹم آخری تھا۔ دو گولوں میں آگ لگائی گئی اور دیکھا کہ پوری بارہ دری اور اس کے ارد گرد لگے ہوئے کھجور کے درختوں کا پورا منظر آتش بازی میں منعکس ہو گیا۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے دو بارہ دریاں ایک دوسرے کے مقابل بنی ہوئی ہیں، ایک اصلی اور ایک آتش بازی کی۔ وائسرے نے اس کمال کو دیکھ کر بہت پسند کیا اور آتش بازوں کو اپنی جیب خاص سے بھی انعام دیا۔

چچا جان چونکہ امین معاوضہ تھے اسی وجہ سے انہیں فلموں کے پاس بھی ملتے تھے۔ امین آباد میں سب سے پرانا ناگی سینما "رائل ٹاکیز" تھا۔ یہاں میں ہر ہفتے نئی فلم دیکھنے جاتا اور چچا جان کی وجہ سے سینما کے مالک اور مینیجر میری بڑی خاطر تواضع کرتے۔ "بمبئی کی بلی"، "طوفان میل"، "جلتی نشانی" اور ایسی جانے کتنی فلمیں میں نے اسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ فلموں کا انتخاب میں دن

میں جاکر کرتا۔ فلموں کے سین والے شوکارڈ سینما کی شو ونڈوز میں لگے رہتے۔ میں ان کو دیکھ کر فلم پسند کر لیتا اور پہلا شو جاکر دیکھ لیتا۔ اس زمانے میں ایک اور چیز بھی بہت شوق سے دیکھتا تھا وہ "بارہ من کی دھوبن" اور "جھانسی کی رانی" کا تماشا ہوتا (نیوٹراما) جو عموماً لکھنؤ میں عورتیں دکھاتی پھرتی تھیں۔

مشن سکول میں میری زندگی سچ مچ ایک بہت رنگین زندگی تھی۔ لڑکیوں سے میری بڑی دوستی تھی میں ایک شریر لڑکے "ریجنیل" سے بہت چڑتا تھا۔ وہ اکثر تالیاں بجا بجا کر لڑکیوں کو چھیڑتا اور ان سے فحش مذاق کرتا تھا۔ ایک بار کسی لڑکی نے اس کی شکایت استانی سے کر دی اور معاملہ بڑے پادری تک پہنچ گیا۔ پادری صاحب نے پورے اسکول کو جمع کرکے اس لڑکے کی ایسی پبلک کیننگ کی کہ میرا ننھا سا دل دہل کر رہ گیا اور خوف و دہشت سے مجھے بخار آگیا۔ جب میں گھر پہنچا تو ابو جان اور چچا جان کے سامنے واقعہ سنایا۔ ابو جان میری وجہ سے اکثر چچا جان کے پاس آتے رہتے تھے۔ ابو جان نے میری ہمت بندھانے کے لیے کہا کہ "ارے تم ڈرتے کیوں ہو۔ تم اس پادری سے کہہ دینا کہ ہمارے ابو نے لوہے کی سلیٹ سے اپنے استاد کا سر پھاڑ دیا تھا۔ اگر مجھے ہاتھ لگایا تو وہ تمہارا بھی یہی حشر کر دیں گے"۔ میں کیا بتاؤں کہ ابو جان کے اس فقرے سے میری کیسی ڈھارس بندھی۔ مگر چچا جان کا فقرہ بھی مجھے نہیں بھولتا وہ بولے "شرافت علی ابھی تو تم نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی"۔ اس زمانے کا مجھے ایک اور واقعہ یاد ہے کہ گھسیاری منڈی میں ہمارے خاندانی طبیب حکیم بشیر احمد تھے۔ بڑے اچھے حکیم مانے جاتے تھے۔ میرے منجھلے چچا سید لیاقت علی ان سے اپنی بیوی اور لڑکی کا علاج کرانے کے لیے کھیوری سے آئے اور لکھنؤ میں کرایہ پر مکان لے کر رہنے لگے۔ ہماری منجھلی اماں اور ان کی لڑکی منن باجی کو گٹھیا کا بڑا شدید عارضہ تھا حکیم صاحب کی ہدایت پر منجھلے چچا کیکڑے جن کو وہاں کینگڑے کہا جاتا تھا تلاش کرکے لاتے۔ انہیں زمین پر چلتا دیکھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ شاید ہی کسی چیز سے مجھے اتنی گھن آئی ہو جتنی کیکڑوں کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی۔ غرض کہ اسکول کی یہ زندگی میرے لیے زندگی کے لاتنے رنگوں میں دیکھنے کی وجہ سے آج بھی میرے ماضی کا سب سے حسین زمانہ ہے مگر یہ اکثر اتوار کی شام کو اسکول کے پادری صاحب چچا جان کے پاس آتے اور ان سے اپنے مذہب کے بارے میں گفتگو کرتے۔ پیر کی شام کو ایک پنڈت صاحب تشریف لاتے اور وہ اپنی مذہبی باتیں کرتے۔ چچا جان کو تقابل ادیان کا بڑا چسکا تھا اور وہ سارے مذاہب کی سچائیوں کو جاننا

چاہتے تھے۔ اس دوران وہ لوگ جو گفتگو کرتے میں اسے بڑے شوق سے سنا کرتا اور ان کے اکثر پڑھے ہوئے اشعار، مذہبی حوالے اور اشلوک یاد کر لیتا تھا۔ چچا جان کو میرے حافظے پر تو ناز تھا ہی، ان پادری صاحب اور پنڈت صاحب سے گفتگو کے بعد کہتے، دیکھئے یہ میرا نورِ چشم آپ کی باتیں کتنی غور سے سنتا ہے اور پھر مجھے اشارہ کر دیتے میں اچھل اچھل کر وہ شعر، اشلوک اور مذہبی حوالے بیان کر دیتا۔ وہ دونوں بڑے خوش بھی ہوتے اور حیران بھی۔ میری تعریف کرتے اور دعائیں دیتے۔ مشن اسکول میں مجھے پڑھتے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ میرے چچا جان سید لطافت علی کا انتقال ہو گیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ایک پادری ان کے سرہانے انجیل پڑھ رہا تھا۔ ایک ہندو رامائن اور ایک مولانا قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔

چچا جان کے انتقال کے بعد میں اپنے تایا زاد بھائی سید جمیل الدین احمد کے یہاں منتقل ہو گیا، جو سید سخاوت علی کے بیٹے تھے۔ بھائی جان اس زمانے میں نظیر آباد میں رہتے تھے، یہ لکھنؤ کے مشہور محلے امین آباد کے قریب ایک بستی تھی۔ امین آباد میں ہم لوگ روز ٹہلنے جاتے تھے اس کے قریب ہی مشہور بازار "گڑبڑ جھالا" تھا جس میں دنیا جہان کی چیزیں بکتی تھیں۔ میں وہاں سے طرح طرح کے کھلونے خرید کر لاتا۔ ہمارا یہ مکان امین آباد اور روشن الدولہ کچہری کو ملانے والی سڑک کے وسط میں تھا۔ بھائی جان مجھ سے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ میری تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ سچ بولنے پر مجھے انہیں کی طرف سے داد ملتی تھی۔ ہمارے ایک اور عزیز مُنّے چچا بھائی جان کے پاس روزانہ آتے تھے۔ کسرتی آدمی تھے۔ ورزش بھی کرتے تھے۔ مُنّے چچا ہمیں ہمارے خاندان کے قصے اور بزرگوں کی روایات مزے لے لے کر سناتے تھے۔ وہ ہمارے ابو کے ماموں اصغر حسین قدوائی کے نواسے تھے، جو شیخ اسماعیلؒ کی اولاد میں تھے۔ شیخ اسماعیلؒ بہت بڑے صاحبِ کرامت بزرگ گزرے تھے۔ ان کے دسیوں عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ مُنّے چچا بیان کرتے تھے کہ ان کے مزار پر بھیڑیے کثرت سے رہتے تھے اور روایت یہ تھی کہ وہ مزار کی حفاظت کرتے تھے دوسروں کو ضرر بالکل نہیں پہنچاتے تھے خود مُنّے چچا کی اپنی روایت تھی کہ وہ جب بھی اپنے نانا کے مزار پر جاتے تو کوئی ایک بھیڑیا ان کو گھر تک چھوڑنے آتا دوسری روایت یہ تھی کہ شیخ اسماعیلؒ کی قبر پر کوئی باجا نہیں بجایا جا سکتا تھا۔ باجا یا آلاتِ موسیقی میں سے کوئی بھی بجتا تو قبر شق ہو کر دو ٹکڑے ہو جاتی تھی۔ بھیڑیے کی روایت کے پیچھے جو قصہ تھا وہ مجھے بہت ہی پسند تھا اور میں ان سے فرمائش کر کے بار بار سنتا تھا۔ مُنّے چچا نے بتایا کہ حضرت

شیخ اسماعیلؒ کی بیوی بہت حسین تھیں خصوصاً ان کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ اپنی خوبصورتی پر انہیں بڑا ناز تھا۔ شوہر معمولی صورت شکل کے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اتنی خوبصورت ہوں کہ مجھے توکسی شاہزادے یا نواب زادے کی بیوی ہونا چاہیے تھا۔ یہ میری قدر کیا جانیں۔" یہ سوچنا تھا کہ اسی روز ان کی آنکھیں آشوب کر آئیں اور اتنی تکلیف ہوئی کہ جیسے دونوں آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ دوسروں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ ان کی آنکھیں دیکھ کر وحشت ہونے لگتی تھی جیسے دونوں ڈھلے باہر ابل کر نکل جائیں گے۔ خیر انہوں نے بڑی توبہ تلا کی۔ شوہر سے اس بات کا ذکر کیا اور معافی مانگی تو شیخ اسماعیلؒ نے دونوں ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔ دونوں ڈھلے اپنی جگہ آگئے اور آشوب بھی جاتا رہا۔ مگر وہ آخر تک اپنے شوہر سے بہت ناز اور نخرے کرتی تھیں۔ ایک بار رات کو انہوں نے مٹھائی کی فرمائش کی حلوائی کی دکان بند ہو چکی تھی۔ شیخ صاحب نے حلوائی سے کہا تازہ جلیبیاں بنا دو۔ اس نے کہا کہ مٹھائی بھی ختم ہو گئی ہے اور لکڑیاں بھی۔ تازہ جلیبیاں کہاں سے بنا دوں۔ انہوں نے کہا "تم بناؤ تو"۔ اور اپنی ایک ٹانگ انگیٹھی کے نیچے لگا دی۔ کرامت دکھائی اور وہ جلنے لگی۔ اس طرح تازہ جلیبیاں لا کر اپنی چہیتی بیوی کو کھلائیں۔

ان کے صرف ایک اولاد نرینہ تھی۔ ایک مرتبہ وہ جنگل گئے۔ جہاں ایک بھیڑیے نے انہیں گھیر لیا اور کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت تک بڑی رات ہو گئی تھی۔ ماں کی حالت غیر تھی بار بار شوہر سے کہتیں کہ "تم کیسے صاحب کرامت ہو اپنے لڑکے کی خبر بھی تم کو نہیں ہے۔ میں اس کو تم سے لوں گی"۔ آخری شیخ نے بیوی سے پوچھا کہ "تم کو لڑکا چاہیے یا شوہر۔ کون زیادہ عزیز ہے۔ جو تم کو عزیز ہو تو دوسرے سے ہاتھ دھو لینا"۔ بیوی نے کہا "تم چاہے رہو یا نہ رہو مجھے تو لڑکا چاہیے"۔ شیخ صاحب نے شیشی میں راکھ بھر کر دی اور کہا "جب یہ سرخ ہو جائے تو جنگل میں فلاں جگہ آدمی بھیج دینا"۔ اور خود جنگل تشریف لے گئے۔ بھیڑیا ان کے لڑکے کو آدھا کھا چکا تھا انہوں نے بھیڑیے سے کہا۔ "تو اس کے بدلے میرا آدھا دھڑ کھا لے اور اس کو چھوڑ دے"۔ بھیڑیے نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اپنی کرامت سے لڑکے کو اچھا کر دیا۔ ادھر بیوی کے پاس رکھی ہوئی شیشی کی راکھ سرخ ہو گئی تو انہوں نے جنگل میں آدمی دوڑا دیا۔ جب وہ آدمی جائے وقوع پر پہنچا تو بیٹے کو موجود پایا اور شیخ صاحب کا آدھا دھڑ بھیڑیے نے کھا لیا تھا۔ مشہور ہے کہ شیخ صاحب نے بھیڑیے سے عہد لیا تھا کہ میری اولاد کا خون تم پر حرام ہے۔ جب شیخ صاحب کا

انتقال ہوا تو خدا جانے کہاں سے بھیڑیوں کا ایک پورا گروہ وہاں آیا اور رہنے لگا۔ بھائی جان بھی اس کی تائید کرتے تھے کہ ان کو لکھنؤ جاتے ہوئے یا اکثر زمینوں کی دیکھ بھال کو جاتے ہوئے بھیڑیے ملتے تھے مگر کبھی کسی بھیڑیے نے ان کو نہیں ستایا۔ خود بھائی صاحب کی روایت تھی کہ جب بھی کرسی اور متنقی سے کھیولی آتے ہوئے مجھے شام ہو جاتی تھی تو ایک بھیڑیا میرا پیچھا کرتا تھا مگر دھیا تک آکر واپس چلا جاتا تھا۔ جب میں نے اس کا ذکر منّے چچا سے کیا تو انہوں نے یہ سارا قصہ سنایا اور کہا کہ "وہ تمہیں کبھی کچھ نہیں کہے گا، وہ تمہارا پیچھا نہیں کرتا، بلکہ تم کو حفاظت سے گھر تک چھوڑنے آتا ہے"۔ غرض کہ وہ مجھے اکثر عجیب و غریب قصے سنایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ یہی منّے چچا نظیر آباد میں بھائی جان کے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ ادھر اُدھر گئے تو اس اثنا میں بھائی جان کا ایک پیمائشی آلہ مجھ سے ٹوٹ گیا۔ میں نے چپکے سے جوڑ کر رکھ دیا کیونکہ بھائی جان کا غصہ دیکھ کر میری بھی روح کانپ جاتی تھی۔ بھائی جان نے جب اپنے پیمانے کو ٹوٹا ہوا دیکھا تو بولے کہ "یہ منّے نے کیا ہوگا۔ بڑی پہلوانی رکھتا ہے۔ اسے بھی توڑ کر رکھ گیا ہوگا"۔ مجھے تو سچ بولنے کی عادت سی پڑ گئی تھی میں نے کہا: "نہیں بھائی جان! یہ مجھ سے ٹوٹا ہے"۔ بھائی جان کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ میں سہم کر رہ گیا۔ پھر ایک دم انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور ہنس کر بولے "واہ میرے سچے بیٹے! ہمیشہ اسی طرح سچ بولنا اور کبھی جھوٹ نہ بولنا"۔

بھائی جان نے مجھے مشن اسکول لال باغ سے اٹھا کر سینٹینیبل اسکول میں داخل کرا دیا تھا جو لکھنؤ کا مشہور اسکول ہے۔ یہاں میرے ساتھ میرے ایک رشتے کے چچا زاد بھائی سید جمال نصیر عرف محمد میاں اور سید ناصر جہاں (جو بعد میں ریڈیو پاکستان کے براڈکاسٹر اور اپنی آواز کی بنا پر مشہور ہوئے۔ مؤلف) بھی پڑھتے تھے۔ میں بھائی جان کے پاس ابھی تھوڑے ہی دن رہا ہوں گا کہ اچانک خبر ملی کہ میرے چچا سید لیاقت علی کا بس سے حادثہ ہو گیا ہے اور میں کھیولی روانہ ہو گیا۔

○

آپا کی روایت ہے کہ سلیم منجھلے بھائی کے انتقال کے بعد کھیولی آگئے تھے۔ ان کا داخلہ

دوبارہ کرسی میں گرا دیا تھا۔ اس بار تمہارے ابوجان نے ان سے کہا کہ "بیٹے اب تم بڑے ہو رہے ہو۔ اسکول کی تعلیم تو ہوتی رہے گی مگر تم نے قرآن ابھی تک نہیں پڑھا ہے، یہ میری کوتاہی تھی۔ اب تم ادھر بھی توجہ کرو۔ آج کل مسجد میں ایک مولوی صاحب کو بچوں کو قرآن پڑھانے کے لیے رکھ لیا گیا ہے تم وہاں چلے جایا کرو"۔ سلیم جب ان مولوی صاحب سے پہلی بار پڑھ کر آئے تو ان کے پڑھانے کے انداز، ان کی نوجوانی، ان کی خوبصورتی اور سب سے بڑھ کر ان کی قابلیت کا ہر وقت کلمہ پڑھنے لگے۔ مجھے ان کی دلچسپی سے یہ یقین ہوگیا کہ وہ انشاءاللہ بہت جلد قرآن شریف ختم کرلیں گے۔ عام بچوں کے مقابلے میں سلیم کا ذہنی پس منظر اس معاملے میں بہت مختلف تھا۔ ایک تو انہیں اپنے منجھلے چچا سے ابتدا سے ہی جو محبت اور عقیدت تھی۔ اس کی وجہ سے وہ دینی باتیں بڑے غور سے سنتے تھے اور بہت ہی کم عمری سے انہوں نے منجھلے بھائی کی لائبریری کی ہر کتاب پڑھنی شروع کردی تھی۔ ہمارے پورے علاقے میں دینی اور تاریخی کتابوں کا جیسا ذخیرہ منجھلے بھائی کے پاس تھا ویسا کہیں اور نہیں تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوتا جب وہ چار پانچ سال ہی کی عمر سے منجھلے بھائی سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور وہ بہت سنجیدگی سے ان کی ہر بات کا جواب دیا کرتے۔ اکثر کتابیں نکلوا کر وہ سلیم سے سنتے۔ بعض آیتیں جو ان سے پڑھی نہ جاتیں خود پڑھتے اور ان کے معنی بتاتے۔ جب سارے خاندان کو یہ معلوم ہوا کہ منجھلے بھائی نے اس ذرا سے بچے کے لیے دلی سے نکلنے والے ایک رسالے "مولوی" کو جاری کروادیا ہے تو سب ہی حیران ہوئے۔ سلیم اس رسالے کو پڑھ کر بہت سی باتیں جان گئے تھے اور ہر بات جو ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی، اپنے منجھلے ابا سے پوچھ لیتے تھے۔ سلیم کا ذوق و شوق دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتے کہ سلیم کو میں دینی تعلیم دلواؤں گا اور تمہارے ابو سے کہتے کہ اس کو قرآن اور احادیث کی ابتدائی تعلیم کے بعد فرنگی محل کے مدرسے میں داخل کرا دینا۔ انہیں کے کہنے پر تمہارے ابوجان مشکوٰۃ شریف خرید کر لائے جس کو سلیم یاد کرلیتے اور اپنے ابو اور منجھلے ابا کو سناتے تو دونوں بھائی نہال ہوجاتے۔

تو جب سلیم نے مولوی عاقل سے پڑھنا شروع کیا حالانکہ ان کو قرآن حفظ کرنے کے لیے کسی نے نہیں کہا تھا اور نہ مولوی عاقل حفظ کراتے تھے مگر سلیم کا حافظہ ایسا تھا کہ جو کچھ وہ پڑھاتے سلیم اسے ایک بار ہی میں یاد کرلیتے۔ جبکہ دوسرے بچے ایک سبق کو دو دو تین تین دن میں بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے۔ یہ کام مولوی عاقل سلیم سے لینے لگے کہ وہ سبق کو باقی کلاس کو یاد

کرائیں - اس دوران وہ جو باتیں سلیم سے قرآن، حدیث، تاریخ اسلام مسئلے اور مسائل کے بارے میں بیان کرتے سلیم ان کو بڑی توجہ سے سنتے اور یاد رکھتے پھر ان سے اپنی طرف سے ایسے سوال کرتے کہ مولوی عاقل ان کی ذہانت، حافظے اور شوق کی بنا پر ان سے انتہائی محبت کرنے لگے تھے اور صرف کھیولی ہی نہیں بلکہ ہر جگہ انہوں نے سلیم کی عمر، اس کے شوق اور صلاحیت کا ایسا تذکرہ کیا کہ وہ لوگ جب کھیولی آتے تو پوچھتے کہ وہ بچہ کہاں ہے جسے مولوی عاقل پڑھاتے ہیں اور جس کی حیرت انگیز ذہانت اور حافظے کا ذکر کرتے ہیں۔ سلیم نے ابھی مولوی عاقل سے اٹھارہ پارے ہی پڑھے تھے کہ تمہارے ابوجان کا انتقال ہو گیا ان کی اس ناگہانی موت نے میری زندگی کو تاریک کر دیا اور میں دن رات سوچنے لگی کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کیا ہوگا یہ سب کیسے پلیں اور بڑھیں گے۔ کھیولی اور اس کے مضافات میں کہیں کوئی اسکول ایسا نہیں تھا جہاں انگریزی تعلیم کا معقول بندوبست ہو۔ جب تمہارے منجھلے ابا بھائی کی موت پر آئے تو میں نے سب سے زیادہ سلیم کے تعلیمی مستقبل پر ان سے بات کی اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ تم سلیم کو میرے پاس بھیج دو اس کی تعلیم کا سلسلہ نہ ٹوٹنا چاہیے۔ اچھی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہو سکتی ہے۔ میں سلیم کو پڑھاؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنی باجی کے مشورے سے جو تمہارے ابو کے انتقال پر کھیولی آئی ہوئی تھیں اور مجھے عدت گزارنے کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں، یہی مناسب سمجھا کہ سلیم کو منجھلے بھائی کے یہاں بھیج دوں اور میں باجی کے ساتھ تمیم اور زاہدہ کو لے کر باندے چلی گئی جہاں میرے بہنوئی عزیز الحسن صاحب مونسپل سیکرٹری تھے۔

تمہارے منجھلے ابا حکیم سید شجاعت علی بھی طبیب تھے اور لکھنؤ کے ایک محلے ٹکیٹ گنج میں رہ رہے تھے۔ تمہارے دادا سید عباس علی ہنر کے بعد یہی باقاعدہ شاعر تھے اور شجاع تخلص کرتے تھے پکے مسلم لیگی تھے۔ ان کے تعلقات چوہدری خلیق الزماں سے بڑے گہرے تھے۔

بھائی صاحب کی روایت ہے کہ منجھلے ابا نے مجھے ننگلہ ہائی سکول میں داخل کرا دیا۔ میں ان کے پاس تقریباً دو سال رہا۔ یہ زمانہ لکھنؤ کی ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کی تاریخ میں بڑا سیاسی ہلچل کا زمانہ تھا۔ ان کے مطب میں طرح طرح کے لوگ جمع ہوتے اور دن رات کانگریس، مسلم لیگ، مجلس احرار اور جمعیت العلمائے ہند اور نہ جانے کن کن سیاسی جماعتوں پر بحث اور مباحثے کرتے

دنیائے اسلام میں ہونے والی ہر تبدیلی یہاں کی گفتگو کا ایک حصہ تھی۔ میں گھنٹوں منجھلے ابا کے مطب میں بیٹھا یہ باتیں سنتا رہتا اور مجھے ان باتوں سے شدید دلچسپی محسوس ہوتی۔ اس طرح سیاست اور مذہب بچپن ہی سے میری توجہ کا مرکز بن گئے۔ منجھلے ابا کی عادت تھی کہ رات کو کھانے کے بعد مجھے آواز دیتے اور حقّہ لانے کے لیے کہتے۔ پھر گھر کے سارے لڑکوں کو جمع کر کے واقدی کی فتوح الشام کھول کر بیٹھ جاتے اور اپنی بھاٹ دار آواز میں اسلامی فتوحات کی داستانیں سنایا کرتے۔ حضرت خالد بن ولید، حضرت ضرار بن الازور، حضرت شرجیل بن حسنہ کے نام روز میرے کانوں میں پڑتے اور منجھلے ابا کے سنانے کا انداز ایسا تھا کہ دل میں جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ میں کہا کرتا کہ کاش ایک بار وہ زمانہ لوٹ آئے کہ اسلامی لشکر فتوحات کے لیے نکلیں اور میرا ننھا سا خواب یہ تھا کہ میں بھی اس لشکر کے ساتھ ہوں اور میرا نام بھی مجاہدین میں شامل ہو۔

فتوح الشام کا ایک کردار مجھے بہت پسند تھا، امس بن ابو الہول۔ یہ ایک بہت لمبے تڑنگے آدمی تھے اور اتنے لمبے تھے کہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو ٹانگیں زمین پر گھسٹتی ہوئی چلتیں۔ اتنے طاقت ور تھے کہ گھوڑے کی دم پکڑ لیتے تو گھوڑے کے پورے زور کے باوجود اسے ٹس سے مس نہ ہونے دیتے اور گھوڑا اپنے زور میں اپنی جگہ کھڑا کھڑا اچھلتا رہتا۔ انہوں نے ایک بار تن تنہا رومی لشکر کے ایک پورے دستے کو شکست دی تھی۔ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گئے تھے۔ وہاں رومی فوج کا ایک دستہ سامان رسد لے کر آ گیا انہوں نے سوچا کہ کسی طرح ان کو مار بھگاؤں تو لشکر اسلام کے لیے بڑی رسد ہاتھ لگے۔ انہوں نے درختوں کی شاخیں کاٹ کر زمین پر نصب کر دیں اور اپنے عمامے کو پھاڑ کر ان کے سرے بنا دیئے اور پھر رومی لشکر پر یہ کہتے ہوئے ٹوٹ پڑے "چلو خالد بن ولید حملہ کرو، ضرار بن ازور دائیں طرف جاؤ، شرجیل بائیں طرف سے حملہ کرو۔" رومی لشکر یہ سمجھا کہ پورا اسلامی دستہ اسلام کے بہتر بن تیغ زنوں کے ساتھ حملہ آور ہو گیا ہے اور وہ انتہائی گھبراہٹ میں رسد چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اسی طرح یوحنا اور یوقنا کا قصہ بھی مجھے بہت پسند تھا۔

فتوح الشام کے بعد منجھلے ابا کی دوسری دلچسپی شاہنامے سے تھی۔ شاہنامے کا اردو منظوم ترجمہ اس جوش سے پڑھتے کہ جیسے خود رستم بن گئے ہوں۔

ادھر سے سپہ دار مازندراں

ادھر سے جہاں دار کشور ستاں

مقابل ہوئے آ کے میدان میں
لڑائی ہوئی برپا توران میں
فرامرز بولا تو دیوانہ ہے
تمیز و خرد سے تو بیگانہ ہے
وہی ہوں تجھے کل کیا تھا زبوں
کروں گا تجھے آج بھی غرقِ خوں

شاہنامے کا سب سے دلچسپ کردار "گرگین" کا تھا جس کی بزدلی اور ریا کاری مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

جو دیکھا تو گرگیں ہے مصروفِ جنگ
ولے دور سے ڈالتا ہے خدنگ

منجھلے ابا کہا کرتے تھے "سلیم رستم ہے اور رضی گرگین ہے"۔ سلیم شیر ہے رضی لومڑی ہے" رضی میرے چچازاد بھائی تھے۔ وہ میرے سب سے چھوٹے تائے سید رفاقت علی کے بیٹے تھے۔ میری ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔ بڑی دلچسپ حرکتیں کرتے تھے۔ ان کی بڑی بہن عائشہ سے بھی مجھے بڑی محبت تھی۔ سید رفاقت علی جنہیں ہم میاں چچوا کہتے تھے محلہ کبیٹ گنج کنڈالا میں رہتے تھے۔ اسکول میں ٹیچر تھے، اور یہ بھی شعر کہتے تھے۔ سحر تخلص تھا۔ مجھ سے اور تمیم سے بڑی محبت کرتے تھے (اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے ذکی الدین اب کراچی میں ہیں، مؤلف)

ٹھیک یہی زمانہ تھا، جب ایک واقعہ میری زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ منجھلے ابا کے بیٹے جن کا نام اشفاق حسین ہے اور جن کو ہم تین بھائی کہتے ہیں مجھے خاکساروں کا ایک مظاہرہ دکھانے کے لیے لے گئے جس میں ایک مصنوعی جنگ کا پروگرام بھی شامل تھا۔ شام کا وقت خاکسار اپنی وردیوں میں چمکتے ہوئے بیلچے لگائے، چپ و راست کرتے ہوئے جنگی مظاہرہ کر رہے تھے۔ تیز بارش شروع ہو گئی مگر تماشائیوں کے جوش و اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ مجھے سارا منظر اب تک یاد ہے۔ میں اس میں ڈوب سا گیا۔ مظاہرہ کرنے والوں میں ایک گیارہ بارہ برس کا بچہ بھی شامل تھا۔ سرخ و سفید رنگت کا بچہ، اپنی خوبصورت وردی میں ننھا سا بیلچہ لگائے مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں دعا مانگنے لگا کہ اس

طرح میں بھی خاکسار تحریک کے مجاہدوں میں شامل ہو جاؤں۔ تب سے خاکسار تحریک سے مجھے شدید دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یہ خاکسار مجاہدین میری نظر میں خالد بن ولید کے جدید لشکر کا نیا روپ تھے بعد میں کانگریس حکومت نے خاکساروں پر گولی چلا دی جس میں متعدد خاکسار شہید ہو گئے۔ اس واقعے نے خاکساروں سے میری دلچسپی اور ہمدردی کو عشق کی حد تک پہنچا دیا۔ ہمارے محلے میں ایک خاکسار رہتے تھے جن کے پاس علامہ مشرقی کا اخبار "الاصلاح" آیا کرتا تھا۔ میں ان سے علامہ اور ان کی تحریک کی باتیں سننے اور کرنے جایا کرتا تھا۔

منجھلے ابا بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اس معاملے میں میں واقعی بڑا خوش نصیب ہوں کہ میرا سارا خاندان اپنی اولاد کے باوجود میرا عاشق تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے جتنے چچا زاد بھائی تھے وہ اپنے والدین کی مجھ سے محبت دیکھ کر سوائے بھائی جان کے اندر ہی اندر جلتے تھے یا کم سے کم اس محبت پر خوش نہ تھے اور میری ایک ہی کمزوری ان کے ہاتھ میں تھی، وہ انگریزی تھی، منجھلے ابا کے صاحبزادے، پتن بھائی کے ایک ملنے والے تھے۔ وہ جب بھی ان سے ملنے آتے تو اپنے بیٹے کو ساتھ لاتے جو میرا ہم عمر تھا اور شاید کسی اور اسکول میں اسی کلاس میں پڑھتا تھا جس میں میں تھا۔ وہ صاحب اپنے لڑکے کی قابلیت دکھانے کے لیے اس سے انگریزی کے الفاظ اور ان کے معانی پوچھا کرتے تھے۔ اور اس مقابلے میں مجھے بھی شریک کرتے تھے نتیجہ یہ کہ ان کا لڑکا تو ہر لفظ کے ہجے اور معنی فر فر بتا دیتا اور میں بھدی سی رہ جاتا۔ پتن بھائی مجھے ذلیل کرتے "دیکھو ایک وہ ہے اور ایک تم ہو"۔ میں کسمسا کر رہ جاتا اور شاید بچپن کی ان ذلتوں کا اثر تھا کہ میں نے انگریزی سے ایک مخاصمت پیدا کر لی تھی جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھے بعد میں خاصی محنت اور جد و جہد کرنی پڑی۔

منجھلی اماں بھی مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی تھیں وہ مجھے "سلمی ستارہ" کہا کرتی تھیں اور میری جو اچھی بات ہوتی تھی ہر ایک سے اس کا تذکرہ کرتیں۔ ان کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا انہوں نے دو جوڑے روڈ مرغیوں کے پال رکھے تھے۔ بڑی زبردست مرغیاں تھیں۔ سال بھر انڈے دیتی تھیں۔ مرغا بہت شاندار اور نہایت شریر تھا۔ ہر آنے جانے والے پر حملہ آور ہو جاتا۔ منجھلی اماں اسے اس طرح ڈانٹتیں جیسے کسی بچے کو ڈانٹتے ہیں۔ اسے سمجھاتیں کہ "دیکھو لڑکوں پر حملہ نہیں کرتے"۔ مگر وہ مرغا تھا ان کی بات کہاں سنتا تو اسے باقاعدہ سزا دیتیں۔ ایک کمرہ بند کو ہٹ کر انہوں نے کوڑ گھر سا بنا لیا تھا اسی کوڑے سے مرغ کو مارا کرتیں۔ منجھلی اماں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ تو ایک بات انہوں

نہ ایسی کی کہ ان کی ساری محبت اور خلوص کے باوجود میرا دل ان سے اور لکھنؤ سے کھٹا ہو گیا۔
ابو جان کے انتقال کے بعد میری بڑی خالہ میری والدہ کو عدت کے لیے اپنے ساتھ لے گئی تھیں
آپا چونکہ غیر خاندان کی تھیں اور پھر کالے کوسوں یعنی یوپی کے دوسرے کونے میں رہتی تھیں تو میری
دادھیال میں بعض عزیز یہ کہنے لگی تھیں کہ وہ اب واپس کھیولی نہیں آئیں گی یا تو کسی دوسری جگہ
شادی کر لیں گی یا اپنے ہی خاندان میں رہیں گی اور بچوں کو وہاں بلا لیں گی۔ ہماری منجھلی اماں اس
خیال کو پھیلانے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھیں۔ اتفاق سے آپا ایک سال تک کھیولی واپس
نہیں آئیں تو منجھلی اماں بغیر یہ سوچے سمجھے کہ میرے ننھے سے دل پر کیا گزرتی ہوگی، مجھ سے کہا کرتیں "اب
تو تم صبر کر لو اب وہ تمہارے پاس نہیں آئیں گی۔ پتہ نہیں کہیں اور نہ شادی کر لی ہو"۔ ایک سال کا انتظار
مایوسی اور یہ باتیں یہ سب میرے قلب پر بڑا گہرا اثر ڈالتی تھیں اور میں گھبرا رات بھر آنگن کے بستر پر کروٹیں
لیا کرتا۔ اچانک آپا کا خط آیا کہ میں آ رہی ہوں۔ اس خط سے میری روح میں "تازگی سی آ گئی۔ آپا آئیں
تو دو روز منجھلے ابا کے پاس رکیں اور اس کے بعد کھیولی جانے لگیں۔ میں انہیں اسٹیشن چھوڑنے
جانا چاہتا تھا مگر تقی بھائی نے اجازت نہیں دی اور آپا بھی مروت کے مارے کچھ نہ کہہ سکیں۔ الٹا مجھے
سمجھانے لگیں کہ "اسٹیشن جا کر کیا کرو گے"۔ اس وقت تو جبراً قہراً میں رک گیا مگر آپا کی روانگی کے
بعد چھپ کر اسٹیشن پہنچ گیا اور آپا کے ڈبے کو تلاش کر کے زار و قطار روتا ہوا ان سے لپٹ گیا۔
میری ضد یہ تھی کہ میں آپ کے ساتھ کھیولی جاؤں گا۔ آپا میری تعلیم کے خیال سے مضطرب تھیں، مجھے
سمجھانے لگیں کہ "بیٹا کھیولی جاؤ گے تو پڑھو گے کیسے اور پڑھو گے نہیں تو اپنی ماں کا سہارا کیسے
بنو گے"۔ میں یہ سب کچھ سنتا مگر سمجھتا کچھ نہیں۔ میری ضد یہ تھی کہ مجھے کھیولی لے چلو۔ ٹرین کی روانگی
کا وقت آ گیا اور اسٹیشن پر کھڑے ہوئے لوگ اور دوسرے مسافروں نے دیکھا کہ ایک بچہ بلک
بلک کر رو رہا ہے اس کی ماں خود بھی روتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سمجھاتی بھی جاتی ہے۔ اس
وقت کا تصور مجھے جب بھی آتا تو کلیجہ پھٹنے سا لگتا ہے۔ ٹرین چلی گئی۔ میں روتا ہوا واپس آ گیا
اور تقی بھائی کی ڈانٹ بھی سنی مگر میرے معصوم دل نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے آپا کو خط لکھا کہ
"مجھے آپ کھیولی بلا لیجیے ورنہ میں خودکشی کر لوں گا یا کہیں اور بھاگ جاؤں گا، مگر منجھلی اماں کے
پاس نہیں رہوں گا"۔ خودکشی کا خیال میری زندگی میں صرف ایک بار آیا اور وہ یہی موقع تھا۔ خط لکھنے
کے بعد میں جواب کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ تیسرے دن اچانک بھائی جان آ گئے۔ اتنی مہلت
میں کہ باہر مطب ہی میں ٹھہرے رہے اور کسی سے ملنے تک نہیں آئے۔ مجھے بلایا اور کہا

"اپنا سامان اٹھا لاؤ، یکہ تیار کھڑا ہے" - آناً فاناً میں میرا سامان یکے میں رکھ دیا گیا اور بھائی جان کے آنے کے دس منٹ کے اندر اندر میں منجھلے ابا، منجھلی اماں اور پتن بھائی کو حیران پریشان چھوڑ کر اپنے بھائی جان کے ساتھ کھیولی جانے کیلئے چار باغ اسٹیشن جا رہا تھا۔ بھائی جان سے پوچھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی رنا اور مزاج کے آدمی تھے۔ کھیولی کی سرزمین کی روح اور علیؓ کی روح ان میں بسی تھی اور سب ان سے ڈرتے تھے ۔ زندگی مجھے کھیولی سے باہر لے کر آئی تھی اور وہی زندگی دوبارہ مجھے کھیولی لیے جا رہی تھی۔ یہ میرے انجان سفر کا ایک نیا موڑ تھا۔

○

میرے شعور اور یادوں میں جو پہلی دھندلی تصویریں ابھرتی ہیں ان کا تاثر شدید تکلیف، صدمے اور خوف کا ہے۔ میں نے دیکھا، یہ یاد نہیں کہ کہاں، گھر اور اسپتال کے درمیان ایک کنواں ہے۔ وہاں بھیڑ جمع ہے۔ میں مارے تجسس کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کچھ لوگ کنویں کے اندر اترے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اوپر کھڑے کنویں کی چرخی کے ذریعے کوئی چیز اوپر کھینچ رہے ہیں۔ تھوڑی سی دیر میں وہ چیز کنویں سے برآمد ہوئی وہ ایک بوڑھے کی لاش تھی جو بالکل برف کی طرح سفید تھی اور کہیں کہیں وہ بہت زیادہ پیلی ہو گئی تھی۔ لاش اتنی گل چکی تھی کہ جہاں جہاں کسی کا ہاتھ لگتا گوشت ادھڑ جاتا۔ میں اس لاش کو دیکھنے کے صدمے سے اتنا خوفزدہ اور متاثر ہوا کہ مجھے اسی روز شدید اور تیز بخار ہو گیا۔ رات کو بھی بخار کی شدت میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا اور بڑے زور سے چلاتا اور ڈرتا رہا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک کوڑھی کی لاش تھی جو علاج کرانے کے لیے اسپتال آیا تھا مگر دو ایک سال علاج کرانے کے بعد جب وہ صحت سے مایوس ہو گیا تو اس نے کنویں میں گر کر خودکشی کر لی تھی۔ میرے معصوم شعور میں جو سوال بار بار ابھرتا تھا وہ یہ تھا کہ آدمی اتنے بیمار کیوں ہو جاتے ہیں وہ آدمی کنویں میں کیوں گر گیا تھا۔ کیا ہر بیماری اور دکھ کا علاج "خودکشی" ہے۔ میں اس سوال کا کوئی جواب نہ پاتا تو بہت افسردہ اور غمگین ہو جاتا۔ جب بھی مغرب کا وقت آتا تو میں ایک ناقابل بیان بوجھ کو قلب پر محسوس کرتا اور یہی کیفیت صبح فجر کے وقت بھی محسوس ہوتی

مجھے اکثر یہ لاش اور پھر اپنے سوال کا جواب نہ پانے کی تکلیف بہت افسردہ اور ہراساں کر دیتی۔ دوسری تکلیف وہ یاد، خود میری ذات سے تعلق رکھتی ہے ——— میں نے خود کو اسپتال میں

پاپا۔ میرے پاس خالو جان کا ملازم رشید ہے اور ایک نوجوان سے عزیز جن کا نام مجھے یاد نہیں مجھے پکڑے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر میرے پیشاب کے مقام پہ ایک نہایت چمکدار سلائی سوراخ کے اندر داخل کر رہا ہے جس سے مجھے ایک شدید اذیت پہنچ رہی ہے کہ جیسے کوئی میرا گوشت نہایت گرم اور تیز دھار آرے سے کاٹ رہا ہے۔ ادھیڑ رہا ہے میں زور زور سے چیخ رہا ہوں۔ اس وقت میرے ذہن میں کنوئیں سے نکلنے والی لاش گھوم رہی ہے جو بار بار میری ذات میں ایک سوال پیدا کر رہی ہے۔ کیا میرا بھی یہی خوفناک انجام ہوگا؟ یہ کیا تکلیف ہے۔ مجھے کیا بیماری ہے کیا دکھ ہے؟ کیا اسی بیماری سے بچنے کے لیے مجھے بھی کنوئیں میں گر کر خودکشی کرنا پڑے گی۔ اس رات پھر مجھے تیز بخار چڑھ جاتا ہے اور میں ایک سرسامی کیفیت میں چلّا رہا ہوں۔ خدا جانے کیا کیا کہہ رہا ہوں لیکن مجھے سب سے زیادہ اذیت اس سے پہنچ رہی ہے کہ کوئی میری اس تکلیف سے واقف نہیں ہے۔ کوئی مجھے سینے سے نہیں لگاتا۔ پیار نہیں کرتا۔ میرے ساتھ نہیں روتا۔ آپا کہاں ہیں؟ اور کوئی ایسا بھی نہیں جو مجھے اپنی آغوش میں لے لے جیسے میرے سر پر چھت نہیں ہے جیسے میں تنہا کسی میدان میں چلّا رہا ہوں۔ اپنی تنہائی، بے بسی، ایک نامعلوم عدم تحفظ، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں کسی کمی کا احساس، ناآسودگی، تشنگی اور بے اطمینانی کا، ایک خلا اور بے چینی کا خوف، اُس سے بھی زیادہ ایک گہری اور نامعلوم کیفیت، الفاظ سے ماورا، محبت کی بھوک! توجہ کی پیاس!! کوئی مجھے اپنے سینے سے لپٹا لے۔ کوئی مجھے اپنے ساتھ بھینچ لے ——— میں نے کافی بڑے ہو کر امّی سے پوچھا کہ یہ دونوں واقعات کہاں اور کب ہوئے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ "باندے" کا قصہ ہے جب اس آدمی کی لاش کنوئیں سے نکلی۔ اس وقت تم میرے پاس آئے ہوئے تھے اور اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد تم اسپتال بھی بھیجے گئے تھے کیونکہ تمہاری پیدائش کے وقت کا کوئی زہریلا مادّہ تمہارے جسم میں رہ گیا تھا جس کی وجہ سے پیشاب کرتے ہوئے تمہیں سوزش ہوتی تھی اور اکثر پیشاب رک جاتا تھا۔ اس کی تکلیف سے تم بہت روتے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر نے سلائی کے ذریعے اس مادّے کو صاف کر دیا تھا۔

اس کے بعد میں کسی سے کچھ کہے بغیر اور مطالبہ یا اظہار کیے بغیر ہر اس شخص سے شدید تعلق پیدا کر لیتا تھا جو مجھ سے ذرا بھی محبت کرتا یا اپنائیت کا اظہار کرتا۔ سب سے زیادہ مجھے بھائی صاحب کی قربت میں تحفظ اور آسودگی کا احساس ہوتا۔ آپا کی ذرا سی توجہ بھی جیسے میرے زخم پہ پھاہا رکھ دیتی چنانچہ ان دونوں سے دوری ایک کسک بن کر میری روح میں اتر جاتی۔ میں کھیولی میں اپنے کھلانے والے بچھو سے محبت کرتا ہوں۔ باندے میں خالو جان کے ملازم رشید سے محبت کرتا ہوں اور ذرا بڑے

ہو کر اپنے پاس چوکیدار "سیتا رام" سے طرح طرح کی باتیں کرنا اور اس کے گھر میں کھانا کھانا مجھے بہت اچھا لگتا۔ پیتل کے چمکدار تھال اور پیتل کے چمکدار گلاس آج بھی میری یادوں میں چمک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی ناک چڑھے عزیز سے یہ طعنہ بھی سنتا ہوں کہ شمیم کو نچلے طبقے کے گھروں میں جا کر بڑا مزا آتا ہے۔ بھوانی کا دودھ پیا ہے نا۔ تو اس دودھ کا اثر ان میں بھی آ گیا ہے۔

کبولی میں اپنے گھر میں مجھے اپنی سب سے پہلی "شعوری" تصویر جو نظر آتی ہے یہ ہے۔ میں اپنا ایک پسندیدہ ہرے رنگ کا سوٹ پہنے، لمبی سی چھڑی ہاتھ میں لیے مکان کے چبوترے پہ بے چینی سے ٹہل رہا ہوں اور اپنے بھائی صاحب کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔ بجنو مجھ سے بار بار کہہ رہا ہے بھیا آؤ بازار جلیبیں۔ میں اسے بھگا دیتا ہوں۔ آپا کی اندر سے بار بار آواز آتی ہے۔ شمیم اندر آ جاؤ سلیم ابھی نہیں آئیں گے۔ تم تھک جاؤ گے۔ میں ان کی کچھ نہیں سنتا۔ اس وقت مجھے دھیا کا نظارہ بھی اچھا نہیں لگتا۔ دھوبیوں کا کپڑے دھونا، چھبیو رام چھبیو رام کی آوازیں، گاؤں کے لڑکے بالوں کا مچھلیاں پکڑنا، تیرنا، دھیا میں لمبی لمبی چھلانگیں لگانا۔ ان سب سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں شام ہونے کے قریب ہے۔ میں نے شام کی چائے بھی گھر میں جا کر نہیں پی۔ ایک اندیشہ، ایک خوف میرے ذہن میں ابھرنے لگتا ہے کیا بھائی صاحب نہیں آئیں گے؟ اتنے میں دھیا کے دونوں حصوں کے درمیانی راستے پر مجھے پہلے بھائی جان نظر آتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ بھائی صاحب۔ میں خوب زور زور سے دوڑتا ہوا اور چلاتا ہوا "بھائی صاحب آ گئے"۔ "بھائی صاحب آ گئے" اور اسلیے کے قریب بھائی صاحب سے جا کر لپٹ جاتا ہوں۔ ان کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں بہت گہری ہو گئی ہیں۔ وہ مجھے سینے سے لپٹا لیتے ہیں ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب پیار کرتے ہیں۔ بھائی جان کے چہرے پر ایک روشنی پھیل رہی ہے۔ میں بھائی صاحب کے ساتھ گھر واپس آ جاتا ہوں۔ وہ جو باتیں کر رہے ہیں انہیں غور سے سنتا ہوں۔ اب سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بڑا با معنی بڑا خوبصورت۔

گھر میں جب رات آتی ہے۔ لالٹینیں جلتی ہیں تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ طرح طرح کے خوف مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ خدا جانے کیا کیا میں نے سن رکھا ہے۔ وہ سب خوف بن کر رات کو مجھے ڈراتے ہیں۔ میں اس کا اظہار کسی سے نہیں کرتا۔ کبھی چوری کا ڈر، کبھی ڈاکے کا خوف، قتل اور جب برسات کی راتیں ہوتیں۔ سات سات دن سورج نہیں نکلتا۔ دھیا سے عجیب عجیب آوازیں آتیں۔ مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ، جھینگروں کی مسلسل آوازیں اور ایک تیز سیٹی

کی سی آواز جن کو بچو کہنا یہ سانپوں کی آوازیں ہیں۔ میں رات کو اپنے بھائی صاحب کے پاس لیٹ جاتا ہوں اور تحفظ کے احساس کے ساتھ سوچتے سوچتے سو جاتا ہوں، رات کو ڈر کر شاید کسی وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں رونے لگتا ہوں۔ صبح کو اماں (ہماری سب سے بڑی تائی اور بھائی جان کی والدہ) مجھ سے کہتیں، شاما مجھے بچپن میں گھر کی سب عورتیں، اماں، مجھلے ہنگا کی لڑکیاں، منفن باجی، مومنہ باجی سب لاڈ سے شاما کہتی ہیں (شاما ہمارے یہاں ایک چھوٹی سی سانولے رنگ کی خوبصورت چڑیا کا نام بھی تھا۔ بڑی بے قرار سی چڑیا تھی اس کی آنکھیں اس کے قد قامت کے مقابلہ پر بڑی بڑی تھی۔ بہت سیاہ جیسے اس نے کاجل لگا رکھا ہو) تم کیوں ڈرتے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں تمھاری پردادی کیسی بہادر تھیں جب وہ یہاں کھیولی میں اپنے گھر میں رہتی تھیں تو تمہارے پردادا اپنے کاموں پر چلے جاتے اور وہ اپنے گھر میں کئی کئی دن رات تنہا رہتیں ایک بڑے کمرے میں، وہ اپنی بھینس کو بھی باندھ لیتی تھیں۔ کیونکہ چور جانور بھی چرا لے جاتے تھے ایک رات ان کی آنکھ کھلی تو انہیں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی ان کے کمرے کی دیوار کھود رہا ہے۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھیں اور جس جگہ دیوار میں سوراخ کرنے کی آواز آ رہی تھی وہاں بھینس کا رسہ کھونٹے میں سے کھول کر اس کا ایک پھندہ سا بنا کر انتظار میں بیٹھ گئیں۔ بالآخر دیوار میں سوراخ ہو گیا۔ چوروں کا یہ عام قاعدہ تھا کہ جب بھی وہ کسی ایسی جگہ پاڑ دیتے تھے تو سب سے پہلے ایک ٹانگ اندر ڈال کر جگہ کا اندازہ کرتے تھے دادی اسی لمحے کی منتظر تھیں جیسے ہی چور نے اپنی ٹانگ اندر ڈالی انھوں نے جھٹ رسی کا پھندا چور کی ٹانگ میں ڈال دیا اور بھینس کو خوب زور سے ڈنڈا مارا۔ بھینس گھبرا کر باہر کی طرف بھاگی اور اس کے زور سے چور کی دونوں ٹانگیں اس طرح چر گئیں جیسے آدمی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس واقعہ سے میری بڑی ہمت بندھی۔ مگر چور کی حالت پر افسوس بھی بہت ہوا۔ آگر پھر میں نے راتوں کو ڈرنا چھوڑ دیا۔ میرا یہ خوف اس وقت بھی غائب ہو جاتا جب بھائی جان رات کو دستک دیتے اور صبح کو جب اچھی باجی (مومنہ باجی) تلاوت کلام پاک خوش الحانی سے کرتیں اماں ہی نے مجھے خاندان کے ایک اور بزرگ کا قصہ سنایا۔ ہمارے خاندان میں بہادری کے ساتھ ساتھ درویشی اور عبادت کی طرف بھی ہمیشہ بڑا رجحان رہا ہے۔ ہمارے ایک دادا کو خاندان کی اسی روایت کے تحت ذرا درویشی اور خانقاہی طور طریق کا شوق چرایا۔ ہر وقت عبادت کرنے اور ضربیں لگاتے تھے۔ سب کام کاج چھوڑ کر جنگل میں نکل جاتے۔ اللہ ہو اللہ ہو کا ورد کرتے اور اکثر لا الٰہ الا اللہ کی ضربیں لگاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کھانے پینے کے

بھی لالے پڑ گئے۔ بیچاری ان کی بیوی یعنی ہماری دادی جو خود ایک بڑے بزرگ کی بیٹی، بڑی صابرہ اور حقیقی طور پر بڑی صاحب باطن خاتون تھیں۔ سب کچھ برداشت کرتی رہتیں اور کچھ نہ بولتیں۔ ایک دفعہ وہ کھڑی ہو کر پیڑھے کوئی پتیلا مانجھ رہی تھیں کہ میاں باہر سے الا اللہ کی ضربیں لگاتے ہوئے کئی روز بعد گھر میں داخل ہوئے۔ دادی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تھا پہلی بار میاں سے بڑے گستاخانہ لہجہ میں بولیں کہ یہ کیا الا للی، ال للی کرتے رہتے ہو۔ مردوں کو اپنے فرائض پہلے پورے کرنے چاہئیں۔ دادا کو سخت غصہ آیا۔ بولے تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔ میں لا الہ الا اللہ کی ضربیں لگا رہا ہوں اور تم اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ یہ ال للی کیا ہوتا ہے۔ دادی جلال میں آگئیں اور بولیں۔ اللہ والا بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے اندر کم از کم اتنی روحانیت پیدا کرو۔ یہ کہہ کر پیڑھے پتیلا مانجھتے ہوئے الٹی طرف گھوم گئیں اور کہا لا الہ اس کے ساتھ ہی نظروں سے غائب ہو گئیں اور پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا الا اللہ اور سامنے آموجود ہوئیں۔ یہ حال جو دادا نے دیکھا تو بیوی سے بڑی معافی تلافی کی اور سیدھی طرح گھر کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

میں اکثر رات گئے تک بھائی صاحب کو پڑھتا دیکھتا وہ لالٹین جلائے نا جانے کیا پڑھتے رہتے۔ بڑی بڑی موٹی کتابیں، دوپہر سے سہ پہر تک اور پھر رات کو ان کا مشغلہ کتابیں ہی پڑھنا تھا۔ ایک بار دوپہر کے کھانے پر بھائی صاحب کی بڑی ڈھنڈیا پڑی۔ ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ مجھ سے ہر ایک کہتا جاؤ سلیم کو ڈھونڈو۔ جاؤ اپنے بھائی صاحب کو بلا کر لاؤ۔ میں انہیں ڈھونڈتا رہا وہ کہیں نہیں ملے۔ بالآخر میں چھوٹے برآمدے میں رکھے ہوئے صندوقوں کی طرف گیا ایک صندوق کا اوپر کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو بھائی صاحب بڑے مزے سے اس میں لیٹے کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد جب بھی وہ دوپہر کو غائب ہوتے تو میں انہیں کسی صندوق سے جا کر بلا لاتا۔ کبھی کبھی گرمیوں کے دنوں میں وہ عصر اور مغرب کے درمیان صحن میں بچھے ہوئے کسی پلنگ پر بیٹھے ہوئے بھی کوئی کتاب پڑھتے رہتے۔ ایک بار وہ اسی طرح کتاب پڑھ رہے تھے میں ان کے ساتھ بہت شرارت کر رہا تھا کبھی ان کے تلووں میں گدگدی کر دیتا کبھی تنکے سے ان کے کان کو کریدنے لگتا۔ کبھی ان کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیتا۔ وہ بار بار مجھے منع کر رہے تھے۔ پھر آپا سے شکایت کرنے لگے کہ دیکھئے آپا شمیم مجھے پڑھنے نہیں دے رہا ہے۔ میں کہاں ماننے والا تھا۔ بھائی صاحب کو ایک دم سے غصہ آگیا انہوں نے کتاب گھما کر مار دی۔ اتنی موٹی کتاب تھی جیسے طلسم ہوشربا کی چھٹی جلد۔

میری پسلیوں پر پڑی، میں الٹ گیا۔ اور میرا سانس اُلٹا سیدھا چلنے لگا۔ آپا گھبرا کر دوڑیں۔ ارے مار ڈالا میرے بچے کو۔ اماں بھی بھاگیں۔ ہا۔ سلموے تم تو مار ہی ڈیلو شاماکو۔ بھائی صاحب بھی شرمندہ شرمندہ سے گھبرا کر مجھے پیار کرنے لگے اور میری پسلیاں سہلانے لگے۔ بولے میں نے کتاب ماری تھوڑی تھی شمیم کے۔ میں تو اسے ڈرا رہا تھا۔ کتاب وزنی ہونے کی وجہ سے ہاتھ سے پھسل گئی۔

بھائی صاحب کے کتابیں پڑھنے کے شوق کو دیکھ کر میں بھی کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا تھا۔ سب سے پہلے میری توجہ جس کتاب نے کھینچی وہ ایک باتصویر کتاب تھی۔ داستان امیر حمزہ بعد میں تو وہ کسی اناڑی کی مضحکہ انگیز مصوری کا نمونہ نظر آتی تھی۔ لیکن اس وقت تو وہ میرے لیے انجم زخشندہ کا منظر کھلا کے مانند ہوگئی تھی۔ ابھی بالکل ابتدائی درسی کتابوں کے پڑھنے کے بعد جو سب سے پہلے کتاب پڑھی وہ یہی داستان امیر حمزہ تھی۔ مجھے اتنی دلچسپ لگی کہ ایک بار ختم کر کے دوبارہ پھر اسے شروع کر دیتا۔ جب داستان امیر حمزہ کا شوق ذرا اعتدال میں آگیا تو میں نے دوسری کتاب الف لیلہ باتصویر پڑھی۔ تیسری کتاب رزم و بزم تھی۔ منشی مراد علی کا، شہاب الدین غوری کے عہد پر لکھا ہوا یہ ضخیم تاریخی ناول میرے خیال میں تاریخی ناولوں کی صف میں آج بھی سب سے بلند مقام پر رکھے جانے کے لائق ہے۔ اس کے بعد ایک جاسوسی ناول "طلسمی برج" پڑھا جس کے کردار اتنے دلچسپ اور جاندار تھے کہ پھر کبھی جاسوسی ناول نظر سے گزرتا تو طلسمی برج یاد آ جاتی۔ اس کے بعد تو مجھے بھی پڑھنے کا ہوکا سا ہوگیا۔ پڑھے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا جو کتاب بھی ہاتھ لگتی پڑھنے لگتا تھا۔ اس زمانہ میں تاریخ طبری کی تمام جلدیں مجھے بہت دلچسپ لگیں۔

بھائی صاحب کھیلوں میں، سہ پہر کو دھنیا پر چلے جاتے اور میں ان کو چند لڑکوں کے ساتھ تیرنے کی مشق کرتا ہوا دیکھتا۔ وہ دھوبیوں کے کپڑے دھونے کے تختے لے کر اس کے سہارے تیرتے پھرتے۔ یہ تختے کھجوروں کے تنے سے بنائے جاتے تھے۔ پھر جب مشق ہو گئی تو انہوں نے تختوں کے بغیر تیرنا شروع کر دیا۔ دور تک تیرتے نکل جاتے۔ مجھے بڑی فکر ہوتی اور میں سانس روکے انہیں اس وقت تک جب تک وہ کنارے پر نہ آجاتے تیرتا دیکھتا رہتا یا پھر انہیں ڈگن یے مچھلیوں کا شکار کھیلتے دیکھتا۔ اس سے مجھے یوں دلچسپی تھی کہ جب بھی وہ بہت سی گرئی مچھلیاں پکڑ کر لاتے تو آپا انہیں بھون کر تل کر اور پکا کر میرے لیے کام و دہن کا

بڑا سامان مہیا کرنے میں۔ برسات کے دنوں میں یہ لوگ پانی کے سانپ پکڑ کر لے آتے اور ایک دوسرے کو ڈراتے، ایک دوسرے پر پھینک دیتے۔ مجھے ان سے بڑا خوف آتا اور میں بھاگ کر گھر کے اندر آ جاتا۔

○

کھیولی میں میری زندگی کا واحد مرکز توجہ بھائی صاحب کی ذات تھی صرف اس لیے نہیں کہ اپنے گھر میں وہ سب کے مرکز توجہ تھے اور مجھے ان سے بڑی محبت تھی ——— بلکہ میری اس ساری "عجیب دنیا" میں جسے کھیولی کہا جاتا تھا ان کی ذات سب کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی، وہ جس جگہ کھڑے ہوتے بڑے ہوں یا ان کے ہم عمر سب ان کی طرف متوجہ ہو جاتے، ہر آدمی ان کی ذات میں دلچسپی لیتا، ان سے بات کرتا، وہ کھیولی کے واحد فرزند تھے کہ پیٹھ پیچھے بھی ہر آدمی ان کی ذہانت، ان کے اخلاق، تعلیم کے شوق، ان کی محبت اور ان کی قابلیت کی تعریف کرتا۔ خاندان میں ان کے ہم عمر اور دو ایک سال چھوٹے بڑے رشتہ دار جب بھی اپنے تعلیمی اداروں کی تعطیلات کے بعد کھیولی میں جمع ہوتے تو وہ سب بھائی صاحب کو گھیرے رکھتے۔ ان کے بغیر کہیں نہ جاتے ان کو بلا بلا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ دھتیا میں نہانے، مچھلی کا شکار کھیلنے اور غلیل لے کر باغوں میں سیر کرتے پھرنے سے لے کر گھریلو کھیلوں، تاش، شطرنج اور کیرم تک بھائی صاحب کے بغیر کوئی محفل نہ جمتی۔ جب بھی دوستوں میں کوئی جھگڑا ہوتا یا کسی بات پر ٹھن جاتی تو ثالث بھائی صاحب کو بنایا جاتا، ان کے فیصلے کو ہر ایک قبول کر لیتا۔ خود ان کا جھگڑا کسی سے نہ ہوتا۔ کسی ایسے جھگڑے میں جب بات بزرگوں تک پہنچتی تو بزرگ سب سے آخر میں بھائی صاحب کو بلاتے اور ان سے جھگڑے کی تفصیل پوچھتے اور جو کچھ بھائی صاحب بتاتے اس کی روشنی میں فیصلہ کرتے سب یہی کہا کرتے کہ سلیم کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور ہمیشہ سچ بات کرتے ہیں خواہ ان کا اپنا ہی کوئی قصور کیوں نہ ہو۔

میں یہ سب دیکھتا اور مجھے بڑا اچھا لگتا، فخر محسوس کرتا کہ بھائی صاحب اتنے کم عمر ہونے کے باوجود بڑے بوڑھوں اور کافی بڑے بھائیوں اور چچاؤں تک میں سب کے چہیتے تھے اور سب ان سے کسی نہ کسی سبب کی وجہ سے جس میں ذہانت اور پڑھائی کا شوق مشترک ہوتا تھا بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی ہر بات مانی جاتی تھی۔ ہمارے رشتے کے چچاؤں میں چچا نصیر نہ صرف اپنے علاقہ

بات بلکہ اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے بھی اپنے گھرانے میں سب سے ممتاز تھے۔ وہ شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کے کتب خانے میں ہر قسم کی کتابیں بڑی افراط سے تھیں۔ ادب و شعر سے لے کر تاریخ و فلسفہ تک گاؤں کے کسی فرد کو بھی وہ اپنے کتب خانے کی ہوا تک نہ لگنے دیتے۔ بچوں کا تو خیر کیا ذکر، مگر بھائی صاحب کو یہ عام اجازت تھی کہ وہ جب بھی آئیں بیٹھک کھولیں اور جو کتاب چاہیں پڑھیں۔ ایک بار میں ساتھ تھا چچا نصیر کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر سے چچی نے بتایا کہ وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔ بھائی صاحب وہیں پھاٹک کے قریب انتظار کرنے لگے۔ (یہ گھر چونکہ پورے گاؤں میں بڑا اور ممتاز تھا اور اس میں بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے چنانچہ اس گھر کا نام ہی پھاٹک پڑ گیا تھا) چچا نصیر آئے تو بولے ارے سلیم! تم یہاں کھڑے ہو۔ بھائی صاحب نے کہا کہ آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھک بند تھی۔ چچا ہم کو ساتھ لے کر پہلے گھر میں آئے اور چچی سے خفگی سے کہنے لگے کہ سلیم کو چابیاں کیوں نہیں دیں اور پھر حکم دیا کہ سلیم جب بھی آئیں میں چاہے گھر میں ہوں یا نہ ہوں، ان کے لیے بیٹھک کھول دی جایا کرے ——— اسی طرح عترت چچا کے یہاں ان کے دونوں بڑے صاحبزادے جو بھائی صاحب سے ۱۰، ۱۲ سال بڑے تھے، بڑی شفقت کرتے۔ جو رسالہ یا کتاب لاتے بھائی صاحب کو دیتے اور بھائی صاحب سے بھی پوچھتے رہتے کہ بھائی صاحب نے کیا کیا پڑھا ہے۔ خصوصاً فرید بھائی، بھائی صاحب کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور رسالہ مولوی سے لے کر احادیث تک پر بھائی صاحب سے گفتگو کرتے۔

گھر میں بھائی صاحب تو زیادہ تر پڑھتے ہی رہتے تھے مگر جب انہوں نے میرے پڑھنے کا شوق دیکھا تو جو کتاب مزے کی پاتے یا ایسی جس میں مجھے دلچسپی ہو سکتی تھی تو مجھ سے کہتے کہ شمیم تم فلانی کتاب ضرور پڑھنا۔ انہوں نے عظیم بیگ چغتائی کی کتاب "قصرِ صحرا" مجھے اسی طرح پڑھوائی (کیسی دلچسپ کتاب تھی اور بچوں کے لیے تو ایسی پُرکشش کہ جو اسے پڑھتا پڑھتا ہی رہتا۔ خدا جانے ایسی کتابیں دوبارہ کیوں نہیں چھاپی جاتیں) اسی طرح انہوں نے مولوی خلیل الرحمان کی کتاب عذرا اور عذرا کی واپسی مجھے ہی کر پڑھوائی تھی۔ ایسا باکمال ترجمہ کہ جو اصل سے کہیں بڑھا ہوا ہے اور کہاں میسّر ہے ——— بھائی صاحب خاص طور پر ان دنوں میں جب گھر کے عزیزوں میں ان کے دوست زیادہ تر پڑھنے کی وجہ سے لکھنؤ گئے ہوئے ہوتے تو میرے ساتھ وہ طرح طرح کے کھیلوں میں لگے رہتے۔ کبھی اپنے باغ سے کیلے کا تنا لا کر تیر کمان سے اس کا نشانہ لیتے اور کوشش یہ کرتے کہ تیر تنے کو چیر کر دوسری طرف نکل جائے۔ ظاہر ہے اس کے لیے زیادہ

قوت کی ضرورت ہوتی تو جھنجھلا جھنجھلا کر تیر کے پھل کو الزام دیتے۔ "زنگ لگ گیا ہے" "نوک کند ہو گئی ہے" مگر دو سال بعد جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو بہت خوش ہوئے اور اپنے بازو اکڑا اکڑا کر اس کی مچھلی نکال کر مجھے دکھانے لیے دباتے اور کہتے دیکھا کتنی قوت ہے مجھ میں کبھی ابو جان کی تلوار نکال کر تلوار خود لے لیتے اور ڈھال مجھے دے دیتے اور تلوار زنی کی مشق شروع ہو جاتی۔ پھر مجھ سے کہتے کہ حملہ کرو۔ میں ڈھال لے کر خوب اچھل اچھل کر ان پر حملہ کرتا وہ میرا وار تلوار پر روکتے اور کبھی کبھی الٹی طرف سے میرے تلوار مار بھی دیتے۔ بڑی چوٹ لگتی میں خوب رونا اور آپا سے جا کر شکایت کرتا کہ دیکھئے بھائی صاحب اتنے بڑے ہو کر ڈھال مجھے دے دیتے ہیں اور خود تلوار سے مجھ پر حملہ کرتے ہیں۔ آپا ڈانتیں تو خوب ہنستے اور کہتے کہ اول تو تلوار اس سے سنبھلے گی نہیں پھر یہ اناڑی کی طرح تلوار میرے پیٹ میں گھونپ دے گا تو میں کیا کروں گا بھائی جان سے البتہ ان کا دم فنا ہوتا تھا۔ جب بھی میں کہتا کہ بھائی جان آ جائیں تو شکایت کروں گا تو میری خوشامد کرنے لگتے۔ "بیٹا میرا، شاما میرا، بھائی جان سے کچھ نہ کہنا۔ میں خود بھی بھائی جان سے ان کی شکایت کرتے ہوئے ڈرتا تھا کیونکہ میری زندگی میں بھائی صاحب کے جو واحد چانٹا پڑا تھا وہ بھائی جان نے ہی مارا تھا۔ بھائی جان گھر میں پکانے کے لیے مرغے لائے اور ذبح کرنے بیٹھے تو بھائی صاحب سے کہا کہ ان کی گردن پکڑو۔ بھائی صاحب نے گردن تو پکڑ لی مگر جب مرغے کی گردن کٹی تو چچ چچ چچ کر کے افسوس کرنے لگے۔ بھائی جان نے ایک زور کا چانٹا مارا اور کہا حرام زادے جب کھائے گا اس وقت چچ نہیں کرے گا۔ (حرام زادے بھائی جان کا تکیہ کلام تھا۔ جب بھی ذرا سا غصہ آتا فوراً منہ سے نکلتا "حرام زادے") بھائی جان کو فوراً احساس ہوا کہ چانٹا غلط مارا ہے تو مرغوں سے فراغت پانے کے بعد بھائی صاحب کو گود میں بٹھایا اور سمجھا کر کہنے لگے بیٹے اللہ نے یہ چیزیں انسانوں ہی کے لیے تو بنائی ہیں۔ نرم بند و تھوڑی ہو مسلمان ہو۔ مسلمانوں کو اتنا بزدل نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں ظلم بری چیز ہے۔ ہندو جانور پر تو رحم کرتے ہیں مگر اپنے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کی قربانی دینے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ اگر وہ اپنی صحیح غذا حاصل کرتے تو انسانوں پر ظلم نہ کرتے میں نے دیکھا کہ یہ سب سُن کر بھائی صاحب کی آنکھوں میں اک چمک سی آ گئی جیسے انہوں نے کوئی نئی بات دریافت کر لی ہو۔ اور ان کے چہرے سے چانٹے کا ملال دور ہو گیا۔ بھائی صاحب کی نرم دلی تو ہمارے گھرانے میں ایک انوکھی چیز سمجھی جاتی تھی۔ ایک بار کوئی زخمی گدھا جس

کے زخم بہت خراب ہو گئے تھے اور وہ دھوبی کے لیے ناکارہ ہو گیا تھا۔ دھتیا کے قریب مارا مارا پھر رہا تھا کوّے اس کے زخموں پر ٹھونگیں مار مار کر تازہ تازہ خون بہا رہے تھے۔ کتنے الگ سے اس کو گھیرا جا رہے تھے اور مکھیاں اس کی جان غنیق کیے دے رہی تھیں۔ گدھے کی بے بسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ بھائی صاحب نے کہیں سے آتے ہوئے گدھے کو جو دیکھا تو تڑپ گئے۔ کتّوں اور کوّوں کو مار کر بھگایا اور سیدھے گھر آئے بہت سی روٹیاں نکالیں ایک ڈبے میں پانی لیا اور رگڑ وا تیل۔ جا کر گدھے کے زخموں کو دھونا شروع کیا گدھے کو بھی جیسے چین سا میسر آ گیا اور بھائی صاحب نے اس کی ادھڑی ہوئی کھال پر تیل لگا کر دھتیا پر کپڑے دھوتے ہوئے دھوبیوں کو بڑی غیرت دلائی کہ تم کیسے آدمی ہو کہ تم نے ساری عمر گدھے سے خدمت لی اور جب وہ بوڑھا اور ناکارہ ہو گیا تو تم نے اسے کتّوں اور کوّوں کے سپرد کر دیا۔ بھائی صاحب کی یہ بات دھوبیوں نے جگہ جگہ پھیلا دی کہ شرافت میاں کے لڑکے نے اس طرح گدھے کے زخم دھوئے اور رحم سے یہ بات کی۔

اودھ کے پورے علاقے میں لکھنؤ کی شیعہ ریاست کے گہرے ثقافتی اور تہذیبی اثرات کی وجہ سے مسلمان عید بقرعید کے بعد محرّم بھی بڑے زور و شور سے مناتے تھے۔ اس زمانے میں چونکہ ہندو، ہولی، دیوالی اور دسہرہ اپنی قومی شناخت کے طور پر منانے لگے تھے۔ اس لیے مسلمان محرّم کے موقع پر اس کے جواب میں تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے۔ سات تاریخ سے نوحہ خوانوں کی پارٹیاں گاؤں کی گلیوں سے گزرنے لگتی تھی۔ اکھاڑے نکلتے تھے جس میں گاؤں کے مسلمان نوجوان گتکہ اور لاٹھی چلانے کا مظاہرہ کرتے۔ کھیولی میں شیعہ گھرانے چونکہ گنتی کے تھے اس لیے علم کے جلوس کم نکلتے تھے۔ محرّم کے اس موقع پر ہمارے ایک چچا جو گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے تعزیہ داری کی بھی ایک پارٹی بنائے ہوئے تھے ان کے مقابلے پر دور کے ایک اور عزیز زمیندار نے اپنی پارٹی قائم کر لی تھی۔ ان دونوں کی چشمک سے محرّم میں گاؤں میں بڑی رونق اور گہما گہمی ہو جاتی تھی۔ یہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش میں نئے سے نیا نوحہ لکھواتیں اور ان کی طرز ایجاد کرتیں۔ جس پارٹی کا نوحہ نیا ہوتا اور طرز انوکھی وہی پارٹی کامیاب سمجھی جاتی، چنانچہ زیادہ متموّل پارٹی نے ایک بار میدان جیتنے کے لیے دو مرزا اور شعر و ادب کے رسیا اعزہ کو لکھنؤ اس غرض سے بھیجا کہ کسی اچھے شاعر سے نیا نوحہ قیمتاً لکھوا کر لائیں اور اس کی طرز بھی بالکل انوکھی ہو۔ اس بات کا گاؤں میں بڑا چرچا تھا۔ نوحہ منگوانے والی پارٹی نے خوب زور و شور سے اس کی تیاری شروع کر دی اور انتہائی

رازداری میں کہ کہیں حریف پارٹی اس کا نیا نوحہ اور طرز نہ چرا لے۔ اس اہتمام کی وجہ سے دوسری پارٹی بھی چوکنا ہو گئی اور اس نے بھی بڑی محنت اور توجہ سے تیاری شروع کر دی لیکن ایک محرم میں عجیب واقعہ ہوا کہ اس سال ایک نئی پارٹی نوحہ خوانی کرنے میدان میں اتری۔ یہ منے چچا کی پارٹی تھی جس کے پاس نہ پیسہ تھا اور نہ بااثر اور پڑھے لکھے افراد۔ یہ نئی پارٹی زیادہ تر لڑکوں بالوں پر مشتمل تھی کھپولی کے چھوٹے سے بازار کے دونوں طرف چوڑی چوڑی مٹی اور اینٹوں کی سڑکوں پر گاؤں کی ہندو مسلم آبادی سات تاریخ کا جلوس دیکھنے اور نوحہ خوانی سننے کے لیے جمع تھی۔ سب سے پہلے میدان میں یہ نئی پارٹی اتری اس میں بھائی صاحب بھی تھے اس نے جو نوحہ پڑھا اور جس طرز میں پڑھا گاؤں والوں پر جیسے کسی نے جادو کر دیا۔ نوحہ بھی لاجواب اور طرز نوحہ خوانی بھی انوکھا۔ مگر ابھی اس نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ گاؤں کی سب سے مضبوط اور متمول نوحہ پارٹی کے چہرے اتر گئے۔ ایک بار تو ان میں کھلبلی سی مچ گئی اس کا علم سننے والوں کو تو نہیں ہوا اور اس پارٹی نے ایک پرانا نوحہ پڑھ دیا مگر اندرون خانہ ان پر قیامت بیت گئی۔ بات یہ تھی کہ گاؤں کی یہ نوجوان نوحہ پارٹی وہی نوحہ اسی طرز میں پڑھ رہی تھی جس کو راز رکھنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ہو نہ ہو یہ شاعر صاحب کی کارستانی ہے جنہوں نے نئی پارٹی کو کسی اور جگہ کا سمجھ کر دوبارہ اسی نوحے کے پیسے کھرے کر لیے۔ چنانچہ نوحہ لانے والے حضرات لکھنؤ کے ان شاعر صاحب کے پاس بہت غصے میں پہنچے اور خوب لڑائی جھگڑا کیا۔ وہ شاعر بیچارہ قسمیں ہی کھاتا رہ گیا کہ نہیں بھائی تم مجھ پر غلط الزام لگا رہے ہو۔ اگلے سال محرم میں ان حضرات نے زیادہ اعتماد کے شاعر سے نوحہ لکھوایا اس کی تیاری میں پہلے سے بھی زیادہ رازداری برتی گئی مگر دوسرے سال بھی یہی ہوا۔ تب وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد ایک عزیز نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ ہمارے یہاں باہر سے آنے والا کوئی فرد نہیں ہوتا البتہ کبھی کبھی سلیم آ جاتے ہیں مگر بڑے بوڑھے یہ تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے کہ ایک بارہ سال کا لڑکا جو تیسرے چوتھے دن اپنے ایک دوست کو بلانے آ جاتا ہے اس کا حافظہ اتنا اچھا ہو سکتا ہے اور اس کی ادبی صلاحیت اتنی غیر معمولی کہ جو نوحہ وہ ایک بار سن لیتا ہے اسے جا کر لفظ بہ لفظ کاغذ پر اتار لیتا ہے اور پھر پارٹی کو یاد کرا دیتا ہے۔ چنانچہ تیسرے سال بھائی صاحب پر خفیہ خفیہ نظر رکھی گئی اور ایک اجنبی لڑکے کو بھائی صاحب کے پیچھے لگا دیا گیا کہ وہ سلیم کا پیچھا کر کے دیکھے کہ وہ کہاں جاتے ہیں اور پھر آ کر

پوری روداد سنائے، ادھر سلیم سے اپنی خود اعتمادی میں ذرا سی غلطی ہوگئی کہ وہ بجائے اپنے گھر جانے کے سیدھے ہمارے یہاں پہنچے۔ لڑکا ان کا پیچھا کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور دروازے سے لگ کر اس نے سن لیا کہ اندر خوب ہوحق مچی ہوئی ہے قہقہے لگ رہے ہیں اور سلیم کہہ رہے ہیں جلدی قلم لاؤ ورنہ سارا نوحہ ذہن سے نکل جائے گا — ہوا یہی تھا کہ بھائی صاحب نے اس پارٹی سے تفریح لینے کے لیے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اگر وہ بار بار گئے تو شبہ ان پر ہی ہوگا رنوحہ کی تیاری تو ۱۰۔۱۵ روز لینی تھی لہٰذا وہ کسی ایک روز بھی اپنے دوست سے ملنے وہاں چلے جاتے تھے جو اس پارٹی کا سرگرم رکن تھا اور وہاں کھڑے ہوکر نوحہ یاد کر لیتے تھے۔ ان کی کم عمری کی بدولت کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ حضرت اپنے حافظے کا کیا استعمال کر رہے ہیں اور پھر گھر آکر وہ نوحہ کاغذ پر اتار لیتے تھے بھائی صاحب کو بچپن ہی نوحے نوحے مرثیوں کے بند کے بند یاد تھے اور اکثر لوگ ان سے فرمائش کر کے سنتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کے دل پر یہ مرثیے جو سب سے بڑا اثر کرتے تھے وہ اہل بیعت کے آپس میں محبتوں کے رشتے تھے۔ سب سے زیادہ بھائی کی بھائی سے محبت کا ہم پر اتنا گہرا اثر ہوتا تھا کہ جب یہ بند پڑھے جاتے تھے تو ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ مجھے بھی بھائی صاحب کے ساتھ کئی نوحے اور مرثیے بچپن ہی یاد ہو گئے تھے۔ ہمارے ننھیالی عزیزوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم اپنی خالہ کے پاس پلکھوے پہلی بار گئے تو وہ محرم کا زمانہ تھا، لہٰذا وہاں کچھ عزیزوں نے نوحوں اور مرثیوں کی فرمائش کی اور ہم دونوں نے جو مرثیہ ماتم کے ساتھ سنایا اسکے کہیں کہیں سے کسی بند کے دو ذہن لوٹے پھوٹے مصرعے مجھے آج بھی یاد ہیں۔

(دریا پہ وہ جب) .... شیر سا پہنچا جری
شانے پہ تھی مشکِ سکینہ دھری
لشکرِ رہ رباہ میں پڑی تھر تھری
پانی پہ دل تڑپا دل افگار کا

مومنو ماتم کرو شہ کے علمدار کا
حضرت عباس کا

اس بند کے ٹیپ کے مصرعوں پر ہم نے اس زور سے ماتم کیا کہ ہمارے سینے سرخ ہو گئے، اور سوج گئے۔ پھر رات کو ہماری خالہ (امی) نے سینے کی سکائی کرتے ہوئے کہ ماتم کرنا سخت

گناہ ہے۔ اس کے بعد پھر ہم نے کبھی ماتم نہیں کیا۔ اسی طرح ایک نوحے کے چند مکمل اور نامکمل مصرعے آج بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔

.... گل ریحاں حسین ہے
زانو نبی کا رحل ہے قرآں حسین ہے

غل پڑ گیا دیکھو شہ والا کے پسر کو
خورشید نے ہاتھوں پہ اٹھایا ہے قمر کو

○

گھیولی کا برسات کا زمانہ ہم بچوں کے لیے بڑے امتحان اور خوف کا زمانہ ہوتا تھا۔ اس دھڑاکے سے بارشیں ہوتیں کہ زمین اور آسمان دھواں دار ہو جاتے۔ چار چار پانچ پانچ روز مسلسل بارشیں ہونا ایک معمولی سی بات تھی۔ ہفتوں گھنا آسمان پہ تلی کھڑی رہتی۔ سورج کا نکلنا محال ہو جاتا۔ آیا تو گویا ہم لوگوں کو گھر میں مقید کر دیتی تھیں۔ اس عالم میں کچے مکانوں کے گرنے اور پختہ مکانوں کے ٹپکنے کی خبروں سے ہم لوگ سہم جاتے۔ بھائی جان راتوں کو لالٹین لے کر چھتوں کو دیکھتے بھاگتے پھرتے۔ بھائی صاحب بھی ابتدائی رات میں ان کے ساتھ ہوتے۔ مٹی ڈالتے، کہیں پانی جمع ہو جاتا تو اسے ہاتھوں سے اچھلتے۔ زیادہ پانی ہوتا تو کسی برتن سے نکالتے اور کبھی ایک نالی سی بنا کر اس کی نکاسی کا انتظام کرتے۔ اس زمانے میں چوروں کی بن آتی جتنی چوریاں اور ڈاکے اس زمانے میں مارے جاتے تھے پورے سال میں اس کے نصف بھی نہ مارے جاتے۔ خصوصاً اندھیری راتوں میں تو ہر گھر میں جاگ ہوتی۔ ذرا بھی کوئی آواز کسی چیز کے گرنے یا کودنے کی آتی، فوراً لوگ چوکنا ہو جاتے۔ اسی خطرے کی وجہ سے گھروں پر پہرے دار مقرر کیے جاتے۔ ہمارے یہاں بھی ایک پاسی، سیتا رام چوکیداری کرتا تھا۔ وہ کافی بوڑھا تھا اور ابو جان کے زمانے سے چلا آ رہا تھا وہ رات بھر حقہ پیتا رہتا یا کھانستا رہتا۔ ایک بار ہمارے سب سے چھوٹے تائے سید رفاقت علی جن کو ہم میاں چھوا کہتے تھے، کے صاحبزادے رضی بھائی تعطیلات میں گھیولی آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑے زندہ دل تھے۔ بعض چھوٹی چھوٹی حرکتیں کر کے ہم چھوٹوں کو ہنسائے رکھتے تھے۔ بھائی صاحب ان کی آمد سے بڑے خوش ہوتے تھے۔ "اگرگیں" ہو تھے۔ وہ کچھ تک بندی کر کر کے مشق سخن کرتے تھے اور رات کو دھپکے کنارے اپنے تو تصنیف اشعار ترنم سے سنایا کرتے۔ ترنم

بھی گیا نھا بکری کی آواز سے ملتی جلتی ایک باریک منمناہٹ تھی۔ ان کی دو تین چیزیں مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اس شعر کو وہ قوالی کی طرز میں سنانے تھے۔

سنیچر جب گزر جاتا ہے تو اتوار آتا ہے

تری ٹم ٹم کے پیچھے میرا موٹر کار آتا ہے

ہو تری ٹم ٹم کے پیچھے، ہو تری ٹم ٹم کے پیچھے

اور کبھی کبھی زنخوں کے انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر تان مارتے

آگ لائیوں، پات لائیوں، لائیوں کنکوا

کوٹھے پہ جو اڑانے گیئوں تو ناک سے گیا کوا

اے بوا نکوڑا گئیں

اے واہ واہ، اے برا نکوڑا گئیں

روز صبح ہر ایک سے ہاتھ ملا کر کہتے "گڈ کی مبینی" یہ گڈ مارننگ کی خرابی تھی۔ وہ ایک چیز بڑے مزے کی کرتے تھے جس پر ہم لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے تھے۔ جب بھی ان کے دوستوں میں سے کسی سے جھگڑا ہوتا اور فریق مخالف بہت زور زور سے بڑ اچھلا کہنے لگتا تھا یا مخالفوں میں کوئی بڑی ڈون کی لیتا تو وہ ذرا ہٹ کر اور منہ پھیر کر کہتے، ہیوؤں۔ ہیوؤں۔ بندھی رہ بندھی رہ، کھونٹے سے بندھی رہ (پھر منہ سے ایسے پچکارتے جیسے گھوڑی کو پچکارتے ہیں پچ پچ) رسّی سے بندھی رہ، ہیوؤں ہیوؤں! اور ہم لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا۔ ان سے ہمیں بہت محبت تھی اور وہ بھی ہم پہ جان چھڑکتے تھے۔ آج کل وہ اللہ انہیں اچھا رکھے۔ بارہ بنکی کے ایک قصبے میں میڈیکل آفیسر ہیں یہی رضی بھائی گھیولی آئے ہوئے تھے انھوں نے بھائی صاحب سے کہا یہ سیتا رام کو تم نے کیا چوکیداری پر رکھا ہے؟ ایک تو وہ ویسے ہی بوڑھا ہے پھر رات کو سو جاتا ہوگا۔ بھائی صاحب نے کہا نہیں بڑا وفادار ہے۔ بوڑھا ہے تو کیا ہے۔ رات بھر کھانستا ہے جاگ تو رہتی ہے۔ مگر رضی بھائی نہیں مانے۔ سیتا رام کی آزمائش کرنے کے لیے ایک رات کو دو تین بجے جا کر اس کی لاٹھی اٹھانے کے لیے جیسے ہی لاٹھی پر ہاتھ رکھا سیتا رام نے لاٹھی کو زور سے پکڑ کر کہا "بس بھیا! ہم کا ایسا غافل سمجھت ہو؟ کوئی اور سسر ہوئے تو سر پھاڑ دیت" اس کے بعد رضی بھائی اس کے بڑے قائل ہو گئے تھے۔

اسی زمانے میں اتفاق سے اپّی یعنی بھائی جان کی بہن اور بچے بھی آگئے تھے اور بھی

رونق ہوگئی تھی۔ ان کے دو بڑے لڑکے بھائی صاحب کے ہم عمر تھے۔ بڑے کا نام وقار احمد تھا مگر گھر میں ان لاڈ سے "پیارے" کہا جاتا تھا۔ دوسرے کا نام مقصود تھا۔ پیارے بھائی پیدائشی طور پر بہت کمزور تھے۔ یہ سب جمع ہوئے تو ان سب لوگوں نے ایک اودھم جوت دیا۔ دنیا بھر کے کھیل شرارتیں ہر قسم کا چھوٹا موٹا شکار، پیڑوں پر چڑھائی، پھلوں اور املی کی ترنگیں مچ جاتی۔ پیارے بھائی ان کھیلوں میں زیادہ حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا مشغلہ زیادہ تر جانور پالنا ہوتا تھا۔ اتفاق سے ان کو ایک اہیر کی کتیا کا ایک پلّا بہت پسند آیا۔ ذرا ہاتھ بھر کا چوکس تھا۔ یہ ہر وقت اس کے گلے میں ڈوری باندھے اس کو ساتھ رکھتے جو کچھ خود کھاتے اسے بھی کھلاتے۔ اس کا ٹہلانا، نہلانا سب خود کرتے اور رات کو اپنے پلنگ کے پائے سے باندھ کر رکھتے تھے۔ غالباً یہ حفاظت سے زیادہ محبت کا اظہار تھا۔ ایک دن بھائی صاحب کی جو صبح آنکھ کھلی تو کیا دیکھا کہ پلّا بھی محبت کے جوش میں آ گیا ہے اور وہ سوتے ہوئے پیارے بھائی کا منہ چاٹ رہا ہے۔ بھائی صاحب نے ایک نعرہ مار کر کتے کو تو بھگا دیا اور مزید نعرے مار کر ہم سب کو بھی جگا دیا اور خوب ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنایا۔ اور پھر کیا تھا، پیارے بھائی کا سب نے مذاق اڑا اڑا کر بالکل اُلّو بنا دیا۔ حد یہ کہ بھائی صاحب نے ان کا نام بدل کر پیارے کی جگہ پلّو رکھ دیا۔ بیچارے پیارے بھائی کو پلّے کی محبت کی وجہ سے اتنی خفّت اٹھانی پڑی تو اسی وقت ساری محبت نفرت میں بدل گئی۔ انہوں نے پلّے کو خوب مارا اور نکال باہر کیا۔ وہ غریب اپنی محبت کے جواب میں یہ سلوک دیکھ کر سہم گیا اور کئی دن تک بھاگ بھاگ کر ان کے پاس آتا رہا۔ بالآخر پیارے بھائی اس کو ڈلے مار مار کر گاؤں کے باہر کھدیڑ آئے۔

تو میں برسات کے زمانے کی بات کر رہا تھا کہ مارے ڈر کے ہم کو رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ طرح طرح کے چوروں اور ڈاکوؤں کے جو واقعات ہم سنتے تھے وہ یاد آتے تو اور بھی دل دھڑکنے لگتا۔ سب سے زیادہ دھتّیا کے لبالب پانی کی لہروں اور اس سے آنے والی طرح طرح کے جانوروں کی آوازیں دہلائے رکھتی تھیں۔ اسی زمانے میں بعض شریر قسم کے لوگ ہمارے گھر میں ڈلے، پتھر اور بعض اوقات گندگی تک پھینکتے تھے۔ ہماری سنجھلی پھپی تو یہ کہتی تھیں کہ یہ چور لوگ ہیں جو یہ دیکھنے کے لیے یہ چیزیں پھینکتے ہیں کہ گھر میں کوئی ہے یا نہیں۔ یا گھر والے کتنی گہری نیند سو رہے ہیں۔ مگر بھائی جان ہمارے عزیزوں میں سے ایک کا نام لیتے کہ یہ ساری کارروائی اس کی ہے اور وہ انتقاماً ایسا کرتا ہے۔ ہماری آپا جب بھی کوئی چیز گرتی تو مارے تجسس کے جاگ کر اسے اٹھا

یقین اور سب کو دکھاتیں اور بتاتیں کہ یہ کیلے ہیں۔ ایک بار اوپر سے دو سکوریاں بندھی ہوئی آگریں۔ آپا نے فوراً اٹھالیں تو ان کا ہاتھ سن ہو گیا۔ پھر تو ان کو اتنی قے آئی کہ طبیعت خراب ہو گئی۔ اور آئندہ سے انھوں نے کسی گرنے والی چیز کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔ البتہ بھائی جان جب بھی کوئی چیز گرتی۔ آپا سے مذاق میں کہتے کہ بجی دیکھئے آپ کیلئے اس نے (ان عزیز کا نام لے کر) کیا تحفہ بھیجا ہے بھائی جان دراصل اس گھرانے سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے مگر آپا ہر ایک سے تعلقات بڑھا کر خوش ہوتی تھیں۔

اسی برسات کی ابتدا تھی کہ بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ چلو شمیم مچھلیاں پکڑتے ہیں میں فوراً ان کے ساتھ ہو لیا۔ دھیا کے دریا نے والے راستے کے اوپر والے حصّہ پر کچھ دور آموں کے کچھ پیڑ تھے جو ہمارے چچا عزت علی کی ملکیت تھے۔ بھائی صاحب وہاں بیٹھ کر کھرپے سے زمین کھودنے لگے۔ میرے ہاتھ میں ٹین کا ایک ڈبہ تھا جیسے ہی کوئی کینچوا نکلتا وہ اسے اٹھا کر فوراً ڈبے میں ڈال دیتے اس کام میں دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ زمین پر کھرپا پڑتے ہی ایک لمبا سا کوئی ڈیڑھ بالشت کا کینچوا بڑی تیزی سے نکلا، اس کی جلد بڑی چمکدار تھی۔ وہ بھائی صاحب کے ہاتھ سے پھسل گیا اور بڑی تیزی سے لہرا کر چلنے لگا۔ بھائی صاحب نے پھر اسے جھٹ سے پکڑ لیا۔ اس نے فوراً پلٹ کر کاٹا اور غائب ہو گیا۔ بھائی صاحب نے بے اختیار مجھ سے کہا شمیم یہ سنپولیا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی صاحب ہاں تھا بڑا چمکدار اور کتھئی۔ کہیں لوہاری نہ ہو یہاں سے۔ یہ کہہ کر جلدی سے گھر آئے خود تیر کی طرح گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ ساتھ دوسرا سب سے بڑا خوف جس کا ہمیں آنکھ کھولتے ہی سامنا کرنا پڑتا تھا وہ سانپوں کا تھا جس کے لیے ہمارا علاقہ بہت مشہور تھا اور سانپوں کی کثرت اور اس کی طرح طرح کی اقسام میں سب سے خطرناک ناگ کو یہاں لوہاری کہا جاتا تھا۔ غالباً اس کے پیچھے اس مثل کا کوئی تصور ضرور موجود تھا۔ "سو سنار کی ایک لوہار کی"۔ کیونکہ لوہاری کا کاٹا پانی نہیں مانگتا تھا۔ "فاناً" میں ناک کان، منہ سے خون جاری ہو جاتا تھا اور دیکھتے دیکھتے آدمی مر جاتا تھا ——— جس قدر سانپوں کی کثرت اور خطرناکی یہاں موجود تھی اتنی ہی شہرت یہاں کے سانپوں کا زہر جھاڑنے والوں کی بھی تھی۔ اس کا ایک پورا انتظام ہمارے یہاں موجود تھا۔ سانپوں کو زہر کے اعتبار سے تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر زہر کے جھاڑنے والے الگ الگ ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ زہریلا سانپ لوہاری تھا جس کے بارے میں کہا جاتا کہ اس کا پرانا ناگ جب زمین پر چلتا ہے تو اس کی پھنکار

ہیں زہر کی وجہ سے زمین بھی کالی ہو تی جاتی ہے چنانچہ اس کے جھاڑنے والے بھی اتنے ہی زبردست ہوتے ہیں۔ تمام زہر کی جھاڑ سیکھنے والوں سے ان کا استاد یا گرو یہ عہد لیتا تھا کہ جیسے ہی اُن کے کان میں آواز پڑے کہ کسی کو سانپ نے کاٹ لیا ہے، وہ کھڑا ہو یا بیٹھا، لیٹا ہو یا کسی کام میں مصروف اس کے لیے لازم ہے کہ وہ گھر سے نکل کر آواز کی سمت چل پڑے۔ پہنچے نہ پہنچے یہ مارگزیدہ کی قسمت مگر اس کی نیت جائے وقوع پر جلد از جلد پہنچنے کی ہونی چاہیے۔ اس عہد کے عوض اس کی جان معاوضہ تھی۔ یعنی اگر کسی نے جان بوجھ کر اس عہد کو توڑا تو اسی رات ناگ اس کو ڈس لے گا اور اس سلسلے کی تمام روایات اس بات کی تصدیق کرتی تھیں کہ جب بھی کسی نے بدعہدی کی اس کی موت ناگ کے کاٹنے سے ہوئی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ہمارے ہوش میں کھیولی میں ہو چکا تھا۔ اہیر ٹولے کا ایک نوجوان جو دھیا کے بیرونی کنارے یعنی ہمارے بالمقابل دوسری سمت آباد تھا۔ سانپ کے کاٹے کا منتر جانتا تھا۔ اس بیچارے کی شادی ہوئی تھی یہ اتفاق تھا کہ اسی روز قریب کے گاؤں میں سانپ کے کاٹے کی واردات ہوئی۔ جس کی آواز اس نے بھی سنی اس کے پڑوس سے ایک اور سانپ کا منتر جاننے والا اسی وقت آواز کی سمت روانہ ہو گیا۔ یہ بیچارہ دولہا بنا ہوا تھا اس نے سوچا کہ پڑوسی تو چلا ہی گیا ہے۔ میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا اور ساتھ ساتھ شادی کا جواز بھی تھا۔ بیچارہ رات کو بیوی کے ساتھ ساتھ سویا تو صبح اٹھ نہ پایا۔ رات کو سانپ کچے کمرے کی چھت کی کڑیوں سے اس پر ٹپکا۔ صبح دلہن نے دیکھا کہ دولہا زہر سے نیلا پڑا ہوا تھا۔ کئی جگہ سانپ کے کاٹنے کے نشان تھے۔ جب بستر جھاڑا گیا تو گدے کے اندر کوڑیالا موجود تھا۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی بیوی جو صبح ہونے سے ایک گھنٹے قبل تک اسی پلنگ پر لیٹی سو رہی تھی۔ اس کو سانپ سے کوئی ضرر نہ پہنچا اسی لیے سانپ کے منتر سیکھنے کا رواج عام نہ تھا۔ لوگ اس عہد کی پابندی کی وجہ سے گھبراتے تھے مگر ہر گاؤں میں ایک آدھ کسی نہ کسی درجے کا منتری ضرور موجود تھا۔ ہمارے علاقے میں زیادہ تر منتری ہندو تھے۔

اسی نظام کا سب سے اہم رکن یہ تھا کہ اگر ذرا بھی کسی کو سانپ کاٹ لے تو اُسے چاہیے تو فوراً ہی آواز لگا دے کہ اُسے سانپ نے کاٹا ہے اور پھر انسانیت کا ہر آدمی پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جو اس آواز کو سُنے خود بھی زور سے آواز لگا دے۔ اس نظام کی وجہ سے ہمیشہ اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ۲۵ میل کے مربع علاقے کا ہر منتر جاننے والا تیز رفتار سواریاں

نہ ہونے کے باوجود آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے تک کی مدّت میں جائے وقوع پر پہنچ جاتا تھا۔ اور پھر یہ فیصلہ کیا جاتا کہ اسے کس سانپ نے کاٹا ہے اور اسی درجے کا جھاڑنے والا اپنا کام شروع کر دیتا۔

میں بھائی صاحب کو گھر آنے کی تاکید کر کے بھاگتا ہوا گھر پہنچا اور آپا کو بتایا کہ بھائی صاحب کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ آپا کو ایک سکتہ سا ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر تفصیل بتانا شروع کر دی۔ جب انہیں یہ پتا چلا کہ سنپولیا تھا تو وہ ذرا سنبھلیں اور بھائی صاحب کو پوچھتی ہوئی کہ وہ کہاں ہیں باہر کے دروازے پر آئیں۔ ابھی اگر کھڑی بھی نہ ہوئی تھیں کہ بھائی صاحب آ گئے۔ بھائی صاحب نے ذرا بے پرواہی سے بتایا کہ ایک ڈیڑھ بالشت کے گہرے کتھئی رنگ کے باریک سے سنپولیے نے کاٹ لیا ہے۔ آپا نے جلدی سے کڑوا تیل لا کر چھنگلیا کے اس حصے پر جس پر سانپ نے کاٹا تھا مل دیا (گاؤں کے اجتماعی تجربے کے مطابق یہ ایک بدیہی بات تھی کہ اگر سانپ زہریلا ہو گا تو سرسوں کا تیل لگانے کی وجہ سے وہ جگہ کالی ہو جائے گی) آپا اور میں نے دیکھا کہ چھنگلیا کا وہ حصہ کالا پڑ گیا ہے۔ ہم لوگوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ مارے رنج اور سانپ کے کاٹنے کی دہشت کی وجہ سے عجیب حالت ہو گئی۔ آپا کو یہاں کی روایات کا زیادہ علم بھی نہ تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے عزت چچا کے یہاں بھیجا کہ وہ گھر میں ہوں تو انہیں بھائی صاحب کا بتا کر بلا لاؤں۔ کیونکہ اس وقت گھر میں آپا، بھائی صاحب اور میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بھائی جان بھی لکھنؤ گئے ہوئے تھے اور اسی روز آنے والے تھے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ کس وقت آئیں گے۔

عزت چچا کو ہمارے پورے علاقے میں سانپوں کے سلسلے میں ایک خاص شہرت حاصل تھی اور کھیولی میں اس کے علاوہ ان سے ایک اور وجہ بھی منسوب کی جاتی تھی۔ شہرت تو اس بناء پر تھی کہ وہ سانپ کو لاٹھی یا لکڑی سے مارنے میں کمال رکھتے تھے کیسا ہی سانپ کیوں نہ ہو اور کیسے ہی بے ڈھب مقام پر کیوں نہ ہو ان کی ضرب سے فوراً مر جاتا تھا تعریف ان کی یہ تھی کہ ایک ضرب کے بعد انہیں کبھی دوسری ضرب مارنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی لیکن صفت ان میں اور بھی تھی کہ اگر آپ کو اس محاورے کو مجسّم دیکھنا ہو کہ سانپ مرے اور اور لاٹھی نہ ٹوٹے تو عشرت چچا کو سانپ مارتے ہوئے دیکھ لیجئے۔ سانپ کیسے ہی نازک مقام پر کیوں نہ ہو اس کو اس طرح مارنا کہ ذرہ برابر نقصان ہوئے بغیر وہ ختم ہو جائے یہی ان کے

فن کا کمال تھا اور اسی لیے انہیں پورے علاقے میں سانپ مارنے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ کھیولی میں اور خصوصیت سے ہمارے گھرانے میں ان کے گھر کو ایک اور وجہ سے بڑی اہمیت حاصل تھی خصوصاً ہم بچوں کا نوان کے گھر جا کر سانس اندر کا اندر رکا رہتا تھا کہا یہ جاتا تھا کہ کھیولی میں تو باری سانپوں کی سب سے بڑی بھٹ جس جگہ تھی اُسی پر عترت چچا کا مکان بنا ہوا تھا۔ بھٹ اس مقام کو کہتے ہیں جو سانپوں کی آماجگاہ ہوتی ہے۔ پالتوں کی بھی بھٹ ہوتی تھی ۔ چنانچہ ان کے مکان کا ایک کمرہ جو سب سے بڑا تھا وہ ہمیشہ بند رہتا تھا اور اس کے دروازے میں بڑا سا ایک تالا لگا رہتا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اس کمرے میں بھٹ کا منہ کھلتا تھا۔ ہم جب ذرا بڑے ہوئے تو انتہائی اشتیاق اور خوف کے عالم میں اس کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو جاتے تھے اندر سے سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں سن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور ہمارے یہاں جب بھی کوئی مہمان آتا تو ہم اس کو اس کمرے تک اس طرح لے جاتے جیسے وہاں ہماری سرزمین کا انمول خزانہ دفن ہو۔ ہم دروازوں کی درزوں میں سے جھانکنے کی لاکھ کوشش کرتے مگر کچھ نظر نہ آتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تو کھیولی میں ہر ایک کو معلوم تھا کہ ایک بار کوئی سانپ اس بند کمرے کے دروازے کی چول سے اندرونی صحن میں آ گیا (اس وقت تک دروازے کی چولوں پر مٹی کا لیپ نہیں ہوا تھا لیپ اسی واقعے کے بعد کیا گیا تھا) جہاں عترت چچا کے سب سے چھوٹے صاحبزادے معید بھائی جو اس وقت غالباً ڈیڑھ دو سال کے سال فرش پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ چچی باورچی خانہ میں تھیں۔ سانپ نکل کر سیدھا معید بھائی کی طرف آیا اور یہ اسے کھلونا سمجھ کر پکڑ پکڑ کر کھینچنے لگے کبھی وہ ان کی بغل سے نکل جاتا کبھی گردن سے ہو کر دوسری طرف چلا جاتا۔ اس کھیل میں معید بھائی کو اتنا مزا آیا کہ وہ کلکاری مار کر ہنسنے بھی جاتے تھے۔ چچی نے جو ان کو اتنا ہنستے سنا تو وہ باورچی خانہ سے باہر نکل کر آئیں کہ معید خلاف معمول اتنا بے اختیار ہو کر کیوں ہنس رہا ہے۔ باہر جو آئیں تو بیٹے پر نظر پڑی تو برف ہو گئیں جیسے زمین نے قدم پکڑ لیے ہوں ۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ ذرا ہوش آیا تو دیوانوں کی طرح باہر بھاگیں اور شوہر کو بلا لائیں ذرا دیکھو تو کیا ہو رہا ہے ۔ ایک بار تو عترت چچا بھی یہ منظر دیکھ کر سن ہو گئے۔ مگر لاٹھی اٹھالی۔ اب سوال یہ تھا کہ بچہ اتنا معصوم کہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ سانپ اس کے چاروں طرف گھوم رہا ہے اوپر سے گزر رہا ہے لاٹھی کیسے چلے کہ بچہ تو بچے ہی نیچے مگر سانپ ایک ہی ضرب میں مارا جائے ورنہ بچے کی خیر نہیں۔ ایک ہی ترکیب سمجھ میں آئی بیوی سے کہا کہ ایک دوسری لکڑی اٹھا کر سانپ کے قریب ڈالو انہوں نے جو لکڑی

سامنے ڈالی سانپ بے اختیار ہو کر اس کی طرف آیا اور اسی وقت چچا کا بے مثال ہاتھ چلا اور
سانپ مردہ ہو کر سامنے کے کمرے میں جا پڑا۔ شاید ابتدا ہی میں سانپوں کے ہجٹ سے باہر نکل
کر آنے اور ان کو لاٹھی سے ٹھکانے لگانے کے ان ہی تجربات نے عزت چچا کو وہ مشق بہم پہنچائی
تھی کہ ان کا لاٹھی چلانا اور اس کا ہدف پورا ہونا لازم و ملزوم بات تھی۔

کمال یہ تھا کہ ہمارا گھر پشت سے ان کے گھر سے ملا ہوا تھا اور ایک ہی قطعہ زمین پر تھا
مگر ایک آدھ فٹ کے فرق سے ہجٹ کا منہ اور سانپوں کی آماجگاہ جو اندر تھی عزت چچا کے گھر
کی طرف چلی گئی تھی اور ہمارا گھر محفوظ رہ گیا تھا۔ مگر کبھی کبھی ہمارے بغلی کمروں میں سے بھی کوئی لوباری
نسل کا سانپ نکل آتا تھا۔ میرے ہوش میں دونوں بغلی کمروں سے نکلنے والا ایک ایک سانپ مارا
گیا تھا۔ الٹے ہاتھ والا کمرہ زیادہ خطرناک تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے
اس میں کچھ ہے۔ کبھی کبھی پھنکارنے اور سرسراہٹ کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ لہٰذا ہم اس میں بہت
کم جاتے تھے۔ آپا نے بتایا تھا کہ نذر کی پیدائش کے بعد (غفار بھائی صاحب سے چھوٹی اور مجھ سے بڑی تھیں جو کم عمری میں فوت
ہو گئیں) ہمارے یہاں بہت ہی عجیب واقعہ ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ گھر کے صحن میں پانی کے دو بڑے بڑے گھڑے ڈھکے
گھڑونچی پر رکھے رہتے تھے۔ ابو آئے تو مولسری کے دو مالے لیتے آئے جن میں سے بڑی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی —
آپا نے یہ ہار رات کو گھڑوں کے گلے میں ڈال دیے۔ اگلی صبح جب آپا کی آنکھ فجر کے وقت کھلی اور
وہ صحن کی طرف گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ایک مٹکے کے گلے کے چاروں طرف سانپ لپٹا ہوا تھا
وہ زور سے چیخیں۔ ہائے سانپ۔ ہائے ناگ۔ ابو جان بھاگ کر آئے۔ ادھر سے ہماری چچا زاد بہنیں
آ گئیں۔ ابو جان اپنی بارہ بور کی بندوق نکال کر لائے مگر وہ اسے دور ہی دور سے نچا رہے
تھے۔ فائر نہیں کرتے تھے۔ آپا نے جب غصے سے کہا آپ سانپ کو مارتے کیوں نہیں۔ کہنے لگے
کہ سنا ہے کہ اگر سانپ دو حصوں میں تقسیم ہو جائے تو اس کا پھن والا حصہ اچھلتا ہے اور
وہ مارنے والے کو خود مرتے مرتے بھی ساتھ لے مرتا ہے۔ یہ شور شرابا جب ہمارے گھر کی پشت
پر عزت چچا تک پہنچا تو وہ لاٹھی لے کر آ گئے (سب ہمارے ابو جان کو چھوٹے میاں کہتے
تھے) اور بولے بس چھوٹے میاں تم ہٹاؤ یہ اپنی بندوق ونددق اور دیکھو ہمارا وار۔ ہاتھ والوں
کو انہوں نے اپنی سمت اکٹھا کر لیا اور لاٹھی سے سانپ کے پھن کو چھوا۔ اس نے جیسے ہی بدن سکیڑ
کر اپنا پھن لہرایا اسی وقت ضرب پڑی۔ عجیب ضرب ہوتی تھی کہ مٹکا اسی طرح ثابت و سالم
رہا۔ سانپ کے بل ڈھیلے پڑنے لگے اور دو تین منٹ میں اس کا بے جان جسم زمین پر گر پڑا۔

اسی طرح ہمارے ایک اور چچا ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ آپا نے ان کا بھی ایک مزیدار قصہ سنایا۔ اچھو چچا۔ ایک دوپہر انہوں نے دیکھا کہ وہ جس کمرے میں لیٹے ہیں اس کے دروازے کی چول سے ایک لوہاری کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچھو چچا نے مارے خوف اور اضطراب کے کمرے میں موجود گپتی نکال کر اس کی کمر کو نوچ لیا (گپتی ایک نوک دھار ہتھیار ہوتا ہے) مگر ایک تو انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ سانپ کتنا بڑا ہے۔ دوسرے اس کے بیچ میں گپتی گھونپی تھی۔ سانپ اتفاق سے کافی لمبا تھا اس کا تقریباً ڈیڑھ فٹ اگلا حصہ دروازے سے باہر آچکا تھا۔ اور کوئی چار پانچ فٹ اندر تھا۔ ایک تو لمبے سانپ کی طاقت پھر اس کی چکناہٹ اور دونوں طرف سے سانپ پوری قوت سے مروڑ کھا رہا تھا چونکہ زیادہ تر وہ اندر کی طرف تھا اس لیے بار بار اندر کی طرف سرکتا تھا اچھو چچا کو اب اپنی غلطی کا اندازہ ہوا۔ ایک تو انہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی لمحے بھی سانپ گپتی کے نیچے سے نکل جائے گا وہ اسے زیادہ دیر تک نہیں روک سکتے، دوسری طرف انہیں یہ خوف تھا کہ وہ نکلا تو اندر کی طرف آئے گا جہاں وہ کمرے میں اکیلے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ زخمی سانپ کتنی خوفناک چیز ہوتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے سانپ کو گپتی کے نیچے لیتے ہی "سانپ ہے" "سانپ ہے" کی آوازیں لگانا شروع کر دیں تھیں۔ ہمارے ابو جان نے سب سے پہلے ان کی آواز سنی انہوں نے ایک آواز صحن سے عزت چچا کو دی کہ اچھو بھائی کے یہاں آجائیں اور اپنی بندوق لے کر بھاگے سب سے پہلے وہی پہنچے۔ بقول آپا، اچھو بھائی پسینے پسینے اور خوف سے ان کی حالت خراب اور ابو جان ہیں کہ بندوق بلا تو رہے ہیں مگر فائر نہیں کرتے اچھو بھائی کو بڑا غصہ آیا۔ ارے میاں بندوق چلاؤ تم تو ناچ رہے ہو۔ اس سے پہلے کہ معاملہ آگے تک پہنچتا عزت چچا پہنچ گئے۔ انہوں نے فوراً اچھو چچا سے کہا کہ گپتی ہٹا لو۔ اچھو چچا بولے "دیکھ لو یہ اندر کی طرف آئے گا پھر میری خیر نہیں۔ عزت چچا نے کہا تم چھوڑو تو، تمہاری جان کا ذمہ میں لیتا ہوں ادھر انہوں نے گپتی ہٹائی ادھر زخمی سانپ نے اپنا سر اندر کی طرف لے جانے کے لیے اپنا سر اٹھایا اسی لمحے ایسی تنگ جگہ پر لاٹھی سانپ کے سر پر اس طرح پڑی کہ وہ لمبا لمبا زمین پر لیٹ گیا۔ اچھو چچا تقریباً نیم بے ہوش تھے ویسے بھی وہ بزدل مشہور تھے البتہ ان کے چھوٹے بھائی حاکم چچا بڑے منہ پھٹ تھے۔ کھیولی کے پرائمری سکول میں مدرس ہو کر آئے تو پورے گاؤں میں بچوں پر ان کے ظلم کی داستانیں مشہور ہو گئیں۔ زاہدہ کو اسکول نہ آنے پر ایسا مارا کہ وہ پھر اسکول ہی سے خوفزدہ ہو گئی۔ پھر اس کا دل تعلیم سے اچاٹ ہو گیا اور بڑی مدت اس کا

خوف نہیں گیا۔

انہی اچھو چچا کے ایک صاحبزادے تھے مبین۔ کھیولی میں ہمارے عزیزوں میں یہی میرے ہم عمر تھے۔ مگر خدا جانے اب دونوں میں کیسی ازلی دشمنی تھی کہ ایک دوسرے کو اکیلا پاکر بغیر لڑے باز نہیں آتے تھے۔ وہ خود اپستہ قد اور گبدے تھے اور میں بالکل چڑی چانپ مگر میدان سے ہٹ کر بھی ایک ہی ٹانگ میں ان کو نیچے گرا لیتا اور دو چار لاتیں رسید کر کے بھاگ لیتا۔ بات یہ تھی کہ وہ بڑے گلیر تھے اور ان کے گالی دینے پر ہی مجھے بڑا غصہ آتا تھا۔ ایک روز اللہ میاں نے ان کو بچا ہی لیا۔ ہم دونوں دھسیا کے کنارے ایک دوسرے سے ملے انہوں نے چھوٹتے ہی کچھ بیہودہ گوئی کی۔ برسات کا موسم ختم ہی ہوا تھا دھسیا لبالب بھری ہوئی تھی۔ میں نے ان کو ننگڑی مار کر زمین پر جو گرایا تو وہ بالکل دھسیا کے کنارے پر گرے ان کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے حسب معمول میری لات سے بچنے کے لیے کروٹ لی اور دھڑام سے دھسیا میں۔ میں چھوٹا بھی بہت تھا اور تیرنا بھی نہیں جانتا تھا خوفزدہ ہو کر بھاگا اور گھر میں آکر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ تو کہیے اللہ کو انہیں نکلنا تھا۔ دوسرے کنارے پر دھوبی کا ایک نوجوان لڑکا یہ لڑائی دیکھ رہا تھا جیسے ہی وہ پانی میں گرے اور میں بھاگا وہ شور مچاتا ہوا دھسیا میں کود گیا۔ ایک آدھ دھوبی بھی آگیا بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے میاں مبین کو باہر نکالا۔ مگر اس وقت تک وہ خاصا پانی پی چکے تھے۔ ان کو الٹا لٹکا کر پیٹ سے پانی نکالا گیا۔ اس طرح ان کی جان بچی۔ میں اب بھی اس سانحے کو سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ میرے یہ دوست آج کل سہارنپور کے کسی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔

لیجیے بیچ میں طرح طرح کے قصے نکل آئے۔ میں عزت چچا کے یہاں سے گھر واپس آیا تو اس وقت تک بھائی جان آچکے تھے۔ آپا نے ساری تفصیل انہیں بتائی۔ بھائی جان نے کوٹھے کی چھت پر کھڑے ہو کر آواز دینا شروع کی "سانپ نے کاٹ لیا ہے" "سانپ نے کاٹ لیا ہے"۔ دیکھتے دیکھتے آدمی پہنچنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے اہیر ٹولے سے لوگ آئے۔ مغرب تک ہمارے گھر کے باہر کے چبوترے پر کوئی تیس چالیس آدمی جمع ہو چکے تھے گھر والوں میں میرے علاوہ دو ایک عزیز اور پانی بھرنے والے سپاہی کے زیادہ تر ہندو تھے۔ بھائی صاحب کو ایک سفید چادر باندھ کر اور ایک کندھے پر سے پیٹ کر کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ایک سفید براق دھوتی پہنے جھاڑنے والا ہاتھ میں تھالی لیے ہوئے بھائی صاحب کی کرسی کے دائیں طرف کھڑا تھا۔ اس نے اپنی گردن کے سفید جنیو سے ایک دھاگہ نکال کر بھائی صاحب کے دائیں کان کو لپیٹا اور دوسرا

سر اس آدمی کے بائیں کان میں لپیٹ دیا گیا جو چبوترے پر چاروں ہاتھوں پیروں پر جانوروں کی طرح کھڑا تھا۔ یہ ایک نہایت کالا اور توانا شخص تھا اور اس کی کھال شاید تیل کی مالش کی وجہ سے بڑی چمک رہی تھی۔ اس کے دونوں طرف لٹھ لیے دو توانا آدمی بھینسوں کی لوہے کی دوہری زنجیر کو پکڑ کر پوری قوت سے اس جھکے ہوئے آدمی کی پیٹھ پر مار رہے تھے اور منتری تھالی بجا بجا کر منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ عجیب سماں تھا۔ حیرت انگیز۔ ناقابل یقین۔ زنجیروں کی مار ہی سے سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لوہاری کی جھاڑ ہے۔ سب سے زیادہ حیرت اس آدمی پر ہو رہی تھی جو زنجیروں کی مار سہہ رہا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ مارنے کے بعد تھالی والے نے زور زور سے تھالی پر تھاپ لگانی شروع کی اور اعلان کیا کہ فلانی مسنی آئی ہے۔ مار روک دی گئی اور پڑھنے والے نے تھالی والے سے پوچھا کتنے بیسی؟ ایک خواب کے سے عالم میں اس آدمی نے بیسی کی کوئی مقدار بتائی بھائی صاحب کے کان پر دھاگے کا ایک اور تاؤ چڑھا دیا گیا اور پھر مار شروع ہو گئی۔ اسی طرح تقریباً چار بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ چار بجے کے بعد جو مار آخر میں پڑی وہ اذان سے قبل ختم ہوئی اور اس وقت جس مسنی کا اعلان کیا گیا وہ حضرت علی تھے غالباً مسلمان مار گزیدہ کے لیے یہ سب سے آخری نام ہوتا ہوگا جیسے ہی انہوں نے "حضرت علی" کی آمد کا اعلان کیا۔ پڑھنے والے سے پوچھا گیا کتنے بیسی؟ اس کے بتانے پر یہ عمل ختم ہو گیا اور بھائی صاحب کے کان سے دھاگہ نکال کر چھنگلیا کے ذرا اوپر باندھ دیا گیا اور منتری نے تھالی بجا بجا کر بڑے مسحور کن انداز میں منتر کا جاپ کیا اور پھر بھائی صاحب کے کان میں کچھ دیر چپکے چپکے کچھ کہتا رہا اور پھر اعلان کیا کہ سلیم بھیا کا بند باندھ دیا گیا ہے۔ بھائی صاحب جب گھر میں داخل ہوئے تو میں نے ان کی چھنگلیا دیکھی کہ بند کہاں بندھا ہوا ہے مگر مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے پوچھا بند کہاں بندھا ہوا ہے؟ وہ ہنسے اور کہنے لگے بیوقوف وہ کوئی دھاگے سے تھوڑی بندھا ہوا ہے منتروں سے بندھا ہوا ہے۔ وہ بپتی جو مجھے شام سے سے بھائی صاحب کی وجہ سے بےچین کیے ہوئے تھی بالآخر تمام ہوئی۔ مگر ایک شک اس کے باوجود تھا کہ کیا واقعی اس طرح زہر کو روکا جا سکتا ہے؟ جو منظر میں نے اس رات دیکھا تھا اُسے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس پر یقین کرنا محال تھا مگر جب لوہاری کے کاٹنے کے واقعات کا مشاہدہ ہوا تو پھر مجھے بھی یقین آ گیا کہ واقعی منتروں میں کچھ نہ کچھ تاثیر ضرور ہوتی ہے۔ پہلا واقعہ تو ہمارے گاؤں کے تیلی کا تھا۔ جسے لوہاری نے گھر میں ڈس لیا تھا۔ اتفاق سے وہ گھر میں اکیلا تھا۔ جب تک اس کی بیوی باہر سے آئے اس کے کان، ناک، منہ سے خون نکل نکل

کر زمین میں جذب ہو رہا تھا اور اس کا سارا بدن سیاہ پڑ گیا تھا اور جگہ جگہ سے اس کی کھال
پھٹنے لگی تھی جب جھاڑنے والوں کو آواز دی گئی اور وہ آئے اس وقت اس کا آدھا جسم تیخ چکا تھا
اور اس سے نیلا نیلا پانی بہہ رہا تھا۔ منتر والوں نے اُسے دیکھنے کے بعد زمین میں دفن کرا دیا
تھا۔ دوسرا واقعہ پھاٹک والوں کے ایک ملازم کے ساتھ پیش آیا جس کا نام محمد علی تھا۔ بہت
تگڑا جوان تھا۔ آموں کے بال رکھنے کا زمانہ تھا وہاں اس کام کے لیے ایک پودے کے پتے
کام آتے تھے جس کو روسا کہا جاتا تھا۔ محمد علی روسا کاٹنے کے لیے جنگل کی طرف گیا ہی تھا کہ اُسے
لوہاری نے کسی روسے کے پودے میں سے نکل کر ڈسا۔ محمد علی نے زور زور سے آوازیں
دیں اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دو ایک آدمی جنہوں نے اس کی آواز سن لی تھی اس کی تلاش کرتے
کرتے اس جگہ تک پہنچے جہاں وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ اس وقت تک اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ سانپ
کے کاٹنے کی آوازیں لگا دی گئیں اور اس کو اٹھا کر پھاٹک پہنچا دیا گیا۔ جب لوہاری جھاڑنے
والے آئے تو انہوں نے محمد علی کی حالت دیکھ کر سب سے دعا کرنے کو کہا اور کہا کہ اس کا بچنا مشکل
ہے۔ مگر اگر ذرا سی بھی سانس کہیں موجود ہے تو بھگوان کی کرپا سے ہم اس کو بال سے بھی نکال
لائیں گے۔ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ واقعی محمد علی کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ وہی عمل شروع
ہوا جو میں نے بھائی صاحب کے وقت دیکھا تھا۔ مگر اس میں انہوں نے ایک اضافہ کر دیا تھا کہ وہ
سستی معلوم کرنے کے وقت محمد علی کو دودھ بھی پلاتے تھے۔ جو ابتدا میں اس کے حلق سے
بڑی مشکل سے اترتا تھا مگر بعد میں آسانی ہو گئی تھی۔ دودھ پینے کے بعد اُسے قے ہو جاتی تھی اور
ہم نے دیکھا کہ یہ دودھ بالکل کالے رنگ کا ہوتا تھا۔ میں رات کے دو بجے کے قریب واپس آ گیا۔
بعد میں معلوم ہوا کہ صبح کے قریب محمد علی نے آنکھیں کھول دی تھیں اس واقعہ کے بعد جہاں مجھے سانپ
کی جھاڑ پر یقین آ گیا تھا وہاں بھائی صاحب کی طرف سے بھی بڑا اطمینان محسوس کرنے لگا تھا۔
ایک بار بھائی صاحب اپنے ایک دوست کو سنپولیے کے کاٹنے کا یہ واقعہ سنا رہے تھے
کہ انہوں نے بعد کی تفصیل میں بتایا کہ تھالی والے نے میرے کان میں بیس شرائط بیان کی تھیں
اور مجھے یہ تنبیہ کی تھی کہ اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی ہوئی تو زہر پھر سے چڑھنا شروع
ہو جائے گا اور منتر کا جو بند بندھا ہوا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ مجھے یہ سن کر بہت پریشانی ہوئی
میں نے بھائی صاحب سے رات کو اپنے "لاڈ" کے وقت پوچھا کہ مجھے وہ شرطیں تو بتا دیجیے جو
سانپ والا بتا گیا ہے۔ بھائی صاحب ہنسے مجھے پیار کیا اور بولے اس کی پہلی شرط ہی یہ ہے

کردہ شرائط کسی کو نہ بتائی جائیں۔

○

گیلولی میں میرے لیے ایک پر شوق خوف اور پُر لذت اسرار اور تجسس کی فضا ہمیشہ قائم رہتی تھی۔ صرف برسات ہی میں نہیں پورے سال ہی عجیب بے چینی اور اشتیاق آمیز دھڑکا لگا رہتا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ ابو جان کے نہ ہونے کے احساس نے خدا جانے مجھے اندر ہی اندر کتنا تنہا اور بے سایہ کر دیا تھا ان ہی میں وہ لمحے بھی ہوتے جب بے اختیار رونے کا جی چاہتا اور کسی کونے کھدرے میں، میں رو کر بھڑاس نکال لیتا تھا۔ دوسروں کو پتا بھی نہ چلتا تھا، مگر بھائی صاحب کی کالی اور گہری آنکھیں اس راز کو جان جاتیں جب بھی میں مغرب کے وقت یا رات کو روتا وہ مجھے زور سے لپٹا لیتے۔ اس طرح پیار کرتے اور اپنے سینے سے بھینچتے جیسے کوئی زخم پر مرہم رکھ رہا ہو۔ میں اپنے بچپن کی ایک رات کبھی نہیں بھول سکتا جب میں نے بھائی صاحب کو بھی اپنی طرح بے سہارا پایا تھا۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ رات وہ تھی جب اچانک معلوم ہوا کہ ہمارے ایک رشتے کے چچا امتیاز علی کو قتل کر دیا گیا ہے۔

اسلے کے قریب ہمارے خاندان کی جو شاخ رہتی تھی وہ نواز بخش چچا اور امتیاز چچا کے گھرانوں پر مشتمل تھی۔ امتیاز چچا بڑے ہی شفیق، نیک اور خوبصورت آدمی تھے۔ ان کی بڑی صاحبزادی حمیرا آپی بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ امتیاز چچا سے جب بھی ہم دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوتی وہ ہمیں پیار ضرور کرتے، وہ جتنے ملنسار تھے اتنے ہی دلیر بھی تھے ان کی چپقلش گرسی کے ایک چھٹے زمیندار ساجد علی سے تھی۔ زمین کے معاملے کا کچھ قضیہ تھا۔ ان دونوں کی زمینیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ ساجد امتیاز چچا کی شرافت سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ اکثر نہر سے آنے والا ان کے حصے کا پانی اپنے کھیتوں میں کاٹ لیتا تھا۔ امتیاز چچا نے ایک آدھ بار شکایت کی، پھر سرزنش کی اور پھر بھی وہ جب باز نہ آیا تو جھگڑا بڑھا اور دونوں میں لاٹھی چل گئی۔ امتیاز چچا اس کے مقابلے میں عمر میں بھی کم تھے اور کاٹھی میں مضبوط ساجد کی اچھی ٹھکائی کر دی اور آئندہ باز نہ آنے کے لیے کہہ کر گھر چلے آئے۔

اس رات کی شام عجیب تھی بڑے بڑے چمگادڑ آسمان پر اُڑ رہے تھے۔ معید بھائی اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر غلیل سے ان کا نشانہ لے رہے تھے۔ یہ بڑے تگڑے اور کسرتی نوجوان تھے۔

غلّے بڑے زبردست بناتے تھے چکنی مٹی کے اندر روئی اور نوک دار ٹھیکر بھرتے پھر اپنے مضبوط
بازوؤں سے پوری قوت سے غلیل کا نشانہ لیتے، غلّہ اس قوت سے پڑتا کہ بڑی چمگادڑ بھی گر جاتی
معید بھائی کی بعض حرکتوں سے ہمارے بھائی جان بڑے ناراض رہتے۔ اکثر مغرب کے بعد دھتّیا
سے آواز آتی، ہپا سارا..... ہپارا ہا...... ہم لوگ پوچھتے یہ آواز کیسی ہے بھائی جان
کہتے "معید ہے"۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ معید بھائی کرتے کیا ہیں، مگر ایک بار آپا نے
بھائی جان سے کہا کہ پیارا اتر فلانے پاسی کی لڑکی ہے بھائی جان کہتے اسی کو تو آواز دیتا ہے۔ بات
اور بھی الجھ جاتی۔ بھائی جان نے یہ بھی کہا کہ معید چمگادڑ مار کر فلانے حکیم کو بیچ دیتا ہے۔ اس
دوران بھائی صاحب یا تو مسکراتے رہتے یا ایک بے نام ہنسی ہنستے — میں ان کے پاس
لیٹا حیرت سے ان کی مسکراہٹ دیکھتا۔ بھائی صاحب ان کے ساتھ چھت پر کھڑے تھے کہ
ایک دم محسوس ہوا کہ جیسے بے اختیار چیخنے اور بین کرنے کی آواز ہوا کے ساتھ ابھری ہو، دل
کو جیسے کسی نے پکڑ لیا مگر دوسرے لمحے وہ آواز غائب ہوگئی۔ معید بھائی اور بھائی صاحب
جلدی جلدی نیچے اتر آئے۔ بھائی صاحب نے پوچھا آپا آپ نے کوئی آواز سنی، وہ باورچی
خانہ میں بیٹھیں کچھ پکا رہی تھیں بولیں "نہیں تو!" مگر میں نے کہا کہ ہاں کچھ رونے کی آواز سنی تو تھی
اتنے میں ہوا نے پھر رخ بدلا اور بہت تیز رونے کی آوازوں کے ساتھ ہجوم کے بولنے اور
باتیں کرنے کا شور ابھرا۔ آپا نے کہا۔ اللہ خیر! اور بھائی صاحب تیزی سے نکل کر باہر بھاگے۔
آپا آواز دیتی رہ گئیں چھمن چھمن یہاں آؤ۔ (وہ بھائی صاحب کو پیار سے کبھی چھمی کہتیں
اور کبھی چھمن) مگر بھائی صاحب تیزی سے املے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی ننگے پاؤں
ان کے پیچھے تھا۔ وہ بار بار مجھے ہاتھ کے اشارے سے مجھے واپس جانے کے لیے کہہ رہے
تھے، مگر میں ان کی نہیں سن رہا تھا املے کے قریب وہ ٹھٹھکے اور تیلی کے قریب والی گلی سے گزر
کر امتیاز چچا کے پختہ مکان کی طرف بڑھے۔ میں نے ان کے پیچھے اور دور سے دیکھا وہاں گاؤں
والوں کا ہجوم تھا، ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا لوگ ایک چارپائی کو اٹھا کر مکان کے اندر لے جا
رہے تھے۔ ہم جو امتیاز چچا کے گھر کے دروازے کے قریب پہنچے تو میرے ننگے پیروں میں
کوئی چیز چپچپا سی گئی۔ میں نے ایک لالٹین کی مدھم سی روشنی میں اپنے پیروں اور زمین کو دیکھا تو
وہاں خون ہی خون تھا۔ میرا دم رکنے لگا۔ میں نے بے تحاشا چیخیں مارنا شروع کر دیں بھائی صاحب
بھائی صاحب اور سب بے ہوش ہوگیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میں گھر میں اپنے بستر پر لیٹا ہوں اور میرے سرہانے مومنہ باجی بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے ڈری ڈری آواز میں آپا کو پکارا۔ مومنہ باجی نے کہا، چچی امتیاز چچا کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ میں بستر سے اتر کر دروازے بھاگا۔ مومنہ باجی جنہیں ہم دونوں بھائی اچھی باجی کہتے تھے، میرے پیچھے باہر تک آئیں اور بار بار بلاتی رہیں مگر میں سیدھا امتیاز چچا کے گھر کے اندر گھس گیا۔ وہاں لالٹینوں کی روشنی میں ایک عجیب منظر دیکھا۔ لکڑی کے تختے پر ان کا دھڑ اور سر الگ الگ رکھا تھا اور اس کے ساتھ ان کی آنکھوں کے ڈھیلے اور زبان بھی کٹی رکھی تھی۔ میں پھر چیخنے لگا اور بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں آپا نے بتایا کہ تم کو اسی وقت لے کر گھر آنا پڑا۔ انہیں شدید بخار ہو گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امتیاز چچا کرسی سے کھیولی واپس آنے کے لیے منی کے قریب والے پل پر پہنچے جو پہلے ہی سے بڑا خطرناک پل مشہور تھا اور وہاں اکثر چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ امتیاز چچا کی گھوڑی پہنچتے ہی پل پر پہنچی گھوڑی کو خطرے کا احساس ہو گیا وہ بھڑکی۔ انہوں نے جلدی سے پل پار کرنا چاہا۔ مگر پل کے نیچے دونوں طرف سے ڈھاٹے باندھے ہوئے آدمی نکل کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ لاٹھیوں کی ضربوں سے وہ زمین پر گر گئے اور گھوڑی بھاگ کھڑی ہوئی۔ ان ظالموں نے ان کی آنکھیں نکالیں زبان کاٹی اور آخر میں گردن۔ ہمارے علاقے میں سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ کارروائی ساجد کے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ اس روز میرے ذہن میں آدمی کی کٹی پھٹی لاش کے ساتھ اس کی مظلومیت اور بے بسی کے ساتھ آدمی کا ایک دوسرا تصور ابھرا۔ آدمی اور اتنا شقی! اس رات میں نے بھائی صاحب کو ایک خواب اور سکتے کے عالم میں گھر میں چلتے پھرتے دیکھا۔ انہوں نے مجھے آنکھ کھولے دیکھا تو مجھ سے لپٹ گئے اور سسکیاں لے لے کر رونے لگے اس ملبے کے ساتھ وہ پل "خونی پل" کے نام سے ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔

○

کھیولی میں عام طور پر لیکن میرے لیے خاص طور پر شام کی بڑی اہمیت تھی۔ شام ہی کو وہ لوگ جن کا ہمیں اور ہمارے گھر کو انتظار رہتا تھا، آتے تھے اور شام ہی کو صبح تک کے لیے ان دیکھے خوف، بے چینی اور رات کے اثرات کے لیے ہم ذہنی طور پر تیاری کر لیتے تھے رات ہمارے لیے ایک افسانوی کردار، ایک پراسرار سفر اور اندیشوں کی ایسی دنیا تھی

جس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب میں ترپن (۵۳) سال کی عمر میں اپنے بچپن کے اس ابتدائی دور کو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے کھیلوں میں گزارے ہوئے دن، شعور اور راتیں لاشعور کی مانند پراسرار اور نیم روشن اور وسیع جنگلوں اور صحراؤں کی مانند نظر آتی ہیں۔ کتنی جیتی جاگتی راتیں تھیں ایک خوف کے مانند دھڑکتی ہوئی۔

ایک شام ہی کا ذکر ہے کہ میں بھائی صاحب کی اسکول سے واپسی کا رستہ دیکھ رہا تھا اور دریا کی طرف منہ کیے ہوئے اپنے گھر کے باہر کے چبوترے پر کھڑا تھا کہ مجھے بھائی صاحب دکھائی دیے۔ مگر ان کے ساتھ ایک اجنبی آدمی تھا جو میرے دیکھے بھالے آدمیوں سے بالکل مختلف تھا۔ لمبا عجیب سے کپڑے پہنے ایک پیر سے لنگ کرتا ہوا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے پہلے دروازے میں سے اندر پکار کر کہا کہ آپا بھائی صاحب آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی ہے۔ پھر میں خود دریا کی طرف بھاگا۔ وہ ٹیلے کے قریب تھے جب میں نے ان کو جا لیا۔ میں اس اجنبی کو دیکھتے ہی رہ گیا۔ وہ ایک لمبے قد کا مضبوط بدن کا بہت گورے رنگ کا آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سبز تھیں اور داڑھی بالکل سنہری۔ مگر اس کے بال بہت الجھے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی لمبی مسافت سے آ رہا ہے جہاں اسے نہانے اور کپڑے بدلنے کی یا تو ضرورت نہیں پڑی یا موقع نہیں ملا۔ اس کے منہ سے جو لفظ نکل رہے تھے اور جو آوازیں وہ اپنے لہجے کے ساتھ نکالتا تھا وہ میرے لیے بالکل نامانوس تھیں۔ بھائی صاحب جب اس سے ایک آدھ انگریزی لفظ کی مدد سے اور ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہتے تو وہ اس پر کبھی سر ہلاتا کبھی انہیں تشویش کی نظر سے دیکھنے لگتا۔ کبھی خود بھی ہاتھوں کی مدد سے اشارے کرنے لگتا۔ بھائی صاحب اس اجنبی کے ساتھ اتنی شدت اور محویت کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے کہ انہوں نے اس وقت تک مجھے دیکھا ہی نہیں جب تک میں نے سلام کرتے ہوئے ان کا ہاتھ نہیں ہلایا۔ وہ چونکے اور کہنے لگے۔ شمیم جلدی سے گھر جاؤ۔ باہر کی بیٹھک کھولو۔ آپا سے کہو ذرا نہانے کے لیے پانی گرم کر دیں۔ میرے ساتھ ایک مہمان ہیں۔ میں بڑی تیزی سے بھاگا اور آپا کو بھائی صاحب کا پیغام دے کر بیٹھک کی چابی نکالی اور بیٹھک کو کھول کر پہلے تو جلدی جلدی مسہری کی چادر کو جھٹک کر صاف کیا۔ تخت کی چاندنی کی گرد جھٹکی اور گاؤ تکیے صاف کر کے رکھ دیے۔ اتنے میں بھائی صاحب اس اجنبی کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھے شاباش دی اور اس اجنبی سے میرا تعارف ایک آدھ لفظ میں کرایا۔ اس نے میرا ہاتھ بڑے زور سے دبایا۔ بھائی صاحب اسے مسہری پر بٹھا کر تیزی سے اندر آئے اور آپا سے کہا۔ یہ بے چارہ کوئی یورپین ہے۔ انگریز نہیں معلوم ہوتا۔

بتا نا بھی نہیں اس کی زبان بھی مختلف ہے۔ بیچارہ زخمی بھی ہے اور بھوکا بھی۔ آپ ذرا ایسا کھانا پکا دیجئے جو وہ کھا سکے اور پانی اگر گرم ہو گیا ہو تو غسل خانے میں ایک بالٹی میں گرم اور ایک میں ٹھنڈا پانی رکھ دیں۔ میں بھائی صاحب کے ساتھ باہر آیا تو اجنبی ایک ریزر سے شیو بنا رہا تھا۔ بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ بیٹے جاؤ آپا نے پانی رکھ دیا ہو تو آکر بتاؤ۔ آپا نے پانی کے ساتھ غسل خانہ میں صاف دھلا ہوا تولیہ اور وہ صابن نکال کر رکھا جس کی خوشبو اور رنگ پر میری جان جاتی تھی۔ یہ صابن میرے ماموں صاحب۔ استعمال کرتے تھے اور آپا نے بتایا تھا کہ جب وہ گھوری آئے تھے تو دو تین صابن آپا کو بھی دیے تھے۔ بعد میں جب میں اس صابن کو خود خریدنے کے قابل ہوا تو یہ پیرز سوپ Pear's Soap نکلا۔ میں نے جا کر اطلاع دی۔ اجنبی نہانے چلا گیا۔ آپا نے اچھی باجی کے یہاں سے ایک مرغی لے کر روسٹ کر لی تھی دو انڈے اور آلو کے چپس تیار کر لیے۔ جب وہ یوریپین نہا دھو کر واپس آیا تو کافی چمک رہا تھا اور جب اس کی نظریں ناشتے پر پڑیں تو اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ آیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ اس نے اچانک بھائی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی شکر گزاری سے انہیں دیکھنے لگا۔ یہ یوریپین ہمارے یہاں تین روز رہا بھائی صاحب نے اس کی خاطر اور دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے ان کو اتنا خوش بہت کم دیکھا تھا۔ پہلے دن اور دوسرے دن کی دوپہر تک وہ اجنبی بہت گھبرایا ہوا اور چوکنّا سا رہا۔ ذرا سی آہٹ پر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور بیٹھا ہوتا تو باہر جھانکنے لگتا۔ مگر دوسرے دن کی دوپہر کے بعد سے اس کو کافی اطمینان ہو گیا۔

ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک اجنبی کی آمد اور رہائش کی خبر کیسے چھپی رہ سکتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے روز کی رات کو ہمارے بعض عزیز آپا کے پاس آئے اور انہیں سمجھایا کہ سلیم ابھی بچے ہیں۔ آج کل یورپ میں حالات بڑے خراب ہیں۔ وہاں کی قوموں اور ملکوں میں کافی دشمنیاں پیدا ہو گئی ہیں کہیں یہ کوئی جرمن جاسوس نہ ہو جو زخمی ہو کر چھپتا پھر رہا ہے اس کے پیچھے یقیناً انگریزوں کی سی آئی ڈی ہو گی۔ کسی جاسوس کو پناہ دینے کو انگریز بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ ہم آپ کی اور سلیم کی بہتری کے لیے آپ سے کہتے ہیں کہ اس اجنبی کو چلتا کیجیے۔ جب آپا نے بھائی صاحب سے یہ ساری بات کی تو وہ کسی طرح نہیں مانے اور غصے میں تیز تیز بولنے لگے۔ "اس معاملے میں میں کسی عزیز و قریب کی بات نہیں مانوں گا۔ کسی مسافر اور مظلوم کی مدد کرنا میرا

خاندانی اور اسلامی وضع سے۔ مگر اسی روز رات کو بھائی جان آئے۔ آپا نے ان کو ساری بات بتائی۔ انہوں نے بھائی صاحب کو اپنے پاس بٹھا کر بہت نرمی اور محبت سے سمجھایا بیٹا تم نے جو تمہارا فرض تھا وہ پورا کیا۔ خدا جانے یہ کون ہے؟ اگر مجرم نہیں ہے تو انگریزوں سے چھپنا کیوں پڑتا ہے۔ بھائی جان کی اس گفتگو پہ بھائی صاحب بالکل چپ ہو گئے۔ مگر ان کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسی شام وہ یوریپین رخصت ہوا۔ خدا جانے اس سے کس نے کیا بات کہہ دی تھی کہ وہ فوراً جانے پہ اصرار کرنے لگا۔ بھائی صاحب اسے رخصت کرنے چلے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ "موتی ہار" کے مقام پہ بھائی صاحب نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے بھائی صاحب کو گلے سے لگا لیا۔ ان کی پیشانی چومی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بھائی صاحب بھی اس کے گلے لگ کر رونے لگے۔ اس روز انہیں اسکول میں جمع کرانے کے لیے جو فیس ملی تھی وہ اس کی جیب میں ڈال دی اس نے بار بار واپس کی مگر بھائی صاحب نہیں مانے۔ ہم جب گھر واپس آئے تو گھر میں ایک سوگوار سی فضا طاری تھی۔ بھائی جان بھی چپ چپ تھے اور بار بار بھائی صاحب کو دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ اس کا چلا جانا ہی اچھا تھا بیٹے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں تمہارے عزیزوں میں کیسے کیسے خبیث موجود ہیں۔ ہمیں پریشان کرنے کے لیے اگر کوئی مخبری کر دیتا تو کیا ہوتا۔ بھائی صاحب پہ اس واقعہ کا اثر کئی روز تک رہا۔

اسی زمانے میں سیاسی جماعتوں کا بڑا زور ہو گیا تھا۔ گاؤں تک میں اخبار پڑھے جاتے تھے ہمیں اس کا شعور تو نہیں تھا کہ سیاست کیا ہوتی ہے مگر آزادی سے محبت اور غلامی سے بڑی نفرت محسوس ہوتی تھی۔ انگریزوں کے خلاف ہمارے خاندان میں پہلے ہی سے ایک شدید تنفر موجود تھا گو کہ آپا جھگڑوں، جلسے جلوسوں سے بہت گھبراتی تھیں مگر ہمارا حال یہ تھا کہ ذرا سی ہلچل مچتی اور ہم باہر نکل جاتے۔ اسی زمانے میں نے کانگریس اور مسلم لیگ کا نام پہلی بار سنا البتہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے نام پہلے ہی سے کان میں پڑے ہوئے تھے۔ اب جو ذرا سیاسی گرماگرمی ہوئی تو زور بڑا اثر آیا۔ ہماری چچا زاد بہنیں کبھی تنہا ہوتیں تو ہمارا ہاتھ پکڑ کر مخصوص ترنم سے گاتیں

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ابتدا میں ہمارے گاؤں میں کانگریس کا چرچا زیادہ تھا۔ ہندو آبادی اور پاسی سب

کانگریس کے ساتھ تھے۔ اکثر مسلمان زمیندار بھی کانگریس کا ساتھ دیتے تھے۔ ہمارے خاندان کے ایک بڑے زمیندار جو رشتے میں ہمارے تایا ہوتے تھے اور گاؤں کے پردھان تھے کانگریس میں باقاعدہ شامل تھے۔ جب کوئی چھوٹا موٹا لیڈر "ملاہار" سے گزرتا یا کیپولی آتا تو یہاں کی پُرسکون فضا میں بھی ایک سیاسی ہلچل سی مچ جاتی۔ میں نے اپنے گھر میں مولانا محمد علی مولانا شوکت علی کے بعد خاکسار تحریک کا ذکر پہلے سنا اور اس کا سبب بھائی صاحب تھے اس کے بعد مسلم لیگ کا ذکر بھی ہونے لگا خصوصاً ہمارے الرحمان کے ننھیالی عزیز جو معمولی حیثیت کے افراد تھے ہمارے کانگریسی تایا کا بڑا مذاق اڑاتے۔ ان کی نظر میں تایا بھی وہ بڑے بزدل اور ڈرپوک تھے۔ ہمارا اپنا خاندان یعنی ہمارے نانا اور ان کی اولاد وغیرہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی بات کرتے تھے مگر مسلم لیگ کانگریس کی طرح زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ ایک بار کوئی خاص ایسی بات ہوئی تھی کہ گاؤں میں سیاسی ہلچل زیادہ تھی۔ ہمارے کانگریسی چچا نے ایک جلوس کی قیادت کی جو دراصل کانگریس کا جلوس تھا اور گاؤں کے تمام ہندو اور مسلمانوں کی اکثریت اس جلوس میں شامل تھی —— ہمارے ننھے چچا کے یہاں کچھ نوجوان اور جوان عزیز جمع ہوئے اور کانگریس کے اس جلوس کا ذکر بھی آیا۔ بھائی صاحب نے ایک دم تجویز پیش کی کہ ہم لوگ مسلم لیگ کا جلوس نکالیں گے اسی وقت ہرا کاغذ اور سفید پنّی منگوائی گئی۔ سینٹھے گھروں میں موجود تھے۔ بہت سی مسلم لیگ کی جھنڈیاں تیار کی گئیں اور ایک بانس میں بڑا جھنڈا لگا دیا گیا۔ اسی روز دوپہر کے بعد کیپولی میں مسلم لیگ کا پہلا جلوس نکلا۔ اس میں زیادہ تر چھوٹے بچوں سے لے کر ۱۴، ۱۵ سال تک کے لڑکے شریک تھے اور کچھ ایسے مسلمان جو غریب زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے یا مسلمانوں کی ایک ذات جو سپاہی کہلاتی تھی اس کے کچھ افراد تھے مگر اس مختصر سے اور پھیکے سے جلوس نے بھی پورے گاؤں کو مسلم لیگی نعروں سے گونجا دیا جب یہ جلوس چچا کے گھر کے قریب پہنچا تو بھائی صاحب نے بڑھ کر جھنڈا تھام لیا اور کانگریسی چچا کے گھر کے سامنے خوب نعرے لگوائے۔ بھائی صاحب خصوصیت سے پہلے یہ نعرہ لگاتے "مسلم ہے تو" باقی اس کا جواب دیتے "مسلم لیگ میں آ" حالانکہ اس وقت بھائی صاحب خاکساروں کی تحریک سے زیادہ متاثر تھے اور علامہ مشرقی کی ایک کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ چچا اس جلوس اور ان نعروں پر بہت چیں بجبیں ہوئے اور ان لوگوں کو بُرا بھلا کہہ کر بھگا دیا مگر شاید اس جلوس کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے ہمارے گاؤں کی فضا کا دامن شہروں تک پھیلا دیا۔

(باقی - باقی)

۲۶ - ۱۹۲۵ء

۱۹۴۹ـ۵۰ء

۱۹۶۲-۶۵ء

۱۹۶۲-۶۳ء

دائیں سے بائیں : انتظار حسین ۔ سلیم احمد ۔ محمد حسن عسکری

۱۹۶۸-۶۹ء

۱۹۶۹-۷۰ء

۱۹۷۵-۷۸ء

۱۹۸۱-۸۲ء

سلیم احمد اپنے دونوں چھوٹے بچوں، کامران (دائیں) اور صبا (بائیں) کے ساتھ

۱۹۸۲ء

HaSnain Sialvi

عزیز حامد مدنی

بمرگِ من یاد آر

بمرگِ من کہ پس از من بمرگِ من یاد آر
بکوئے خویشتن آں نعشِ بے کفن یاد آر
من آں نیم کہ زمرگم جہاں بہم نخورد
فغانِ زاہد و فریادِ برہمن یاد آر
بہ سازِ نالہ گروہی زاہلِ دل دریاب
بہ بندِ مرثیہ جمعے تہ اہلِ فن یاد آر
ہزار خستہ و رنجور در جہاں داری
یکے زغالبِ رنجور و خستہ تن یاد آر

رنجور اور خستہ تن سلیم احمد ۱ ستمبر ۳۱ اگست ۸۳ء کے پچھلے پہر ایک مرگِ ناگہانی کی نذر ہو گئے۔ ان کی ذاتی، نجی اور خاندانی زندگی سہل سے سہل تر اور شاداب سے شاداب تر ہوتی چلی گئی تھی مگر ان کی اصل حیات یہ تھی کہ وہ اپنی ذہنی زندگی کے لیے بے پناہ اضطراب کے نقطۂ عروج پر ہی زندہ رہے۔ ان کی عمر کی ایک ہی تقویم میں دو عصر تھے۔ ایک نہایت گرم جولاں، ایک نہایت آسودہ خرام۔ انہوں نے دانستہ ہمیشہ اپنے لیے ایک ایسا موضوع اور اس پر لکھنے کا ایک ایسا وقت انتخاب کیا جو ذہنی اور جذباتی کشمکش کی منجدھار سے کبھی الگ نہیں ہوا۔ ادب کے مورخین آئندہ انہیں جو بھی جگہ دیں، کوئی یہ فراموش نہیں کر سکتا کہ وہ ایک وہ بے پایاں اضطراب کے جو تخلیق کے لیے لازمی ہوتا ہے، ایک زندہ دل پیراک تھے۔ وہ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس کی زندہ تحریریں ۵۰ء کی دہائی میں خود کو نمایاں کرنے لگی تھیں۔

اور ۶۰ء میں ان کو ایک ادبی اہمیت اور وقار حاصل ہو گیا تھا۔ یہ نسل بہت تیزی سے اپنے کام کا لوہا معاشرے سے منوانا چاہتی تھی۔ اس کی تحریروں کے Clinical حصے اور منفی ضدین خواہ آدمی کسری ہو یا پورا آدمی ہو، شوخیٔ تحریر کے علاوہ نئے ذہنوں کی ہی جھلکیاں تو ضرور رکھتی تھیں، مگر کسی حد تک منصفانہ اور بالغ رائے سے تشنہ رہ گئی تھیں۔ سلیم احمد جیسے بالغ آدمی کو اس کا احساس تھا۔ ان کا ذوق آگہی، تغیرات اور روایات کو ناقابل تقسیم سمجھنا تھا۔ ان میں رفتہ رفتہ سارے مسائل کو بنیادی طور پر قومی اور بین قومی اکائی میں سمجھنے کی صلاحیت نمودار ہو گئی تھی جو ان کی تحریروں میں بروئے کار تھی۔ وہ غم و غصہ، جملوں کی تیز دھار، وہ طنز و استہزا جو ان کی تحریروں کو ہر نوع کے قاری کے لیے دلچسپ بنا دیتا تھا، بدل کر اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا کہ اس میں ایک غم دل کی سی شرکت کا احساس شامل ہونے لگا تھا۔ یہ وہ منزل تھی جہاں ان کی فکر خود اپنے رد و کد میں مصروف رہنے لگی تھی۔

ایک دن مجمع احباب میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ میں بھی شریک محفل ہو گیا۔ ایک بے اختیار لمحے میں جب لاشعور نسبتاً آزادی چاہتا ہے، کہنے لگے کہ میری ذہنی تربیت تو مذہبی تھی مگر میں نے اپنے لیے ادب کا انتخاب کیا۔ انہیں اس شعوری انتخاب کی طرف کچھ ان کا فطری میلان طبع کچھ ۳۵ء سے ۵۰ء تک اردو کے جدید ادب کا تاثر جس میں ہر مکتبہ خیال کی تحریریں موجود تھیں، لے آیا تھا۔ اس عہد کے ادب کے غالب عناصر کے علاوہ اس میں فکر کی چھوٹی بڑی شاخوں سے اختلاف کی شدتیں بھی موجود تھیں۔ یہاں سے جب ان کا مطالعہ آگے بڑھا تو مغربی تنقید کے بنیادی اصولوں کی نکتہ رسی تک وہ پروفیسر حسن عسکری کی معیت میں پہنچے، پروفیسر محمد حسن عسکری مرحوم ادب کے ایک نکتہ رس پارکھی تھے۔ مغربی ادب کی رمز شناسی، اس کے طرز تحریر کا جادو، جس میں ایک چونکا دینے والی بات کہہ دینے کے سلیقے کے علاوہ ایک انفرادی انحراف کا پرکشش جذبہ بھی ہوتا ہے، وہ خوب پہچانتے تھے۔ ان کی تحریروں میں اس نوع کی فکری کاوشیں خود نمایاں تھیں۔ یہ ساری باتیں اردو ادب میں بھی ایک نیا رخ اختیار کر چکی تھیں۔ سلیم احمد بھی اس سے متاثر ہوئے۔ برصغیر کی سیاسی فضا میں ایسی تحریریں فکری عناصر سے خالی نہیں تھیں، مگر ان میں اسلوب کی تراش خراش پر بھی کچھ کم زور نہیں تھا۔ ان اجزا کے مثبت پہلوؤں نے ان کے اسلوب کو متاثر کیا تھا۔ تنقیدی ادب کے علاوہ انہوں نے دیکھا کہ برصغیر کی مختلف یونیورسٹیوں کے پیدا کردہ شعرا کے کلام میں نئے نئے زاویے اور خیالات کے نقش بن بن کر ابھر رہے ہیں تو انہوں نے بھی مغربی شعرا کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ یہ مطالعہ کبھی عسکری صاحب کے مضامین کے اشارات کی رو میں علامتی شعرا کا، کبھی نوجوان ادیبوں کے گروہ میں بیٹھ کر امریکی اور انگریزی شاعری کا، اور کبھی خود اپنی پسند کے مطابق یورپی زبانوں کے شعرا کا، انہوں نے جاری رکھا۔ یہ چیزیں ایک نیا ولولہ تو

ضرور پیدا کرتی رہیں اور کسی حد تک ان کے اسلوب کی تازگی ان کے امیج سے بھی ایک تاثر انہوں نے اخذ کیا جس کی جھلک ان کی نظم کی نگارش میں آئی تھی، مگر ان کی طبیعت کو اس سے وہ تسکین حاصل نہیں ہوئی جو اردو کی کلاسک اور قدیم رنگ سے حاصل ہوئی تھی۔

ان کے اکثر ہمعصروں میں یہ بحث نکلتی رہتی ہے کہ وہ طبعاً شاعر تھے یا نثر نگار۔ اس بحث سے الگ وہ خود یہ خوب سمجھتے تھے کہ جدید فکر کا بنیادی کام نثر میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ کام انہوں نے جی لگا کے کیا ہے۔ تنقید کی طرف ان کے رجحان سے اردو کی جدید تنقید کو ایک بیدار مغز نقاد مل گیا۔ ان کی نثر ایک اپنا اسلوب رکھتی ہے۔ اس میں فکر کی ایک تہہ ہوتی ہے، وہ ایک کھلے ہوئے ذہن کے جمہوریت پسند ادیب تھے۔ اطراف واکناف کی خبر رکھتے تھے، معاشرے کے نیک و بد سے آگاہ تھے۔ ان ادیبوں کی صف میں تھے جو عہد حاضر کی بنیادی ضرورتوں سے واقف ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ کسی بھی رنگ کی قدامت بہت دیر تک ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ تغیرات کی تیزی ہر معاشرے کو ایک فکری، اقتصادی اور معاشرتی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور آج کا وژن اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تیسری دنیا اور اسلامی دنیا، اپنی تاریخ اور روایات کو سمیٹے ہوئے اگر کوئی مقابلہ کی قوت پیدا کرنا چاہتی ہے تو اسے اپنی فکر کا پیمانہ وسیع تر کرنا پڑے گا۔ ان کی تحریر میں بے شک ان باتوں کا کوئی منطقی یا سائنٹیفک استدلال تو نہیں ہے مگر ان کے ذہن کے غالب عناصر میں قدامت زدگی اور رجعت کا کوئی رُخ نہیں تھا۔ جدید زندگی کے کچھ فکری پہلو ایسے ضرور تھے جو ان کی ذہنی تربیت اور خیال کی نہج میں آخر تک ایک اجنبیت اور اختلافی رنگ لیے ہوئے تھے اور ان کی تشریح و تفسیر میں جب وہ کچھ لکھنے بیٹھتے تھے کہیں کہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نادیدہ حریف کے تخیل سے تسکین پاتا ان کی نفسیات میں داخل ہو گیا ہے مگر وہ ایک معتدل اور صلح کل فطرت کے آدمی تھے۔ ان کا ذہن یک رُخی سوچ کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں تھا۔ کوئی فساد یا ضد بھی ان کی نیت میں نہیں تھی مگر تنقید کے جس زاویے کو انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا اس کی گہری چھاؤں ان کی تحریروں میں آجاتی ہے کبھی کبھی یہ سایہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے انہیں ایک سخت و سست لہجے تک پہنچا دیتا ہے۔

وہ نہایت خلیق، خوش طبع اور مہذب آدمی تھے۔ اور پینتیس ۳۵ سالوں کی طویل ملاقاتوں میں میں نے کبھی ان خوبیوں میں کوئی کمی ہوتے نہیں دیکھی ہے۔ بلکہ طبیعت کے گداز سے وہ کچھ نکھرتی گئی تھیں۔ ان سے پہلی ملاقات کو جیسے ایک جگ بیت گیا ہو۔ برسوں پہلے کی بات ہے کہ مجتبیٰ حسین صاحب، عسکری صاحب، قدیم خاں اور سلیم احمد کی فرصت کے اوقات میں ٹینس کے men's double کی

طرح گپ شپ، ایک کورٹ میں ہوئی تھی۔ اس انتہائی ذاتی اور نجی نشست کا آغاز یوں ہوا تھا کہ ایک دن ایک نوخیز، بیضوی چہرے، گندمی رنگ کے نووارد ادب ناسی رنگ کی شیروانی پہنے مضمون کا رجسٹر بغل میں دبائے گوردھن داس مارکیٹ کی ایک فرنگی ساخت کی عمارت میں تشریف لائے۔ یہ تھے سلیم احمد، ان دنوں کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تھا کہ "جاسوس سلطان در کمیں" بھی ہو سکتا ہے۔ سلیم کو ایک مضمون انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک ازلوداعی نشست میں پڑھنا تھا۔ کچھ ان کی تر زبانی، کچھ مضمون میں نئے گوشے نکلتے ہوئے۔ اختلافات میں گرمی بھی آئی۔ مگر انہیں آداب محفل کا پورا خیال رہا۔ غالباً یہ ۴۸ء کے آخر یا ۴۹ء کے آغاز کی بات ہے۔ ان دنوں سلیم احمد کا قیام کراچی کے مغربی کنارے کی ایک بستی میں، جسے بہار کالونی کہتے تھے، مجتبیٰ حسین صاحب کے پڑوس میں تھا۔ اس محلے کا جغرافیہ چاکیواڑہ اور لیاری کوارٹرز کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ بستیاں بڑے جیالے محنت کش اور زندہ دل لوگوں کا مسکن ہیں جو آج بھی اس تجارتی شہر کی نصف مزدوری کا بار گراں اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ خیر تو یہ بستیاں ادیبوں کی خیمہ گاہ کے راستے کا ایک جزو تھیں۔ لکڑی کی ٹالیں، کوئلے کے گودام، ایک دباغ گاہ —— ویسی سے ٹیڑی —— کھالوں پر نمک و شورا —— دھوپ میں گندھک کلسا دھواں اٹھتا ہوا۔ اور اس کے ادھر پرانے مکان درختوں کے جھنڈ کی طرح اُگے ہوئے۔ بیچ میں کھلا ہوا میدان کہ موسم گرما ہو تو غبار آلودہ زنگ و نسب ہو کر آپ پہنچیں۔ بارش ہو تو بس اس فکر کا ہے نام وصال کہ ملاقات نہ ہو تو کیا ہو اور اگر ہو تو کیونکر ہو' —— اس میں ایک طرف مجتبیٰ صاحب رہتے تھے، ایک طرف سلیم احمد جن کے ساتھ عسکری صاحب کا قیام تھا۔ یہ نشستیں وہاں تک پہنچنے کی دقت کے باوجود آخری بس کی واپسی تک ہوتی رہتی تھیں۔ ان نشستوں میں الہ آباد یونیورسٹی کے دو بہترین ذہن جنہوں نے پروفیسر دیب، پروفیسر فراق اور ضامن علی صاحب کی آنکھیں دیکھی تھیں، موجود تھے۔
الہ آباد یونیورسٹی شمالی ہند کی ایک نمائندہ درس گاہ ہونے کی حیثیت سے سیاسی رہبروں اور مفکروں، فلاسفروں اور ادیبوں کا ایک گہوارہ تھی۔ یہ الہ آباد —— اکبر الہ آبادی 'پانیر pioneer' اور امرودوں کا الہ آباد بھی تھا۔ اور جواہر لال نہرو کا گھر بھی۔ یہاں سر تیج بہادر سپرو بھی رہتے تھے اور اصغر گونڈوی بھی۔ اسی شہر سے اقبال کی معرکۃ الآرا تقریر خطبۂ الہ آباد کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ ہماری محفل میں ان تمام حضرات کے قصے لطیفے نہایت بے تکلفی سے چلتے رہتے تھے۔ چائے کی پیالیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ وقفہ وقفہ سے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے دیہی علاقوں کے قصے نکل آتے تھے۔ رساول، کھیرے اور ککڑی کا موسم، تربوز اور خربوزے۔ وہاں کے شہر —— متھرا اور بنارس، غالب کا

سفر، علی حزیں کے اشعار، بارہ بنکی کی فضا، جونپور کی گلیوں میں چنبیلی کی خوشبو، پانچ سو قاضیوں کی پالکیاں جو سلطان حسین مشرقی کی سلطنت میں عدل گستری کے لیے نکلتی تھیں۔ میرٹھ کے کباب، فوجی چھاؤنیوں کی بغاوت، فرنگی دور کا آغاز، بس انہی داستان سرائیوں اور بحثوں کے درمیان کام کی تلاش شروع ہوئی۔ کچھ مہینوں کے بعد مکانات بدل گئے اور ہمسائیگی کا سفر اتنا دشوار نہیں رہا۔ سارے لوگ ایک سواد میں رہنے لگے۔ شاہد احمد دہلوی، جمیل جالبی، مجتبیٰ، عسکری، سلیم اور میں۔ ہماری محفل اسی طرح جمی رہتی۔ یہ بے تکلف دوستوں کی بزمِ خاص تھی اس میں نہ کوئی تنگ دلی تھی، نہ فکر و خیال کی شدت بیچ میں کوئی دیواریں اٹھا سکتی تھی۔ اتنے بڑے شہر میں جائے رہائش کی کئی کئی گردشیں ہوتی ہیں۔ مکانات پھر بدلنے لگے، سلیم احمد پیر الٰہی بخش کالونی سے جہانگیر روڈ پر چلے گئے۔ عسکری صاحب اپنی ہمشیرہ کے یہاں ہاؤسنگ سوسائٹی میں چلے گئے۔ مجتبیٰ اپنے نئے مکان نارتھ ناظم آباد میں اُٹھ گئے۔ رزق کی فراہمی مشاغل اور پیشہ کی مصروفیت، کاموں کی الگ الگ نوعیت نے ساری صورت ہی بدل کر رکھ دی۔ وقت کو بس ایک حیلہ چاہیے، بنانے اور بگاڑنے کا ـــــ عمروں کے تفاوت کے باوصف دلوں میں ایک محبت کی قدردانی نے دوری پیدا نہ ہونے دی۔ مگر وہ سلسلہ، جو ہر نوع کی ادبی اور تہذیبی گفتگو کا، از خود مرتب ہوا تھا، بکھرتا چلا گیا۔ ایک دن چلتے چلتے راستے میں عسکری صاحب کے قدم رُک گئے کسی نے پہچان کر گھر پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر دل رُک گیا۔ سلیم احمد نصف شب کو یہ کہہ کر سوئے تھے کہ صبح مجھے اٹھا دینا۔ وہ اس بات سے آگاہ نہ تھے کہ صبح ان کے اٹھانے والوں میں ان کی بیٹی ہوگی، جواب ان کی ماتم گسار ہے ـــــ اُن کی وفات کے بعد ان پر کچھ لکھنا جس میں اختلافی امور بھی ہوں، امر محال تھا، مگر ایک معتبر ادیب کی فکری روش کے کسی گوشے کو تشنہ چھوڑنا، نہ ادب سے دیانت داری ہوتی ہے نہ اس سے۔ وہ میرے دوست بھی تھے اور چھوٹے بھائیوں کی سی قوت بازو بھی۔ ان کا قرب ایک ذاتی ملکیت ہے۔ اس خزانے کا 'وقت کی قزاقی' کچھ نہ بگاڑ سکے گی ـــــ میں نے یہ ساری باتیں ان معنی میں لکھی ہیں کہ ان کی ہمدردی کسی کاروباری، سیاسی، اقتصادی یا ادبی مصلحت کی بنا پر نہ تھی۔ بس ایک قرب تھا جو ہمیشہ رہا۔ کبھی یہ ہوتا کہ ان کے گھر کی فضا میں ہماری باتوں کو کاٹ کر اندر سے ان کی والدہ یا ہمشیرہ کی آواز آتی جس میں ٹماٹر اور انڈوں کی چڑھتی ہوئی قیمتوں کا حال ہوتا، رشتہ داروں کی شادی بیاہ کے چرچے ہوتے، محلے پڑوس کے مسائل کا تجزیہ ہوتا۔ کبھی یہ ہوتا کہ بچوں کی جنگ کے دوران الگ الگ تشغف کے انہماک میں ان کی آواز ہر ایک کو نام بنام پکارنے میں رائیگاں ہوتی رہتی اور وہ مسکرا کر کہتے کہ کوئی نہیں سن رہا۔ اور میں ان سے کہتا کہ آپ بھی خاموش ہو جایئے۔ بس وقت

اسی طرح زندگی کی نجی اور ذاتی چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں کو سیراب کرتا ہوا گزرجاتا ہے۔

ابھی ۵۰ء کی دہائی ختم ہو رہی تھی کہ ان کی کچھ کتابیں .... بیاض، نئی نظم اور پورا آدمی، غالب کون؟ اور ادھوری جدیدیت لکھی جا چکی تھیں۔ مگر شاید شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اسی عرصے میں ان کی علالت کا ایک تشویشناک دور بھی آیا اور گزر گیا! .... آدمی کو اندر سے جلا دینے کے لیے کتنے غم کتنے اندیشے ہوتے ہیں۔ ماحول اور وراثت کے نیز ابی اجزا کیا کچھ نہیں ہوتے مگر آدمی بھی وہی ہے جو اپنی خاکستر سے خود پیدا ہو جائے۔ میں نے یہ بات بہت قریب سے بھی دیکھی ہے اور دور سے بھی کہ رزق کے مہیا کرنے میں، گھر کی خبر رکھنے میں، بچوں سے پیار کرنے میں، خاندانی مراسم کی استواری میں، مجمع احباب کو مایوس نہ کرنے اور P.R کے رشتوں کو مٹھی میں رکھنے کے درمیان وہ برابر لکھتے رہے، ان کا قلم کبھی رکا نہیں۔ یہ وقت ان کی نظم و نثر کی تفصیل میں جانے کا نہیں ہے، مگر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے نہ ہونے سے اردو کی جدید تنقید میں ایک کمی آگئی ہے۔

سلیم احمد نے شعر و تنقید کے علاوہ ریڈیو، ٹی وی اور فلم کے لیے بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ ان کی محفل میں جو نئے چہرے نظر آنے لگے تھے ان میں کچھ میڈیا کے لوگ، کچھ صحافی، کچھ فلم پروڈیوسر، کچھ فلم ڈائریکٹر تھے۔ کبھی ایک سین چل رہا ہے، کبھی ایک ڈائیلاگ ختم ہو رہا ہے، کہیں ایک سینیریو تیار ہو رہا ہے۔ دو تین صاحبان مراقبے میں بیٹھے ہیں۔ ایک ٹی وی کے پروڈیوسر ہیں، ایک معاون مصنف ہیں۔ دوستوں کی سی گرمی ہے۔ کمال فن کی راہیں سوچی جا رہی ہیں۔ خیر، ان مختلف بدلتے ہوئے مناظر کے پیچھے ایک ہنس مکھ چہرہ زندگی کی دشواریوں اور آسانیوں کے درمیان ایک کیف حاصل کرتا رہا۔ سامنے کئی رخ، کئی پہلو آتے جاتے رہے۔ اس رنگ و آہنگ سے ان کے ذہن میں کئی تلخ اور خوشگوار حقیقتیں اجاگر ہوتی رہیں۔ ان کے ربط و تعلق کی دنیا میں کم عمر لوگ بھی تھے۔ ہم عمر بھی تھے۔ اجنبی اور نوارد بھی تھے، جہاں دیدہ بزرگ بھی تھے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ کاروبار حیات کے ہنگاموں میں ہماری جو خاص محفل تھی، برہم ہو گئی۔ اسی محفل کے ایک جونیئر ممبر شمیم احمد بھی تھے جنہوں نے ایک ہی بیک ہینڈ سے دو اور دو کو پانچ کر کے دکھا دیا۔ سلیم احمد کی مصروف زندگی کو مصروف تر بنانے والوں کی کثیر تعداد تھی۔ جب دیکھا ایک جم غفیر ہی دیکھا۔ گوشہ نشینی کا ذائقہ ان کی طبیعت کی چیز نہیں تھی۔ طلب یہ تھی کہ ایک سلسلہ گفتگو کا، تخلیقی کاموں کا، کسی کتاب پر بحث کا، کسی خیال کے افق کا، سامنے رہے۔ ایک ایسے ہی موڑ پر کچھ بیتاب اور تازہ فکر شعرا اور ادیبوں کا گروہ جنہوں نے اپنے سے پہلے آنے والوں کے کام میں نئی

فکری زاویے دیکھے تھے۔ ان کی طرف آتا جاتا رہے۔ ان سب میں جدید فکر سے ایک رغبت تھی۔ نئے اسلوب کا ایک فطری میلان تھا۔ ان میں کئی اقسام کے لوگ تھے ــــ متین و بردبار، طبیعت میں تیز طرار، کوئی نسل برہم زدہ کا نمائندہ، کوئی تصوف کا گرویدہ، کوئی اردو ادب کے چین بہ جبیں جوانوں کی تنزی سپر لیے ہوئے۔ کوئی غزل سرا۔ اچھے اور جوہر آتنا لوگوں کا ایک کاروان ــــ ان میں اطہر نفیس، ساقی فاروقی اور اسد محمد خاں بھی تھے، جمال پانی پتی، نگار صہبائی بھی۔ افتخار عارف، احمد علی سید اور نظیر صدیقی۔ ان کی تحریریں اب بھی شد و مد سے جاری ہیں۔

بیس سال کی مدت میں ۶۰ء اور ۸۰ء کے زمانی عہد میں قومی اور بین قومی پیمانے پر بڑے تغیرات ہوئے۔ دو بڑی طاقتوں کی حکمت عملی میں، انسان اور کائنات کے رشتوں میں، سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں، ان تغیرات کا اثر، مسائل کی نوعیت کو بدل گیا۔ خلا میں رسد گاہیں قائم ہو گئیں۔ تجربہ گاہوں اور معملوں کے درمیان انسان کی فتح و شکست و فتح کے کئی نشانات آئے۔ خیر و شر کی نئی بحثیں چھڑ گئیں۔ ان ساری وسعتوں کو جو اس صدی کے پچھلے پچاس سالوں نے پائی ہیں۔ دنیا کے فنکار اور ادیبوں نے بھی کم کم ہی سمیٹا ہے۔ لیکن انسانی فکر کے نئے اندیشے آپ کو ہر زبان کے ادب میں ملیں گے۔ ہمارے یہاں بھی جوش و فراق نے، فیض و راشد نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان خطوط کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ اندیشے انسان کی بقا، اس کے روحانی اضطراب، اس کے خیر و شر کے تصورات کا امتحان ہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں کے بڑے ادیب بھی ان مسائل پر لکھتے ہوئے کئی مکتبہ ہائے خیال میں تقسیم ہو گئے۔ ان سے بہت دور تیسری دنیا کے ایک چھوٹے سے حصہ میں اردو میں جو کچھ لکھا گیا، وہ اپنے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے کیا وزن رکھتا ہے اس پر آتشیں بحثیں چھڑ چکی ہیں۔ اس سلسلے کی بحثیں ہمارے بڑے شعرا و پر اور ہمارے اہم ترین شعرا و پر جن کا دور ہم سے قریب تر ہے، آج بھی جاری ہیں۔ ہر عبوری دور میں جب عملی زندگی پر، تعمیر و تنظیم پر زور ہوتا ہے، ادبی تخلیقات نظر سے اوجھل سی ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک محدود حلقہ میں، ایک تہذیبی اقلیت سے زیادہ اپنا دائرہ اثر نہیں بڑھا سکتیں۔ مگر اس کے باوصف، ۴۷ء کے بعد ان اڑتیس سالوں میں شعر و ادب کے دس اہم ترین مصنفین کی کتابیں پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں فیض و راشد کے علاوہ سعادت حسن منٹو، غلام عباس، اختر حسین رائے پوری، احمد ندیم قاسمی، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، مجتبیٰ حسین اور قرۃ العین ہیں (جو اب ہندوستانی ہیں)۔ اہم ترین مصنفین کی یہ آخری تعداد نہیں ہے۔ ہندوستان میں یہ تعداد اس سے کم یا اس سے بہت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ دس کی تعداد ایک قیاس کی حد ہے جس سے ہم ایک

معیار مقرر کر سکتے ہیں۔ معیار کے اس تعین کے بعد ـــــ ایک تازہ فہرست مرتب کی جاسکتی ہے اور مرتب کی جا چکی ہے۔ اس معیار کی پاسداری میں مرحوم سلیم احمد نے جو کچھ لکھا ہے، وہ نظم و نثر میں اپنا جوہر رکھتا ہے۔ ان کی تنقید میں مسائل حاضرہ کی آگاہی ایک دوسرے مزاج کی پچھلی تحریک سے ہم آہنگی رکھتی ہے۔ ہر چند کہ ان کا تجزیہ ایک تہذیبی پس منظر میں نفسیاتی ہے۔ وہ کسی حد تک فرائیڈ سے بھی متاثر ہیں۔ لیکن وہ ان چند نقادوں میں سے ہیں جن کی تحریر میں زمانہ حاضر کی بے تابیاں اور سماجی کشمکش غیر شعوری طور پر ان کے مزاج کا جزو بن کر سامنے آئی ہیں۔ حقیقت پسندی کی فضا اور ماحول کا توسط ان کی ذات ہے۔ ان کی کئی تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی شائع ہونے کو ہیں۔ ان کی تنقید کو کھلے ذہن سے پڑھنا چاہیے۔ اس میں اختلافی امور بھی آتے ہیں۔

سلیم احمد ایک خاص مکتبہ خیال کے آدمی تھے۔ اس مکتبہ خیال نے نئی قدروں کی معنویت کورد کرنے میں کبھی کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ ہر دور میں معیاری ادب کی تخلیق کا باعث معاشرے کے اندرونی پیکار کی آگہی ہوتی ہے۔ ان سے متعلق ایک یادداشت مرتب کرنے میں میرا مقصد ان کی تنقید سے بحث ہرگز نہیں ہے۔ لیکن کچھ ذکر ان کی فکر و نظر کا ضرور آئے گا، جس کے بغیر ان کی کاوشوں کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ ان کی تنقید کی کتابوں میں نئی نظم اور پورا آدمی، غالب کون، ادھوری جدیدیت، اقبال ایک شاعر، حسن عسکری آدمی یا انسان، شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے متضاد مزاج کے ادیبوں پر لکھا ہے اور ہر بار بڑی جانفشانی سے پورے سیاق و سباق سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ساری جستجو کا محور ان کے مضامین میں ہے، ان سے گفتگو رہا کرتی تھی۔ مغربی ادب میں تنقید کے معیار پر با میں ہوتی تھیں۔ یہ ذکر بھی رہا کرتا تھا کہ مغربی تہذیب جس کا بیشتر حصہ اپنے کو سرمایہ داری اور عیسائیت کا حامی کہتا ہے، اس کے ادیب ایک جمہوری فراخ ذہنی سے لکھا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو شدتیں پیدا ہو رہی ہیں ان سے کہیں تخلیقی عناصر میں کسی طرح کی کمی تو نہیں پیدا ہو جائے گی۔ وہ کھلے ذہن سے ان باتوں پر سوچا کرتے تھے اور ان کی تحریر میں اس بات کا ثبوت بھی ہے۔

بہرکیف ان کے نہایت محنت سے لکھے ہوئے مضامین، جوش ملیح آبادی پر تفصیلی مضمون اور حسن عسکری آدمی یا انسان۔ بڑی خوبی کے مضامین ہیں۔ ان کی دو شائع شدہ کتابیں نئی نظم اور پورا آدمی اور ادھوری جدیدیت نئے پڑھنے کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان کتابوں پر انہوں نے اہم ترین شعرا پر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اختلافات کے سارے زاویے نمایاں کرتا ہے۔ یہ تنقید ان عناصر پر ہے جہاں شعرا کی حسیات، اس کی ترکیب نو، ایک نئے امیج اور نئے

محاورے کی سطح قابو ہو جانے کے بعد ہماری موجودہ شاعری پہنچی ہے۔ اس دور کے اہم ترین شاعر فیض ہیں۔ فیض ایک نیا ذہن بھی ہیں اور اردو شاعری کا نیا مزاج بھی۔ سارے سخن ہمارے نسخہائے وفا کے بعد ان کے کلام سے زندگی کی کلیت کا جو تصور ابھرتا ہے وہ ان تمام نظریات سے الگ جس سے ان کی شاعری منسلک سمجھی جاتی ہے، اپنی فکری نہج میں ہمارے ادب کا معیار ہو گیا ہے سلیم احمد تعصبات کے آدمی نہیں تھے۔ ہر مرحلہ پر ان کی تحریر سے متعلق ان سے گفتگو ہو جایا کرتی تھی اب جو یہ ذکر یہاں نکل آیا ہے تو یہ بھی ادب کے اہم ترین حصوں پر آپس کی کھلی ہوئی گفتگو کی ایک شب گزشتہ کا واقعہ ہے۔

ان کی ایک کتاب "اقبال ایک شاعر" ہے۔ اس میں اختلافی امور شدید تر ہیں۔ اقبال کا شمار اس صدی کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مغربی ادب میں ایک "تحریک مشرق" بھی ہے جس کا ذکر اقبال نے خود کیا ہے۔ گوئٹے اور شلر سے چل کر فرانس، جرمنی اور انگلستان کے مستشرقین ادب نے ہمارے تین شعرا کو بہت اونچا مقام دیا ہے ___ رومی، سعدی اور حافظ اُن کے یہاں بھی بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ لیکن ایک مدت سے اس تحریک مشرق کی محفل سونی پڑی تھی۔ اقبال کی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی نے ایک بار پھر مغرب کو چونکا دیا ہے ان کی کتابوں میں مشرق کا تاریخی شعور اپنی تہذیبی روایات کی متحرک فکر بن گیا، یہ وقت اقبال پر کچھ لکھنے کا نہیں ہے۔ اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے مشرقی ذہن کی بالغ نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک اکیڈمک فلاسفر کی بھی ہے جو عہد جدید کے تقاضوں کی رو میں مشرقی فکر کے ایک حصہ کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے بہترین ذہنوں کے ساتھ وقت گذارا تھا۔ جب وہ کیمبرج پہنچے تو وہاں "کیمبرج فلاسفر" کا ایک گروہ Personality and Absolute پر کام کر رہا تھا۔ اس گروہ میں پروفیسر انڈریو سیٹھ، پروفیسر ریشڈیل اور اقبال کے استاد پروفیسر میک ٹیگرٹ بھی تھے۔ وہ بھی ایک بڑے عالم آدمی تھے۔ میں سلیم احمد کو ان کا ایک جملہ سنایا کرتا تھا جس کی بہرکیف مذہبی فکر میں بھی ایک بنیادی حیثیت ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"No man is justified in a religious attitude except as a result of metaphysical study"

"کسی شخص کے کسی بھی مذہبی رویے کا جواز صرف مابعد الطبیعیاتی مطالعے پر مبنی ہے"

سکتا ہے"۔

یہی بات میں نے عسکری صاحب سے بھی کہی تھی۔ سلیم احمد نے اپنی کتاب کے ایک حصے میں اسلامی فکر کی چند بنیادی باتوں کی تشریح سے اختلاف کیا ہے۔ اقبال کی اجتہادی فکر خود اپنے وسیع علم، فقیہان معتبر اور مفکرین اسلام کے مشوروں کی بنیاد پر شریعت سے مربوط اور طریقت کی وجدانی کیفیت کی آگہی سے آراستہ تھی۔ اس کی دوسری سطح یہ تھی کہ عہد حاضر کے تقاضوں کو خود یہ فکر اپنے اندر سمونے کی کتنی سمیٹ اور سکت رکھتی ہے۔ اس کا جواب اقبال نے اثبات میں دیا ہے۔ میں نے کئی بار ان تیس سالوں میں اشارۃً یہ لکھا ہے کہ اسلامی فکر کا دائرہ، اس کے قصص، اس کے استعارے اس کی علامتوں کے سوا وہ اپنی جدت فکر کو جس کی روح آفاقی ہے، دوسروں تک پہنچا ہی نہیں سکتے تھے۔ کسی اور زاویے سے کہی ہوئی بات میں نہ مشرق آتا اور نہ اس کی تہذیبی روایات۔ ان کے نزدیک تاریخ کا یہ عمل جاریہ فکر کا واحد پیمانہ تھا جس طرح ہم ایلیس سے پال ولیری تک پڑھنے میں یونانی اساطیری فضا کو مغربی فکر کا ایک غیر مشروطی حصہ سمجھتے ہیں۔ دانتے سے پال کلاڈل تک شعری قالب کے لیے مسیحی اخلاق کو نمایاں پاتے ہیں، اسی طرح رومی اور اقبال کو ایک اپنے آشنا حلقۂ فکر سے عالمی فکر میں شامل ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ دنیا کی بہترین شاعری میں غیر مشروطی اور مذہبی علامتیں انسان کی اعلیٰ ترین قدروں کا وسیلہ اظہار رہی ہیں۔ اقبال کی آواز در دل تک بھی پہنچتی ہے اور دروازۂ حیات تک بھی۔ وہ انہی دو دروازوں کے شاعر تھے۔

بحث چلی تھی تفسیر و تشریح کی۔ سلیم احمد نے بھی جو کچھ لکھا تھا وہ کسی بزرگ مفکر کے سلسلۂ عقاید کے مطابق تھا۔ اس سلسلے میں ان سے جو باتیں ہوئیں وہ بھی اسلامی مفکرین کے حوالے سے ہوئی تھیں۔ اقبال کی حیات ہی میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کلام اقبال کو عرب دنیا سے متعارف کرایا تھا۔ اقبال پر ان کی کتاب نقوش اقبال، عبدالسلام ندوی کی کتاب اقبال کامل۔ مولانا اسلم جیراج پوری کے مضامین اور حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "اقبال اور قرآن" جو ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب نے لکھی ہے، اقبال کی فکر کی تشریح کرتی ہے۔ ان تمام حضرات نے اقبال کی فکر کو ہماری تہذیب و ثقافت کی روشنی میں ایک اعلیٰ نمایندہ مقام کا حامل ٹھہرایا ہے۔ بحث فکر اقبال سے نہیں کہ وہ دانش حاضر کے عہد آفریں تغیرات میں آپ اپنی محکم سند ہے۔ بلکہ ایک نئے نقاد کی اس جستجو سے ہے جو فکر اقبال سے گہرا شغف رکھتا تھا جو اسے ایک عظیم شاعر بھی سمجھتا تھا جو ان کی آگہی کو ہماری تہذیب کا ایک لازمی جزو قرار دیتا تھا۔ تو پھر اس کے قلم سے جو ناگوار باتیں نکلیں ان کو

یوں سمجھنا چاہیے کہ سلیم احمد کی تنقید میں اختلافی امور کی نوعیت ایک فطری رجحان تھا۔ اس نفسیاتی عمل کی کوئی تاویل اب بے سود ہوگی۔

اردو کے جدید ادب کی ہر صنف پر مغربی ادب کے اسلوب کا اثر ہے۔ محض اسلوب پر نہیں ہے بلکہ نئے ادب کی نشو و نما کے پورے تخلیقی عمل پر ہے۔ فکر کی اثر پذیری تو اقبال کے بعد جوش، فراق تک بھی آئی تھی مگر ان کے بعد ساخت ہی بدل گئی۔ یہ کوئی حکمرانی کا تسلط ہی نہیں تھا بلکہ ذہنا ایک فکری بین قومی قوس کے نیچے آرہی تھی نئے علوم شعر و ادب کے تخلیقی عمل میں شریک ہو گئے تھے۔ ان سے تجربہ اور رچ گیا، تعمیر اور ہو گئی ــــ ان سب باتوں کا غیر شعوری اثر اور شعوری بھی۔ ۱۹۴۰ کی دہائی میں نمایاں ہو گیا، اور یہاں تک آتے آتے تو اس کا حال ہی اور ہے۔ مگر اب ذکر آرہا ہے اس دور سے سو سال پہلے کا۔ مرزا غالب کی پیدائش کو نہیں وفات کو سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں ــــ مظلر والے حالی نے ان کی وفات پر مرثیہ بھی لکھا ہے اور ان پر کتاب بھی۔ قصہ یہ ہے کہ عہد غلاماں سے عہد انگلشیہ تک تین یادگار شخصیتیں ہم نے شعر و ادب میں پیدا کی ہیں، خسرو، غالب اور اقبال۔ انہوں نے الگ الگ دور میں تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا جو چراغ روشن کیا اسی کی روشنی میں ہم نے کچھ پایا ہے خسرو پر کم لکھا گیا ہے مگر ان کی سات سو سالہ برسی پر ہندوستان اور پاکستان میں کچھ وقیع کام ہوا ہے۔ غالب پر ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری سے عبد اللطیف تک، پروفیسر رشید احمد صدیقی سے آفتاب احمد خاں تک سبھی نے لکھا ہے۔ یہ کئی نوع کی تحریریں ہیں۔ ہر بڑی تحریر میں خواہ وہ سوفوکلیز یا شیکسپیئر کی ہو، رومی یا حافظ کی ہو، غالب یا اقبال کی ہو، شرفِ انسانی پر زور رہتا ہے۔ اس کا وسیلۂ اظہار کبھی ایک تمثیل، کبھی ایک غزل، کبھی تصوف کی آگہی، کبھی ایک ذاتی ادراک کی اعلیٰ منزل رہی ہے۔ ذاتی ادراک کا فکری اُفق، اور انانیت کی تعمیر ایک محکم نظامِ فکر کی شرکت سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسی انانیت جس کی نکتہ رسی تصورِ حیات کو آفاقیت دے، اس کا قالب شخصی ہوتا ہے۔ مگر وہ ایک پوری تہذیب کی علامت ہوتی ہے۔ یہ انانیت ایک عرفان کا درجہ رکھتی ہے۔

سلیم احمد نے مسکراتے ہوئے جب اپنی کتاب "غالب کون" مجھے دی تو میں نے ان سے کہا کہ فراق صاحب اور عسکری صاحب کا اختلاف مجھے معلوم ہے۔ فراق غالب کی نفاست طبع، فراخ ذہنی اور شگفتگی کلام سے گریزاں ہی نہیں بلکہ ایک حد تک خائف تھے۔ یہ دو الگ ذہن ہیں، دو الگ مزاج کے لوگ ہیں۔ مگر تمہاری تنقید سے یہ معلوم ہو گیا کہ غالب کی فکر کتنا گراں مایہ مواد فراہم کر سکتی ہے۔ اس کا ذہن اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ ایک منزہ فکر تمام علائق، حادثات اور

واقعات کے دائرے سے نکل کر زندگی کی متضاد کیفیات کو لاتعلق ہو کر کیونکر دیکھ سکتی ہے۔ اردو کے کسی شاعر کے یہاں فکر کا یہ وجود نہیں ہے۔ غالب نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ایک خاص جذبہ اور احساس جو شخصی ہوتا ہے، ایک تمنا جس کی ایک زمانی مدت ہوتی ہے۔ ایک خواہش جس میں ایک تپش ہوتی ہے یعنی وہ سارے عناصر جو ایک آدمی کی داخلی زندگی میں آتے ہیں۔ ایک منزہ شعور انسانی کے لیے خارجی ہوتے ہیں، وہ فکر جو ان کو دور سے بازیگری میں مبتلا دیکھ سکتی ہے سا لیسی ہی فکر کو "توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا" کہنے کا حق ہوتا ہے۔ اس کی فکر کسی قدر غیر مشروطی بنیادوں پر حیات وکائنات پر ایک اپنا نقطۂ نظر رکھتی ہے —— اگر تم نے اس نقطہ نگاہ کو غلط سمجھا ہے یا اس سے اختلاف کیا ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں اختلاف کے بڑے بڑے پہلو نکل آتے ہیں، صرف یہی ایک دنیا ہے جس میں فکر پر کسی نوع کی پابندی نہیں ہے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک عجیب اتفاق ہے کہ مغل تہذیب بھی اور اس میں تعلیم و تربیت کا نظام بھی ایک آزادی فکر کی طرف رغبت رکھتا تھا۔ بس اسی طرح کی باتیں ان سے ہوتی رہیں، اور پھر میں نے انہیں غالب کا ایک شعر سنایا:

پوچھو ہو کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

وہ بیتاب ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔

سلیم احمد جدید شعرا میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے لب ولہجہ کے متعلق احمد ندیم قاسمی صاحب کی رائے سے جو ان کی کتاب اکائی میں درج ہے، اکثر ناقدین کو اتفاق ہے۔ ان کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا تھا جو ان کے مزاج سے ہم آہنگ بھی ہے۔ ان کی غزل میں یگانہ، فراق اور حسرت کا تاثر ہے۔ یگانہ سے کچھ اصلاح بھی انہوں نے لی تھی۔ یہ یگانہ کے آخری دور کی بات ہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے بیاض اور اکائی شائع ہو چکے ہیں۔ اکائی میں کچھ نظمیں اور قطعات بھی ہیں۔ ان کی ۵۰ تازہ غزلوں کا ایک مجموعہ "چراغ نیم شب" میں ان کی اس بیتابی اور کیفیت کا اظہار ہے جس سے وہ اپنی وفات سے پہلے گزر رہے تھے۔ وہ ایک ایسے موڑ پر تھے جہاں بیداری اور خواب کی حدیں مل جاتی ہیں۔ ایک ہوا تھی جو انہیں راتوں کو جگاتی تھی۔ سکون نا آشنا رکھتی تھی۔ وہ اپنے اندر بھی کچھ ڈھونڈتے تھے اور باہر بھی تلاش کرتے تھے، مگر محور وہی ایک بیتابی تھی جس پر شکست کا احساس غالب تھا۔ ان غزلوں میں بھی ایک شکست کا احساس ہے۔ ان غزلوں میں ان کے دل کی دھڑکن اندر کی فنی چابک دستی پر حاوی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ بیاض اور اکائی میں

یہ کیفیت نہیں ہے مگر ان کتابوں میں فکر ایک شعوری اور اختیاری رنگ لیے ہوئے ہے جس میں ان کی مشق اور پختہ کاری کو دخل ہے۔ "چراغ نیم شب" ایک خلوتی شکست کی خود کلامی ہے۔ اسی احساس شکست کی رو میں کئی سالوں سے وہ ایک طویل نظم کہہ رہے تھے۔ اس کا عنوان ہے "مشرق ہار گیا"۔ اس نظم کے چند حصے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دس بارہ ہزار مصرعوں پر مشتمل ہے اور بڑی حد تک نظم آزاد کے پیرایہ میں ہے۔ اس کا بنیادی خیال ان کے اس جذبے سے منسلک ہے کہ مغربی افکار کے تسلط سے مشرق پسپا ہو گیا ہے۔ ان کے اثر نے مشرق کو بے بس کر دیا ہے۔ پروفیسر کرار حسین صاحب نے اس نظم کے متعلق بہت فکر انگیز بات کہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "روایت اور مشرقیت سے سلیم کو جو وابستگی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے "مشرق ہار گیا" لکھ کر اپنے قلبی محسوسات کا اظہار کیا ہے۔" مشرقیت کی شکست کا احساس ان کا آخری موضوع سخن تھا۔

ہم جس معاشرے میں زندہ رہتے ہیں، جس تہذیب کے پروردہ ہوتے ہیں، جن خوابوں کی رو میں زندگی گزارتے ہیں، ان کا ایک ذاتی رُخ بھی ہوتا ہے۔ حلقہ احباب، کچھ بڑے لوگ، وہ بات جنہوں نے ہمیں سنوارا ہے۔ وہ صحبتیں جن سے ہماری فکر کی آبیاری ہوئی۔ تا دیر ہمارے ساتھ منزل بہ منزل آتی رہتی ہیں۔ سلیم احمد کے خیالوں میں جو یہ جلتی بجھتی ہوئی شمع کافوری کی ضو دور دور تک ہے، وہ بھی کچھ صاحبانِ فکر کے قرب کا اثر ہے۔ ان میں سب سے پہلا نام پروفیسر کرار حسین صاحب کا ہے۔ کرار حسین صاحب کا شمار ان کے اساتذہ میں بھی ہوتا ہے اور جگ استاد میں بھی، ان کی شخصیت اور فکر سے سلیم بھی متاثر تھے اور دوسرے ادیب و شعرا بھی ہیں۔ دوسرا وقیع نام مولانا ذہین شاہ یوسفی تاجی کا ہے جو ایک عالم اور صوفی بزرگ تھے جن سے انہوں نے فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کی تفسیر و تشریح سنی تھی۔ ان کے بزرگ دوست پروفیسر محمد حسن عسکری جن کی فکری رہبری کا ذکر ان کی تحریروں میں اکثر آتا ہے، ان سے بہت قریب تھے۔ ادب کی کچھ نامور شخصیتیں ان کے خاص حلقہ احباب میں تھیں۔ ان میں پروفیسر مجتبیٰ حسین، مرزا جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور راحد ہمدانی ہیں۔ ان صاحبان سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال میں ان کا اچھا وقت گزرا ہے۔ یہ سب ان کے قریبی دوست بھی ہیں اور ان کی نظم و نثر کے اچھے پارکھی بھی۔ اتفاق و اختلاف کے عمل سے الگ جو محبت ان سب سے سلیم کو تھی اور ان سب کو سلیم سے، وہ تہذیب انسانی کی نفاست کا ہی ایک رُخ ہے۔ مولانا اصلح الحسینی بھی جو عربی اور فارسی کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، ان سے قریب تھے۔ ان کے شہر میرٹھ کے حلقہ یاراں میں انتظار حسین صاحب، قیام صاحب، اور ثمر نظامی

صاحب بھی ان کے خاص احباب ہیں۔ وہ نئے لوگوں میں گھل مل جاتے تھے، بڑے تپاک سے ملتے تھے آنے والے ان کا کام کرتے تھے، وہ ان کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ وہ ان کی تخلیقات میں دلچسپی لیتے تھے بحث کرتے تھے، نکات ادب بتاتے تھے۔ ان پر مضامین لکھتے تھے۔ اس حلقہ میں جاذب قریشی، سجاد میر، طاہر مسعود، باسط عظیم شامل تھے۔ ان کے بہت سے ہم خیال اور رفیق اور ہوں گے مگر ان کے گھر کی آبادی میں ان کے پیارے بچوں اور ان کی اہلیہ کی رفاقت ہزار گردشوں میں ایک عافیت کا محور تھی زندگی کا وہ اعتبار، وہ امیدیں جو ان کے ہر وقت کے اضطراب میں اُن کی سپر ہو جاتی تھیں، آخر کار اُن کے گھر کی پر سکون فضا کا ایک تسلسل تھیں۔

سلیم احمد کا ذوقِ تجسس خود ان کے لیے آزمائش کا باعث ہوتا تھا۔ ان کی جستجو کا رخ ایک ایسے پیچیدہ عہد میں جب بہت سی فیصلہ کن باتیں صاحبانِ فکر کی صف آرائی سے الگ بھی اپنی تلوار کی دھار رکھتی ہیں۔ ہمیشہ ایک ادبی رزم گاہ کی طرف لے جاتا تھا اپنی مرگ ناگہانی سے دو ایک ماہ پہلے انہوں نے ایک نشست میں کئی سفاک سوالات اٹھائے تھے جن کی رمزیت ادب اور معاشرے اور صدی کے فکری پیمانوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ وہ اس بات سے محرمانہ واقفیت رکھتے تھے کہ ان سوالات کی تہ بہ تہ پیچیدگیوں سے گزرنے میں کتنی مشکلیں پیش آئیں گی۔ مجھے خاموش پاکر وہ گفتگو کرنے لگتے۔ ان کی گفتگو کے چند نکات وہی تھے جو انہوں نے اپنی وفات سے چند ہفتے پہلے لکھنے شروع کیے تھے مگر بنیادی فرق یہ تھا کہ ان کا ذہن از سر نو تمام مسائل کا تازہ ترین جائزہ چاہتا تھا، بلکہ اس پر ایک ایسی تنقید جو ان کے ذہن میں ایک نیا خاکہ تیار کر رہی تھی۔ اپنی گفتگو کو منطقی سانچوں میں ڈھالنے کے لیے انہوں نے سوالات کے مختلف حصوں کو چند جملوں میں تقسیم کر دیا، کیا اس صدی کے ادب نے ہمیں دوسرے ادوار کے ادب سے کچھ مختلف چیزیں دی ہیں۔ کیا ہیں قومی سیاست کی سرد جنگ سے الگ خالص فکر کا کوئی ایسا پیمانہ ہے جس سے پوری نوع انسانی متاثر ہو سکے۔ کیا تاریخ میں کوئی ایسا عہد تھا جو جنگ سے خالی تھا، کیا ہمارے معاشرے میں ایک تعطل کا دور ہے اب فکر کا کیا رُخ ہونا چاہیے۔ میں نے ان سے کہا، سلیم احمد

رات آدھی ہوئی نیّتِ شبِ حرام

بوئے گل، حرفِ پیمان سلامت لیے!

دنیا میں ماضی قریب میں جو انقلابات ہوئے ہیں۔ یعنی اس صدی میں اُن کا حال تو یہ ہے کہ پیرس میں بیٹھے ہوئے ایک نیم ناقد کش دانشور نے روس کی رہبری کی۔ چین میں ایک کتب خانے

کے لائبریرین نے ساری قوم کو ۲۵ سال تک لانگ مارچ پر لگا دیا۔ ہندوستان میں ایک سیاسی رشی کے مرن برت نے حکومتِ برطانیہ کو ہراساں کر دیا۔ اس صدی کے فکری افق پر جرمنی کے ایک جلاوطن ریاضی دان نے بغیر کسی معمل یا رصدگاہ میں داخل ہوئے پیڈ اور پنسل کی مدد سے ایسی اتنی مساوات لکھ دیں جس نے وقت اور مقام کا تصور بدل دیا۔ ایک دوسرے جلاوطن ماہرِ طب نے دماغ کو شعور اور لاشعور میں تقسیم کر کے اچھے اچھوں کو Odepus Complex میں مبتلا کر دیا۔ اس صدی کا وقت دو مہیب جنگوں، ہیروشیما اور ناگاساکی، ایشیا اور افریقہ کے کئی ملکوں کی آزادی، پکاسو، میتناسی، پاف لاط، عبدالرحمٰن چغتائی کی مصوری، نجنسکی، مارگریٹ، فانٹین کے رقص، آندرے ژید اور سارتر کی تحریروں، پال ویلری، ٹیگور اور اقبال کی شاعری میں گزر گیا۔

رات آدھی ہو چکی ہے اب سو جاؤ، باقی حصہ کا جواب تمہارا خواب خود دے دے گا۔

اور اب وہ سو گئے ہیں اور ایسی نیند سے آخر کس نے کس کو اٹھایا ہے!

○

آہ! پیغمبرِ سخن و ادب

۱۹۸۳ء

(انور جاوید)

پروفیسر مجتبیٰ حسین

سلیم احمد

کراچی ــــ ۴۸ء کی ایک شام ــــ برنس گارڈن کے ایک گوشے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی نشست لان پر ہو رہی تھی۔ اس وقت تک انجمن کا کوئی دفتر نہیں تھا۔ ظہور نظر، ریاض روفی، اشرف علی (مقدور ہی تو نہیں ہے ــــ) اور اس وقت کے جمیل الدین عالی اور کئی اور ادیب شاعر موجود تھے۔ جب مضامین پڑھے جا چکے اور ان پر بحث ختم ہو چکی تو ایک سانولے سلونے نوجوان نے ایک آزاد نظم سنائی جس کا پہلا مصرعہ اب تک یاد ہے۔ "بس ایک ضربِ سنگ میں وہ مر گیا۔ ــــ میں نظم سنتا رہا اور اس نوجوان کا چہرہ دیکھتا رہا ــــ جو نظم سے زیادہ اثر آفریں اور مرتب تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور جائزہ لیتی ہوئی ایک روشنی ــــ قدرے شوخ۔

نظم ختم ہوئی تو نظم پر بحث چھڑی۔ شاعر نے جس لہجے میں جوابات دیے اس میں تیکھا پن اور شعر و ادب کے رموز و نکات سے آگاہی تھی۔ ایک اور چیز بھی اس لہجے میں تھی ــــ تہذیبی روایات کا رچاؤ۔

نشست ختم ہوئی اور جب میں شاعر سے ملا تو علم ہوا کہ اس کا نام سلیم احمد ہے ــــ اور اس کے بعد سے سلیم احمد سے جو ربط قائم ہوا وہ ان کے مرنے کے بعد بھی برقرار ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا جلسہ برنس گارڈن سے اٹھ کر اب بندر روڈ کی ایک عمارت میں ہونے لگا جس میں سلیم برابر شرکت کرتے رہے۔ وہ اس انجمن کے رکن بھی بن گئے تھے ــــ جب کبھی ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند ادب کی گفتگو چھڑتی تو مذاق سے کہتے ــــ "آپ گواہ رہیے گا ــــ میں نے رکنیت سے استعفا کبھی نہیں دیا ــــ" اور میں جواباً کہتا "سے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔"

اب انجمن میں اچھی خاصی رونق ہو چلی تھی۔ بہت سے لکھنے والے باقاعدگی سے شرکت کرنے لگے تھے۔ عزیز حامد مدنی بھی ہندوستان سے آچکے تھے —— اور ان کے آنے سے انجمن کی ادبی بحثوں میں مزید جہتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ سلیم احمد نے اس زمانے میں غزلیں پڑھنے کے علاوہ کئی طویل مضامین بھی پڑھے —— ان مضامین میں ترقی پسند تحریک، ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تنقید پر سخت نکتہ چینی ہوتی۔ بحث کے دوران بڑی گرما گرمی ہوتی۔ سلیم چونکھی لڑتے —— اور پسپا ہونے کا نام نہ لیتے۔ یہ بحثیں کسی کو پسپا یا ظفریاب کرنے کی غرض سے ہوتی بھی نہیں تھیں۔

سلیم احمد کی تحریروں میں اُسی وقت سے اتنی پختگی اور خوش اسلوبی آچلی تھی۔ وہ بنے بنائے اور رائج الوقت ادبی معیاروں کو ماننے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ اُس وقت تک وہ ادبی مباحث میں فریق نہیں بنے تھے۔ ترقی پسند ادب کے نہ مخالف تھے نہ موافق —— وہ صرف اچھے ادب کے موافق تھے —— اور اچھے ادب کے موافق وہ ہمیشہ رہے —— محمد حسن عسکری کے متشددانہ ادبی نظریات کا اثر اُن پر نہیں پڑا تھا۔ عسکری کی تحریریں موقع محل کے لحاظ سے کئی دور اور مختلف نظریہ سازیوں کی شکست و تشکیل سے گذری ہیں۔ کرشن چندر کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف اور کرشن چندر کی اہانت آمیز تنقید دونوں ان کے قلم کی کرشمہ سازی ہے۔ "جھلکیاں" سے البلاغ تک کی منزل بہت طویل تھی، مغربی ادب، اسلامی ادب، پاکستانی ادب اور آخر میں عسکری ادب یہ ان کے ذہنی سفر کا حاصل ہے۔ یہاں عسکری سے بحث مقصود نہیں ہے۔ یہ اشارے اس لیے کر دیئے گئے ہیں تاکہ سلیم احمد کے انتقادی ادب کا اگر کوئی جائزہ لے تو شاید اُن اثرات کی نشاندہی کر سکے جو محمد حسن عسکری کی وساطت سے سلیم کی تحریروں میں کئی جگہ بعد میں پائے جاتے ہیں۔

سلیم احمد اُس وقت جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، تازہ تھے، قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے" آچکا تھا —— اور بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا تھا —— تہذیبی روابط کا جو گہرا رومانی احساس قرۃ العین کے ناولوں میں پایا جاتا ہے اور جس کی شکست کی المناکی کا شاہکار "آگ کا دریا" بن گیا ہے —— وہ "میرے بھی صنم خانے" سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ناول سلیم پڑھ بھی رہے تھے، پڑھا بھی رہے تھے اور اس پر یاروں کی محفل میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔!

سلیم اس وقت بہار کالونی مان روڈ پر رہتے تھے۔ یہ غالباً ۵۰ء کا زمانہ تھا۔ میں بھی جہانگیر روڈ سے بہار کالونی منتقل ہو چکا تھا۔ بہار کالونی میں عسکری بھی تھے۔ سلیم کے یہاں سرِ شام ادبی

نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ سلیم ہر نشست میں تازہ غزلیں سناتے۔ ان کی غزلوں میں کہیں فراق، کہیں حسرت اور کہیں یگانہ نمودار ہوتے رہتے۔ میرے خیال میں جدید، قدیم اور برہنہ گفتاری کے یہ تینوں مرحلے ان کی نثری اور شعری تحریروں میں برابر آتے رہے ــــ ان کی غزلوں میں اس وقت ایک دبا ہوا "روحانی عشقیہ جذبہ" اُبھرتا رہتا تھا ــــ یہ سلیم احمد کی بڑی بابت اور پُر دل آویز پہچان تھی ــــ معلوم نہیں کیوں انہوں نے اسے کچل دیا ــــ اس سے ان کی غزلوں کو کلاسیکی رچاؤ اور پختگی ضرور ملی مگر "اسقاط" کے اس دانستہ عمل نے ہم سے وہ سلیم چھین لیا جو بیک وقت طلسم ہوشربا کا بھی عاشق تھا اور "میرے بھی صنم خانے" کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

بہار کالونی میں سلیم سے میری ملاقات روز ہو جاتی تھی ــــ میں نے اسے ملاقات تو کہہ دیا ــــ مگر فی الحقیقت ــــ یہ کوئی اور ہی چیز تھی ــــ یہ ایک قسم کی مشترکہ پڑھائی تھی ــــ کتابوں کی، ہندوستان کی، پاکستان کی، اور اپنی اپنی جوانیوں کی ــــ گفتگو میں طویل نظموں، مختصر غزلوں اور رباعیوں کا رنگ ہوتا ــــ کوئی بات نہ ختم ہوتی نہ شروع ــــ بس ایک سلسلہ تھا جو "کل اور آج" سے بے نیاز تھا ــــ اس گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا جیسے جتنی چیزیں ہم کھو چکے ہیں ــــ وہ ہمیں پھر مل گئی ہیں ــــ ہر تہذیبی احساس جاگ اٹھتا ہے ــــ ساون کی گھٹا ٹوپ اندھیری رات ہے ــــ کبھی اُمس، کبھی بارش کی جھڑی ــــ چارپائیاں کبھی صحن میں، کبھی برآمدے میں ــــ پھر صبح ــــ دُھلی دُھلائی ہوئی ــــ زمین نم ــــ جس میں رات کے پچھلے پہر اور پَو پھٹنے کی ملی جلی مہک ــــ چڑیوں کے گیت ــــ حمد، نعت اور منقبت ــــ پھر دوپہر ــــ سڑی ہوئی گرمی ــــ اور پچھم کی طرف سے ہلکے ہلکے بادلوں کا پیغام ــــ کہ ہم آ رہے ہیں ــــ نیم کی پتیوں پر انتظار کا ہلکا سا رنگ ــــ پھر بادل گھرنے لگے ــــ پتوں پر انتظار کا رنگ اور گہرا ہو گیا ــــ پھر گھٹا اُمڈ پڑی ــــ اور نیم کی پتیوں کا رنگ ــــ !! جوش صاحب کے بقول ـ "الحفیظ والاماں" ــــ شام ہو گئی لالٹین جل گئی ــــ چولہوں میں آگ ــــ سرکنا دوپٹہ ــــ دمکتے چہرے ــــ الف لیلہ ــــ "حاتم طائی" ــــ اور "کجری"

میں نے سلیم کو ایسی فضا میں پایا ــــ وہ زمانہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ہمارے لیے مالی اعتبار سے بڑے ابتلا کا تھا ــــ مگر سلیم سے مل کر اُن سے باتیں کر کے، سب کچھ بھول جاتا

بڑی غمگساری تھی ان میں۔ ان کی اس چیز پر عسکری صاحب بھی چھاپا نہیں مار سکے ۔۔۔ دکھ بانٹنے اور دوسروں کے کام آنے میں انہیں میں نے لمحہ بھر کے لیے بھی تامل کرتے نہیں دیکھا۔ شیرانی بہنی اور روانہ ہو گئے۔ کام نے پایہ بنے وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ۔۔۔ ان کی تہذیبی شخصیت بڑی پائیدار تھی ۔۔۔ دوستوں کو دیکھ کر ان کا چہرہ کھل اٹھتا

سلیم کا یہ چہرہ ہمیشہ کھلا رہا ۔۔۔ اس وقت بھی جب بلڈ پریشر کی وجہ سے چہرہ پہ آماس آ گیا تھا۔ اس کی دلربائی میں کوئی کمی نہیں آئی ۔۔۔ بے ساختہ ہنسی پھر ہنسی تیز ہوتی ۔۔۔ کمرے میں قہقہہ گونجتا ۔۔۔ غم رفوچکر ہو جاتا ۔۔۔ روگ کٹ جاتا ۔۔۔ سلیم اور آنے والا دونوں تندرست اور توانا، شاداں اور فرحاں نظر آنے ۔۔۔ ان کے اندر ۔۔۔ وہ جوان کی تہذیب تھی وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی۔

ہمارکالونی ہی میں سلیم کا ریڈیو سے ربط ضبط پیدا ہوا۔ بعد میں وہ مستقلاً ریڈیو کے ہو گئے ۔۔۔ مدنی بھی ریڈیو میں ملازم ہو چکے تھے اس وقت ریڈیو اسٹیشن انٹیلیجنس اسکول میں تھا۔ وہیں سلیم سے دوسرے تیسرے روز ملاقات ہوتی ۔۔۔ مدنی کے کمرے میں ۔۔۔ بڑی تند و تیز ادبی بحثیں ہوتیں ۔۔۔ غزلیں سنی اور سنائی جاتیں۔ تنقید، تنقیص اور تحقیر سارے مراحل طے کرنے کے بعد چائے پی جاتی ۔۔۔ اور سارا غم روزگار چائے کی پیالی اور باتوں میں اڑ جاتا۔

چائے سلیم بہت پیتے تھے ۔۔۔ بلکہ بے تحاشا پیتے تھے ۔۔۔ سگریٹ نوشی کا بھی یہی حساب تھا۔ جاڑے میں تاش کے ساتھ مونگ پھلی چلتی۔ نمک ٹرے میں رکھا ہوتا ۔۔۔ لطیفے قہقہے اور تاش کی بازی

پھر صبح کو پیٹ پوجا ۔۔۔ شام کو ۔۔۔ کراچی کی شام اُس وقت اجلی ۔۔۔ نہیں تھی ادب کبوتروں کی اقسام پر باتیں ۔۔۔ پتنگ بازی میں کامیابی کے اسرار و رموز اور کبھی کبھی دوسروں کی غیبت اور قہقہے

عجیب دن تھے وہ بھی۔ ساری فکر مندی کے باوجود کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔ پاکستانی سیاست میں ابھی کدورت اور عناد کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا۔ البتہ ادب میں رنجش بجا کی ابتدا ہو چکی تھی ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں ٹھن گئی تھی۔ ادیب کی وفاداری اور غداری کی باتیں پھیلائی جا رہی تھیں ۔۔۔ مگر سلیم احمد میں غیر ادبی رجحانات شاذونادر ہی پائے گئے

وہ ترقی پسند ادب کے جارح نکتہ چین تھے ــــ مگر ذاتی تعلقات میں وہ سلیم احمد تھے۔ سلیم احمد سے ادب کے علاوہ دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں ہوتی تھیں ــــ بالخصوص مذہبیات پر ــــ مجھے دیکھتے ہی آغوش وا کئے ہوئے ــــ آنکھوں میں محبتیں انڈیلتے ہوئے نعرہ لگاتے ــــ "آیئے سید صاحب!" پھر ہم گلے ملتے ــــ اور میں کان میں کہتا ــــ "آج مناظرہ ہوگا؟" ــــ خوش ہو کے کہتے "ہاں ہاں ــــ مگر پہلے تنقیحات قائم کرلی جائیں ــــ" میں کہتا وہ تو چودہ سو برس سے قائم ہیں" ہنستے ــــ "اچھا ــــ کون کون سی؟" ــــ میں پھر کان میں کہتا ــــ چار تنقیحات ہیں" ــــ بڑے زور سے ہنستے۔ اور دیر تک سینے سے لپٹائے رہتے۔

سلیم احمد سا خوش ذوق آدمی بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ شعر میں ذرا سا بھی سقم ہو، حرفوں میں ذرا سا بھی جھول ہو، سلیم کی نظر فوراً اس تک پہنچ جاتی۔ سلیم کے اشعار اور ان کی نثر ان کی خوش ذوقی، سخن طرازی، نکتہ آفرینی اور جملہ سازی کی بین دلیل ہے ــــ محمد حسن عسکری کی وسعت مطالعہ تسلیم، مگر میرے خیال میں وہ ایسی ادب آفریں اور سخن گسترانہ نثر لکھنے پر قادر نہیں تھے جیسی سلیم کے یہاں ملتی ہے ــــ اس پر مستزاد یہ کہ سلیم کا ذوق شعر نثر کو غیر سنجیدہ بنائے بغیر اس میں "لطف سخن" پیدا کر دیتا تھا ــــ میں سلیم کو کبھی کبھی چھیڑتا بھی، ایسا کرو ــــ کبھی عسکری سے اشعار کو موزوں پڑھا کر سنوا دو ــــ وہ اشعار ــــ یا ان شاعروں کے اشعار نہیں جن پر عسکری صاحب محنت سے کام کر چکے ہیں بلکہ ایسے شعرا کا کلام جو ان کی نظر سے نہیں گزرا ــــ اگر پہلی بار موزوں پڑھ لیں تو میں ان کے ہر نظریے کو تسلیم کیے لیتا ہوں ــــ کاغذ پر اسٹامپ کر دیتا ہوں ــــ"

سلیم خفا نہیں ہوتے، ہنس پڑتے ــــ عسکری سے انہیں بڑی عقیدت تھی ــــ مگر وہ عسکری سے الگ ہو کر بھی سوچنا اور لکھنا جانتے تھے ــــ سلیم احمد کی گفتگو اور تحریر دونوں فکر انگیز اور کبھی کبھی اشتعال انگیز ہوتی تھیں۔ وہ آدمی کو چھیڑتے تھے، اکساتے تھے ــــ ادبی مسائل کی وساطت سے جملہ معاشرتی مسائل کی طرف توجہ دلاتے تھے ــــ ان کا اسلوب "حجتی" تھا ــــ زندہ، بے باک، ادب شناس۔ ثقافتی اقدار سے معطر!

وہ ایک تہذیب تھے ــــ سلیم سے مل کر ــــ تم ظریفی دیکھیے ــــ حالی یاد آتے تھے۔ ــ

ملتے ہی اُن سے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

ان سے گھنٹوں صحبت رہی ہے —— مگر سیری کبھی نہیں ہوئی —— خلوت ہو یا جلوت میں نے سلیم کو ایک سا پایا —— اندر سے وہ بہت مغموم اور ایک حد تک پریشان تھے —— مگر لبوں پر تبسم، وضع داری کا نہیں —— دل کی کشادگی کا ہر وقت استقبال کو موجود رہتا ہے

بہار کالونی سے سلیم جہانگیر روڈ آگئے —— وہاں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں —— پھر جہانگیر روڈ سے انچولی چلے گئے —— میرے گھر سے انچولی کا محلہ ذرا دور تھا۔ اس لیے ملاقات کم ہوتی تھی —— پھر میں کوئٹہ آگیا —— اور سال میں ایک دو بار ملنا ہوتا —— آگے آگے سید صاحب! سلیم دونوں ہاتھوں کو پھیلائے آگے بڑھتے۔ میرٹھ، بارہ بنکی، فیض آباد، جونپور لکھنؤ۔ دلی۔ اور کراچی کتنی منزلیں آگے بڑھتے ہوئے قدم چشم زدن میں طے کر لیتے۔

برادر عزیز شمیم سلمہٗ یہاں کوئٹے میں میرے رفیق کار تھے۔ ان سے سلیم کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی کبھی اطمینان بخش، کبھی تشویشناک۔ جب شمیم یہاں سے جامعہ کراچی چلے گئے تو اپنے ساتھ ایک حصہ سلیم کا بھی لے گئے

گزشتہ سال ماہ ستمبر (۸۳ء) میں ایک کام سے کراچی جانا پڑا۔ شام کو پہنچا۔ نہا دھو کے سب سے پہلا کام شمیم کا گھر تلاش کرنا تھا۔ مدت سے ملا نہیں تھا۔ چنانچہ میں محمد رئیس سلمہٗ (میرے بہت عزیز شاگرد اور دورِ حاضر کے بڑے خوش گو شاعر) کے گھر گیا تاکہ ان کو لے کر یا ان سے پوچھ کر شمیم کے گھر جاؤں۔ رئیس گھر پر نہیں تھے —— ان کی بیوی نے بتایا کہ سلیم احمد صاحب کا آج صبح انتقال ہو گیا ہے۔ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ میں سلیم احمد کے گھر پہنچا —— وہ واقعی جا چکے تھے —— دوست احباب عزیز اقارب انہیں کراچی کی خاک کے سپرد کر کے لوٹ آئے تھے

تیز ہوا چلی —— سارے پھلیندے زمین پر آ رہے۔ کبوتر راستہ بھول کر بھٹکنے لگے الگنی پر پھیلائے ہوئے کپڑے اڑ کر زمین پر آ رہے اور مٹی میں اٹ گئے۔ باہر گھڑونچی پر رکھی ہوئی صراحی گھڑونچی سمیت زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئی —— زمین نے تھوڑی دیر میں پانی کو جذب کر لیا۔

انتظار حسین

ادھوری تصویریں

کتنے دنوں سے میں سلیم پر لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کتنی مرتبہ ساتھ گزارے ہوئے دنوں کو حافظے میں زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دنوں کے ساتھ اپنی آنکھ مچولی چل رہی ہے۔ آس پاس منڈلانے لگتے ہیں جیسے اب آئے پکڑے میں۔ مگر آتے آتے ایک دم سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ میں تو یادوں ہی کا شناور ہوں۔ یہاں ایسا کیوں ہے۔ شاید اچانک چلے جانے والے یادوں میں جلدی واپس نہیں آیا کرتے یا میری یادیں سست رو ہیں۔ منور ہونے میں بہت ہیں وقت لگاتی ہیں یا ممکن ہے سلیم کو یادیں کر واپس آنے میں ابھی تامل ہو۔

بہت کوشش سے کچھ دھندلی دھندلی تصویریں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ فی الحال وہی سہی۔

پہلی تصویر۔ فیض عام انٹر کالج میں ایک ادبی شام۔ ایک کم عمر طالب علم چپ چاپ سا بیٹھا ہے باری آنے پر شعر سناتا ہے۔ رنگِ اقبال میں رنگے ہوئے قطعات۔

دوسری تصویر۔ وہی طالب علم خاکی کرتا پاجامہ۔ کاندھے پر بیلچہ۔ چپ راست۔ چپ راست۔ چپ راست۔

یہ تصویر بھی اپنا آگا پیچھا بنائے بغیر دھندلا جاتی ہے۔

تیسری تصویر۔ بیلچہ غائب۔ خاکی کرتا پاجامہ ندارد۔ وہی عام سا سفید کرتا پاجامہ۔ یاروں کی منڈلی جمی ہوئی ہے۔ لطیفہ بازی ہو رہی ہے۔ منڈلی میں کوئی شاعر، کوئی ہاکی کا کھلاڑی، کوئی قاری، میرا اس منڈلی میں کیسے گزر ہوا۔ اس نوخیز سے کہ نام سلیم احمد تخلص ہنر رکھتا ہے کیسے تعارف ہوا کیسے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ میرا فیض عام سے کیا تعلق۔ میں میرٹھ کالج کی مخلوق ہوں مگر

مگر ایسی مخلوق جو کسی ٹکڑی کسی منڈلی میں شامل نہیں ہے۔ ہاں اب اس منڈلی سے مانوس ہوتا چلا جا رہا ہوں۔

یہ تصویر بھی جلدی دھندلا جاتی ہے جو نئی تصویر ابھرتی ہے اس میں شاموں کا طور بدلا ہوا ہے اب شہر میں عسکری صاحب وارد ہو چکے ہیں ہم حیران ہو کر دیکھتے ہیں کہ اچھا یہ 'حرامجادی' اور 'جھلکیاں' والے محمد حسن عسکری ہیں، پھر ان کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو اب شامیں عسکری صاحب کے لیے وقف ہیں۔ روز بلا ناغہ ان کے ہمراہ لمبی ٹہل ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس ٹہل کی ایک منزل ٹھہرتی ہے۔ کرار صاحب کا گھر جس کا مردانہ علامہ مشرقی سے بچھڑے ہوئے نوجوان خاکساروں کا مہمان خانہ بھی ہے۔ ہفت روزہ 'الامین' کا دفتر بھی' اردو میں ایم۔ اے کرنے والوں کا کلاس روم بھی اور یاروں دوستوں کی بیٹھک بھی۔ تو روز شام کو ہم گھومتے پھرتے وہاں پہنچتے۔ لمبی بیٹھک کی، رات پڑے واپس۔

اچانک روز و شب کا رنگ بدلتا ہے۔ قریب و دور سے فسادات کی خبریں آ رہی ہیں۔ میرٹھ کی فضا کشیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ گڑھ مکتیشر کے سانحے کے رد عمل میں یہاں ابھی پچھلے دنوں ایک فساد بھی ہو چکا ہے۔ سو اب فضا میں بہت تناتنی ہے۔ دن تو خیریت سے گزرتا ہے مگر شام کے بعد کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس وقت اکیلے دکیلے آدمی کے ساتھ کیا واردات گزر جائے۔ سو زندگی کا یہ طور ٹھہرا ہے کہ دن دن میں باہر کے سارے کاموں سے فراغت حاصل کی اور شام ہوتے ہوتے لپک جھپک اپنے اپنے گھروں کو واپس۔ پھر اپنے اپنے گھروں میں بند۔ اپنے اپنے محلے میں مقید۔ مسلمان کی مجال نہیں کہ شام کے بعد ہندوؤں کے کسی بازار سے گزر جائے، کسی محلے میں قدم رکھے۔ ادھر ہندو کی ہمت نہیں کہ مسلمانوں کے محلے میں گزر کرے۔ مگر عسکری صاحب کے گھر کا انوکھا جغرافیہ ہے ہندوؤں کا لمبا بازار۔ دائیں بائیں دکانوں کے عقب میں ہندو گھر۔ ایک نکڑ پر جا کر ایک گلی آتی ہے جس میں تین چار مسلمان گھر ہیں انہیں میں ایک گھر عسکری صاحب کا ہے۔ ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ شام سے پہلے اٹھ لیں۔ مگر کرار صاحب کی گفتگو ہمیں باندھے رکھتی ہے۔ تحصیل والی سڑک کے نکڑ پر پہنچتے پہنچتے رات ہو جاتی ہے۔ پھر عسکری صاحب اپنی راہ اور میں اور سلیم اپنی راہ کہ ہم خیر نگر سے ادھر گھنٹہ گھر کے پار اس علاقے میں رہتے ہیں جو خالصتاً مسلمان علاقہ ہے

"یار سلیم یہ راستہ تو بہت خطرناک ہے۔ کہیں اردو ادب کا نقصان نہ ہو جائے۔" عسکری صاحب کو نکڑ پر چھوڑ کر واپس ہوتے ہوئے میں نے کہا

سلیم نے قہقہہ لگایا۔ "اردو ادب خطرے میں ہے۔"

رفتہ رفتہ ہم سنجیدہ ہوتے گئے۔ پھر ہم نے طے کیا کہ کل سے ہم عسکری صاحب کو ان کے گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔

دوسرے دن ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے ہیں۔ بازار کے نکڑ پر پہنچ کر عسکری صاحب ہم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم ساتھ لگے چلے جا رہے ہیں۔ دکانیں تیزی سے بند ہوتی چلی رہی ہیں۔ لوگ کتنی تیزی میں ہیں۔ جب ہم واپس ہوتے ہیں تو پورا بازار بند ہو چکا ہے۔ سڑک اندھیری ہے۔ دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک نکڑ پر اپنے پرانے ٹھکانے پر گول گپوں والا اپنا خوانچہ جمائے بیٹھا ہے۔ چند نوجوان گول گپے کھانے میں مصروف ہیں۔

"انتظار، گول گپے کھائیں۔"

"پاگل ہوئے ہو۔ بس چلے چلو۔"

سلیم میری ایک نہیں سنتا آگے بڑھ کر خوانچے کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔ اب ایک دونا اس کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دونا میرے ہاتھ میں۔ سلیم گول گپے کھاتے کھاتے پھر یری لیتا ہے اور لطیفہ سنانا شروع کر دیتا ہے۔ ارد گرد کھڑے گاہک تیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتے ہیں۔

"یہ تم نے کیا حرکت کی۔" وہاں سے آگے نکل کر میں نے باز پرس کی۔

"یار اب تو ہمیں روز ہی اس راستے سے گزرنا ہے میں نے سوچا کہ گربہ کشتن روز اول پہلے ہی دن ہم ان پر جتا دیں کہ ہم ڈرنے والی مخلوق نہیں ہیں۔"

یہ تصویر بھی دھندلا جاتی ہے۔ اس کے ساتھ پورا میرٹھ میرے حافظے میں دھندلا جاتا ہے اب جو تصویر ابھرتی ہے اس میں میرٹھ کہیں نہیں ہے۔ سپیشل ٹرین دوڑی چلی جا رہی ہے۔ ہم مشرقی پنجاب سے گزر رہے ہیں۔ میں ہوں۔ سلیم ہے۔ سلیم کی منڈلی کے کچھ دانے، سلیم کے افراد خاندان، عسکری صاحب کے افراد خاندان، حسن مثنیٰ، صوکت۔ رفعت۔ خوف ہمارا ہم سفر ہے دن تو جیسے تیسے گزر جاتا ہے۔ رات سو اندیشوں وسوسوں کے ساتھ آتی ہے۔ پوری ٹرین کے اندر اندھیرا ہے۔ ہدایت ہے کہ دیا سلائی بھی نہ جلائی جائے۔ کھڑکیاں بند رکھی جائیں۔ مگر سلیم سگریٹ پیئے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ ماچس گھستا ہے۔ اندھیرے میں بیٹھے مسافر شور مچاتے ہیں ساچس بجھاؤ۔ ماچس بجھاؤ۔ سلیم کی سگریٹ پینے کی طلب پوری ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔

اب گاڑی کسی سٹیشن پر نہیں رک رہی۔ سٹیشن آنے پر تیزی سے گزرتی ہے۔ مگر غیر آباد

مقامات سے گزرتے ہوئے کبھی کچھوے کی چال چلتی ہے کبھی رک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ حفاظتی دستہ نیچے اتر کر دور تک سرچ لائٹوں سے اردگرد کا جائزہ لیتا ہے۔ گاڑی پھر چل پڑتی ہے۔

اس مرتبہ گاڑی بیچ جنگل میں رکی ہے۔ حفاظتی دستے کا کوئی سپاہی ہمارے کمپارٹمنٹ کے آس پاس نظر نہیں آتا۔ مکمل سناٹا۔ دل زور زور سے دھڑک رہے ہیں۔ ہم گھپ اندھیرے میں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن صاف سن سکتے ہیں۔ اندھیرے میں ایک سرگوشی۔ "حملہ ہونے والا ہے"۔ اور اچانک سلیم محمد رواں ہو جاتا ہے "یار ایک لطیفہ یاد آگیا"۔ ایک لطیفہ دوسرا لطیفہ۔ غضبناک آنکھیں اندھیرے میں سلیم کو گھور رہی ہیں جیسے اسے کھا جائیں گی۔ مگر سلیم رواں ہے۔ ہماری محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔

"آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے"۔ اندھیرے میں ایک غصیلی آواز۔

"کس بات پر؟" سلیم معصومیت سے پوچھتا ہے۔

ایک بوڑھی عورت جس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اپنا سفید برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا ہے سمجھاتی ہے۔ "بیٹے یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے کلمہ پڑھو"۔

بوڑھی عورت کے اس مکالمے کے ساتھ تصویر دھندلا جاتی ہے۔ بعد کا سفر بالکل یاد نہیں آ رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ منگلورہ سٹیشن پر پہنچ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ ہذا فراق بینی وبینکم۔ پاکستان آگیا۔ میری اپنی راہ۔ سلیم کی اپنی راہ۔ میں لاہور میں۔ سلیم کراچی کی طرف۔

میں اپنے پرانے دھرانے کاغذ ٹٹول رہا ہوں۔ شاید خط کا کوئی پرزہ نکل آئے اور اس سے مجھے اس زمانے کی کچھ باتیں یاد آجائیں۔ ہاں ایک پرزہ نکل آیا۔

"تم سے ملے ہوئے اتنے دن گزر گئے کہ اب بے انتہا ملنے کو جی چاہتا ہے یہاں کے ماحول کو تم جانتے ہی ہو۔ کوئی اتنا بھی نہیں کہ جس کے پاس ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر گپ ہی مار لوں۔ ایک وہی جمیل صاحب۔ انہیں کو اوڑھ لو یا بچھا لو۔ کہاں میری تگی زندگی کہاں یہ دن شماری۔ بس یوں سمجھ لو کہ جس طرح بن پڑ رہی ہے کاٹے رہا ہوں۔ اس حالت میں تم لوگوں کو خط لکھتا ہوں اور اس کا جواب نہیں آتا تو سخت غصہ آتا ہے۔ اور مایوسی سی ہوتی ہے"۔

میں حیران ہوتا ہوں۔ وہ تو اپنی پوری منڈلی کو لے کر کراچی پہنچا تھا۔ سعید لودھا، امید فاضلی، قیام الدین وغیرہ وغیرہ۔ ویسے ٹھیک بھی ہے۔ اکھڑ کر جمنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

تو چند ہی سال بعد کا ایک پرزہ برآمد ہو گیا۔ ارے اب تو یار میرے کے تیور ہی بدلے ہوئے ہیں۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں تمہاری اور تمہاری نئی نسل کی طرح دھیمے الفاظ نہیں لکھ سکتا پر تو اس وقت ممکن ہے جب پانی خاموشی سے بہنے لگے۔۔۔۔۔۔ کل ایک صاحب سے دیر تک تمہارا ذکر خیر ہوتا رہا۔ تمہاری ٹیبل ٹاک قسم کی کوئی چیز پڑھ آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ادب میں یہ گورکھے کہاں سے داخل ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا باقی حضرات کو تو میں جانتا نہیں مگر حضرت انتظار کا حدود اربعہ مجھے معلوم ہے۔"

اصل میں اب سلیم کراچی میں رچ بس چکا ہے۔ منٹلی جمع ہو چکی ہے۔ ایسی منٹلی کہ میرٹھ کی منٹلی اس کے آگے کیا بیچتی ہے۔ اور اب ادب میں میری اور اس کی راہیں الگ ہیں۔ میں اس کے حساب سے لاہوریا بن چکا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اب تم لالوکھیت کے منگر کہلانے کے حقدار ہو ادب میں میری جو روش ہے اس پر سلیم کو اعتراض ہے۔ سلیم پر جو سودا سوار ہوتا ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لمبی طنز و تعریض کے بعد افہام و تفہیم۔ بس جیسے اب شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ مگر پھر اختلاف کا کوئی پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہی طنز و تعریض کا سلسلہ۔ اور اب مجھے یاد آرہا ہے کہ وہ سلیم کے آخری ایام تھے جب مجھے حریت میں اس کے کالم پڑھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں میرا یار شعر و ادب کو تیاگ کر خالص مصلح نہ بن جائے۔ میں روک ٹوک کرنے کی ٹھانتا ہوں مگر سلیم اس وقت بہت زوروں میں ہے۔ اپنے مصلحانہ جوش میں میری ایسی کی تیسی کر دیتا ہے۔ سلیم کو تو غصہ آگیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اچھا تھوڑے دن چپ رہتے ہیں۔ اس کا دماغ ٹھنڈا ہو جائے۔ پھر مزاج پوچھیں گے۔

مگر مزاج پوچھنے کی پھر نوبت کہاں آئی۔ موت کا فرشتہ بیچ میں کود پڑا۔

نظیر صدیقی

سلیم احمد

لوگ کہتے ہیں کہ سلیم احمد کو عمر بھر چونکانے کی عادت رہی۔ آخر کار انہوں نے اس دنیا سے گزرنے کا بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو لوگوں کو چونکا دے۔ رات کو سوئے تو صبح کو اٹھے ہی نہیں۔ زندگی کی نیند کو موت کی نیند سے ملا دیا۔

یہ ساری باتیں تحریر کرنے کی ہیں۔ لیکن میں کیا بتاؤں کہ ان کی نہایت غیر متوقع اور اچانک موت نے مجھے کس طرح دم بخود کر کے رکھ دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بیمار تھے۔ برسوں سے بیمار تھے۔ ادھر دو تین مہینوں سے بے خوابی کے بھی شکار تھے۔ صرف خواب آور گولیاں کھا کر سو سکتے تھے۔ ان کے ڈاکٹر نے ان پر یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ رات کے دس بجے تک ہر حال میں سو جایا کریں خواہ مشاعرہ پڑھ کر ہی کیوں نہ سونا پڑے چنانچہ جب وہ ۱۳ اگست (۱۹۸۳ء) کو کل پاکستان ریڈیو مشاعرہ پڑھنے کے لیے اسلام آباد آئے اور حسب معمول میرے ہاں ٹھہرے تو اس شرط کے ساتھ مشاعرے میں گئے کہ انہیں شروع ہی میں پڑھوا کر میرے ہاں دس بجے تک واپس پہنچا دیا جائے۔ دو ایک شاعرات کے اس اصرار پر کہ میرا کلام سن کے جایئے وہ دس بجے مشاعرے سے فارغ ہونے کے باوجود گیارہ بجے تک رک گئے۔

دوسرے دن جشن آزادی ہی کے سلسلے میں اسلام آباد کی ایک ثقافتی انجمن 'دائرہ' کی طرف سے ہولیڈے ان میں رات کے نو بجے مشاعرہ تھا۔ دائرے کے کسی عہدے دار نے ان سے کہا کہ اب آپ ہمارے مہمان ہیں۔ کل دن کا اور رات کا کھانا بھی آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے اور مشاعرہ بھی پڑھیں گے۔

ریڈیو کے مشاعرے میں ضیا جالندھری کے ساتھ بھی یہ طے ہوا تھا کہ جب سلیم دن کے کھانے پر ہوٹل آئیں گے تو کھانے کے بعد صدیق سالک کے ساتھ ضیا جالندھری کے ہاں بیٹھیں گے اور صدیق سالک

کی کسی غیر مطبوعہ کتاب پر گفتگو کریں گے۔

دوسرے دن دوپہر کے کھانے کے وقت نہ دائرے کا کوئی آدمی انہیں لینے آیا۔ ضیا جالندھری کو ان کے بارے میں کوئی جستجو ہوئی۔ ضیا کم از کم سلیم سے ملنے کے لیے بارہا میرے گھر آتے رہے ہیں۔ اب میں نے مکان بدل دیا ہے لیکن اگر وہ میرے پرانے مکان تک آئے ہوتے تو میرے نئے مکان تک پہنچنا کوئی مشکل نہ ہوتا۔ یہی نہیں کہ وہ دوپہر کو نہیں آئے بلکہ بالکل ہی نہیں آئے جبکہ ادھر سلیم احمد نے یہ سوچ کر کہ پہلی مرتبہ ضیا کے ہاں جا رہے ہیں بچوں کے لیے ایک ڈبہ مٹھائی بھی منگوا کر رکھ لی تھی۔

اب کی بار سلیم کے ساتھ صرف اتنی ہی زیادتی نہیں ہوئی کہ دائرے والوں نے انہیں اپنا مہمان بنانے اور دونوں وقت کے کھانے پر مدعو کرنے کے باوجود نہ صرف دن کے وقت انہیں لینے نہیں آئے بلکہ رات کے وقت بھی انہیں نہ کھانے پر لے جانے کے لیے آئے نہ مشاعرے میں لے جانے کے لیے۔ یہ طرزِ عمل اسلام آباد کی اس ثقافتی انجمن کا تھا جو آج کل اسلام آباد کی سب سے نمایاں ثقافتی انجمن ہے۔

بعض ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ کیا سلیم کو کھانے اور مشاعرے میں لے جانے کی ذمہ داری دائرے والوں ہی کی تھی اور جب دائرے کا کوئی آدمی انہیں میرے ہاں سے نہ لے گیا تو میں نے انہیں کیوں نہ پہنچا دیا۔ لہٰذا وضاحت کے طور پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ سلیم جیسی شخصیت کو لانے لے جانے کی ذمہ داری ہمیشہ انہیں مدعو کرنے والے اداروں کی ہوتی ہے۔ اس باب میں میں نے ان کی مدد اس لیے نہیں کی کہ میں دائرے کی طرف سے نہ کھانے میں مدعو تھا نہ مشاعرے میں۔

بہر حال سلیم کے ساتھ دائرے والوں کے غیر ثقافتی سلوک اور ضیا جالندھری کی بے اعتنائی کا فائدہ مجھے یوں پہنچا کہ سلیم کے ساتھ مجھے زیادہ سے زیادہ گفتگو کا موقع مل سکا۔ سلیم نے بھی گفتگو کے دوران ایک سے زائد مرتبہ کہا کہ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ دائرے والے نہیں آئے۔ میرے اسلام آباد آنے کا بنیادی مقصد تم سے ملنا ہوتا ہے اور جس طرح کی گفتگو تم سے ہوتی ہے وہ کراچی میں کسی کے ساتھ نہیں ہوتی۔ تمہاری باتیں میرے لیے ذہنی غذا فراہم کرتی رہتی ہیں۔ یہ اور اس طرح کی باتیں رسماً بھی کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ سلیم مجھ سے زیادہ سے زیادہ تفصیلی ملاقاتوں کے متمنی رہا کرتے تھے۔ اس لیے سلیم کی ان باتوں کو رسمی کہنا ان کے خلوص کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

۱۴ اگست چھٹی کا دن تھا۔ ہم دونوں دن بھر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شکر ہے کہ اس دن میرے ملنے والوں میں بھی جناب ظفر کے سوا اور کوئی نہیں آیا۔ جناب ظفر بھی کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چلے گئے۔ میرے اور سلیم کے درمیان مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ادھر دو سال کے اندر جب کبھی ان سے ایسی ملاقات

ہوئی جس میں کوئی تیسرا شریک نہ تھا تو ایک موضوع میرے ان کے درمیان ضرور آیا۔ ہم دونوں کو اس کا شدید احساس تھا کہ ہم دونوں عمر طبعی گزار چکے ہیں۔ تھوڑی سی زندگی اور رہ گئی ہے۔ اس میں کوئی ٹھوس اور دیرپا علمی یا ادبی کام کر لینا چاہیے۔ وقتی اور فرمائشی موضوعات پر لکھ کر وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوئی صورت نکالنا چاہیے۔ آئے دن چھپنے والی کتابوں کے دیباچوں، فلیپ کی رائیوں، تقریبات زفافی سے متعلق مضامین ان سب سے کسی طرح جان چھڑانی چاہیے۔ سلیم کے پیش نظر کوئی ادبی منصوبہ نہیں بلکہ ایک دینی منصوبہ تھا۔ ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں آج کل زیادہ تر اسلامیات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنی روایت کے سرچشموں سے زیادہ گہری واقفیت پیدا کر دوں۔

میرے اور سلیم کے درمیان ایک احساس مشترک تھا تمام عمر لکھنے اور بہت کچھ (اس 'بہت کچھ' میں 'بہت' سلیم کے لیے ہے اور 'کچھ' میرے لیے) لکھتے رہنے کے باوجود ہم دونوں اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کرتے رہے کہ ہمیں اصل میں جو کچھ لکھنا ہے وہ باقی ہے۔ اس لیے گزشتہ دو تین سال کے اندر ہم دونوں یہ عہد کرتے رہے کہ اب ہم اپنے اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور ہنگامی فرمائشوں کی طرف قطعی توجہ نہ دیں گے خواہ وہ فرمائشیں ادیبوں اور شاعروں کی ہوں یا رسالوں کے مدیروں کی۔

لیکن میرے ساتھ اس باہمی معاہدے کے باوجود سلیم روزمرہ کی مصروفیات سے نکل نہیں پاتے تھے۔ فلیپ کے لیے رائیں لکھنے سے لے کر ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت تک ان کے لیے ناگزیر تھی۔ میں سلیم سے کہا کرتا کہ میرے تمہارے معاہدے اپنی جگہ لیکن اس کا کیا علاج کہ زندگی کے چھوٹے کام بڑے کام نہیں کرنے دیتے۔ سلیم میرے اس فقرے سے لطف اندوز ہوتے اور معاہدے کی تجدید کر کے کراچی واپس چلے جاتے۔

لیکن ۱۴ اگست (۱۹۸۳ء) کی ملاقات میں میں نے سلیم کی ذہنی دلچسپیوں اور ان کے علمی پس منظر کے پیش نظر ان سے تین بڑے کاموں کا وعدہ لیا۔ میں نے سلیم احمد سے کہا تھا کہ تین موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر جیسا تم لکھ سکتے ہو اردو کا کوئی دوسرا ادیب اور نقاد شاید ہی لکھ سکے۔ ان تین موضوعات میں سے ایک ہے علامہ اقبال کے سات خطبے، دوسرا ابن العربی اور تیسرا ڈی۔ ایچ لارنس۔

سلیم کو اقبال کی شاعری سے جیسی عقیدت مندانہ اور ان کے خیالات و نظریات سے جیسی ناقدانہ دلچسپی تھی اور ان کا ذہن فلسفہ، تصوف، اسلامی تاریخ اور مذہب اور سائنس کی بڑھتی ہوئی کشمکش کے نازک پہلوؤں سے جس حد تک آراستہ تھا اس کے پیش نظر مجھے توقع رہی کہ سلیم اقبال کے سات لیکچرز پر دوسروں سے مختلف بھی لکھیں گے اور بہتر بھی لکھیں گے۔

موجودہ اردو ادب میں ابن عربی کا چرچا حسن عسکری اور سلیم احمد کی وجہ سے آیا۔ سلیم احمد نے ابن عربی کی تعلیم بابا ذہین شاہ تاجی سے حاصل کی تھی جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ دورِ حاضر میں ابن عربی اُن سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میں نے سلیم احمد سے کہا کہ جب تک تم ابن عربی پر ایک کتاب نہیں لکھو گے اچھے اچھوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ابن عربی تھے کیا اور وہ کہہ کیا گئے۔ یوں تو ان کی دونوں کتابوں (فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ) کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں لیکن وہ اب بھی بند کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تم اس مشکل کو آسان کر دو ورنہ میرے جیسے لوگ انگریزی میں ابن عربی پر عفیفی کی کتاب پڑھ کر گمراہ ہوتے رہیں گے۔ سلیم عفیفی کی کتاب کو نہایت گمراہ کن قرار دیتے تھے۔

مغربی ادب کے ناول نگاروں میں سلیم کی دلچسپی سب سے زیادہ ڈی۔ ایچ لارنس سے تھی جو انہوں نے اپنی بہت سی ذہنی دلچسپیوں کی طرح حسن عسکری ہی سے ورثے میں پائی تھی۔ حسن عسکری تو ضمنی طور پر لارنس کے بارے میں بہت کچھ لکھتے رہے۔ سلیم نے بہت کم لکھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے عسکری کی تحریروں اور سلیم کی گفتگو سے تھا کہ دونوں نے لارنس کو اہلِ مغرب سے مختلف طور پر پڑھا اور سمجھا ہے چنانچہ جب میں نے سلیم سے لارنس کے سب سے بڑے مغربی پرستار اور نقاد پروفیسر ایف آر لیوس کا ذکر کیا تو سلیم نے مجھے یہ تاثر دیا کہ ایف آر لیوس بھی لارنس کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکا ہے۔

پچاس سال سے اوپر کے ہر آدمی کی طرح سلیم بھی یہی سمجھتے تھے کہ ابھی شاید دس پندرہ سال اور جی لیں گے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کا وقت اتنا قریب آچکا تھا اور ان کی قوم کو اب بھی کیا خبر ہے کہ علم و بصیرت کا کیسا نادر خزانہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔ اپنے غیر معمولی ذہنوں سے صحیح کام لینے کا جذبہ ہمارے اندر نہ پہلے تھا نہ اب ہے اور نہ ایک نامعلوم مدت تک پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔ ہم اپنے جوہر قابل کو کھو کر اس کا ماتم تو کر سکتے ہیں اور بسا اوقات خوب ماتم کرتے ہیں لیکن اس سے بھرپور طریقے پر مستفید ہونے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ مستفید ہونے کا سلیقہ تو ایک طرف اسے نظر انداز کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ۱۹۷۷ء میں جب لاہور میں علامہ اقبال سے متعلق پہلی بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی تو کیسے کیسے غیر متعلق لوگوں کو مدعو کر کے ایک ہفتے تک ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرایا گیا اور ان سے مقالات پڑھوائے گئے لیکن سلیم احمد کو مدعو نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ملک کی یونیورسٹیوں میں کسی یونیورسٹی کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ سلیم احمد کو کسی موضوع پر اپنے یہاں مدعو کرے۔ ہماری یونیورسٹیاں صرف ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی پاس جہلا (ظاہر ہے کہ ہر ایم اے اور پی ایچ ڈی پاس جاہل نہیں ہوتا) کی قدر افزائی کر سکتی ہیں۔ انہیں ان باصلاحیت لوگوں کو پہچاننا نہیں آتا جو ایم اے اور پی ایچ ڈی کیے بغیر دنیا کو اپنی علمیت اور بصیرت سے مالا مال کرتے

رہتے تھے۔

صحت کی تمام تر خرابیوں کے باوجود سلیم کا حافظہ اب بھی اتنا قوی اور ذہن اتنا مرتب تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے جس دور میں بھی جو کچھ پڑھا اور سوچا وہ ترتیب کے ساتھ ان کے ذہن میں موجود رہا کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر سلیم لکھنے پر آئے تو وہ ایک سال کے اندر ان تینوں کتابوں سے فارغ ہو لیں گے جن کے لکھنے کا وعدہ کر کے وہ کراچی واپس گئے تھے۔ لیکن سلیم سے ان تینوں کتابوں کے لکھنے کا وعدہ لیتے وقت مجھے کیا خبر تھی کہ ان سے میری آخری ملاقات ہو رہی ہے اور اب ان کی زندگی تین ہفتے سے بھی کم رہ گئی ہے۔

اب جب کہ سلیم احمد ہمارے درمیان نہیں ہیں ہم اس بات کا رونا رویا جا رہا ہے کہ ہماری قوم نے سلیم کی قدر نہیں کی۔ ان سے وہ کام نہیں لیا جس کے وہ زیادہ سے زیادہ اہل تھے۔ قوم نے انہیں ریڈیو اسکرپٹ، ٹیلی وژن ڈرامے اور اخباری کالم لکھنے پر لگا دیا جو وہ خود زندہ رہنے اور اپنے خاندان کو زندہ رکھنے کے لیے لکھتے رہے۔ اس طرح ہم نے ایک جوہر قابل کو ضائع کر دیا۔

اب اس پچھتاوے سے کیا ہوتا ہے لیکن سلیم کے انتقال کے بعد خود میرے اندر یہ احساس جرم بڑھتا جا رہا ہے کہ میں جو سلیم کا اتنا مداح رہا ہوں میں نے بھی سلیم کی قدر ویسی نہیں کی جیسی کرنی چاہیے تھی۔ سلیم اس بات کے آرزو مند رہا کرتے تھے کہ میں خطوں میں کوئی موضوع چھیڑ دوں اور اس موضوع پر میرے ان کے درمیان اسی طرح مکالمے ہوتے رہیں جیسے برسوں پہلے ہوتے تھے۔ وہ اتنے دنوں تک میرے ہاں آتے جاتے رہے مگر ان کے ساتھ کبھی تصویر کھنچوانے تک کا خیال نہ آیا۔ اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کتنی اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

میں نے کسی مشہور و ممتاز ادیب یا شاعر کو ملنے جلنے میں اتنا سہل الحصول، ملنے والوں کے ساتھ اتنا خلیق، بات چیت میں اتنا منکسر المزاج، کھانے پینے میں اتنا سادگی پسند اور پہننے اوڑھنے کے معاملے میں اتنا بے نیاز نہیں پایا جتنا کہ سلیم تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی اور زمانے سے اس شخص کے مطالبات کچھ ہیں ہی نہیں۔ نہ زندگی سے مطالبات، نہ بیوی سے شکایات نہ اپنے ہونے پر اصرار، نہ دوسروں کے ہونے سے انکار نہ امیری کی ہوس نہ فقیری کا زعم۔ تمام عمر ایک ہی وضع قطع میں گزار دی۔ یہ خیال کبھی نہیں چھو کر نہیں گزرا کہ شیروانی اور پاجامے کا زمانہ گزر چکا ہے کبھی بشرٹ اور پینٹ بھی پہننا چاہیے۔ گزشتہ پانچ چھ سالوں کے دوران میں جب وہ مختلف اداروں کی طرف سے اسلام آباد مدعو ہونے لگے تو ان کے ٹھہرنے کا انتظام تھری اسٹار ہوٹل سے لے کر فائیو اسٹار ہوٹل تک میں ہوتا لیکن وہ ترجیح دیتے میرے غریب خانے کو۔ کراچی سے آتے وقت اپنا ایک سوٹ کیس لے لیتے جس میں ایک جوڑا

کرتا اور پاجامے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ آخری مرتبہ جب وہ ریڈیو پاکستان کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ۱۲ اگست ۱۹۸۴ء کو اسلام آباد آئے تو ان کے پاس وہ خالی خولی سوٹ کیس بھی نہ تھا۔ اتنے لمبے سفر میں رخت سفر سے ان کی بے نیازی حیران کن ضرور تھی۔ لیکن مجھے زیادہ حیرت اس لیے نہ ہوئی کہ جس زمانے میں محمود اعظم فاروقی مرکزی کابینہ کے وزیر اور سلیم ان کے مشیر مقرر ہوئے وہ اپنے سوٹ کیس میں لائے صرف ایک جوڑے کرتے اور پاجامے کو بھی استعمال کیے بغیر اسی کرتے اور پاجامے میں ہمارے گھر سے اپنے وزیر کے دفتر جانے لگے جسے پہن کر وہ کراچی سے آئے تھے اور جسے پہنے ہوئے وہ رات کو سو گئے تھے۔ بہر حال میری بیوی کے مشورے پر انہوں نے یہ دونوں چیزیں بدلیں۔ یوں تو ان کے کھانے پینے کے معاملے میں عموماً تکلف نہ کرتا لیکن اگر دسترخوان پر کئی چیزیں ہوتیں تبھی وہ روٹی اور سالن کے سوا کسی اور چیز کی طرف مشکل سے نظر ڈالتے۔ ایک مرتبہ ہوٹل انٹرکونٹی نینٹل میں بھی مجھے ان کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں حسب معمول انواع واقسام کے کھانے موجود تھے۔ لیکن میں نے انہیں انواع اقسام سے کسی قسم کی دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مولانا حسرت موہانی کی سادگی اگر کسی حد تک کسی کے ورثے میں آئی تو وہ سلیم احمد تھے۔

میں سلیم کو صوفی یا درویش قسم کی چیز ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ صرف یہ واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے اور رہنے سہنے جیسے بنیادی معاملاتِ حیات میں وہ دوسروں سے کتنے مختلف تھے۔ وہ فنا فی اللہ یقیناً نہ تھے مگر فنا فی الدنیا بھی نہ تھے۔ مادی چیزوں سے ان کی دلچسپی عام انسانوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ وہ مادی ضروریات سے بلند تر نہ تھے لیکن کوئی مادی نصب العین ان کی زندگی کا محور نہ تھا۔ بظاہر بڑے قناعت پسند اور راضی برضا قسم کے آدمی تھے۔ ذاتی مسائل اور مصائب کو موضوع گفتگو نہیں بناتے تھے۔ لیکن چونکہ انسان تھے اس لیے زندگی کے درد و کرب سے محفوظ بھی نہ تھے۔ میرے نام اپنے خطوں میں کبھی کبھار اس درد و کرب کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ ان کے احباب میں بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ ان پر دل شکستگی، مایوسی اور بیزاری کے کیسے کیسے لمحات گزرتے رہے اور ان کے ظاہری سکون کی تہ میں کتنا طلاطم پوشیدہ تھا

سلیم ریڈیو اور ٹیلی وژن کی دنیا میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور شعر و ادب کی دنیا میں نقاد اور شاعر کی حیثیت سے۔ ان کی تنقیدوں میں جھگڑے بہت ہیں، کہیں غالب سے، کہیں میر سے، کہیں حالی سے، کہیں اقبال سے، کہیں ترقی پسندوں سے، کہیں اسلام پسندوں سے بظاہر وہ بت شکن معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک مرتبہ مجھے ان کی کسی تحریر میں محسوس ہوا کہ وہ نقاد سے

زیادہ نوحہ خواں ہوئے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنا یہ تاثر لکھ بھیجا جواب میں انہوں نے جو خط بھیجا میرے نزدیک وہ ایک ایسا خط ہے جو نقاد سلیم کو سمجھنے میں ایک نہایت قیمتی مدد کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے لکھا:

'نظیر پیارے۔ بہت بہت پیار۔ کبھی کبھی تم سچ مچ بہت اچھے لگنے لگتے ہو۔ تمہارا یہ خط بہت مزے کا تھا اور میں نے کئی بار پڑھا۔ یہ بات تم نے بہت اچھی لکھی کہ میں اب نقاد سے زیادہ نوحہ خواں ہونے کا تاثر دینے لگا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تمہیں میری کن تحریروں سے یہ اندازہ ہوا، کیا تم ان تحریروں کی نشاندہی کر سکتے ہو؟ یہ بڑی ذہانت کا اندازہ ہے جو تم نے لگایا ہے۔ شاید میں بیمار ہوں۔ اور مایوس ہوں۔ یا شاید میری خود رحمی نے نوحہ خوانی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بہرحال کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے اتنی ذہانت اور سچائی سے ایک ایسی بات کی جو میرے احساس میں موجود تھی اور جس کی میں تصدیق کر سکتا ہوں۔ یار میں نے یہ کب کہا کہ سیدھی سادھی باتیں بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں۔ کہا ہو تو مجھے یاد نہیں۔ میں تمہیں کند ذہن تو نہیں سمجھتا۔ سمجھتا تو کہہ دیتا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں نظیر سیدھی سادھی باتوں کا بادشاہ ہے۔ سیدھی سادھی باتوں کا مطلب وہ حقائق ہیں جو بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے بغیر کوئی تعمیر ہو ہی نہیں سکتی ....

اب مثلاً وہی باتیں جو تم نے غالب پر میرے خیالات کی تنقید کرتے ہوئے لکھی ہیں، یہ سب صحیح باتیں ہیں۔ اچھی باتیں ہیں منطقی باتیں ہیں۔ زیادہ تعریف کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ سائنٹیفک باتیں ہیں۔ (اس سائنٹیفک کی ایسی تیسی) مگر یہ سب اوپری باتیں ہیں۔ میں اپنی روح کی گہرائیوں سے جانتا ہوں کہ میں عہد جدید سے خوش نہیں ہوں۔ اس نے مجھے توڑ دیا ہے اور میرا دشمن بن کر خود میرے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ میں حالی سے لڑا۔ ترقی پسندوں سے لڑا۔ روایت پرستوں سے لڑا اور غالب سے لڑا۔ مگر میں کسی سے نہیں لڑا۔ میں تو اپنے آپ سے لڑنے میں مصروف ہوں اس لیے کہ جن عناصر سے میں لڑ رہا ہوں اور جو میرے اندر موجود ہیں میں جانتا ہوں کہ وہ غیر تخلیقی اور غیر انسانی ہیں۔ اب اس لڑائی میں میں اپنے مورچوں کا بس جائزہ لیتا ہوں اور اپنے دشمن کے کمزور پہلوؤں کو بھی دیکھتا ہوں۔ غالب کہتا ہے دین بزرگان خوش نکرد۔ فراق صاحب کہتے ہیں ہر بائی مذہب لامذہب ہوتا ہے ...... یہ بغاوت کے ملے میں کی ہوئی تعمیمات ہیں۔ غالب اور فراق اور سو برس میں پیدا ہونے والے تمام باغی مع نظیر صدیقی کے ایسی ہی تعمیمات سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ غالب تو باغیوں کی ہمنا زادی کی ہے اور وہ باغیوں میں پہلا باغی ہے۔ یہ غالب کی بھی تعریف ہے اور فراق کی بھی اور تمہاری بھی۔ مگر

پیارے اس بغاوت کا دور گزر چکا ۔ یہ بغاوت اپنا کام کر کے اب اپنے آخری مراحل طے کر رہی ہے
اب یہ مردہ اور آؤٹ آف ڈیٹ ہے ۔ اب اس میں کوئی انسپائریشن نہیں ۔ اب یہ گندے انڈے کی
طرح کوئی بچہ پیدا نہیں کر سکتی ۔ اب بغاوت کے خلاف بغاوت کی ضرورت ہے ۔

تم میرے مسئلے کو اس طرح سمجھنے کی بجائے اوپر اوپر منطقی اور سائنٹیفک باتیں جھاڑنے لگتے ہو ۔
معروضی باتیں کیا ہوتی ہیں ؟ سائنس بڑی معروضی ہے لیکن سائنس انسان نے پیدا کی ہے اور میں جانتا
ہوں کہ اگر انسان ویسا نہیں رہے گا جیسا وہ ہے تو اس کی سائنس بھی ایسی نہیں رہے گی ۔ پیارے
اپنے باطن میں اتر کر دیکھو کہ نظیر صدیقی کے اصل مسائل کیا ہیں ۔ وہ ادیب بننا چاہتا ہے ۔ ایک تخلیقی فنکار
کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے ۔ مگر اس کا ماحول اسے کامیاب نہیں ہونے دیتا ۔ یہ ماحول کیا ہے ؟ یہ
وہ قوتیں ہیں جو اسے اندر اور باہر سے توڑ رہی ہیں ۔ ان قوتوں کو سمجھو ۔ ان کا تجزیہ کرو ۔ اور پھر اپنے وجود
کی سچائی کے لیے ان سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ ۔ اب میں نوحہ خوانی کی بجائے رجز خوانی پر اتر آیا ہوں ۔
اچھا بھائی میں میدان جنگ میں ہوں تو نوحہ خوانی بھی کروں گا ۔ رجز خوانی بھی کروں گا ۔ زخموں سے کراہوں
گا بھی اور چیخوں اور تڑپوں گا بھی ۔ اور اپنے زخموں پر پٹیاں باندھ کر تیر اندازی بھی کروں گا ۔ تم نے مجھے تنقید
کا صحیح فرض یاد دلایا ہے ۔ کیا میں نقاد کہلانا چاہتا ہوں ۔ لعنت ہو مجھ پر ۔ میں تو صرف اپنے وجود کا حال
لکھنا چاہتا ہوں چاہے وہ تنقید ہو یا شعر ہو یا ڈرامہ ہو یا کچھ ہو ۔ اور بس "

تو یہ ہیں وہ سلیم احمد جن کے لکھنے کا مقصد وہ نہیں تھا جو انہیں پڑھتے وقت ہم نے پیش نظر رکھا
یا عموماً پیش نظر رکھتے ہیں ۔ اگر ان کی تنقید یا شاعری یا ڈرامے کو اس تناظر سے نہ دیکھا گیا تو اسے صحیح طور پر
سمجھنا ممکن نہ ہوگا ۔ باقی باتیں پھر کبھی !

۲، دسمبر ۱۹۸۳ء

اسلم فرخی

ٹوٹی ہوئی اکائی

۱۹۸۴ء میں حکیم راغب مراد آبادی (اللہ تعالیٰ انہیں صحت مند و سلامت رکھے) شمس زبیری اور میں نے مل جل کر ایک ادبی ادارہ اردو مرکز کے نام سے قائم کیا تھا۔ اتوار کے اتوار اس کے جلسے انجمن ترقیٔ اردو و سندھ کے کتب خانے میں ہوتے تھے۔ بڑی افراتفری کا زمانہ تھا۔ مختلف شہروں اور علاقوں سے آئے ہوئے لوگ، ایک دوسرے سے ناواقف، راستوں اور مقاموں سے ناواقف! مکانوں کی قلت، بے سروسامانی لیکن تعمیر کا ایک جذبۂ لازوال کچھ کرنے کا حوصلہ اور زندہ رہنے کی بے پناہ اُمنگ تھی۔ اردو مرکز نے بکھرے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی یکجائی اور ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کرانے کا فریضہ بڑے خوشگوار انداز سے انجام دیا۔ اس کے جلسے بڑے بارونق اور شاندار ہوتے تھے۔ نامور اور معروف ادیب بھی شرکت کرتے تھے، غیر معروف ادیب بھی آتے تھے۔ بڑی گہما گہمی رہتی تھی۔

اردو مرکز کے ایک ادبی جلسے میں میری ملاقات سلیم احمد سے ہوئی۔ چھریرا بدن، گول چہرہ، آنکھوں میں غور و فکر اور تعمق کے گہرے سائے، چہرے پر معصوم لیکن شرارت آمیز مسکراہٹ، کرتا پاجامہ اور صدری پہنے۔ پہلی ہی ملاقات میں بڑی محبت سے ملے۔ مجھے بھی ایک غیر معمولی جاذبیت اور کشش کا احساس ہوا۔ اگلے اجلاس میں مضمون پڑھنے کی فرمائش کی۔ سلیم نے اگلے اجلاس میں اردو تنقید کے رویوں کے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔ بڑا دلچسپ اور چونکا دینے والا اور تازگیٔ فکر سے مملو مضمون تھا۔ بڑی زوردار بحث ہوئی۔ سلیم خاموش بیٹھا سب کی سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی معصوم مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بحث کرنے والوں کے جوش بے جا پر دل ہی دل میں ہنس رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے دام میں آنے والا نہیں، تمہیں میری روش پر چلنا پڑے گا، میں تمہاری روش پر

نہیں چل سکتا۔

سلیم ان دنوں بہار کالونی میں رہتے تھے کسی دفتر میں ملازمت کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مہاجرین کی آبادکاری کا کوئی مالی ادارہ تھا جس میں وہ خزانچی تھے۔ اب میں سوچتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ خزانہ داری سلیم احمد کا حصہ تھی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے ادارے میں خزانہ دار رہا۔ علم و ادب کا خزانہ دار رہا۔ ساری زندگی دونوں ہاتھوں سے خزانہ لٹاتا رہا اور جب گیا تو خزانے کو بھرا پڑا اور مالا مال چھوڑ گیا۔ اس زمانے میں بھی سلیم کے گرد دوستوں اور چاہنے والوں کا ایک حلقہ تھا جو اسے ہیے ہیے پھرتا تھا اور اسے اپنا ادبی رہنما مانتا تھا۔ ذاتی حالات کے عدم استحکام کے باوجود یہ ہم لوگوں کی بے فکری کا زمانہ تھا جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے، بڑی دلچسپ صحبتیں رہیں۔ دنیا کے ہر موضوع پر سلیم سے تبادلہ خیال رہا۔ اس کا مطالعہ بڑا گہرا، یادداشت بہت تیز اور انداز فکر میں ندرت تھی۔ ہم لوگ دنیا و مافیہا سے بےخبر چھوٹے چھوٹے ایرانی چائے خانوں میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ اس وقت تک ہمارے رہنے کے ٹھکانے اس قابل نہیں تھے کہ ہم وہاں سکون و اطمینان سے گھنٹوں بیٹھ کر بحثیں کرتے۔ ایک شام ہم لوگ اردو مرکز کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ایک بزرگ عمدہ سوٹ پہنے تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ ہماری گفتگو میں بھی شریک ہو گئے۔ اتفاق یہ کہ تاریخ اسلام کے حوالے سے معتزلہ کے بارے میں گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ آنے والے بزرگ نے بڑے مرعوب کن اور تحکمانہ انداز میں اظہار خیال شروع کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ سلیم نے ان کی گفتگو سے مسئلے کے مختلف پہلو اجاگر کرنا شروع کیے اور پھر ایسی تفصیل بیان کی، ایسے نکتے واضح کیے جن سے یہ ظاہر ہو گیا کہ محض علم کتاب سے کام نہیں چلتا، نظر بھی ضروری ہے، فکر بھی ضروری ہے۔ تنقید و تجزیہ کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ وہ صاحب ہمیں مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ سلیم نے انہیں زچ کر دیا جب وہ چلے گئے تو کسی نے ہمیں بتایا کہ یہ صاحب فلاں کالج کے پرنسپل اور تاریخ اسلام کے عالم ہیں۔ مجھے اور سلیم، دونوں کو اپنے جارحانہ رویے پر افسوس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ وہ ڈاکٹر صاحب ہمارے دوست ہو گئے اور ہم سے دوستانہ اور بے تکلفانہ ملنے لگے۔

۴۹ء ہی میں مجھے ریڈیو میں ایک جگہ مل گئی۔ یہ ریڈیو اسٹیشن بھی خوب تھا۔ کوئنز روڈ پر سمندر کے کنارے خیمے بپا۔ ایک لمبی سی بارک میں دو اسٹوڈیو۔ بوجھل سمندری ہوائیں اور نمی۔ بے سرو سامانی کا احساس۔ سلیم کی آمد و رفت یہاں بھی تھی۔ شاہد بھائی نے ایک دن بخاری صاحب سے کہا: "آپ اس لڑکے کو یہاں کیوں نہیں لے لیتے" بخاری صاحب خود بھی سلیم سے متاثر تھے چنانچہ

ایک سہانی صبح سلیم بھی حلقۂ دوستاں سے بڑھ کر حلقۂ دوستاں میں شامل ہو گئے۔

ریڈیو میں سلیم نے محنت بھی بہت کی اور ان کے جوہر بھی خوب چمکے۔ ڈرامے، تقریریں، فیچر ہر صنف میں سلیم کا سکہ چلا۔ بڑے بڑے نازک اور مشکل مقام آئے لیکن سلیم نے سب کو بڑی کامیابی سے سر کر لیا۔ دو چار واقعات اب بھی میرے ذہن میں ہیں:

کراچی میں فری اسٹائل کشتیوں کے پہلے دنگل کا اہتمام ہوا۔ متعدد پہلوان باہر سے بھی آئے۔ ایک صبح بخاری صاحب نے مجھے اور سلیم کو طلب کیا اور کہا کہ پاکستانی اور غیر ملکی پہلوانوں سے ملو اور ریڈیو کے لیے ایک پروگرام تیار کرو۔ جن لوگوں کو بخاری صاحب کی نگرانی میں کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ بخاری صاحب مسوّدوں کو کس دقّتِ نظر سے دیکھتے تھے۔ پہلوانوں سے نہ کوئی میرا واسطہ نہ سلیم کا کوئی تعلق، نہ ہم اخبار نویسوں کی طرح کسی کا انٹرویو کرنے کے عادی لیکن حکم حاکم، سلیم نے مجھے اور میں نے سلیم کو بہ نظرِ تاسف دیکھا اور چپ چاپ سُولی پر چڑھ گئے۔ پہلے پاکستان چوک میں واقع بھولو پہلوان کے اکھاڑے دارالصحت گئے۔ بھولو برادران ہم لوگوں کے ساتھ غیر معمولی محبت اور تواضع سے پیش آئے۔ یہاں ہم اطمینان سے بیٹھے بڑے بڑے گلاسوں میں ٹھنڈائی پینے کی کوشش کرتے رہے اور پہلوانی کے رموز و نکات سے آشنا ہوتے رہے۔ ٹھنڈائی کے گلاس اتنے بڑے تھے کہ میرے اور سلیم دونوں کے چھکّے چھوٹ گئے۔ بہر حال ہم نے بڑی ہمت کر کے آدھے آدھے گلاس پیے اور بقیہ کے لیے معذرت کر لی۔ وہاں سے نکلے تو ایک ہوٹل پہنچائے گئے جہاں غیر ملکی پہلوان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے بھی بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ واپس آ کر ہم دونوں نے ایک فیچر تیار کیا جو بخاری صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ بخاری صاحب نے اسے پڑھا اور پسند کیا اور پھر یہ فری اسٹائل کشتیوں پر رواں تبصرے سے پہلے نشر کیا گیا۔

بہت عرصے بعد بخاری صاحب نے اسی قسم کا تجربہ کیا۔ ہم لوگ خیموں کی آزاد فضا سے نکل کر براڈکاسٹنگ ہاؤس کے دفتری ماحول میں آ چکے تھے۔ بخاری صاحب کو شوق ہوا کہ روزانہ شام کو آدھ گھنٹے کا ایک خصوصی پروگرام نشر کیا جائے اس پروگرام کا مسودہ لکھنے کے لیے سلیم، افضل صدیقی اور راقم الحروف مقرر کیے گئے۔ بخاری صاحب تو حکم دے کر اپنے دفتر چلے گئے۔ اب مشکل یہ ہوئی کہ میں ان دنوں صبح ساڑھے پانچ بجے سے دوپہر تک ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ افضل صدیقی ۹ بجے دفتر آتے تھے اور سلیم گیارہ بارہ بجے پہنچتے تھے۔ ہم تینوں سر جوڑ کر بیٹھے اور ہم نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ میں موضوع معلوم کر کے فیچر کا ابتدائیہ لکھ رکھتا تھا۔ افضل صدیقی آتے تو کچھ بات چیت ہوتی اور

وہ اس فیچر کا وسطی حصہ قلم بند کرتے۔ سلیم کے پہنچنے پر یہ مسودہ ان کے حوالے کر دیا جاتا اور وہ اس کا
کام تمام کر دیتے۔ یہ سلسلہ کافی دن تک چلتا رہا۔ کبھی کبھی بخاری صاحب کے سامنے بھی پیشی ہو
جاتی لیکن انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ساجھے کی ہانڈی بالعموم چوراہے پر پھوٹتی ہے لیکن یہ
ہانڈی بخیر و خوبی پکتی رہی۔ اور ہم پر ہلکی سی آنچ بھی نہ آئی۔ اس سارے عمل میں ہم میں آپس میں نہ کوئی
اختلاف رائے ہوا نہ بدمزگی پیدا ہوئی نہ کوئی چپقلش ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ سلیم اور افضل
صدیقی کا برادرانہ رویہ تھا۔ سلیم نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہمارے لکھے ہوئے اجزا کو آگے
بڑھایا اور اس کی بطریق احسن تکمیل کی۔ کچھ عرصے کے بعد بخاری صاحب کسی اور پروگرام کی طرف
متوجہ ہو گئے اور ہم اس مشترک عمل سے چھوٹ گئے۔

ریڈیو میں بالعموم افسری اور ماتحتی کا وہ تصور نہیں جو دوسرے دفتروں میں پایا جاتا ہے بلکہ
ہمارے زمانے میں ریڈیو کی ہینڈ بک میں یہ ہدایت درج تھی کہ اسٹاف آرٹسٹ بڑے لائق
اور باعزت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا پورا احترام کیا جائے۔ ویسے بھی چونکہ اس زمانے میں ریڈیو علم و
ادب کا گہوارہ تھا لہٰذا افسری ماتحتی کا چکر نہیں تھا۔ بخاری صاحب اپنے سارے کروفر کے باوجود
منکسر المزاج تھے۔ کراچی اسٹیشن کے افسری کے طنطنے سے خالی تھے۔ قطب صاحب ہوں یا فرید
صاحب، نیازی صاحب ہوں یا حمید نسیم صاحب۔ سب میں غیر معمولی شائستگی اور انکسار تھا
حمید نسیم صاحب کی تو یہ کیفیت تھی کہ جب وہ بہت بڑے افسر تھے اس وقت بھی ان کا مزاج
درویشانہ تھا اور آج جب وہ افسر نہیں ہیں ان کی درویشی ہر ریڈیو والے کے لیے قابل احترام
ہے لیکن اس زمانے میں ایک ایسے صاحب بھی آ گئے جو تھے تو پروگرام ایگزیکٹو لیکن اپنے آپ
کو ریڈیو کا مالک سمجھتے تھے۔ نصیر احمد نام نے ان کا نام "لٹل ڈیول" رکھا تھا۔ یہ وہی صاحب تھے
جنہوں نے اپنی افسری کے زعم میں پروفیسر محمد حسن عسکری جیسے درویش صفت انسان سے "اچھا
صاحب آپ ہی بڑے باپ کے بیٹے بن جائیے" کہا تھا اور عسکری صاحب نے اپنا مسودہ پھاڑ
کر پھینک دیا تھا۔ لٹل ڈیول کی جو بات ہم لوگوں کو ناپسند تھی۔ وہ ان کا اہانت آمیز رویہ تھی
آخر کار جب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو ایک دن شاہد بھائی کی غیر موجودگی میں ہم سب
نے مل کر "لٹل ڈیول" کو گھیر لیا۔ اور ہم میں سے ہر ایک نے فرداً فرداً اپنے خیالات کا برملا اور
بے محابا اظہار کر دیا۔ لٹل ڈیول سناٹے میں آ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا ہو سکتا
ہے۔ کچھ کھسیائے۔ کچھ جھنجھلائے۔ لیکن آدمی تھے عقل مند۔ سب کچھ سن کر پی گئے اور ٹھیک

ٹھیک چلتے گئے۔ سلیم اس سارے ہنگامے میں خاموش مسکراتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے الفاظ کا سہارا لیے بغیر محض اپنے چہرے کے تاثرات سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ہم نے الفاظ کے ذریعے سے بیان کیا تھا۔ نسل ڈیول بیچارے کچھ دن کے بعد ریڈیو سے علیحدہ کر دیے گئے اور پھر جلد ہی اس محفل ہست و بود سے بھی رخصت ہو گئے۔

جب ریڈیو پاکستان میں قومی پروگراموں کا پہلا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا چراغ حسن حسرت اس کے نگران مقرر ہوئے۔ پروڈکشن رفیع پیر کے ذمے ہوا۔ ایک پورا یونٹ بنایا گیا۔ سلیم کو بحیثیت مسودہ نگار یہاں رکھا گیا۔ یہ تقرر ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ سلیم نے اس پروگرام کے لیے بے شمار فیچر اور ڈرامے لکھے اور خوب لکھے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ سلیم کی خداداد صلاحیت نے اس پروگرام کو پرکشش اور جاندار بنا دیا۔ بڑی محنت کی۔ جانفشانی سے جگر صرف کیا۔ حسرت اور رفیع پیر دونوں اپنے فن میں منجھے ہوئے تھے۔ سلیم نے اپنی صلاحیت کے بھرپور اظہار سے دونوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ریڈیو کی دنیا میں سلیم کی بڑی دھوم رہی اور اسے بڑا اعزاز حاصل ہوا۔

سلیم نے ریڈیو کے لیے بہت کچھ لکھا اور ہر رنگ میں لکھا۔ بچوں کا پروگرام ہو۔ خواتین کا پروگرام ہو۔ دیہی پروگرام ہو۔ ادبی پروگرام ہو۔ سلیم کی موجودگی ہر جگہ پُر وقار انداز میں محسوس کی جاتی تھی۔ کراچی اسٹیشن کو وقار بخشنے والوں میں سلیم کا نام سرفہرست ہے۔

ریڈیو میں سلیم نے اوقاتِ کار اور دفتری آداب کی کبھی کوئی پابندی نہیں کی۔ ان میں اس محکومی کی اہلیت ہی نہیں تھی۔ ان کا خود ایک ضابطہ اخلاق تھا۔ گیارہ بجے آنا۔ کرسی پہ پاؤں اٹھا کر جمے رہنا۔ سگرٹ سے سگرٹ سلگانا۔ دوستوں کے حلقے میں میرِ محفل بن کر گفتگو کرتے رہنا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ سلیم کی اس بے تکلفانہ روش و عادت سے جس کی تہہ میں اک رکھ رکھاؤ کا ایک پورا تصور موجود تھا۔ بڑے بڑے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اور سلیم کا دم بھرنے لگتے تھے۔ شعیب حزیں مرحوم کا ہم سب احترام کرتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے پرانے گریجویٹ اور کسی قدر رنگ چڑھے آدمی تھے لیکن میں نے یہ دیکھا کہ سلیم کے سامنے وہ بھی ہاتھ باندھے رہتے تھے۔ یہی کیفیت بہت سے دوسروں کے ساتھ بھی تھی۔

ایک ادبی موضوع کے سلسلے میں سلیم کا ایک مشہور نقاد سے اختلاف رائے ہوا اور اس اختلاف رائے کا اظہار تحریر میں بھی ہوا۔ ایک جوان عزیز نے کہ اب مرحوم و مغفور ہو چکا ہے ایک خط نما مضمون ایک رسالے میں لکھ مارا کہ یہ سلیم احمد کون ہیں۔ یہ قلم کے بجائے لٹھ سے کیوں لکھتے ہیں اسی

قسم کے دو چار تیز فقرے اور بھی تھے۔ مجھے یہ مضمون بہت ناگوار گزرا کہ بڑوں کے اختلاف میں چھوٹوں کا شریک ہو جانا مجھے کبھی اچھا نہیں معلوم ہوا۔ میری رائے میں حمایتی بھی برابر کا ہونا چاہیئے سو ئے اتفاق کہ اس مضمون کی اشاعت کے کچھ دن بعد وہ صاحب نظر آ گئے۔ مڈبھیڑ کلاس کے باہر ہوئی۔ میں نے قدرے تلخ لہجے میں ان سے کہا کہ تمہیں اس جھگڑے سے کیا تعلق۔ تمہارے قلم سے اس قسم کے مضمون نہایت نامناسب ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس نوجوان نے میری باتیں کان دبا کر سنیں اور پھر اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جب سلیم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے کہا "تم نے اس بیچارے کو بلا وجہ ڈانٹا" خدا معلوم انہیں اطلاع کیسے ہوئی لیکن ان کا ردعمل شریفانہ اور عفو و درگزر کا تھا۔

واقعات قلمبند کر رہا ہوں تو یادوں کا پٹارا کھل گیا ہے۔ ایک صاحب تھے۔ اچھا بھلا نام تھا نذیر احمد۔ بعد میں فلمی دنیا میں چلے گئے تو نذیر صوفی ہو گئے۔ جس زمانے میں وہ نذیر احمد اور صحافی تھے تو انہیں ایک اعلیٰ درجے کا رسالہ نکالنے کا شوق ہوا۔ بہت دن تک شاہد لبنانی کے سر رہے کہ یہ پرچہ آپ سنبھالیے۔ شاہد بھائی نے سلیم کا نام بڑے پُرزور اور توصیفی انداز سے پیش کیا۔ چنانچہ پرچہ ان کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ ایک بڑا دیدہ زیب رسالہ تھا۔ سلیم نے اس میں بعض بڑے معرکہ آرا مضامین لکھے۔ جمال الدین افغانی کے بارے میں ان کا ایک مضمون اب بھی میرے ذہن میں ہے۔ انداز نظر بھی نیا تھا اور حقائق میں ایک نئی معنویت کا اشارہ بھی تھا۔ پھر اردو کے عام رسالوں کی طرح یہ رسالہ بھی بند ہو گیا لیکن سلیم احمد فلمی دنیا میں پہنچ گئے۔ انہوں نے بعض فلموں کے مکالمے اور منظر نامے لکھے اور حسب معمول کامیاب رہے لیکن جلد ہی وہ اس دنیا سے اپنی دنیا میں اپنی دنیا میں واپس آ گئے اور یہ اچھا ہی ہوا۔

میں لکھنؤ میں ریڈیو کو خیر آباد کہا لیکن سلیم سے ملاقاتیں برابر جاری رہیں۔ جہانگیر روڈ پر ان کا مکان اور بعد ازاں انچولی سوسائٹی کا مکان شہر میں ادیبوں اور شاعروں اور نئے لکھنے والوں کا اہم مرکز بن گیا۔ میں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ دو چار آدمی بیٹھے ہیں اور گفتگو چھڑی ہوئی ہے۔ بڑا حوصلہ تھا سلیم کی طبیعت میں اور مزاج میں غیر معمولی برداشت تھی۔ استفادہ کرنے اور فیض اٹھانے والوں کو تو چھوڑیے بڑے بڑے فضول اور وقت ضائع کرنے والے بھی جو سلیم کی رسوائی کا سبب بنتے تھے، دن رات جمے رہتے تھے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے سلیم کی وفات کے بعد بھی انہیں بخشا نہیں ان کے ایک نام نہاد حاشیہ نشین اور چاہنے والے کا کمال یہ ہے کہ اس نے پچھلے سال سلیم کی برسی کے موقع پر ایک

بھس بھسی نظم لکھ کر کراچی کے تمام اخباروں میں بیک وقت شائع کرا دی۔ تاکہ سلیم کی بیساکھی سے سہارا پاکر ان کی شہرت ہر طرف پھیل جائے۔ سلیم ان سب کو گوارا کرتے تھے۔

سلیم نے تحریر و تنقید دونوں میں نئے ذہن کی تشکیل میں بھرپور حصہ لیا اور بے شمار لکھنے والوں کی ذہنی تربیت کی۔ میں انہیں پارس تو نہیں کہوں گا کیونکہ پارس محض ایک پتھر ہوتا ہے جس سے دوسروں کو فیض پہنچتا ہے مگر وہ خود پتھر ہی رہتا ہے۔ سلیم تو مقناطیس تھے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور خام لوہے میں مقناطیسیت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وظیفۂ انسانیت کیا ہے؟ ہماری تخلیق کا مقصد و منشا کیا ہے؟ ذہن جواب دیتا ہے کہ یہ مقصد نئے ذہن کی بہتر تشکیل نژادِ نو کو پروان چڑھانے اور نئی نسل کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ ازل سے اب تک یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو سلیم بڑا کامیاب انسان تھا اس نے بہتوں کے ذوقِ ادب کی تربیت کی۔ نہ جانے کتنوں کو لکھنے پڑھنے پر مائل کیا۔ اس حلقے میں بیٹھنے والے اس کے فیضِ صحبت سے بلند پرواز ہوئے لیکن اس نے کبھی اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کیا۔ یہ سب کچھ تو اس کے لیے روزمرہ کی باتیں تھیں۔

سلیم عام طور پر گفتگو میں سلیم الطبع تھے لیکن موقع محل کی مناسبت سے اڑیل بھی ہو جاتے تھے اور بڑے خوبصورت انداز میں کٹ حجتی کرتے تھے لیکن اس کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ کیونکہ لوگ گفتگو میں ان کا خاصا لحاظ کرتے تھے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں مسابقت اور تقدیم تاخیر کا مسئلہ ہمیشہ سے ہے۔ سلیم ان چیزوں سے بے نیاز تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ وعدے کا پابند پایا۔ ہر انسان کی زندگی میں کشر نغام بے بسی کے ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جب اسے کسی مشاعرے یا ادبی جلسے کی انتظامی ذمہ داریاں طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑتی ہیں۔ مجھے بھی گریز و فرار کے تمام پہلوؤں پر عبور حاصل ہونے کے باوجود ایسے بہت سے لمحوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ سلیم کو جب بھی مدعو کیا انہوں نے خندہ پیشانی سے دعوت قبول کی اور وہ جو ایسے موقعوں پر ایک انا اور تنفر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ گاڑی کس وقت آئے گی اور صدارت کون کرے گا اور کون کون ہوگا وغیرہ وغیرہ ــــ سلیم نے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں کیں بلکہ ہمیشہ یہ ہوا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کے بجے آجاؤں۔ تم گاڑی مت بھیجنا میں خود آجاؤں گا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سلیم وقت پر نہ پہنچے ہوں۔ صرف ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ سلیم کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں آسکے۔ مگر انہوں نے صبح سویرے مجھے اطلاع بھجوا دی تھی اور ساتھ ہی وہ مضمون بھی بھجوایا جو انہیں اس جلسے میں پڑھنا تھا۔ میں اب اس واقعے کو یاد کرتا ہوں کہ سوچتا ہوں کہ

بظاہر بے پروا نظر آنے والا یہ انسان کتنا ذمہ دار تھا۔ اُسے اپنے وعدے کا کتنا پاس تھا۔ یہ سب محبت خلوص اور بڑے پن کی باتیں ہیں۔ سلیم آنے جانے کے زیادہ دلدادہ نہیں تھے۔ لیکن میں نے انہیں جب بھی دعوت دی انہوں نے انکار نہیں کیا اور بر وقت پہنچے۔ ادھر کچھ عرصے سے انہیں فلسفے سے زیادہ شغف ہو گیا تھا۔ جب ملاقات ہوتی تو پروگرام بناتے کہ دن بھر کے لیے تمہارے یہاں آؤں گا۔ یونیورسٹی لائبریری میں فلسفے کی کتابیں دیکھوں گا۔ بس تم ساری کتابیں نکلوا دینا۔ مگر اس کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ ہم لوگ یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھتے۔

سلیم کی وضع قطع اور لباس ہر قسم کے تکلفات سے پاک اور سیدھا سادا تھا۔ ایک زمانے میں صدری پہنتے تھے۔ پھر شیروانی پر گزارا کرنے لگے۔ شیروانی میں بھی کوئی احساس تفاخر نہیں۔ بس پہن لی وہ ان لوگوں میں سے تھے جو لباس اور اس کے لوازمات کو اہمیت نہیں دیتے۔ اصل چیز تو انسان کی روح۔ اس کا ذہن۔ خلوص اور لگن ہے۔ ایک شام میں ان کے یہاں گیا تو وہ صرف بنیان اور پاجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ بنیان بھی دامن یوسف کی طرح ...... اندر سے ان کی بیٹی آئی اور کان میں کچھ کہا غالباً یہی کہ کرتا پہن لیجیے۔ سلیم ہنسے اور بولے ارے یہ تو اپنے اسلم ہیں۔ ان سے کیا تکلف۔ ویسے ہی بیٹھے رہے لیکن جب ایک اور صاحب کے آنے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے جلدی سے کرتا پہن لیا۔

سلیم کا رویہ صلح کل اور انداز درویشانہ تھا۔ جب وہ وزیر اطلاعات کے مشیر تھے اس وقت بھی ان کی درویشی پوری طرح برقرار رہی۔ دوستوں کی دلداری ان کا شعار اور دوسروں کو چونکا دینا ان کی سرشت تھی ان کا انداز اور سوچ سب سے الگ تھی۔ بعض لوگ سلیم سے ناراض بھی ہوئے مگر شاید ان لوگوں نے سلیم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ سلیم کے یہاں معصومیت اور کھرا پن تھا منافقت نہیں تھی۔ حق گوئی تھی مصلحت نہیں تھی۔ دوستوں کی دلداری کے باوجود اس نے کبھی کسی کی جھوٹی تعریف یا بیجا حمایت نہیں کی۔

میں نے سلیم کو غیظ و غضب کے عالم یا جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں انہیں غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ بحث میں گرما گرمی تو ہوتی مگر اس نے غصے یا تلخی کا رنگ کبھی اختیار نہیں کیا۔ جذبات کا مظاہرہ بھی نہیں دیکھا۔ اپنی والدہ کے انتقال پر سلیم بالکل چپ چاپ نظر آئے شمیم کے ایکسیڈنٹ پر بھی انہیں افسردہ تو دیکھا۔ غل مچاتے یا چیختے پیٹتے نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ مجھ سے صرف اتنا کہا "آج یہ سن کر کہ شمیم اپنے شعبے میں بیساکھیوں کے سہارے پہنچے تھے دل پر بڑی

پھوٹ لگی ۔ ایک اور دفعہ میں ان کے یہاں بیٹھا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں کسی نے اندر آ کر اطلاع دی کہ بچے اسکول سے نہیں آئے ۔ سلیم یہ سن کر پریشان سے ہو گئے ۔ فوراً فون کیا ۔ گلی میں تھوڑی دور جا کر دیکھا ۔ پھر آ کر بیٹھ گئے لیکن رہے پریشان ۔ اتنے میں بچے آ گئے ۔ اسکول بس میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ سلیم نے بچوں سے خیریت پوچھی اور پھر باتوں میں لگ گئے ۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ ہلکی سی پریشانی کا احساس تو تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سلیم نے بڑی محنت سے انفرادی حیثیت حاصل کی تھی۔ مطالعہ اور غور و فکر میں ہمیشہ منہمک رہے ۔ قدیم ادب پر بھی ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور جدید ادب کے ہر گوشے سے واقف تھے ان کا مطالعہ اردو ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ انگریزی کے توسط سے انہوں نے ادبیات عالیہ کے تمام شہ کاروں اور عصر جدید کے تمام ادبی رجحانات کو سمجھا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بہت سی انگریزی نظموں کے ترجمے سنائے جس سے اندازہ ہوا کہ انہیں جدید انگریزی شاعری سے پوری واقفیت ہے اور انہوں نے انگریزی کے جدید شاعروں کا مطالعہ ہی نہیں کیا انہیں اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ سلیم کے یہاں ذہنی ارتقاء کا عمل مسلسل متحکم اور مثبت رہا ہے ہمارے یہاں عام دستور یہ ہے کہ ایک خاص سطح پر لوگ مطالعے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور بند پانی میں محصور ہونے کے باوجود اپنے خیالات عالیہ کو سمندر سے بھی زیادہ وسیع سمجھنے لگتے ہیں سلیم کے یہاں اس قسم کی کوئی خفیف الحرکاتی نہیں تھی۔ ان کا علم تازہ، قدیم و جدید دونوں پھیلاؤ اور فراخی بصیرت کے امتزاج سے نکھرا ہوا تھا۔ یہی کیفیت سلیم کے لکھنے کی بھی تھی ۔ سلیم نے اس سلسلے میں بھی بڑی محنت کی تھی۔ بڑا ریاض کیا تھا ۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا ۔ اخباری کالم، ریڈیائی فیچر، تقریریں، ڈرامے تنقیدی مضامین ۔ اشعار سب میں سلیم نے اپنا انداز الگ نکالا۔ محنت اور خلوص سے کام کیا۔ ٹالا نہیں ۔ سلیم نے بعض افسانوں اور ناولوں کی ڈرامائی تشکیل میں بھی اتنی ہی محنت کی جتنی محنت اپنے ادبی اور تنقیدی مضامین پر کی ہے ۔ یہ سلیم کا مزاج اور ان کی ادبی لگن کا بھرپور اظہار تھا ان کا فن بہتر سے بہتر کی جانب بڑھتا رہا۔ صلاحیت بھرپور انداز میں ظاہر ہوتی رہی ۔ بیاض سے چراغ نیم شب اور نئی نظم سے اسلامی نظم تک سلیم نے ایک پورا سفر کیا ہے ۔ ایک منزل سے دوسری منزل کیطرف قیام کہیں نہیں کیا ۔ آگے ہی قدم بڑھاتے رہے۔ سلیم احمد ہمارے ادب میں ارتقائے مسلسل اور ہمہ جہتی کی ایک خوشگوار علامت ہیں۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا لیکن انگریزی محاورے کے مطابق موم بتی کو دونوں سروں سے جلانے کی کوشش نہیں کی۔

سلیم میں بعض عادتیں ایسی بھی تھیں جن سے طبقۂ اشراف کے دانشور نالاں رہتے تھے۔ اب مثلاً ہمدانی کا فون آیا کہ فلاں دن گیارہ بجے ادبی مذاکرے کی ریکارڈنگ ہے۔ طبقۂ اشراف کے دانشور گیارہ بجے پہنچ گئے اوّل تو چراغ گل پگڑی غائب والا مضمون یعنی خود ہمدانی ہی غائب۔ خدا خدا کر کے کہیں سے برآمد ہوئے تو معلوم ہوا کہ سلیم کو بھی اس مذاکرے میں شریک ہونا ہے۔ اب سب کے سب بیٹھے حق تو سبحان تو کر رہے ہیں۔ ہمدانی نے فون کیا۔ معلوم ہوا کہ چلنے والے ہیں۔ طبقۂ اشراف کے دانشور بیٹھے پھن پھنا رہے ہیں کہ ہمیں تو صدر صاحب نے بلایا ہے اور فلاں وزیر ہمارے دولت کدے پر آنے والے ہیں۔ لعنت ہو ہم پر جو آئندہ ایسے پروگرام میں آئے۔ (لطف یہ کہ جب بھی مجھے اس پروگرام میں جانے کا اتفاق ہوا ان لوگوں کو ہمیشہ پہلے سے موجود پایا) ہمدانی خان اپنی ساری نرگستانی کے باوجود بڑی لجاجت سے سمجھا رہے ہیں۔ اتنے میں گھڑی نے بارہ بجائے ذرا دیر بعد سلیم بھی مسکراتے ہوئے آپہنچے اور آتے ہی ہمدانی پر برس پڑے۔ یہ روز روز کے مذاکرے تم نے خوب نکالے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے اور پھر یہ تاکید بھی بارہ بجے پہنچ جاؤ۔ بارہ بجے بھی کوئی پہنچ سکتا ہے۔ پھن پھنانے والے طبقۂ اشراف کے دانشور ایسی موقعے پر چپ سادھے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ میں نے یہ منظر بے شمار دفعہ دیکھا ہے۔ نہ سلیم نے کبھی اپنی روش بدلی نہ طبقۂ اشراف کا انداز بدلا۔ ہمدانی غریب دونوں پاٹوں کے درمیان پستا رہا اور صحت مند و مسرور رہا۔

میں نے سلیم کو کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا نہ وہ خود کسی سے مرعوب کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں مو ہنی تھی۔ لوگ خود بخود کھنچتے تھے۔ وہ اپنے بعض اصولوں میں بہت سخت تھا۔ مثلاً کسی ایسی کتاب کی رسم اجرا میں شرکت نہیں کرتا تھا جس کے لیے اشتہاری مجلہ شائع کیا گیا ہو۔ یہ اس کی ایک ادا تھی۔ دوست احباب چڑتے بھی تھے مگر وہ اپنی وضع پر قائم رہا۔ ۴۸ء سے ۸۳ء تک سلیم سے تعلقات رہے مگر میں نے اس کی زبان سے کوئی ناشائستہ بات، بیہودہ جملہ یا کسی کی برائی نہیں سنی جب سنی سچی اور کھری بات سنی۔ میرے اس کے درمیان کوئی تکلف نہ تھا۔ میں اسے سلیم کہتا تھا اور وہ مجھے اسلم۔ گفتگو میں آپ جناب بالکل نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی مجھے تم کہتا تھا اور میں بھی تم ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ ایک شفیق باپ محبت کرنے والا بھائی اور خدمت گزار بیٹا تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کسی کا سہارا نہیں لیا۔ کسی کی امداد نہیں چاہی اور چونکہ وہ خود حالات کی بھٹی میں پگھل کر کندن ہوا تھا۔

اس لیے نوجوانوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا ہمدردانہ تھا۔ وقفے وقفے سے اعصابی دباؤ کا شکار رہنے کے باوجود وہ ہمیشہ خوش مزاج نظر آتا تھا۔

سلیم کے یہاں انصاف پسندی کے ساتھ ساتھ حفظ مراتب کا اہتمام بھی تھا۔ ایک دفعہ اردو مرکز کے تنقیدی اجلاس میں ناول کے فن پر گفتگو ہو رہی تھی۔ سلیم بھی موجود تھے اور قیسی رامپوری بھی تھے۔ قیسی اظہار خیال کر چکے تو کسی نے سلیم سے کہا۔ آپ بھی کچھ فرمائیے۔ سلیم نے کہا "ایک ایسے شخص کے خیالات سننے کے بعد جس کی ساری زندگی ناول نویسی میں گزری ہے میرا کچھ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سلیم قیسی کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ مگر سلیم نے خاموش رہ کر قیسی کا بھرم قائم رکھا۔ سلیم بلا وجہ کسی سے نہیں الجھتا تھا۔ شرارت اور چھیڑ کی بات الگ ہے جب ملاقات ہوتی تو وہ شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہتا "ہاں تو تم اس دن کیا کہہ رہے تھے اس مضمون کے بارے میں۔ اور پھر ایک پُر لطف بوچھار شروع ہو جاتی۔ خود ہی سوال کرتا۔ خود ہی جواب دیتا۔ ادھر کچھ دن سے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ سلیم کی گفتگو کی جاذبیت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ اکثر وہ آنکھیں بند کر کے سرگوشی کے انداز میں بولتا رہتا اور ہم لوگ چپ چاپ سنتے رہتے۔ بعض اوقات مسحور ہو جاتے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ موت کے فرشتے نے سلیم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ایسے لمحے کا انتخاب کیا جب وہ محو خواب تھا کیونکہ عالم بیداری میں اگر سلیم اپنے دل موہ لینے والے انداز میں گفتگو شروع کر دیتا تو شاید اس فرشتے کو اپنے کار منصبی کی انجام دہی میں دقت پیش آتی۔ اقبال کا ایک شعر بے اختیار ذہن میں آتا ہے ؎

فرشتۂ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

سلیم کا مرکزِ وجود بھی موت کے فرشتے کی دسترس سے بہت دور تھا۔

فتح محمد ملک

میرے سلیم بھائی

اسلام آباد ہوٹل کے ایک کمرے میں احمد ندیم قاسمی کے پاس ادیبوں کا جمگھٹ لگا تھا جائے تنگ و مردماں بسیار کی صورت درپیش تھی۔ لوگ آتے اور جہاں جگہ پاتے ٹک جاتے۔ سلیم احمد تشریف لائے تو میں نے بہ منت انہیں اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ سلیم احمد کے رخصت ہونے پر پروفیسر پریشان خٹک میرے اس طرزِ عمل پر معترض ہوئے۔ کہنے لگے:

"میں ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں۔ صدیق سالک صدر مملکت کے پریس سیکرٹری ہیں۔ ہم دونوں خوبصورت، لمبے تڑنگے جوان ہیں۔ ہم نے تھری پیس سوٹ پہن رکھے ہیں۔ جب ہم داخل ہوتے تو ملک صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن جب میلی سی شیروانی میں ملبوس ایک شخص آیا تو انہوں نے بہ صد اصرار اسے اپنی کرسی پیش کر دی۔ میں اور سالک پلنگ کی پائنتی پر سکڑ رہے ہیں۔ میں اپنی اور سالک کی طرف سے اس رویّے پر احتجاج کرتا ہوں۔"

اس پر احمد ندیم قاسمی نے حیرت کے ساتھ پوچھا:

"پریشان صاحب آپ واقعتہً اس اُجلی اور منوّر شخصیت سے متعارف نہیں؟ یہ سلیم احمد تھے۔"

"اچھا، تبھی آپ بھی ہم سب کو بھول کر صرف انہی کے ساتھ باتوں میں محو تھے۔" پریشان خٹک کی تشفی ہو گئی اور میں یہ واقعہ بھول گیا۔ ایک مدت بعد سلیم احمد کی یاد میں برپا ایک تقریب میں پروفیسر پریشان خٹک نے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے میرے ذہن میں اس واردات کو تازہ کر دیا۔ میرے اور سلیم احمد کے درمیان محبت اور رفاقت کا یہ گہرا اور اٹوٹ ربط اس زمانے سے قائم ہے جب

اوّل تو مجھے کوئی جانتا ہی نہ تھا اور جن چند لوگوں کی نظر سے میرے ابتدائی مضامین گزرے تھے انہیں یہ ماننے میں تامل تھا کہ واقعتہً میرا کوئی وجود ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فتح محمد بھی بھلا کسی ادیب کا نام ہو سکتا ہے۔ ہو نہ ہو کوئی پرانا ادیب اس قلمی نام کے ساتھ ادبی مباحث چھیڑ رہا ہے۔ ایسے میں "ادبِ لطیف" میں میرا ایک مضمون پڑھ کر سلیم احمد نے انتظار حسین سے پوچھا:

"یہ تم نے فتح محمد ملک صاحب کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟ کون صاحب ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کب لکھنا شروع کیا اور تمہارے ہتھے کیسے چڑھے؟ ان کا مضمون بہت پسند آیا۔ ادبِ لطیف اگر ہر مہینے ایک مضمون ایسا شائع کر دے اور سال بھر میں دو ایک آدمی ایسے ڈھونڈ نکالے تو سمجھو کہ بات بن گئی۔"

جنوری ۶۳ء کے ادبِ لطیف میں سلیم احمد کی یہ بے ساختہ اور والہانہ داد پا کر مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی۔ چند روز بعد سلیم احمد کا پہلا خط ملا۔ میں ان دنوں اپنے گاؤں میں مقیم تھا۔ اس احساس نے میری خوشی کو دوچند کر دیا کہ ضلع اٹک کے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں بیٹھے ایک نوعمر اور گمنام مبتدی کی تحریروں کو سلیم احمد اتنی توجہ اور اس قدر محبت کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ میں خوشی میں ایسا سرشار ہوا کہ خط لکھنے میں تاخیر کر دی۔ اس پر سلیم احمد نے لکھا:

"ملک صاحب، میں تو آپ کے جواب سے مایوس ہی ہو چکا تھا کیونکہ ایک صاحب نے مجھے یہاں بتایا کہ جس مقام کا نام میں نے "لہتی" لکھا ہے وہ لہتی نہیں "لیٹی" ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کیا امید رہتی ہے۔ ارادہ کر رہا تھا کہ دوسرا خط لکھوں کہ اتنے میں آپ کا جواب آیا۔

"گذشتِ دفا" کے تبصرہ پر آپ کو تو نہیں مگر قاسمی صاحب کو یہی گمان گذرا ہے کہ یہ ان کے نکاہی کالموں کا ردِعمل ہے۔ خوب تماشا ہے کہ یہاں دہری جواب دہی کرنی پڑتی ہے بعض لوگ کہتے ہیں تبصرہ میں قاسمی کی اتنی تعریف کی گئی ہے جس کے وہ مستحق نہیں تھے اور خود قاسمی صاحب کو اس میں مخالفت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر قاسمی صاحب کو آپ کے خط کا اقتباس بھیجوں گا۔ رہ گیا آپ کا یہ کہنا کہ بھائی سلیم احمد تمہیں دوسروں کی رائے سے کیا لینا؟ مجھے دوسروں کی رائے سے کچھ نہیں لینا اسی لیے تو یہ جھگڑا ہے۔ ورنہ دوسروں کی رائے لینے والے تو بس چپ چاپ رائیں نقل ہی کرتے چلے جاتے ہیں کیا آپ کا خیال ہے کہ غالب پر کوئی صحیح رائے اس وقت تک دی جا سکتی

ہے۔ اب تک ان تمام نقادوں سے نہ لڑا جائے جنہوں نے غالب کی شخصیت پر ہزارہا پردے ٹانگ دیئے ہیں۔ میر، سالک اور ممتاز حسین کی رائیں، جو ظاہر ہے کہ ذمہ داری سے ظاہر کی گئی ہیں، قاسمی کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ پڑھنے والے انہیں محترم ادیبوں کی وقیع ادبی رایوں کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ پھر ان پر بات کرنا غلط کیسے ٹھہرا۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان و بیان کی غلطیاں شاعری کے لیے سم قاتل ہیں۔ شاعری کے "معنی" پر غیر ضروری زور دینے کے سبب یہ خیال عام ہوا کہ زبان و بیان کچھ نہیں۔ لیکن میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ شاعری صرف "زبان" ہے اور صرف "بیان" ہے۔ پہلے اس میں معنی بھی ڈال دیجئے تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ بیدل نے تو یہ کہا ہے کہ "شعر خوب معنی ندارد"۔

اچھا ایک بات بتائیے۔ آپ بھی دوسروں کی طرح اس مرض میں کیوں مبتلا ہیں کہ لکھنے والے کی ہر تحریر کو اس کے جذبات کی "عکاسی" کے طور پر پڑھیں۔ تحریر لکھنے والے کی شخصیت اور کردار کا آئینہ سہی، مگر تحریر کوئی گٹر نہیں ہے جس میں آدمی چپ چاپ سارا کوڑا کرکٹ پھینک دے۔ "غیر ضروری شدت" کا ذکر بعض لوگوں نے اسی انداز میں کیا ہے جیسے میں نے اپنے دل کی "بھڑاس" نکالی ہے۔ اور اب بھڑاس نکالنے کے بعد متوازن ہو جاؤں گا۔ خیر دوسرے لوگوں کا ذکر نہیں لیکن جب مظفر اور آپ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں اس وقت میں بیچارہ کیا کروں۔ دائمی نظم اور پورا آدمی جیسی ایک پوری نسل، پورے رجحان بلکہ باقاعدہ ایک نظریہ سے لڑ رہا ہوں۔ تبصرہ میں میرا معاملہ افراد سے ہے۔ اصول ہے کہ ہاتھی کو گرز سے مارا جاتا ہے اور چیونٹی کو چپل سے۔ مجھ میں غیر ضروری شدت نہ پہلے موجود تھی۔ نہ اب کم ہوئی ہے۔ بس میں گرز کی جگہ گرز استعمال کرتا ہوں اور چپل کی جگہ چپل یہی اصول لڑائی کا ہے اور یہی اصول صلح کا۔ صلح میں بھی بعض لوگوں کا کام ایک پھول کے تحفہ سے چل جاتا ہے اور بعض لوگوں کے لیے گلستان بھی کم پڑتے ہیں۔

لکھنے کی ضرورت تو نہیں، لیکن دل چاہتا ہے تو کیوں نہ لکھوں، آپ کی تحریریں مجھے پسند ہیں۔ ادب لطیف میں آپ کا مضمون "تمیز دار بھوکی بدتمیزی" اتنا پسند آیا کہ بے اختیار انتظار کر مبارک باد دینی پڑی کہ اس نے اتنا ضروری، اتنا خیال افروز

اور اتنا دلچسپ مضمون شائع کیا۔ اس کے ساتھ آپ کی دوسری تحریروں کا اشتیاق پیدا ہوا۔ آپ کی تحریروں میں ایک عجیب بات پاتا ہوں اور یہ میرا ذاتی تاثر ہے کہ آپ میرے اندر شدید امید پیدا کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد شدید مایوسی۔ خدا جانے گڑبڑ کہاں ہو جاتی ہے۔ میں چونکہ مقبول لوگوں کے غیر ضروری تشدد کا مارا ہوں اس لیے آپ کے بارے میں کہتا ہوں "فتح محمد بہت اچھا لکھتا ہے۔ مگر بے ایمان ہے۔" آپ کو بُرا لگا؟ لگا تو لگے۔ آپ اپنے آپ سے بے ایمانی کرتے ہیں۔ یہ آپ کے "ممدوحین" کیا چیز ہیں۔ قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، لاہور کی نئی نسل۔ ان میں کچھ تعریف کی باتیں ہیں تو تعریف ضرور کیجئے کیونکہ تعریف نہ کرنے والا بھی بے ایمان ہوتا ہے۔ تعریف ضرور کیجئے مگر اپنی "اقیمنٹ" پر نہیں۔ آپ ان سب سے زیادہ گراں بہا چیز ہیں۔ بشرطیکہ آپ جو کچھ ہیں اس سے روگردانی کر کے کچھ اور بننے کی کوشش نہ کریں۔

جمیل صاحب کا بس سے حادثہ ہو گیا تھا۔ بچ گئے۔ اب بہتر ہیں۔ ان کی کتاب کتابت کے لیے جا چکی ہے۔ میں نے اس دوران دو ایک مضمون لکھے ہیں۔ آپ کراچی آئینگے تو دکھاؤں گا۔ آپ کراچی کب آ رہے ہیں؟

آپ کا

سلیم احمد

سلیم احمد نے حسب معمول خط پر تاریخ درج نہیں کی مگر لفافہ پر ڈاک کی مہر بتاتی ہے کہ مجھے یہ خط ۱۹ اگست ۶۲ء کو موصول ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم ترقی پسندوں کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ رسالہ "نیا دور" میں "دشت وفا" پر اپنے مفصل تبصرہ میں انہوں نے غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک اور ممتاز حسین کے خیالات کی تردید اور زبان و بیان کے دو ایک اسقام کی نشاندہی کے بعد ندیم صاحب کی شاعری کے اصل حسن کی تحسین کی تھی۔ مگر یار لوگوں کی نگاہ فقط تردید میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ دونوں طرف نیتوں پر شکوک بڑھنے لگے تھے۔ میں نے ندیم صاحب کو سلیم احمد کے قلم سے تحسینی تبصرہ پر مبارکباد دی اور سلیم احمد صاحب سے تردیدی حصہ کی شکایت کی تھی۔ چنانچہ سلیم احمد نے اپنے خط کے ایک حصہ میں میری شکایت کی تو دوسرے حصے میں میری حقیر تحریروں پر اتنی بے لاگ اور اس قدر محبت بھری تنقید کی کہ "بے ایمان" کا ام صفت مجھے دشنام

نہیں انعام معلوم ہوا۔

ہماری باہمی محبت میں جو چیز نادر و نایاب ہے وہ ہے اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کی نیت کی صفائی اور رائے کی دیانت پہ اٹوٹ اعتماد۔ احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب اور لاہور کی نئی نسل (ناصر کاظمی، انتظار حسین اور ان کا حلقۂ اثر) آج بھی میرے "ممدوحین" میں شامل ہیں اس کے باوجود سلیم احمد کی محبت اور رفاقت کی یاد میرا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ میں کسی معاشرے کی تندرستی اور توانائی کا اندازہ اس میں اختلاف رائے کے پنپنے کے امکانات سے کرتا ہوں۔ کسی معاشرے میں انفرادی اور گروہی اختلاف رائے کے حدود Range جس قدر وسیع ہوں گے وہ معاشرہ اسی قدر تندرست و توانا ہوگا۔ بدنصیبی سے تنگ نظری اور کوتاہ باطنی کی منحوس گرفت نے ہمارے معاشرے کو ایک بیمار معاشرہ بنا رکھا ہے۔ آج ہمارے ہاں قرض محبت کی قینچی ہو یا نہ ہو، اختلاف رائے ضرور محبت کی قینچی ہے۔ رائے سے اختلاف ذات پر حملہ تصور کیا جانے لگا ہے۔ ایسے میں سلیم احمد کی ذات ہماری معاشرتی توانائی کی علامت تھی۔ وہ جس دلیری اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اسی بہادری کے ساتھ مخالفانہ نقطۂ نظر پر غور کرتے تھے۔ ادب اور سیاست کے چند مسائل پر کبھی کبھار میرے اور ان کے درمیان چھوٹے موٹے اختلاف پیدا ہوتے۔ مگر ذہنی تحفظ کی اس فضا میں بھی ہماری قلبی یگانگت میں سر مو فرق نہ آیا۔ جس وقت بھٹو شہید کے اسلامی مساوات کے نعرہ نے مجھے مسحور کر رکھا تھا عین اس وقت سلیم احمد نے اسلامی سوشلزم کے تصور کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا اور پھر وہ وقت آیا جب سلیم احمد وزارت اطلاعات کے مشیر مقرر ہوئے اور "جسارت" کا نامہ نگار یونیورسٹی سے میری برطرفی کا مطالبہ کرنے لگا۔ ان حالات میں بھی سلیم احمد کی گرمجوشی میں کمی نہ آئی۔ اگر وہ ایک دن کے لیے بھی اسلام آباد آئے تو نظیر صدیقی کو ساتھ لے کر مجھے ڈھونڈتے پھرے۔ دینی عقاید میں اختلاف کا معاملہ ادب اور سیاست سے کہیں زیادہ نازک معاملہ ہے مگر دیکھیے کہ سلیم احمد اس نازک مرحلے کو بھی کس حسن و خوبی کے ساتھ طے کرتے ہیں۔

برادرم ملک صاحب! السلام مسنون

ابھی ابھی آپ کا محبت بھرا خط ملا۔ آپ نے میری صحت کی دعا کی ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے "سانداز نظر" تو میرے سرہانے رکھی ہے۔ ایک دفعہ پڑھ چکا ہوں،

دوسری بار ورق گردانی کر رہا ہوں لیکن تعصبات میرے پاس نہیں ہے۔ ایک صاحب مجھے کتابیں لاکر دیتے ہیں وہ اتوار کو آئیں گے تو ان سے اسے منگوا دوں گا اور ان شاء اللہ دونوں کتابوں پر ایک ساتھ تبصرہ کروں گا۔ آپ کو پاکستان سے جیسی سچی محبت ہے وہ ہمارے تعلق کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ لیکن اسلام کے بارے میں آپ کے پورے خیالات ابھی مجھ پر واضح نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں۔ آپ میرے اقبال والے خط کا جواب دیں گے تو اس ضمن میں یہ گفتگو بھی ہوتی رہے گی۔ معلوم ہوا کہ نظیر صدیقی صاحب بھارت سے واپس آگئے ہیں۔ ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دیجئے گا۔

آپ کا بھائی
سلیم احمد

یہ ہیں میرے سلیم بھائی جو فتوی جاری نہیں کرتے باتیں کرتے ہیں جو عمر بھر سچی تخلیقی لگن اور گہرے علمی تجسس کے ساتھ حق کی تلاش میں سرگرم عمل رہے اور جن کے لب پر ہمارے لیے ہمیشہ یہ دعا رہی ہے

تو شیشہ بنے کہ سنگ، کچھ بن
اندر سے مگر گداز ہو جا

مظفر علی سید

ظہر سے عصر تک ــــ سلیم کے ساتھ

عصر کی قسم! انسان تو سراسر نقصان میں ہے۔ ماسوا ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیئے اور جو (لوگوں کو) حق کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور صبر کی سمت بلاتے ہیں

(سورۃ العصر)

تب بھی ظہر کا وقت تھا، زندگی کی ظہر کا، جب سلیم سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اور اب کہ زمین ۳۵ مرتبہ اس کا طواف کر چکی تھی، تو سورج پھر سوا نیزے پر کھڑا تھا ــــ ۲۹ اگست ۸۳ کا سورج میں کوئی ایک ہزار مرتبہ سلیم کے دروازے پر آیا ہوں گا مگر یہ ایک ہزار اکیویں آمد کیوں اتنی مختلف لگ رہی تھی؟

ڈیڑھ دن پہلے کراچی میں وارد ہوا تو مشفق خواجہ نے بتایا تھا:
سلیم بہت بیمار ہے۔ پوچھ رہا تھا مظفر آخر پشاور سے کب آئے گا۔

اور میں نے سوچا وہ کب بیمار نہیں تھا۔ اور ہم میں سے کون ہے جس نے ایک نہ ایک موذی مرض نہیں پال رکھا، اور سو مرضوں کا ایک مرض تو یہی ہے کہ وطن میں مکھو بڑھ کر ردی لکھانے کا عارضہ ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

بیماری ویماری تو ٹھیک ہے مگر میں اب چار پانچ دن کے لیے آیا ہوں تو مل کر ہی جاؤں گا۔

نہیں، نہیں! شمیم کہہ رہا تھا، بھائی صاحب بتاتے نہیں مگر واقعی سخت بیمار رہیں اور تمہارا بار بار پوچھ چکے ہیں کب کراچی پہنچو گے اور اب کی بار تو تم نے:

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

— ہاں پروگرام تو میں نے بنایا تھا بہت دنوں سے ہو رہا ہے، آج چلتا ہوں کل چلتا ہوں مگر جون سے اگست کا اواخر آن پہنچا۔

— اب جو میں نے بنایا کہ آخرکار آنے ہی والے ہیں تو فرمایا کہ اس سے کہنا آتے ہی جا ملے۔

آخر ایسی بھی کیا بڑا اڑی تھی۔ اس کے یہاں تو جب جاؤ ٹھٹ کے ٹھٹ بندھے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ خود کم ہی باہر نکلتا ہے۔ ریڈیو کا ایک آدھ چکر ہفتے عشرے میں گھنٹے دو گھنٹے کے لیے لگاتا ہے۔ کالم بھی لکھ کے کسی کے ہاتھ بھجوا دیتا ہے۔ کوئی تقریب ہو تو جو بلائے آ کرلے جائے۔ اگر اسے ملنا چاہو تو اتنے سارے قدردانوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے باقاعدہ انٹرویو کرنا پڑتا ہے۔ اسے کیا پڑی ہے کہ میرا انتظار کرے؟ کہیں کوئی کام نہ پڑ گیا ہو؟ یوں ہوتا تو خط بھی لکھ سکتا تھا۔ مگر اسے کب کسی سے کوئی کام پڑا؟ اور مجھ سے تو کبھی نہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے؟ خیر ابھی تو آیا ہوں اور وقت بھی خاصا ہے، کسی دن دیکھ لیں گے جا کر۔

اگلے دن دوسرے دوستوں سے، اور بھی وحشت خیز خبریں ملیں۔ آخر کیوں اتنا ٹوٹ کے ملنا چاہتا ہے؟ خدا خیر کرے۔ اس کے آخری کالم جو دیکھے تھے تو لگا تھا جیسے اتنا مضبوط آدمی ڈھے سا گیا ہو۔ بات کچھ یوں تھی کہ اسلام، اس فاسد معاشرے میں کوئی اجتماعی تغیر پیدا نہیں کرتا تو صورت حاضرہ کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایک پردہ دُودہ ایک سموک اسکرین کے سوا اس کا مصرف کیا ہے؟ یہ سوال تو بہت اذیت ناک ہوگا، ایک ایسے شخص کے لیے جس نے اپنا تن من دھن اسی ایک داؤں پر لگا رکھا ہو۔ تیس تیس برس پہلے وہ پتوں پہ داؤں لگا کر یاروں کو کھلایا پلایا کرتا تھا۔ جب کہ اس کا اپنا وسیلۂ روزگار۔ ان دنوں، بعد میں ریڈیو کے سکرپٹ رائٹر کی نوکری سے بھی کم بار آور تھا اور چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں بھی اس کے سر پر تھیں۔ اور اب کی بار تو اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا داؤں لگایا تھا۔ جبکہ پتے بھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھے۔ جیت بھی ان کی تھی ہار بھی ان کی تھی۔ مگر وہ کھیلے جا رہا تھا، ذہانت کے ساتھ اور صبر کے ساتھ۔ کھیل کے ساتھی کہہ رہے تھے ایسے نہیں کھیلتے، سلیم بھائی! یوں تو پٹ کے رہو گے اور اس کے بعد اس کی پٹائی کو یقینی بنانے کے وہ سارے حربے جو انہوں نے خود سلیم سے سیکھ رکھے تھے مگر جن کو اب اس نے اپنے ہاتھوں پر حرام کر رکھا تھا، وہ سب حربے اسی پہ آزمائے جا رہے تھے۔ کب تک آخر کب تک چلے گا، یہ پردہ دُودہ کا تماشا؟ اچھا پوچھیں گے جا کر پرسوں ترسوں۔

مگر پرسوں ترسوں کوئی ہفتہ پہلے جب کراچی پہنچے بمشکل ایک دن ہوا تھا، گھر سے اطلاع آئی کہ ایک محترم بزرگ انتقال فرما گئے۔ اب میں جلدی سے گجرات پہنچنے کی فکر میں تھا، اور اس دن لاہور تک پی آئی اے کی کسی پرواز پر جگہ مل گئی ہوتی تو سلیم سے ملنا رہ گیا ہوتا۔ مگر بھلا ہو ہوائی ٹریفک والوں کا انہوں نے ایک پورا دن میرے لیے خالی چھوڑ دیا۔ کچھ دیر اپنا کام سمیٹنے میں گزری اور پھر ایک مانگے کی گاڑی لے کر کراچی یونیورسٹی کے علاقے میں ایک صاحب سے ملنے کو نکلا تو میں نے ڈرائیور سے کہا کہ واپس آکر کھانا کھاؤں گا اور ڈاکٹروں کی نصیحت پر ذرا آرام کروں گا۔ شام کو ایک دوست کی طرف جانا ہے۔ اتنے میں تم بھی کھانا وانا کھا کے آجانا۔ مگر واپسی پر ابھی یونیورسٹی کی چوکی سے باہر نکل کے کارساز کی طرف گاڑی مڑنے ہی والی تھی کہ یکایک منہ سے نکلا ـــــ سیدھے! ڈرائیور حیران کہ سیدھے کہاں؟ بتایا کہ انچولی میں جس دوست کے پاس شام کو جانا تھا، ابھی ہو آئیں تو بہتر ہے کہ شام کو وہاں ہجوم ہو جائے گا۔ اس وقت اکیلے ہوں گے۔ مسکن ۲۰۔ بی کے سامنے اترا تو لوہے کے پھاٹک نے آغوش کھولی ہوئی تھی اور ڈیوڑھی میں کوئی بچہ کھیلتے ہوئے نہ ملا کہ پوچھوں دائیں طرف اس کے کمرے کا دروازہ ذرا سی درز چھوڑ کر بھیڑا ہوا تھا۔ اسے تھوڑا سرکا کے آواز دی تو کسی نے تکیے سے سر اٹھایا۔ وہی تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور حواس باختہ جیسے ابھی سو کے اٹھا ہو۔ چونک کے پوچھا، کون؟ بتایا تو اٹھ کے ایک دم بغلگیر ہو گیا۔

ارے تم، کب آئے؟ میں نے تو جانے کس کس سے کہہ رکھا تھا۔ بہت دیر کر دی۔ چلو آؤ بیٹھو!

اب کیا ہو سکتا تھا؟ بیٹھتے ہی وہ سب باتیں جو پوچھنا تھیں ایک دم دماغ میں گھوم گئیں خیالات میں یہ نیا موڑ کیسے آیا؟ یاروں کا ردعمل کیا ہے؟ اور وہ ہندوستان کے خلیجی ترکار کا ناول کہاں ہے جو کہتے ہیں کہ تم نے چھاپا ہے اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اور وہ تمہارا دوسرا مجموعۂ کلام کہاں ہے جو سنتے ہیں لاہور کی عظمت مآب ہستیوں نے غلط سلط چھاپ کے برباد کر دیا ہے؟ اور ایسے بہت سے دوسرے دوستانہ سوال جن پر عام حالات میں کھل کے بحث ہوتی۔ مگر دیکھا تو میز پر دواؤں کا ڈھیر لگا تھا، اور بستر پر ہومیو پیتھی کی شیشیاں بلکہ بہت سی کھلی گولیاں لڑھکتی پھر رہی تھیں۔ اب میرے سب سوال بے معنی ہو چکے تھے۔ گھر میں سناٹا تھا جیسے بچے کہیں باہر گئے ہوئے ہوں۔ انہی سے بات شروع کی تو بڑی بیٹی کو آواز دی۔

ارے دیکھو تو کون آئے ہیں؟ تمہارے پشاوری چچا!

اونچا کہتے ہوئے وہ چھیڑ نے ہنسا۔ عمر میں وہ مجھ سے چھوٹا تھا یا بڑا، ہم میں سے کسی نے کبھی مان کے نہیں دیا تھا مگر وہ بچوں کے شانے پر بندوق رکھ کر چلا دیتا تھا۔ بیٹی سے چائے لانے کو کہا۔ تب میں نے کہا کہ ابھی تو آیا تھا مگر اب جلد کلاس میں جانا پڑ رہا ہے۔ کیوں؟ بتایا تو تمکسار ی کرتا رہا اور پھر یکایک کہنے لگا۔

میں تو سوچ رہا تھا تم سے بہت باتیں ہوں گی بحثیں اور لڑائیاں جھگڑے!

تم لڑائی جھگڑے کی بات کرتے ہو اور یار لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ دونوں عسکری کے مجاور بنے ہوئے ہیں اور کسی کو بے وضو ان کا نام بھی نہیں لینے دیتے۔

ارے جانے دو ان کو۔ فکر ہر کس......

وہ تو کہتے ہیں تم خود ان کی جان بخشی نہیں کرتے۔

خیر وہ تو بہت کچھ کہتے ہیں مگر ان کو کیا خبر کہ عسکری سے جس کا ذرا سا بھی رابطہ رہا ہے، اَزلوں سے رہا ہے۔ کوئی مفاد درمیان میں نہیں تھا اور اب بھی آپس میں ان کے درمیان کوئی رسمی تعلق نہیں بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے معمولی مروّت تک نہیں کرتے رہیں خود عسکری سے ان کی زندگی میں جدا ہوا تھا اور اب تک ان کی دو چار باتوں کا سخت قائل ہونے کے باوجود بیسیوں باتوں پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہوں۔ اور تم، خیر تم تو یوں بھی عسکری سے زیادہ خواجہ منظور صاحب کے شاگرد رہے ہو۔ اب بھی عسکری کا بہت لحاظ کرو تو خواجہ صاحب سے دل ہی دل میں ان کی صلح کرائے دم لوگے۔ ہاں تم چاہو تو عسکری کی ادبی شخصیت کی بازیابی کے لیے کام کر سکتے ہو۔

علی گڑھ والوں نے تو عسکری پر کتاب بھی مرتب کر ڈالی۔ ماضی کی بازیافت دیکھی تم نے؟

ذکر سنا ہے مگر میں تو، ماضی کی نہیں، عسکری بلکہ ادیب عسکری کی بازیافت کی بات کر رہا ہوں

اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے عسکری سے چند ایک ادیبوں کے شخصی خاکے بہت ضد کر کے لکھوائے تھے جو خود تمہارے خیال میں ناکام رہے مگر تم نے کبھی ان سے پاکستان بننے کے بعد سے لیکر اپنی جدائی تک کوئی افسانہ لکھوانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

بہت کوشش کی مگر وہ ڈھرّے پر نہیں آئے۔ پھر میں نے چھیڑنا شروع کر دیا، نہیں لکھ سکتے تھے آپ کوئی افسانہ! آپ نے تو نقاد اور مفکر اور عابد و زاہد اور صوفی اور مبلغ اسلام بن کر فنکار عسکری کے گلے پر چھری پھیر دی ہے۔ اب آپ اس کو ذبح کرنے کے بعد پھر سے زندہ نہیں کر سکتے۔ اگلے دن آئے تو کہنے لگے، سلیم خان! تم اگر چاہتے ہو کہ میں کوئی افسانہ لکھوں جس کے چھپنے پر پورے برصغیر میں

دھوم پڑ جائے تو کل ہی لے لو مگر یاد رکھنا یہ وہ افسانہ نہیں ہو گا جو میں لکھنا چاہتا ہوں
تالیاں ! مگر افسانہ سننے کا شوقین بچہ یہ پوچھے گا کہ پھر کیا ہوا !
پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے بھی ضد چھوڑ دی اور چھیڑ چھاڑ بھی۔
تو گویا اپنے عسکری صاحب چوٹ دے گئے تمہیں، معیار کی چوٹ! ارے لکھنے دیا ہوتا۔ ذرا دھوم ہی ہو جاتی اور کون جانے قلم کا یا کسی اور چیز کا زنگ اترتا تو وہ افسانہ بھی وجود میں آجاتا جسے وہ واقعی لکھنا چاہتے تھے۔ اب تو بیٹھے ان کی یاد کو دھنکا کرو۔ ایں ہم رفت آں ہم رفت
چھوڑو، تم کہو کیا کر رہے ہو؟ سنا ہے تم نے میر کو فارسی کا بھی زبردست شاعر بنا ڈالا۔ کب آرہا ہے نقوش کا تازہ میر نمبر؟
بس آنے ہی والا ہے اور میں تو چاہتا ہوں ذرا فکشن پر دو چار تحریری منصوبے مکمل کر کے میر صاحب کی خدمت میں بیٹھ جاؤں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم نے اب تک میر صاحب کو تمہاری اصطلاح میں ریزہ ریزہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی جامعیت کو نہیں دیکھ سکے۔ نہ میر کے دور کے تناظر میں، نہ اپنے دور کے تناظر میں۔ معمولی مشابہت کو چھوڑ کر۔
یہاں پھر عسکری صاحب کی ایک بات یاد آئی ہے۔ کہتے تھے اردو زبان میں کوئی نئی قسم کا شعر پڑھو اور اچھا لگے تو کلیات میر کھول کے بیٹھ جاؤ۔ اس سے ملتا جلتا کوئی شعر مل جائے تو سمجھ لو جو چیز تمہیں پسند آئی تھی اس کی ولدیت درست نہیں۔ تم بھی اپنے طور پر کسی ایسی ہی تلاش میں سرگرداں ہو گے مگر اس سے پہلے کوئی اور منصوبہ مکمل کرنے کا ارادہ ہے تو ہو چکا یہ کام! میر صاحب کا اللہ بیلی مگر نہیں یار، یہ فکشن والی بات بھی ضروری ہے۔ انتظار مجھے لنگڑا نقاد کہتا ہے اس لیے کہ میں فکشن پر نہیں لکھتا۔
تم نے فکشن ہی پہ لکھا ہوتا اور شاعری پر کچھ نہ لکھتے تو کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ انتظار پھر بھی یہ کہتا؟
نہیں، میں سمجھتا ہوں مگر میں نے اس سے کہا کہ میں فکشن پر لکھوں تو مجھے دو چار سال، صبح فکشن شام فکشن لے کے بیٹھنا پڑے گا بہت محنت کرنا ہو گی۔ چھٹی کون دے گا؟ اور گھر کیسے چلے گا؟
اتنے میں چائے آگئی اور ساتھ میں بھابی کا پیغام کہ دوا کھا لیجیے۔ مجھے بھی اپنی دوا یاد آگئی۔ نکال کے سامنے رکھی اور پھر چائے پینے لگ گیا۔ پوچھا، دوا نہیں کھا رہے؟ میں نے کہا، اس دوا کے بعد کچھ دیر کے لیے چائے نہیں پی جاتی۔ اب ذرا ٹھہر کے کھا لوں گا مگر تم یہ کیا کیا دوائیں کھا رہے ہو؟

کس کا علاج ہے؟ کیا بتاتے ہیں؟

اس نے سر سے لے کر پاؤں تک بیسیوں بیماریوں کے نام گنا ڈالے اور سیکڑوں دواؤں کے جن میں سے اکثر میرے لیے نئے تھے کہ اپنے لئے تو ایک ہی بیماری بہت ہے، بقول شیخ الرئیس سب سے بڑی بیماری، دل کی بیماری اور دل کی بیماریوں میں سب سے بڑی دل آزاری۔

اس کی مصیبت یہ تھی کہ وہ دل آزاری سے بہت ڈرتا تھا۔ فیملی ڈاکٹر اور دوست احباب جو بھی کہتے مان جاتا۔ جو بھی دوا تجویز کرتے منگوا لیتا۔ ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، آیورویدک، طب یونانی، طب چین یا کسی قسم کا کوئی مجرب ٹوٹکا جڑی بوٹی، جنگلی چورن یا جوائن بلا بھی ہو۔ وہ بیک وقت ہر قسم کی دوائیں کھا رہا تھا اور لگتا تھا اخلاقاً کھا رہا ہے۔ اس لیے کبھی تو بھول جاتا تھا اور کبھی ایک ساتھ پانچ سات گولیاں اور چھ کوڑیاں پھانک لیتا۔ اور کھاتے ہی لگتا کہ تھک سا گیا ہے اگرچہ دیکھتے ہیں اور بات چیت میں وہ تھکا ہوا نہیں تھا، شاید ہم پنجابیوں کی اصطلاح میں اکا ہوا اکتایا ہوا زیادہ لگتا تھا۔

وہ دیکھا تم نے، میرے نام جو خط ساقی فاروقی نے لکھا ہے؟ اس نے یکایک ایسا سوال کر ڈالا جسے میں خود گفتگو سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

ہاں دیکھا تو ہے۔ مجھے کہنا پڑا، ابھی ہندوستان کے ایک رسالے نے اوراق سے نقل کر کے چھاپا ہے پہلے نہیں پڑھا تھا۔

ایک دم جیسے وقت کی سرنگ میں پچیس تیس برس پہلے کا زمانہ پلٹ آیا اور میں کیا دیکھتا ہوں، کہ ایک سبز آغاز سا لڑکا سلیم کے پاس ہیبت زدہ نیاز مندی کے ساتھ منہ کھولے بیٹھا ہے اور ادب کے بارے میں معمولی سے معلوماتی سوال پوچھ پوچھ کر جوابات کو ذہن نشین کر رہا ہے اور اب دیکھو کیا دم خم ہیں۔ ابھی کل ہی جالی کہہ رہا تھا کہ سلیم کے ساتھ بھی وہی ہوا جو پرانے استادوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے:

کس نیا موخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

میں نے چاہا کہ تلخی اور مایوسی سے الگ کوئی بات کروں

ہاں اس میں ایک مزیداری یہ تھی کہ اس نے تمہارے چھ سات مصرعے منتخب کیے تھے بہت اچھے مصرعے منتخب کیے تھے، لیکن اس نے نقد ادب کے طور پر منطقی نتیجہ نکالنے کا روگ تو کبھی پالا نہیں

یہ بھی نہ سوچا ایسے چھ سات مصرعے اور کس کس کے پاس ہیں؟ اور ایزرا پاؤنڈ کی یہ بات اس نے پڑھی سنی ہوگی تو بھول گیا ہوگا کہ ٹھکانے کے چھ مصرعے بھی کوئی لکھ دے تو ادب کی تاریخ میں اس کا مقام ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔

میں تمہیں بتا نہیں سکتا مظفر، کہ مجھے کتنا رنج ہوا ہے۔ میں نے اس کے لیے......

خاصا وقت ضائع کیا ہے اور شاید ایسے ہی کرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر نہ وقت کی قدر محسوس ہوتی ہے نہ آدمی کا پتا چلتا ہے۔

نہیں تم نہیں جانتے تم تو وہاں پہاڑ پر چڑھ کر بیٹھے ہو، پشاور میں

ویسے پشاور پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔

خیر جہاں کہیں بھی ہو، خوب ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں کوئی اخبار نہ آتا ہو، کوئی ڈاک خانہ نہ ہو، کوئی ریڈیو نہ ہو، کوئی ٹی وی........

ریڈیو کیسٹ تو آج کل گاؤں کی پگڈنڈیوں پر رینگتے ہوئے گدھوں کے گلے میں بھی لٹکے ہوئے ہوتے ہیں اور ٹی وی والوں کو تمہارے جانے کی خبر ملے گی تو نسیم حجازی کا تیسرا ناول لے کے آجائیں گے کہ سلیم بھائی وہاں فرصت ملے گی، ذرا الٹتے ہوئے ایک نیا سیریل بنا کے دیتے آیئے گا۔ تم ضرور آؤ۔ ہم بھی پشاور سے باہر سمجھو ایک گاؤں میں ہی رہتے ہیں، مگر یوں کرنا کہ ناول ساتھ لے کے نہ آنا، سیریل بے شک لکھ ڈالنا۔

ناول تو خیر پہلے بھی بس کہیں کہیں سے اٹھا کر کبھی دیکھ لیتا تھا۔ اور وہ دوسرا سیریل ملنے سے پہلے، ہاں اسے ملنا ہی کہو، تم نے جو مجھے اور اسد محمد خاں کو بہت اچھی دعا لکھی تھی کہ خدا تم دونوں کو اپنی امان میں رکھے۔ اس کے باوجود ہم دونوں باری باری ہفتے دس دن تک بخار میں پھنکتے رہے۔

یہ بخار ناول پڑا تر تا تو خوب تھا۔

مگر پھر بچوں کے کپڑے کیسے سلتے؟

چلو چھوڑو ٹی وی والوں کو۔ کہو شاعری اور تنقید کی صحت کا احوال کیا ہے؟

وہ لمبی نظم لکھی تھی ——— مشرق ——— تم تو بہت دور تھے جب لکھی جا رہی تھی۔ اب ایک ساتھ چھپے گی تو دیکھنا اور اقبال والی کتاب کا نیا ایڈیشن تیار کر کے، اضافوں کے ساتھ، ناشر کو بھیجا ہے۔ چند ایک اعتراضوں کا جواب بھی اس میں ہے۔

اور وہ سستے قسم کے اعتراض تو چھوڑ دیئے تھے نا!؟

نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ سنتے ہوں یا ڈھنگے، اعتراض تو اعتراض ہوتے ہیں یا گفتگو اور بحث کا ایک بہانہ۔ تم تو خیر عسکری کے دفاع کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہو اور جو لوگ ان کے خلاف مہم چلاتے ہیں ان پر زبانی فقرے بازی کر کے دل کا بخار نکال لیتے ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ایک بات شروع کی ہے تو اسے آگے چلانا چاہیے۔ یا اسے صحیح سمت میں موڑ دینا چاہیے اس لیے میں تو دھم سے کود پڑتا ہوں۔

اور اس کے بعد پھیلے ہوئے جال کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ اپنے مدیران کرام عقل کے اندھے سہی مگر گانٹھ کے پورے ہیں۔

اب چھوڑو تم اپنے لاہور کے قصے۔ تم نے وہ خط نہیں دیکھے جو میرے نام آتے رہے کس کے جاننے والوں نے کیا کیا نہیں کہا؟

تو گالیاں کھا کے بے مزہ ہو گئے؟ اب تم بھی ذرا جانے دو ان لوگوں کو جن کو گالی دینے کا سلیقہ بھی نہیں۔ ابھی ابھی لاہور رہی ہیں مذہب کا نام لے کر ایک نیا گروہ نکلا ہے جس نے عسکری پر ایک تازہ مہم کا آغاز کیا ہے اور تم ان کا بھی جواب لکھنے بیٹھ گئے تمہارے کرنے کے ہزاروں کام ہیں جن میں سے کوئی بھی اتنے وقت میں ہو جاتا تو بہتر نہ ہوتا

یہ تو بتاؤ کون لوگ ہیں وہ اور کیوں ایسا کر رہے ہیں؟

ان حضرات نے ایک مرحوم مفسر قرآن کو اپنا امام بنا رکھا ہے اور عسکری صاحب کا قصور اتنا ہے کہ شمس الرحمان فاروقی کے نام خطوط میں ایک جگہ انہوں نے اس امام کے عقائد پر ایک کشفیدہ بات لکھ دی ہے۔ اب وہ غلط ہے تو بھائی اس کی مدلل تردید کرو۔ عسکری کے نقد ادب سے لے کر ان کے افکار تک کے بارے میں سوقیانہ لہجے کے ساتھ لکھ لکھ کر تو آپ کے امام کا نام روشن نہیں ہو سکتا۔ نہ ان کے عقائد درست ہو سکتے ہیں۔

اچھا یہاں ایک اور صاحب ہیں جنہیں تم جانتے ہو، پتا ہے انہوں نے میرے متعلق کیا لکھ دیا یہاں کے اخباروں میں؟

کراچی بلکہ کہیں کے اخبار بھی ہیں تو بس کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیتا ہوں۔ میں نے نہیں پڑھا۔

فرماتے ہیں کہ "نئی نظم اور پورا آدمی" اصل میں عسکری کا لکھا ہوا مضمون تھا جسے سلیم احمد نے اپنے نام سے چھاپ دیا۔

سبحان اللہ، اور اس کے باوجود عسکری سے الگ ہونے کے بعد انہیں برسوں تک بولنے نہیں

دیا حتیٰ کہ بچارے اسی غم میں وفات پا گئے۔ اب ایسوں کو کیا جواب دیا جائے؟ اور کہاں تک ان کے بارے میں سنجیدگی سے گفتگو کی جائے۔

اتنے میں سگریٹ کی ڈبیا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو خالی تھی۔ بیٹی کو آواز دی کہ اور سگریٹ لے کے آئے وہ بچاری لے تو آئی مگر اس فہمائش کے ساتھ کہ امی کہتی ہیں کہ سگریٹ ذرا کم پئیں۔ پوچھا کہ میری طرح تمہیں بھی منع ہے؟

ہاں اور تمہاری طرح میں بھی باز نہیں رہ سکتا اور دونوں بیٹھے رہے تو دیکھو دو ڈبیاں خالی ہو گئیں۔ میرے والی میں تو دس بارہ سگریٹ ہوں گے اور تمہارے؟

یاد نہیں مگر چلنے سے پہلے ایک بات بتاؤ۔ ایک دوست کی تجویز ہے کہ یہاں بھی عسکری پر مقالات کا ایک نیا مجموعہ ترتیب دیا جائے۔ شخصیت اور فکر و فن، ہر چیز کے بارے میں جس سے عسکری کو دلچسپی تھی۔ ایک خاکہ سا بنایا ہے اور تمہارے نام کے آگے لکھا ہے۔ عسکری اور حکمت ایمانیاں۔

کیا چاہتے ہو؟

بس یہی کہ عسکری صاحب نے جو ایک جگہ سنائی کا شعر استعمال کیا ہے؟

چند خوانی حکمتِ یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں

اس کی ذرا وضاحت ہو جائے۔

ارے ہاں، سنائی نے تو جب یہ کہا تھا تو نہ مولوی اشرف علی تھانوی تھے، نہ شاہ ولی اللہ نہ مجدد صاحب بلکہ شاید مولانا روم اور ابن عربی بھی بعد میں ہوئے ہیں تو پھر سنائی کون سی حکمت ہم سے پڑھوانا چاہتے تھے؟ قرآن و حدیث؟

نہیں، اسے تو حکمتِ ایمانی کہیے، حکمتِ ایمانیاں تو وہ ہو گی جسے خود اہلِ ایمان نے حکمتِ ایمانی کی بنیاد پر اپنی فہم و بصیرت سے تعمیر کیا۔

وہ کون سی حکمت ہے؟ میں سمجھ گیا نہیں بھائی نہیں! اب ہم قرآن و حدیث کا نام لے سکتے ہیں اور بعد میں تو مولوی اشرف علی تھانوی بلکہ اس سے آگے مودودی صاحب تک بھی جا سکتے ہیں۔ مگر اہلِ ایمان نے جو حکمت بنائی تھی اسے ہم نے مسمار کر دیا۔ اسی لیے اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے تو خود ہی لکھو۔

میں تو تم جانتے ہو ادب کی سرحد سے باہر قدم رکھتے ہوئے سو بار ہچکچاتا ہوں۔ اللہ تمہیں زندگی دے اور صحت یاب ہو جاؤ تو سوچنا۔ شاید کوئی راستہ نکلے

اس نے سوچنے کا وعدہ کیا مگر پھر اسے دو دن سے زیادہ مہلت نہ مل سکی اور یہ تجویز بھی بہت سی امیدوں کے ساتھ خاک ہو کر رہ گئی۔ اگلے دن میں گجرات پہنچ کر اپنے بزرگ کی رسم قل میں شریک ہوا اور اس کے بعد لاہور پہنچا تو معلوم ہوا۔ سلیم کا سورج غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ظہر سے عصر تک کے درمیان اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک اب یاد آئی ہے۔ پوچھا کہ ہمارے دوست شہزاد احمد جو لاہور سے کراچی منتقل ہو چکے ہیں کبھی ملے۔ تو سلیم نے کہا ____ ایسے ہی سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اور کہتے تھے آؤں گا مگر سوچتے ہوں گے یہ سلیم اور سمندر پاس ہی تو ہیں کسی دن ہو آئیں گے۔

مگر اب کوئی کراچی جائے تو اسے شدت سے محسوس ہوگا کہ وہاں اب کوئی سمندر باقی نہیں رہا۔ سب بخارات بن کے اُڑ چکا ہے جو خدا جانے کب باران رحمت کی صورت میں نازل ہو۔

پشاور پہنچ کر دو رباعیاں لکھیں جن کے آخری مصرعوں سے ہجری اور عیسوی تقویم کے حساب سے سلیم کا سال رحلت برآمد ہوتا ہے۔

آخر ہوئی گرداب کی گردش خاموش
دریائے زندگی کی شورش خاموش
اب بحث و گفتگو کا در بند ہوا
سید نے کہا: صاحب دانش خاموش

۱۴۰۳ھ

جب بستہ ہوا ہے باب اسلام صحیح
وہ دیکھ رہا تھا خواب اسلام صحیح
ذی عقل سلیم و صاحب ذوق سلیم
تھا مظہر انقلاب اسلام صحیح

۱۹۸۳ء

اور سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔

مجھے کچھ ایسی آنکھیں چاہییں اپنے رفیقوں میں

جنھیں بے باک سچّے آئنوں سے ڈر نہیں لگتا

خطوط

بنام نظیر صدیقی

(۱)

نظیر

تمہارا خط ملا۔ بھئی میں نے تم سے رائے پوچھی تھی یہ تھوڑی کہا تھا کہ تم کو ممبر کے فرائض بھی انجام دو۔ پرچے نہیں ملے تھے تو اس کے لیے اتنی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور وہ بھی بیماری کی حالت میں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہر چیز کے بارے میں اتنے سنجیدہ کیوں ہو۔ یہاں تک کہ تکلف اور بے تکلفی کے بارے میں بھی، تمہارا دل "پیارے سلیم" لکھنے کو چاہا تو کیوں نہیں لکھا۔ میں اتنا ہی چھوئی موئی ہوتا اور ناراض ہو جاتا تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ اس "مائی ڈیئر سلیم صاحب" سے البتہ طبیعت جل گئی۔ تم پہلے آدمی ہو جس نے مجھے اس نامعقول "مائی ڈیئر" سے نوازا ہے۔ آئندہ وہ لکھو جو تمہارا جی چاہے میں بگڑوں گا بھی تو اس کا مطلب ترک تعلق نہیں ہوگا۔ بلکہ اضافہ تعلق۔

تم میرے مضمون پڑھ کر الجھ جاتے ہو۔ اور میں تمہارا خط پڑھ کر۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ میری شاعری اگر بدترین قافیہ پیمائی ہے تو ناقابل ذکر چیز ہے۔ کبھی یہ سوچو کہ اس پر لوگ مشتعل کیوں ہوتے ہیں۔ کیا قافیہ پیمائی کا جرم صرف میں کر رہا ہوں؟ اچھی، بری، پھسپھسی، بے جان اور ناکام شاعری اور بہت سے لوگ بھی کر رہے ہیں۔ پھر میری جانِ حزیں پہ عذاب کیوں ہے کہ کوہستان، نوائے وقت، امروز، قندیل، چٹان اور جنگ سے لے کر صبا، انشا اور سات رنگ تک تمام اخبار اور رسالے صرف میرا ہی مذاق اڑانے پر تل گئے ہیں۔ تم کہتے ہو یہ اعلیٰ شاعری نہیں ہے۔ میں نے اس کا دعویٰ کب کیا۔ میں اسے شاعری بھی نہیں کہتا۔ تم نے لکھا ہے کہ یہ خیال کے اعتبار سے درست لیکن ہیئت کے اعتبار سے یقیناً بکواس ہے۔ میں تو اسے خیال کے اعتبار سے بھی بکواس ماننے کے لیے تیار ہوں مجھے صرف اتنا بتا دو کہ اس پہ اتنا شدید ردعمل کیوں ہے۔ کیا وہ لوگ جو میری نام نہاد "اچھی" شاعری پر کبھی میرا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک دم میرے اتنے ہمدرد ہو گئے ہیں کہ میری

شاعرانہ صلاحیتوں کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ چلو، تمہارے جذبات کا خلوص تسلیم، مگر تمہارے خلوص نے صرف یہی کیا نا کہ مجھے خط لکھ دیا۔ میرے دوسرے ہمدرد تو سیدھے کالم لکھ کر اخبار کے دفتر دوڑ جاتے ہیں۔ لوگوں نے مجھ پر ذاتی حملے کیے۔ بعض بقراط "تحلیل نفسی" کے ذریعہ میری جنس زدگی کا سراغ ڈھونڈنے نکلے۔ کچھ کہتے ہیں میں بالکل کھوکھلا ہو چکا ہوں۔ بعض اہلِ نظر کا خیال ہے کہ صرف اسٹنٹ بازی کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی تمہارے خط میں بھی یہی لب ولہجہ آجاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایک لکھنے والے کی حیثیت سے مجھ میں تھوڑا سا یقین رکھو اور کم از کم مجھے اپنی تحریر سے اتنا پُرخلوص ضرور سمجھو جتنے تم خود ہو۔ ہمارے درمیان ہزار اختلافات ہو سکتے ہیں۔ مگر اختلاف کی بنیاد عدم اعتماد کی بجائے اعتماد پر ہونی چاہیے اگر میں اسٹنٹ باز ہوں تو پھر میرا اور تمہارا کیا واسطہ۔ ایک لکھنے والے کی حیثیت سے تمہیں کسی اسٹنٹ باز کو آتی لفٹ نہیں دینی چاہیے۔

میری غیر معمولی صلاحیت؟ تمہیں اس کی اطلاع کہاں سے ملی۔ غیر معمولی ذہانت؟! اس کا سراغ رساں کون ہے؟ غزلیں بدترین قافیہ پیمائی ہیں۔ مضامین بدترین فقرہ بازی۔ پھر تمہیں میری صلاحیت اور ذہانت کی اطلاع کہاں سے ملی ہے۔ میں غلطی پر ہو سکتا ہوں مگر میں نے آج تک کوئی ایک فقرہ ایسا لکھنے کی کوشش نہیں جو میرے خیال کو آگے نہ بڑھاتا ہو یا اس کی وضاحت نہ کرتا ہو۔ یا اس کی شدت میں اضافہ نہ کرتا ہو۔ ذاتیات پر حملہ کرنے کو میں حرام سمجھتا ہوں۔ فقرہ برائے فقرہ سے مجھے چڑ ہے اور میری جان! میں نے جو کچھ لکھا ہے بہت کڑھ کڑھ کر۔ بہت دکھ اٹھا کر لکھا ہے۔ اب تمہارے جیسا ادیدہ ور کو بھی صرف میرے فقرے نظر آتے ہیں۔ میرا دکھ اور میری کڑھن نظر نہیں آتی تو اپنی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہوں؟ کہیں کہیں میرا لہجہ شدید طور پر طنزیہ ضرور ہو گیا ہے۔ لیکن طنز کو میں حماقت سے جنگ کرنے کا واحد ہتھیار سمجھتا ہوں۔ اتنی بہی سچائی، کرسی نشین، مجرب، مقبول و معروف، محبوب عوام و مرغوب خواص قسم کی حماقت سے لڑنا صرف استدلال کے ذریعہ ممکن نہیں۔ یہ اتنی دبیز ہو چکی ہے کہ دلیل اس پہ اثر نہیں کرتی۔ یہ ہر خیال کو اپنی چربی کا جزو بنا لیتی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتی تنقید اب تک صرف خیال رسانی کا ذریعہ رہی ہے۔ میں نے اسے خیال کے ساتھ احساس کی ترسیل کا ذریعہ بھی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میرا احساس تلخ ہے۔ اور تم جیسے نازک طبع لوگوں کو ناگوار گزر سکتا ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ میں اپنے قاری کو کدھر لے جانا چاہتا ہوں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اگر تم مجھ سے یہ پوچھتے کہ تم کدھر جانا چاہتے ہو۔ اس وقت میرا جواب سیدھا سادھا ہوتا میں جس زمین پہ کھڑا ہوں۔ وہ میری اپنی نہیں ہے۔ مجھے ایک ایسی زمین کی تلاش ہے جسے میں اپنا کہہ

سکوں۔ اور بس۔ میں اس زمین کی تلاش میں ہوں۔ چلنے والے کے لیے یہ کب سے ضروری ہوگیا کہ اسے منزل کا پتہ پہلے سے معلوم ہو؟ اس طرح چلنے میں یہی خطرہ ہے کہ میں بھٹکتا رہوں گا، تو میں اس خطرہ کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس مقام پر کھڑا نہیں ہونا چاہتا جہاں دوسرے لوگ کھڑے ہیں مجھے ان کی منزلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں ان کی عافیت کے گوشوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کے مقابلے پر مجھے اپنا بھٹکنا زیادہ عزیز ہے اور میں ان لوگوں کی تلاش میں ہوں جو بھٹکنے کے لیے تیار ہوں خواہ ان کے بھٹکنے کی راہ مجھ سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو انتظار حسین کی مجھے یہی بات پسند ہے۔ وہ بھٹکنے سے خوف نہیں کھاتا۔ ہمیں منزل نشین لوگوں سے کچھ نہیں لینا۔ ان کے لیے مارکس علیہ السلام اور فرایڈ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ پہلے سے منزلیں طے کر گئے ہیں۔ بہت بڑھے تو ایڈلر اور یونگ کی سرزمینوں تک پہنچ گئے ورنہ جمالیات پرستوں کی صف میں کھسک لیے۔ یا فلسفۂ زیست والوں کی حدود میں جا نکلے اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا حوصلہ۔ بہرحال میری راہ اور میری منزل ان سے الگ ہے۔ راہ میں بنا رہا ہوں اور منزل کا حال خدا جانے۔

میں تمہیں اپنے بارے میں اتنا کچھ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ اپنی صفائی میں بیان دیتا پھروں اور اتنا چھچھورا بننے کی توفیق نہیں کہ ہر ایک کو اپنے کام کی معنویت پر غور کرنے کی دعوت دوں۔ تمہیں یہ سب کچھ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ کہیں میرے مستقل گریز سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے کھلنا نہیں چاہتا۔ میں جن لوگوں کو دوست بناتا ہوں ان سے میری دوستی کی واحد شرط یہی ہوتی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے اپنے خیالات، جذبات اور محسوسات چھپانے سے گریز کریں گے۔ سوائے ان معاملات کے جن کا تعلق دوسروں کی ذات سے ہو۔

فکر و خیال میں تبصرہ شاید نہ آسکے۔ کیونکہ اس کے مدیر محترم آنے کا وعدہ کر کے تشریف نہیں لائے ہیں۔ اس لیے "نیا دور" میں شائع کرانے کا ارادہ ہے۔ بہرحال جس پرچہ میں تبصرہ شائع ہو گا اس کی ایک کاپی تمہیں ضرور بھجواؤں گا۔ تم نے یہ نہیں لکھا کہ تم اپنے علاج کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہو یا نہیں؟

تمہارا ——— سلیم

۸ مئی، ۱۹۶۳ء

۲

نظیر، بہت دنوں سے تمہیں خط نہیں لکھا۔ تمہیں کیا کسی کو بھی۔ وجہ کچھ بھی نہیں۔ بس دل نہیں چاہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہر چیز بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اپنی زندگی بھی۔ پھر خدا کی مار کہ اس بے معنی پن میں بھی معنویت ڈھونڈنی پڑتی ہے۔

معلوم نہیں تم کیسے ہو!

خفا ہو گئے شاید۔ دو خطوں کا جواب نہ ملنے کا برا مانا ہوگا۔ نہ جانے کیا سوچتے ہو گے۔ یا شاید کچھ بھی نہ سوچا ہو۔ اور یہ سب میری خوش فہمی ہو۔ بہر حال خفا ہو تو من جاؤ۔ برا مانا ہو تو معاف کر دو۔ کچھ سوچا ہو تو بھول جاؤ۔ اور کچھ نہ سوچا ہو تو پھر مجھے خفا ہونے کی اجازت دو۔

ایک واہیات اطلاع تمہیں دے رہا ہوں۔ تمہاری کتاب پر تبصرہ اس نیا دور میں نہیں آ رہا۔ جمیل نے خود مجھ سے کہا تھا کہ نظیر اور اشک پر تبصرہ لکھ دو۔ لیکن ثنا ءاللہ اختلاف کر گئے۔ انہوں نے دو تبصرے (ایک قاسمی پر، ایک ممتاز شیریں پر) تو اس شمارہ میں شامل کر لیے اور باقی دو اگلے شمارہ کے لیے محفوظ کر لیے۔ اب مشکل یہ ہے کہ جو چیز ان کی "حفاظت" میں پہنچ جائے وہ پھر وہاں سے نکل بھی نہیں سکتی۔ اور نیا دور کا اگلا شمارہ تین چار مہینے سے پہلے تو کیا آئے گا۔ اب تم مجھے لکھو کہ میں کیا کروں؟

آج کل تو شاید تمہاری چھٹیاں ہوں گی۔ کیا کرتے رہتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چھٹیوں کا کچھ حصہ کراچی کی نذر کرو

تمہارا ـــــ سلیم

۲۷-۷-۶۲

کراچی - ۸ فروری ۶۲ء

نظیر پیارے۔ بہت دنوں کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ خفا ہو تو معاف کر دو۔ میرے اور تمہارے درمیان غلط فہمی کا کیا سوال ہے۔ پیارے میں تم سے محبت کرتا ہوں خط کا جواب کیوں نہیں لکھا؟ مصروفیت؟ علالت؟ کاہلی؟ ہاں یہ سب کچھ اور کچھ اس کے سوا بھی۔ بعض اوقات ذہنی

کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ کسی کام کو دل نہیں چاہتا۔ ارادہ کرتا ہوں مگر ارادہ عمل میں نہیں آتا۔ بار بار سوچا۔ بار بار چاہا مگر لکھ نہ سکا۔ کچھ شرمندگی بھی تھی۔ وعدہ کے باوجود تمہارا کام نہ کر سکا۔ کچھ لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ ابتدائی بات چیت بھی ہوئی۔ امید بھی بندھی کہ شاید کچھ ہو جائے گا مگر جیسی کوشش ہونی چاہیے ویسی نہ ہوئی۔ دل خود مطمئن نہیں تھا تو تمہیں کیا لکھتا۔ محبوب خزاں تو خدا جانے کن خوابوں میں رہتے ہیں جب تک کوئی ٹھوس صورت نہ نکلے میں تمہیں کراچی آنے کا مشورہ نہ دوں گا۔ مفت روپیہ اور وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ سیر و تفریح کے لیے آؤ تو اور بات ہے لیکن جس مقصد سے آنا چاہتے ہو اس کی کچھ ابتدائی صورت پہلے سے طے ہونی چاہیے۔ ایک نئے کالج کے لوگوں نے مجھ سے کچھ ماہ کی مہلت مانگی تھی۔ دیکھو ان سے کچھ بات ہو جائے تو تمہیں لکھوں۔

بیاض پر تمہارے رائے پڑھ کر دلی مسرت ہوگی خواہ اچھا لکھو یا برا۔ یہاں سجاد باقر صاحب نے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب نے حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے اور جمیل جالبی صاحب نے کراچی ریڈیو اسٹیشن سے بیاض پر تبصرے نشر کیے ہیں جمیل ایک مضمون بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ فتح محمد ملک صاحب کا خط بھی آیا ہے۔ وہ کچھ فنون میں لکھ رہے ہیں۔ مظفر علی سید صاحب بھی شاید کچھ لکھیں گے۔ تم اگر کچھ لکھو تو نیا دور کے لیے لکھو۔ اوراق والے تو شاید مجھ سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ ورنہ اوراق میں بھی لکھنا مناسب ہوتا۔ اوراق کا سالنامہ بازار میں آ گیا ہے۔ میرا صدر جانا نہیں ہوا۔ دو ایک روز میں خرید کر لاؤں گا اور تمہارا مضمون دیکھوں گا۔

مجھ سے آج کل کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے۔ شعر تو تین سال سے نہیں ہوا۔ اور ہونے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا۔ خدا جانے یہ بیماری ہے یا صحت ہے۔

مقالات کا مجموعہ جلد چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کاش میں غالب اور میر پر کچھ لکھ سکتا غالب کے بارے میں تو بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ لکھا نہیں جاتا۔ تمہاری بھابی دو ماہ کے لیے ہندوستان جا رہی ہیں۔ تمہاری بھتیجی تمہیں سلام کہتی ہے۔ بھابی سے میرا بہت بہت سلام کہو۔ بلکہ دعا۔ جواب جلد دینا۔

تمہارا ـــــ سلیم

(۴)

نظیر، تمہارا محبت نامہ ملا۔ بھئی میں تو اپنے مشورے پر قائم ہوں۔ یونس احمر بھی ملے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم لوگ کیا اوٹ پٹانگ باتیں نظیر کو لکھتے رہتے ہو۔ کہنے لگے کہ نہیں بھئی میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ جب تک کوئی خاص امید نہ ہو وہ کراچی نہ آئیں۔ میں نے تو انہیں محبوب خزاں کا مشورہ لکھا تھا۔ اتفاق سے محبوب بھی کراچی آئے ہوئے تھے۔ لیکن ان سے اتنی افراتفری میں ملاقات ہوئی کہ تمہارے بارے میں گفتگو نہ کر سکا۔ اب انہیں خط لکھ کر پوچھ رہا ہوں کہ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو۔ اور کیا کر سکتے ہو۔ اور کچھ کیوں نہیں کرتے۔ تمہارا خط ملنے کے بعد بخاری صاحب سے ملاقات کی کوشش کی تھی۔ وہ یہاں سے بہت دور باتھ آئی لینڈ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ ایک بار گیا تو ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسری بار جانے کی ابھی تک ہمت نہیں ہوئی۔ دو ایک روز میں جاؤں گا اور جو گفتگو ہو گی تمہیں اس سے مطلع کروں گا۔ اگر ٹیلی وژن میں کچھ ہو جائے تو اچھا رہے گا۔ یہاں کالجوں میں تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اوراق میں تمہارا مضمون املا کے مسئلہ پر دیکھا۔ یقیناً اچھا مضمون ہے گو حوالے بہت ہیں۔ شاید ضروری بھی تھے۔ ایک بار اور پڑھوں گا تو مفصل رائے لکھوں گا۔ تمہارا ایک اور مختصر سا مضمون "تنقید میں نئی اخلاقیات کی ضرورت" (کچھ ایسا ہی عنوان ہے) نظر سے گزرا۔ یہ بھی پسند آیا۔ تم نے ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دراصل ہمارے لکھنے والے اپنی تحریر اور اپنی ذات کے درمیان امتیاز نہیں کرتے اور اسی لیے تحریر سے اختلاف کو ذاتی اختلاف سمجھ بیٹھتے ہیں۔ تحریر لکھنے والے کا حصہ ضرور ہوتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں لکھنے والے بھی یہ قوت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اس پر معروضی نظر ڈال سکے۔

تمہاری بھابی ہندوستان چلی گئی ہیں۔ تمہیں بھیجنے کے لیے ان کے ساتھ ایک تصویر کھنچوائی تھی مگر اس لیے نہیں بھیجی کہ اس تصویر میں میں نہایت موٹا، بھدا اور بدصورت نظر آتا ہوں۔ وہ ہندوستان سے واپس آ جائیں تو دوسری تصویر کھنچوا کر بھیجوں گا۔ بھابی سے میرا سلام کہو۔ بچوں کو پیار

تمہارا ——— سلیم

۱-۳-۶۷

(۵)

پیارے نظیر، تمہارا مضمون مل گیا۔ بہت بہت شکریہ۔ میں تمہاری ادبی خلوص اور ناقدانہ دیانت کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ اس مضمون سے اور زیادہ قائل ہوا۔ میرے "تیسرے رنگ" پر تمہاری تنقید بھرپور ہے۔ مضمون کا پہلا فقرہ بہت اچھا لکھا۔ بلکہ پورے مضمون میں ایسا دوسرا فقرہ نہیں نہیں لکھ سکے۔ لیکن اشتعال انگیزی کی توجیہ تم سے نہ ہو سکی۔ مضمون کا دوسرا حصہ جس میں تم نے "تعصبات" کے بعد اپنے "تاثرات" لکھے میں ذرا تشنہ معلوم ہوا۔ شاید تمہیں خود بھی اس کا احساس ہے اس لیے تم نے مضمون کا خاتمہ "پھر کبھی" پر کیا ہے .... تمہارا مضمون ملتے ہی میں نے سیپ کے دفتر فون کیا تھا مگر نسیم درانی صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کا پرچہ سنا ہے کہ پریس میں ہے۔ اگر گنجائش ہوئی تو مضمون اسی پرچہ میں آجائے گا، ورنہ پھر آئندہ شمارے میں۔ تمہارا ابلاغ والا مضمون دوبارہ پڑھا تم اس بنیادی فرق تک صحیح پہنچے ہو کہ قدیم شاعری میں ابہام اگر کہیں ہے تو مجبوری کے سبب ہے۔ جبکہ جدید شاعری کا ابہام بالقصد ہے۔ یہ لوگ ابہام کی معذرت نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے نظریہ بناتے ہیں۔ تمہارے ذہن کی یہ بڑی خوبی ہے کہ تم بڑے بڑے ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اور ان کے افکار و خیالات کو اپنے نقطہ نظر کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہو۔ یہ خوبی اس مضمون میں بھی موجود ہے۔

بہت جلدی میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں کیونکہ ایک بہت ضروری کام سے کہیں جانا ہے اور ایک صاحب سر پر مسلط ہیں۔ بخاری صاحب سے ملنے کے لیے دوبارہ نہیں جا سکا۔ اس ہفتہ انشاءاللہ جاؤں گا۔ تمہاری بھابی دو مہینے کے لیے ہندوستان گئی ہیں۔ ان کی واپسی پر تمہیں تصویریں بھیجوں گا۔ بھابی سے بہت بہت آداب کہو۔

تمہارا سلیم

میرے دیباچے سے تم ناحق لڑ گئے وہ میں نے زبردستی لکھا ہے اور لکھ کر خوش نہیں ہوں۔

(۶)

نظیر! تمہارا مضمون مجھے "کسی حد تک" نہیں "بڑی حد تک" پسند آیا۔ یہ پہلا مضمون ہے جس میں میری شاعری کی تنقیص سنجیدگی اور خلوص سے کی گئی ہے۔ کسی چیز کی اگر مخالفت ڈھنگ سے کی

جائے تو اس پر سنجیدہ گفتگو کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ میں نے اپنی یہ بدنام شاعری یہ سوچ کر تو نہیں کی کہ لوگ اس کی تعریف کریں گے۔ گالیاں کھانے کی توقع تو پہلے ہی سے تھی۔ لیکن گالیاں دینے والے تمہارے جیسے ہوں تو زیادہ مایوسی نہیں ہوتی۔ اشتعال انگیزی کی بات میں نے کچھ سوچ کر نہیں لکھی لیکن تم نے اس پر زور دیا ہے تو اس کا سبب بھی تمہیں کو بتانا چاہیے۔ میرے نزدیک تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ایک مخصوص ذہنیت سے لڑنے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ ایک مستحکم یقین ہے کہ یہ زمانہ سچے جذبات کا زمانہ نہیں ہے۔ لوگوں نے جھوٹے جذبات زندہ رکھے ہیں اور ایک قسم کی ”سخت دلی“ میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس سخت دلی کا سب سے بڑا پردہ ایک نوع کی رقت انگیز شاعری ہے جس کے پیچھے ”حقیقی“ معنوں میں کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ لیکن جو جذبہ سے بھرپور ہونے کا دھوکا دیتی ہے۔ شاعری کا کچھ تعلق شاید اپنے زمانے سے بھی ہوتا ہے اور یہاں ”زمانے“ کے معنی وہ نہیں ہیں جن معنوں میں ترقی پسند اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں زمانے کی آگاہی ”من و تو“ کے بنیادی رشتہ میں ہے۔ بیسویں صدی میں حقیقی انسانی تعلقات پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کا اظہار صرف ایک جگہ ہوا ہے یگانہ کی شاعری میں۔ لیکن تم یگانہ پر ایک اچھا مضمون لکھنے کے باوجود اس مسئلہ کو اس کی گہرائی میں نہیں دیکھ سکے۔ اور اسے صرف زبان کے ایک مخصوص استعمال کی حد تک ہی سمجھ سکے۔ خیر یہ بحث لمبی ہے۔ اور میں طبعاً اپنی شاعری پر گفتگو کرنے سے بور ہوتا ہوں۔ اسی لیے مجھ سے بیاض کا دیباچہ بھی نہیں لکھا جا سکا۔ شعر کہنے اور پھر اس کے ”ہجے“ بھی خود کرنے کی بات مجھے پسند نہیں آتی۔ تم نے مجھ پر اخلاقی بے حیائی کا الزام لگایا ہے۔ اسے پڑھ کر تو میں روتے روتے بچ گیا۔ خیر اس زمانے میں تم جیسا ایک آدمی تو ہے جو کسی کو اخلاقی بے حیائی پر ٹوک سکتا ہے۔

تمہارا مضمون اب تو سیپ ہی میں آئے گا کیونکہ میں اسے نسیم درانی کو بھیج چکا ہوں۔ ان سے واپس لینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

شاعری ترک کیا کر دی! شاعری خود مجھے ترک کر چکی ہے۔ مضمون نویسی کبھی میرے لیے مقصود بالذات نہیں رہی اور آج کل تو شعر و ادب کے پڑھنے پڑھانے سے بھی طبیعت اکتا گئی ہے۔ میں کچھ اور کام کرنا چاہتا ہوں لیکن کسی اور موضوع پر میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بخاری صاحب کے پاس میں ان سے وقت لے کر گیا تھا لیکن سوء اتفاق سے انہیں کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا۔ ممکن ہے کہ ان سے جمعرات کو ریڈیو اسٹیشن پر مل لوں۔ وہ وہاں اپنا پروگرام ریکارڈ کرانے آتے ہیں۔ آج کل تاثرات و تعصبات پڑھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں بیشتر

مضامین میں ایک آنچ کی کسر معلوم ہوتی ہے۔ اپنے تاثرات پھر کبھی لکھوں گا

تمہارا ــــــ سلیم

۷۔ مارچ ۶۷ء

(۷)

پیارے نظیر ۔عین انتظار میں تمہارا خط ملا ۔میں گزشتہ اتوار کو بخار میں مبتلا ہو گیا تھا ۔ بعد کے اگلے روز بخار اترا ۔اب ٹھیک ہوں مگر کمزوری محسوس ہوتی ہے ۔ لیٹے لیٹے تمہارے پچھلے خطوط پڑھتا رہا ۔تم نے اپنے ان خطوں میں میری شاعری پر جتنی سخت گرفت کی ہے اپنے مضمون میں بھی نہیں کی ۔معلوم نہیں کیوں یہ خط پڑھ کر تم پر بہت پیار آیا ۔تم سچی بات کہنے کا ڈھب جانتے ہو اور یہ کمال تمہارا ہے کہ آدمی گالیاں کھا کر بھی بے مزا نہیں ہوتا ۔ بھئی تم مجھ سے میری شاعری پر بحث کیوں کرنا چاہتے ہو ۔شعر کا معاملہ تو یہ ہے کہ پسند آیا تو آیا نہ آیا تو نہ آیا ۔اس میں قائل معقول کرنے کی گنجائش ذرا کم ہوتی ہے ۔میں اگر فلسفہ بگھاروں گا تو تم کون سے قائل ہو جاؤ گے اور پھر اپنی شاعری کے بارے میں فلسفہ بگھارنا ایسی کون سی معقول بات ہے ۔چھوڑو گولی مارو ۔ دو چار شعر تمہیں پسند آ گئے ہیں ۔میرے لیے یہ بہت ہے ۔ممکن ہے کہ میں آئندہ دس بیس شعر اور ایسے کہہ سکوں ۔فی الحال تو ایک مصرعہ کی بھی امید نہیں معلوم ہوتی ۔شاعری نے مجھے چھوڑ دیا ۔تین ساڑھے تین برس ہو گئے ۔ایک مصرعہ کی گونج بھی سنائی نہیں دیتی ۔چلو اچھا ہی ہوا ۔ایسے شعر کہنے سے کیا فائدہ جو دوسروں کو بھی تکلیف دیں ۔ اور مجھے تو انہوں نے اندر سے چھلنی کر دیا ہے ۔بقول یگانہ ؎

قلم کے زخم کھا کر بیکر خونبار ہو جانا

قیامت ہے مری تصویر کا بیکار ہو جانا

سخت دلی کے ہر زمانے میں موجود رہنے پر تم نے بڑی مدلل بحث کی ہے ۔مجھے اس سے انکار نہیں ۔انسانی زندگی اپنے تمام اچھے برے خصائص کے ساتھ ہمیشہ موجود رہی ہے ۔لیکن اس کی بعض خصوصیات کا احساس بعض زمانوں میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ سوال یہ نہیں ہے کہ سخت دلی پہلے موجود تھی یا نہیں ۔ سوال احساس کا ہے ۔ اور پھر اس احساس کے اظہار کا ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ میری لڑائی اتنی خارجی بھی نہیں ۔ممکن ہے کہ میں جس چیز کو زمانے سے منسوب کر رہا ہوں اسے سب سے پہلے میں نے خود اپنے اندر دریافت کیا ہو اور اس کے بعد اپنے تجربے کی تعمیم کر دی ہو

(دنیا سے بھی جنگ ہو رہی ہے گی۔ فی الحال تو خود سے لڑ رہا ہوں) بودلیئر نے عہد حاضر کی سب سے بڑی بلا "اکتاہٹ" کو قرار دیا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ "بے حسی" کا ہے۔ یہ بے حسی ہماری ساری سخت دلی کی بنیاد ہے۔ ضروری نہیں کہ تم یا کوئی اس سے اتفاق کرے۔ لیکن میرا احساس ہے کہ یہ بے حسی بڑی گہری اور روح میں اتری ہوئی ہے مگر عہد حاضر کا انسان اسے محسوس نہیں کرنا چاہتا۔ وہ خود کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے کہ وہ "حساس" اور "جذبات سے بھرپور" ہے اور اس دھوکے کو قائم رکھنے کے لیے جھوٹے جذبات پیدا کرتا رہتا ہے۔ بحث کے لیے نہیں کہتا، صرف اپنا احساس بیان کرتا ہوں کہ ہماری بیشتر رقت انگیز شاعری انہیں جھوٹے جذبات سے پیدا ہوئی ہے۔ میری اپنی شاعری کا تلخ ترین احساس یہی ہے کہ ہم سے غم کی حقیقی غم کی صلاحیت چھن گئی ہے ؎

شکوہ تجھ سے ہے نہ شکر کرم یوں بھی آنا تھا اہل دل کو قرار

دل کو مژدہ ہو کہ وہ بھی خیر سے جاتی رہی
آہ سے پہلے جو کچھ محسوس ہوتی تھی کھٹکن

دل ہے شاید درد سے خالی سلیم آپ کا لہجہ بہت غمناک ہے

کیا کیا گماں تھے کہ غم جاوداں ملا
دو چار دن جو روئے طبیعت سنبھل گئی

عشق کی دیوانگی وضع جنوں کے ساتھ تھی
چاک دل بھی سل گیا جب سے سیا ہے پیرہن

ایک دھوکہ بھی نہ کھا پائے بنام آرزو
یوں بھی عمر رائگاں کو رائگاں ہونا نہ تھا

یگانہ پر تمہارا مضمون میرے لیے خاصی دل چسپی کا باعث ہے۔ اس لیے کہ تم نے اس میں اپنے بنیادی ذوق شعری سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ذوق کی تربیت

جذباتی دبستان شاعری سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس مضمون میں تم نے اپنے ذوق کو وسعت ضروری ہے۔ پھر بھی یگانہ کی شاعری کے تمام خصائص بیان کرنے کے باوجود تم اس تلخ کام یگانہ کی روح میں نہیں اتر سکے جسے شکایت تھی کہ ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا۔ مضمون دوبارہ پڑھوں تو شاید کچھ اور پتہ چلے۔ بھابی سے سلام!

تمہارا ——— سلیم

۲۸-۳-۶۷

(۸)

نظیر۔ منگل کو تمہارا خط ملا تھا۔ جواب فوراً اس لیے نہیں دیا کہ اسی روز بخاری صاحب نے دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ سوچا کہ ان سے کچھ بات ہو جائے تو تمہیں خط لکھوں۔ دفتر جانے پر معلوم ہوا کہ بخاری صاحب نے منگل کے بجائے بدھ کا دن مقرر کیا ہے۔ خیر، کل بدھ کو بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ٹیلی وژن کے پروگرام شروع کرنے والے ہیں اور اسی کے لیے انہیں لکھنے والوں کی شدید ضرورت ہے۔ بہت سے پروگرام تیار کیے۔ یہ موقع ایسا تھا کہ تم یہاں ہوتے تو بہت اچھا ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم اب یہاں آجاؤ تو بہت کام بن سکتا ہے۔ تم نے ایک دفعہ مجھے لکھا تھا کہ تمہیں ۶۰۰/- روپیہ ماہوار کا کام مل جائے تو تم آسکتے ہو۔ میرے خیال میں اتنا کام تمہیں مل سکتا ہے۔ اس کے بعد مستقل ملازمت کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں۔ کم از کم یہاں قدم جمانے کا ٹھکانا تو ہو جائے گا اور خدانخواستہ فوری طور پر کوئی صورت نہ نکلی تو تمہارے آمد و رفت کا خرچ اور ٹھہرنے کے اخراجات تو پورے ہو ہی جائیں گے۔ یعنی آنے میں تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا اور فائدہ کی امید اور امکانات بہت ہیں۔ پہلے تو میں نے تمہیں اس لیے منع کیا تھا کہ مفت بیٹھے بٹھائے پیسہ ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن اب ٹیلی وژن پروگراموں کی ایک صورت سامنے ہے تو میں تمہارے یہاں آنے میں اور آکر کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ فوراً جواب دو کہ تم اس سلسلے میں کیا ارادہ رکھتے ہو؟

میں نے آج یونس احمر کو بھی یہ باتیں تفصیلی طور پر بتا دی ہیں۔ وہ بھی تمہیں خط لکھیں گے۔ اچھا یہ تو ہوئی کام کی بات اب ذرا گپ سنو۔

تمہارے خیالات کو جہاں تک میں سمجھا ہوں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم و جدید زمانہ کے انسان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ انسان اپنے بنیادی خصائص میں جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے اس

یلیے جدید انسان اور جدید زمانہ کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ مبنی بر حقیقت نہیں ہے اور اسی لیے نئے انسان کی بے حسی کے بارے میں میرے خیالات کو تم نے ماضی پرستی کا نتیجہ سمجھا ہے۔ میں ماضی پرستی کے الزام سے کچھ زیادہ ڈرتا نہیں ہوں لیکن ماضی اور حال کی بحث میں نے نہیں چھیڑی۔ انسان پہلے کیسا تھا اور اب کیسا ہے۔ یہ میرا موضوع گفتگو نہیں ہے میں نے تو اس ساری بحث سے ہٹ کر یہ خیال تمہارے سامنے پیش کیا کہ انسان اور انسانیت اپنے بنیادی خصائص کے ساتھ ہمیشہ موجود رہا ہے لیکن کسی خاص زمانہ میں کسی ایک خصوصیت کا احساس ایک خاص شدت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً نئے ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے "جنس" اور "بھوک" کو دریافت کیا۔ اس کا مطلب یہ تو کسی صورت سے نہیں ہے کہ انسان کو اس سے پہلے جنسی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ یا بھوک نہیں لگتی تھی۔ لیکن ان مسائل کا جیسا احساس اس زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ ویسا پہلے نہیں تھا۔ بالخصوص ادب و شعر میں اس کا اظہار اس طرح نہیں ہوا تھا۔ غم دوراں انسان کو کب نہیں رہا۔ مگر غم دوراں کو جو اہمیت ہمارے دور میں ملی وہ کبھی نہیں ملی تھی۔ ادبی تخلیقات خواہ وہ تحریکوں کی صورت میں ہوں یا انفرادی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہوں بعض ایسے نفسیات سے پیدا ہوتی ہیں جنہیں کوئی ایک نسل یا فرد اپنے اندر دریافت کرتی ہے اور اس کے بعد انہیں کسی کلیہ کی شکل دے دیتی ہے میری ذات کی حد تک مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان بے حس تھا یا نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی بے حسی کا ایک شدید احساس میرے اندر ہے اور میں اسے موضوع شعر بنانا چاہتا ہوں۔ شعری کامیابی یا ناکامی سے یہاں کوئی بحث نہیں۔ ممکن ہے کہ آج کی ناکامی کل کی کامیابی بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات اور اپنی نسل میں کچھ چیزیں میں نے دریافت کی ہیں اور یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان کا ادبی یا تخلیقی اظہار نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے میں ان کی طرف خود بھی توجہ کر رہا ہوں اور دوسروں کو بھی توجہ دلا رہا ہوں ...... تو اس پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ انسان خالص معروضی نقطہ نظر سے بھی ویسا نہیں ہے جیسا پہلے تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بہتر ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بدتر ہو گیا ہے۔ یہ اپنے اپنے زاویۂ نظر کی بات ہے لیکن اس کلیہ پر توجدید تہذیب کی اساس ہے کہ یہ نئے انسان کی تہذیب ہے۔ اس نئے انسان کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اس پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ لیکن شاعروں اور ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی طرف گئی ہے کہ نئے انسان نے بہت کچھ کھو دیا ہے اسپینڈر کے ایک مضمون inside the Cage کا ایک فقرہ نقل کر رہا ہوں۔

"You can show people that they are bored, that what they have

in this civilization is not life but a kind of death-in-life. Baudilaire says: reader, you are bored. Lawrence: you have denied and frustrated your instinctive life. Eliot: you are dead."

یہ بات نہیں ہے کہ اس نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بودلیئر، لارنس، ایلیٹ، پاؤنڈ، بلکہ میں تو ییٹس کا بھی نام لوں گا۔ یہ سب یہ کیوں کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی کہیں گم ہوگئی ہے بلکہ جہاں تک میرے محدود مطالعہ کا تعلق ہے یہ سب کے سب کسی نہ کسی طرح اس دنیا کی ازسرِ نو تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو ماضی میں انسان کی ملکیت تھی۔ بحث لمبی ہو جائے گی ورنہ میں ان سب کے اقتباسات پیش کرتا۔ بہرحال میرے لیے یہ بات خاصی تسلی بخش ہے کہ میں اپنے محسوسات میں تنہا نہیں ہوں۔

"اکتاہٹ کے بارے میں پاسکل نے ضرور کچھ لکھا ہوگا۔ لیکن میرا اشارہ تو بودلیئر کی پہلی ہی نظم کی طرف تھا جو "بدی کے پھول" میں شامل ہے۔ مجموعہ تمہارے پاس موجود ہو تو دیکھ لو۔

بھابی سے سلام کہو۔ اور میری طرف سے معافی طلب کرو کہ انہیں میری وجہ سے تمہاری مصروفیت کی بوریت برداشت کرنی پڑتی ہے

جواب فوراً دو!

تمہارا ——— سلیم

۹-۴-۷۶

⑨

بھئی تم بھی کمال کرتے ہو۔ میں نے تم سے یہ کب کہا کہ تم ٹیلی وژن میں ملازمت کر لو۔ وہ بھی اسکرپٹ رائٹنگ کی۔ یہاں ملازمت کا سوال بھی نہیں تھا کیونکہ بخاری صاحب کسی اسکرپٹ رائٹر کو ملازم نہیں رکھنا چاہتے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ وہ لکھنے والوں سے ڈرامے، فیچر اور تقریریں وغیرہ "مول" لیا کریں گے۔ تحریر کا ریٹ ۱۲ روپیہ فی منٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ۱۵-۱۵ منٹ کے چار پروگرام لکھے جائیں تو ایک مہینے میں ۷۲۰ روپے کی آمدنی ہو سکتی ہے۔ میری مراد صرف یہ تھی کہ تم یہاں آجاؤ اور اپنے لیے ملازمت کی کوشش کرو۔ جب تک ملازمت نہ ملے یا اچھی ملازمت نہ ملے اس وقت تک ٹیلی وژن سے کام چلاؤ۔ اس عرصہ میں ممکن ہے کہ ٹیلی وژن پر ہی تمہیں کوئی انتظامی عہدہ مل جائے۔ لیکن اگر ٹیلی وژن پر بھی کام نہ بنے اور خدانخواستہ باہر بھی کوئی سلسلہ نہ چلے تو اطمینان سے واپس چلے جاؤ

ٹیلیویژن کے پروگراموں سے تمہاری رہائش کا خرچ بھی نکل آئے گا اور آمد و رفت کا کرایہ بھی تم خدا جانے کیا سمجھے اور صاف انکار لکھ بھیجا - میرے بھائی - اس پر غور کرو - اور اس کے بعد اپنے فیصلے سے مطلع کرو - اب رہ گیا یہ سوال کہ تم دوسروں کی پسند اور پالیسی کے مطابق نہیں لکھ سکتے، تو صاحب زادے ڈرامہ میں کون سی پالیسی چلتی ہے - اور فیچر بھی لکھنے والے کی اپنی پسند کے ہوں گے - مثلاً اگر تم سے کہا جائے کہ توبۃ النصوح کو آٹھ دس فیچروں میں لکھ دو تو یہ کون سا مشکل کام ہو گا؟ زود نویسی کا عذر بھی بیکار ہے - میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم ڈاکومنٹ کے چار فیچر ایک مہینے میں نہیں لکھ سکتے - اتنا تو سست سے سست لکھنے والے بھی لکھ لیتے ہیں - اور پھر جیسا کہ میں نے لکھا ہے یہ انتظام تو بالکل عارضی ہو گا - یعنی ملازمت تلاش کرنے کے وقفہ میں کام آئے گا - باقی سوچ لو جیسی تمہاری مرضی -

نسیم درانی صاحب سے ملاقات نہیں، تمہارے پسندیدہ اشعار انہیں ابھی نہیں بھیجے ہیں - کسی روز بھیج دوں گا ابھی تو ان کا تازہ پرچہ بھی نہیں آیا ہے دوسرے پرچے میں تو دیر ہے -

سکونِ قلب کی بات تم نے ذرا جلدی چھیڑ دی - ابھی تو مسئلہ صرف یہ تھا کہ موجودہ صورتحال کا صحیح جائزہ لیا جائے یعنی دیکھا جائے کہ موجودہ تہذیب میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے اور کھونے اور پانے کی نسبت کیا ہے؟ اگر ہم نے جو کچھ پایا ہے وہ سکونِ قلب سے زیادہ قیمتی ہے تو اسے بہر حال برقرار رکھنا چاہیے - دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اگر ہم نے کچھ کھو کر کچھ ایسا پایا ہے جو انسان کی حیثیت سے ہمارے لیے زیادہ اہم اور معنی خیز ہے تو ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم نے "انسانی معنویت" کھو دی ہو - مذہب کائنات میں ایک معنی کی "تلاش" ہے، فلسفہ، منطق، سائنس اور فنی ترقی سے اگر وہ معنویت غائب ہو گئی ہے تو ہمیں نئے معنی کی "تلاش" کرنی چاہیے ــــ Illusion کے کیا معنی ہیں؟ کہیں کائنات میں معنی کی موجودگی کو تو تم Illusion نہیں کہتے - یہ سوال بڑی دلاوری کا ہے کہ سکونِ قلب کی خاطر Illusion میں مبتلا رہنا بہتر ہے یا سکونِ قلب کے بغیر Disillusioned رہنا - فلسفہ وجودیت والے تو اس سوال کا جواب بڑی قوت سے دے چکے ہیں کہ ہمیں زندگی کی "مہملیت" کو قبول کر لینا چاہیے - لیکن زندگی کی مہملیت کو قبول کرنے کے معنی معنویت کی تلاش سے دستبردار ہو جانا نہیں ہے بلکہ ایک نئی معنویت کی تلاش - مذہب نے کائنات میں جن معانی کا سراغ لگایا تھا اگر وہ غلط ثابت ہوئے یا اپنی قوت کھو کر فرسودہ ہو گئے تو اب یہ کام انسان کو بغیر مذہب کے کرنا چاہیے - اگر اجتماعی طور پر نہ کر سکے تو انفرادی طور پر سہی - یہاں سوال صرف اخلاقی اقدار کی بحالی کا نہیں ہے - اخلاقی اقدار مابعد الطبیعات کے بغیر

قائم نہیں ہو سکتیں خواہ مابعد الطبیعیات نئی ہو یا پرانی۔ کیونکہ اخلاقی اقدار کا تعلق انسانی حدود و حیات سے ہے۔ انسانی حدود حیات میں کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بری اس کا فیصلہ اس وقت نہیں کیا جا سکتا جب تک ہم آفاقی اور کائناتی سطح پر اس کا تعین نہ کریں۔ اس طرح اخلاقی اقدار کا مسئلہ براہ راست مابعد الطبیعیات سے الجھا ہوا ہے۔ ہمارے لیے انتخاب کا مسئلہ مابعد الطبیعیات کے ہونے یا نہ ہونے کے درمیان نہیں ہے بلکہ اچھی اور بری مابعد الطبیعیات کے درمیان۔ کیونکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم سب اپنی اپنی مابعد الطبیعیات رکھتے ہیں۔

مذہب کی طرف واپسی کے ممکن ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ بھی تم نے بر وقت نہیں اٹھایا سوال زندگی کے ایک پیچ کی تلاش کا ہے اور زندگی کا لفظ میں یہاں وسیع تر مفہوم میں لکھ رہا ہوں۔ یعنی زندگی سے مراد صرف چند ذہنی سرگرمیاں نہیں ہیں بلکہ زندگی کا ایک مکمل نظام جو اصول سے رسوم تک ہر پہلو پر ہو۔ انسانوں کا ایک مخصوص طبقہ شاید رسوم کے بغیر زندگی بسر کر سکے۔ لیکن انسانوں کی اکثریت کے لیے مجرد اصولوں کے ساتھ ساتھ ان کی محسوس اور مرئی شکلیں بھی ہونی چاہییں جو انہیں اصولوں کی یاد دہانی کراتی رہیں۔

بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو "سرگزشت بخاری" کا تقاضہ کر دیا جائے گا۔ بھابی سے بہت بہت سلام کہو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ذہنی سرگرمیوں سے پیدا ہونے والی بوریت کو ادیب، شاعر اور فلسفی قسم کی بیوی برداشت کر سکتی ہے۔ اسے تو در حقیقت وہ سیدھی سادھی بیوی ہی برداشت کر سکتی ہے جسے فلسفہ و ادب کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔

تمہارا ——— سلیم

(۱۰)

نظیر! ابھی تمہارے پہلے خط کا جواب نہیں لکھ سکا تھا کہ تمہارا دوسرا خط مل گیا۔ تمہارے کراچی نہ آ سکنے کی مجبوریاں اور مصلحتیں معلوم ہونے کے بعد میں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے بھی میرے اصرار کی وجہ ایک غلط فہمی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تم آنے کے لیے تیار ہو اور میں تمہیں روک رہا ہوں۔ میرے رکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی موہوم امید پر یہاں آؤ اور مفت میں مالی طور پر نقصان اٹھاؤ جب ایک صورت ایسی پیدا ہوئی کہ تمہارے آنے جانے کا خرچہ نکل آئے تو میں نے تمہیں آنے کے لیے لکھ دیا...... بہر حال تم اب مجبوراً یا مصلحتاً نہیں آنا چاہتے تو مت آؤ۔ اللہ مالک ہے کوئی اور صورت نکلے گی تو مطلع کروں گا۔ ماہِ نو کے بارے میں میں نے اڑتی سی خبر سنی تھی کہ ظفر قریشی صاحب ڈیلز

ہو رہے ہیں۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد ماہ نو کو بند کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ ایک ڈائجسٹ نکالا جائے گا۔ یا ماہ نو کو ہی ڈائجسٹ بنا دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ شاید آئندہ خط میں کچھ تفصیلات لکھ سکوں۔ شاید اس لیے کہ دو چار روز ہوئے ایک فلمی کام شروع کیا ہے اس میں بری طرح مصروف ہوں۔ معلوم نہیں شہر کی طرف جانا ہو سکے گا یا نہیں۔

شاہد بھائی کی موت ایک سنگین سانحہ ہے۔ اس کا جتنا بھی صدمہ کیا جائے کم ہے۔ میرے ان سے بیس سال کے تعلقات تھے۔ وہ بھی بزرگانہ اور خوردی کے۔ گو آخر میں حالات کچھ ایسے ہوئے کہ پہلے جیسے مراسم باقی نہ رہے اور دلوں میں فرق پڑ گیا۔ مگر پرانے رشتے ایسی باتوں سے منقطع نہیں ہوتے خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ کیا تم ان پر کچھ لکھ رہے ہو۔ میرے خیال میں انشا استحقاق تو وہ رکھتے ہیں۔ ان کی موت کے بعد حسب معمول ان کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے مگر یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ ان پر ایک آدھ مضمون ایسا بھی آنا چاہیے جو بعد میں بھی باقی رہے۔

عربوں کا انجام عبرت ناک ہے۔ سیاسی معاملات میں میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن مجھے تو یہ سب کچھ ایک ڈرامہ سا معلوم ہوتا ہے۔ عربوں نے امریکہ اور برطانیہ پر جو الزامات لگائے ہیں اگر وہ درست ہیں تو یقیناً جلد یا بدیر اسی قسم کی صورت حال پاکستان کے ساتھ پیش آ سکتی ہے بات یہ ہے کہ کمزور کی موت اس کی کمزوری ہے لیکن تقدیر کی منطق کچھ اور ہے۔ یہی کمزور ممالک طاقتور ملکوں کے لیے ایک سرطان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کا خاتمہ اگر ہو گا تو اس کی بنیاد یہی چھوٹے اور کمزور ممالک ہوں گے —— یادش بخیر، تمہارے جناب سارتر بھی صف دشمناں میں ہیں —— الکفر ملۃ واحدۃ۔

اخلاقیات اور مذہب کے رشتے کے بارے میں تم نے جو کچھ لکھا ہے اس پر گفتگو سے ڈر لگتا ہے کہ بات کہیں مناظرہ کی صورت اختیار نہ کر لے۔ پھر مذہب کے معاملہ کو انفرادی بحثوں میں طے کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ موضوع کی وسعت کے اعتبار سے یہ ایک بحر زخّار ہے جس میں شناوری کا مجھے یارا نہیں۔ لیکن تم نے اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات کے رشتے سے بھی انکار کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں بھی کئی طرح کے نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ لیکن میری رائے اس بارے میں یہ ہے کہ کوئی اخلاقیات اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک وہ کائنات میں انسان کے مقام کا تعین نہ کرے۔ اس کا تعلق ایک طرف انسانی فطرت سے ہے اور دوسری طرف کائنات میں انسان کے مقام سے۔ پھر یہ دونوں سوال اس سوال سے

متعلق ہیں کہ "خود فطرت کائنات" کیا ہے۔ آپ بچے کو یہ سکھا دیجیے کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بری۔ لیکن اس کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ جو چیز بری ہے وہ بری کیوں ہے اور جو چیز اچھی ہے وہ اچھی کیوں ہے اور بری چیز سے بچنا کیوں ضروری ہے اور اچھی چیز کو اختیار کرنا کیوں لازمی ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک اس کا جواب عملی افادیت ہے یعنی برائی نہ کرو تاکہ دوسرے تم سے برائی نہ کریں اور اچھائی کرو تاکہ دوسرے تم سے اچھائی کریں۔ یہ ایک کمزور بنیاد ہے۔ کیونکہ ان کا بنیادی تصور عملی افادیت ہے اور عمل کی دنیا میں ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ یہ اصول کام نہیں دیتا۔ لازمی طور پر اچھے آدمی سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا اور برے آدمی کا انجام برا نہیں ہوتا سوائے مولوی اسمٰعیل پانی پتی کی کتابوں کے۔ ایک سوال اور بھی ہے۔ فرض کیجیے میں یہ انتظام کر لوں کہ دوسرے مجھے ضرر نہ پہنچا سکیں تو مجھے ضرر سے روکنے والی چیز کیا ہوگی۔ جو لوگ طاقت حاصل کر لیتے ہیں یا دولت جمع کر لیتے ہیں یا جوڑ توڑ سے حقیقی بندی میں کامیاب ہو جاتے ہیں انہیں دوسروں کے ضرر کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں اخلاقیات ان کے کس کام آ سکتی ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر کو ایک طرف رکھ دیا اور محسوس عملی زندگی میں دیکھا جائے تو "کامیاب آدمی" اخلاقیات کو ایک کمزوری سمجھتے ہیں۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کا مقصد دنیاوی کامیابی حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصود بالذات ہے۔ پھر جو لوگ اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے اس کا باعث ان کی کمزوری ہوتا ہے جسے وہ اخلاقی اصولوں کا رنگ دیتے ہیں۔ اخلاق کی عملی افادیت کو ماننے والے اس تصور سے آگے نہیں جا سکتے لیکن تم جانتے ہو کہ اخلاق کو مذہبی بنیادوں پر ماننے والوں کا مقصود دنیاوی کامیابی نہیں ہوتا بلکہ خوشنودی حق .... یعنی اخلاقیات مقصود بالذات بن جاتی ہے خواہ اس سے عملی افادیت حاصل ہو یا نہ ہو اور جب تک اخلاقیات ان معنوں میں مقصود بالذات نہیں ہے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

دوسرے لفظوں میں عمل خیر کو بذاتہ خیر ہونا چاہیے۔ لیکن خیر میں یہ "خیریت" کہاں سے آئے۔ میں نے اس مسئلہ پر جو تھوڑا بہت غور کیا ہے اس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں اخلاقیات کی ضرورت کا انکار کر دیں جس کی ہمت ابھی تک بہت ہی کم لوگوں کو ہوئی ہے۔ عقائد کا انکار آسان ہے مگر کہا جاتا ہے کہ احکام عشرہ کے انکار کی ہمت بڑے بڑوں کو نہیں ہوتی لیکن اخلاقیات کی ضرورت اگر ہے اور انسانوں کو امکانی حد تک اس کا پابند بھی بنانا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی اساس حیات مابعد الموت کے عقیدہ پر رکھی جائے۔ اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا تصور آخرت ضروری ہے۔ تاریخ انسانی اس پر گواہ ہے کہ بقائے روح کے تصور کے بغیر آپ اس کے عمل میں کوئی

حقیقی معنویت نہیں پیدا کر سکتے۔ تم کہو گے انسان اس تصور یا عقیدہ سے آگے نکل آیا ہے۔ ٹھیک ہے لیکن پھر اسے اخلاقیات سے بھی آگے نکل جانا چاہیئے......... مذہب پرستی چھوڑ کر اخلاق پرستی کا نظریہ اپنی حقیقت میں انتہائی ناپائیدار اور بے اصل نظریہ ہے۔ کچھ لوگوں نے اجتماعی اور معروضی اخلاقیات کو چھوڑ کر ایک ذاتی اخلاقیات کا پرچار شروع کیا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ فرد کو اپنے خیر و شر کے اصول خود وضع کرنے چاہئیں اور اپنی "عزت نفس" کے نام پر ان کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ یہ ایک دلیرانہ اصول تھا کہ نتیجہ کچھ بھی ہو میں اپنے اصول خیر کی پیروی کروں گا۔ لیکن اس نظریہ کی تہہ میں جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں بدترین قسم کی خود پرستی کے سوا اور کسی چیز کے پروان چڑھنے کا امکان نہیں ہے۔ جس اخلاق کی بنیاد یہ تصور ہو کہ "میں اتنا اچھا ہوں کہ فلاں کام نہیں کر سکتا" اس سے آپ اپنی منطقی انتہا پر خود پرستی کے سوا اور کسی چیز کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔ ایسے خود پرست میں نے اپنی زندگی میں بہت دیکھے ہیں اور ان کا سب سے بڑا شر، ان کی اخلاقیات کے اندر ہی مضمر پایا ہے۔ پتہ نہیں یہ کس کا فقرہ ہے مگر خوب ہے کہ ہمیں اخلاق کو اس کے باپ شیطان کے حوالے کرنا چاہیئے۔ معلوم نہیں اس کا صحیح مفہوم کیا ہے لیکن ایک بات پر میں نے غور کیا ہے۔ اخلاقیات کا اصول اگر ہمارے باطن میں موجود نہ ہو تو یہ ایک طرح کی میکانکیت بن جاتی ہے۔ زندہ افراد اپنی زندگی ان گہرے باطنی تقاضوں کے مطابق بسر کرتے ہیں جو ان کے اعماق قلب سے ان پر وارد ہوتے ہیں۔ انسان بہت شدید روحانی کاوش کے بعد اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے قلب کے فتوی کے مطابق عمل کرے۔ حقیقی اخلاقیات انسان کو اس قابل بنانے کی تربیت کا نام ہے۔ میں اسے ہر طرح کی میکانکیت سے آزادی کے عمل سے تعبیر کرتا ہوں۔ حقیقی تہذیب انسان پر پابندی عائد کرتی ہے تاکہ اسے آزاد کر سکے۔ اس کے برعکس جھوٹی تہذیب نام ہے صرف خارجی پابندیوں کی رسمی پیروی کا۔ میرے خیال میں مذہب کی تعلیمات اس سلسلہ میں اتنی عمیق ہیں کہ سرسری نگاہ سے ان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن محی الدین ابن عربی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "خوشبو کا کیڑا خوشبو میں خوش اور گو کا کیڑا گو میں خوش"۔ میں نے اپنے ایک قطعہ میں رسمی اخلاق پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا:

عمر بھر کفر پہ للچائی طبیعت لیکن
شکر اللہ کا ہے کٹ گئی ایمان کے ساتھ
اُن کے اخلاق کا مقصد بھی یہی ہے شاید
بچے شیطان کے ہوں اور رہیں رحمان کیساتھ

لیکن اخلاقیات پر یہ بحث کہاں تک جائے گی؟

اب رہ گیا زندگی اور کائنات کے مہمل ہونے کا سوال۔ انسان ایک جانی پہچانی کائنات میں رہتا ہے اور اسے "اپنا گھر" بناتا ہے۔ یہ گھر انسان سے چھن جائے تو زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ لیکن تاریخ انسانی میں بار بار ایسے ادوار آتے رہے ہیں جب انسان نے اپنے آپ کو ایک "اجنبی دنیا" میں پایا ہے۔ یعنی اس کا گھر اس سے چھن گیا ہے۔ تاریخ کے بہت بڑے ادوار انسان کی اس جد و جہد سے پیدا ہوئے ہیں کہ وہ کائنات کو کس طرح اپنا گھر بنائے۔ تاریخ نے سب سے بڑے گھر مذاہب نے تعمیر کیے۔ موجودہ دور انسان کی "بے گھری" کا زمانہ ہے اس کی مانوس دنیا اس سے چھن گئی ہے۔ اس کے در و دیوار شکستہ ہو چکے ہیں۔ اس کی چھتیں ڈھے گئی ہیں۔ اس حالت میں لازمی ہے کہ زندگی مہمل نظر آئے۔ لیکن انسان ایک گھریلو جانور ہے۔ انسان کو اگر اس کائنات میں رہنا ہے تو اسے اپنا گھر بنانا پڑے گا۔ تم کہتے ہو یہ مذہب نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ہے لیکن پھر کیا ہو سکتا ہے؟ .... کہتے ہیں کہ ایک بہت بڑا گھر ہیگل نے تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا گھر "مکان" میں نہیں "زمان" میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا نظام فکر عیسائیت کی منہدم عمارت کی جگہ لے سکے گا، مگر فلسفیوں کے ساتھ افلاطون سے ہیگل تک یہ ٹریجڈی ہوتی رہی ہے کہ ان کے افکار کتابوں میں تو بڑے آب و تاب سے چمکتے ہیں مگر عمل کی دنیا میں نہیں آتے۔ ہیگل کے ملبہ سے ایک گھر مارکس نے بھی تعمیر کیا ہے اور ایک تہائی انسانیت اس کے سائے میں زندگی گزارنے کا تجربہ کر رہی ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ تم مارکسیت کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہو۔

زندگی مہمل ہے :۔ نتیجہ: انسان کو خودکشی کر لینی چاہیے۔ پھر مہملیت کے قائل حضرات خودکشی کیوں نہیں کر لیتے۔ تم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ انسانوں کی اکثریت کے لیے یہ حل ناقابل قبول ہے اس لیے دوسرے حل کی ضرورت ہے لیکن انسانوں کی اکثریت کی بات غلط بحث ہے جن لوگوں پر زندگی کی مہملیت کھل چکی ہے انہیں دلاوری سے کام لے کر انسانوں کی اکثریت کی پروا کیے بغیر خودکشی کر لینی چاہیے۔ وجودی فلسفیوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں لیکن یہ تمہارے وجودی فلسفی کتنا ہی فلسفہ بگھاریں انسانی فطرت کے لیے مہملیت کا تصور قابل قبول نہیں۔ اس سے وہ نفرت کرتا ہے۔ مذہب، فلسفہ، سائنس سب معنی کی تلاش ہیں۔ تلاش نہیں معنی کا یقین ہیں۔ ان کے اندر یہ بات پہلے سے ودیعت ہے کہ کائنات بے معنی نہیں ہے۔ معنی ہیں اور اس لیے معنی کی تلاش ہے۔ پھر ایک سوال اور بھی ہے۔ کیا انسانوں کی اکثریت کے لیے سچ مچ کائنات

معطل ہو چکی ہے، میرے خیال میں حقائق اس کی تردید کریں گے۔ انسانوں کی اکثریت اب بھی معنی میں
یقین رکھتی ہے بلکہ مذہب کے دیے ہوئے معنی کے تحت زندگی بسر کرتی ہے۔ مسئلہ کا ایک پہلو اور
بھی ہے کہ یہ معنی اور مہملیت کی باتیں چند افراد کے ذہنی مسائل ہیں۔ انسانوں کی اکثریت کا اس سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ انسانوں کی اکثریت کے لیے اس عمل میں بھی بہت معنی ہیں کہ وہ بچے پیدا کرتا ہے انہیں
پالتا ہے۔ ان کے لیے روزی کماتا ہے۔ فرصت میں ان کے ساتھ پکنک مناتا ہے۔ تم جب چند افراد
کے ذہنی مسائل کو انسان پر منطبق کرتے ہو تو اس سے مسائل کی تقسیم میں دقت پیدا ہوتی ہے۔ مذہب
چند لوگوں کی ذہنی عیاشی کا سامان نہیں ہے۔ "انسان" کی...... انسانوں کی عظیم اکثریت کی عمیق
ترین زندگی کے مطالبات اس سے تسکین پاتے ہیں۔

لیکن تسکین کے بارے میں تمہارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حقیقت کو تسلیم کرنا زیادہ بنیادی بات
ہے۔ اگر سکون کے لیے جھوٹ کو قبول کرنا پڑا تو سکون کو قربان کر دینا چاہیے اور حقیقت کا اثبات
کرنا چاہیے۔ لیکن سوال تو یہی ہے کہ حقیقت کیا ہے، سائنسی حقیقت یا فلسفیانہ حقیقت، مذہبی حقیقت؟
ان سب کے اپنے اپنے طریق کار ہیں۔ اور ان طریق کار سے ان کی حقیقت کا تصور متعین ہوتا ہے
بلکہ طریق کار ہی ہے جو ایک حد تک حقیقت تک رسائی کا ذریعہ بھی ہے اور اسے محدود بھی بناتا ہے
مجھے جدید فکر کے انتشار کی سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اس نے مختلف طریق کار سے حاصل ہونے
والے مختلف نتائج کو گڈمڈ کر دیا ہے اور تکمیل تک کسی ایک کو بھی نہیں پہنچایا۔ ڈیکارٹ کے وقت
سے فلسفہ سائنسی نتائج سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت کی کسوٹی اگر
سائنس ہے تو پھر فلسفہ کی کیا ضرورت ہے۔ غالباً اس کے جواب میں تم یہ کہو گے کہ سائنس "اقدار"
سے بحث نہیں کرتی اور اقدار متعین کرنے کا کام فلسفہ کا ہے۔ لیکن میرے خیال میں فلسفہ نے سائنس
سے مطابقت کی کوشش میں اپنی آزادیٔ فکر کو بہت محدود کر لیا ہے۔ خیر، فلسفیوں کے مسائل فلسفی
جانیں۔ میرا سوال تو صرف اتنا ہے کہ تم جب حقیقت کہتے ہو تو اس سے تمہاری مراد کس حقیقت سے
ہوتی ہے........ اب رہ گیا تمہارا یہ سوال کہ سکونِ قلب کی خاطر Illusion میں
مبتلا رہنا بہتر ہے یا سکونِ قلب کے بعد Disillusioned رہنا۔ Illusion کے
معنی تم نے خوش گمانیاں بتائے ہیں جن کی بنیاد حقیقت پر نہیں ہے۔ مگر مثلاً ایک حقیقت مذہب کی
ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کافر لوگ اپنے اوہام باطلہ (خوش گمانیوں) میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب یہ حقیقت
سے دوچار ہوں گے تب اپنی زندگی ضائع کرنے کا افسوس کریں گے........ مثلاً یوم آخرت

ہیں کافر کہے گا کہ اسے کافر میں مٹی ہوتا۔ دنیاوی اعتبار سے دیکھا جائے تو حقیقت دنیوی ہے اور اس کے مقابلہ پر مذہبی عقائد خوش گمانیاں ہیں۔ مذہبی اعتبار سے دیکھا جائے تو حقیقت اخروی ہے اور اس کے مقابلہ پر دنیوی باتیں خوش گمانیاں ہیں۔ دراصل خوش گمانی اور حقیقت پسندی دونوں کا تعلق حقیقت کے تصور سے ہے۔ جب تک حقیقت کا تعین نہ کر لیا جائے یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا خوش گمانی ہے اور کیا حقیقت پرستی۔ تمہارا رجحان چونکہ مذہب کے خلاف ہے اس لیے خوش گمانی کی نسبت تم مذہب کی طرف کرتے ہو۔ لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دنیا جو سینکڑوں شہیدوں کی قدر و منزلت کرتی ہے ان کی زندگی تو رائگاں ہی ہوگی اگر خدا نہیں ہے اور انہوں نے خدا کی خوشنودی کے لیے جان دی اور مال و متاع کو قربان کیا اور اولاد تک کو نچھاور کر دیا تو ان سے زیادہ خسارے میں اور کون رہا۔ پتہ چلا کہ حسینؑ خوش گمانی میں مبتلا تھے اور یزید حقیقت پسند تھا۔

مسئلہ کا ایک اور رخ یہ سوال ہے کہ معروضی حقیقت تک انسان کی رسائی کیسے ہو؟ ہم اپنی خواہشوں اور خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور حقیقت کا تصور انہیں کے رنگ میں کرتے ہیں۔ دوسری حد بندی یہ ہے کہ ہمارا ادراک حقیقت ہمارے حواس تک محدود ہے۔ ایک بہرے آدمی کے لیے آواز کی دنیا کا کوئی وجود نہیں۔ ایک اندھے کے لیے رنگوں کی دنیا معدوم ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے ماسوا کوئی اور مخلوق دنیا کا تجربہ کس طرح کرتی ہے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے .... کہ انسان کی وہ قسم جو پیغمبر کہلاتی ہے حقیقت کا ادراک کس طرح کرتی ہے۔ جو اس کی اس حد بندی سے نکل کر حقیقت اشیاء کو معروضی طور پر جاننا اس کے لیے ممکن ہے یا نہیں۔ یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان کیا جان سکتا ہے۔ علم کی حقیقت کیا ہے اور ہمارے علم کا حقیقت سے کیا تعلق ہے؟ جب تک ان سب باتوں کا تعین نہ ہو جائے ہم جلد بازی میں خوش گمانی اور حقیقت پسندی کا تعین نہیں کر سکتے۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم فلسفہ میں ایم۔ اے کر رہے ہو۔ میرے لیے یہ نہ حیرت کی بات ہے نہ ہنسنے کی۔ خدا کرے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ پھر تم سے شاید میں بھی کچھ مسائل کے سلسلہ میں مدد لوں۔ زندگی جہل اور لاعلمی کی نذر کرنے کے بعد اب کچھ کرنے کا خیال آیا تو معلوم ہوا کہ وقت بہت کم ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ فلسفہ کا اول تا آخر مطالعہ کروں۔ تم پڑھ لو گے تو بہت سی باتیں تم سے پوچھ لوں گا۔

میں اپنے مضامین کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔ بلکہ یہ کہنا شاید صحیح ہوگا کہ کسی ادارے نے از خود دیا نہیں اور میں نے مانگا نہیں۔ کبھی کچھ پیسے ہم قلم، ہم خیال اور راہ نوں سے مل گئے تو وہ سب کو مل ہی جاتے ہیں

پبلشر مجھے بھی کوئی نہیں ملتا۔ میری دونوں کتابیں دوستوں نے چھاپی ہیں۔ پبلشر پھانسنا ایک گر ہے جو شاید ہم دونوں کو نہیں آتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں ہماری ادبی حیثیت کا بھی کوئی دخل ہو گو اس پہلو کو تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

جوش پر میں بہت کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں لیکن بات ابھی تک بنی نہیں ہے جمیل مظہری پر تمہارا مضمون اوراق کے کس شمارے میں شائع ہوا ہے مطلع کرو تو منگوا کر پڑھوں۔ جوش کا مسلک لا ادریت کا مسلک ضرور ہے مگر ان کے اندر ایک اس سے گہرا جذبہ موجود ہے جو انہیں لاادریت پر بھی قائم نہیں ہونے دیتا۔ انہوں نے ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ خدا سے دنیا کے مصائب اور تکالیف کی شکایت کرتے ہیں۔ خدا پوچھتا ہے کہ جوش کہاں چوٹ لگی ہے۔ دماغ میں، دل میں۔ آخر میں جوش کہتے ہیں۔ اے میرے چارہ ساز دو عالم کہیں نہیں۔ میرے خیال میں تو جوش اس نظم میں خدا کے اتنے قریب پہنچ گئے ہیں کہ دست رحمت کا لمس اپنے جسم پر محسوس کیا ہے۔

نئی شاعری سے متعلق اگلے خط میں گفتگو ہوگی۔ تمہاری بھابی تم دونوں کو سلام کہتی ہیں۔ بھابی سے میرا سلام کہو اور مزاج پوچھو۔ تمہاری بھتیجی تمہیں سلام کہتی ہے۔ دونوں کی تصویریں تمہیں جلد بھیج دوں گا معاف کرنا پیڈ ختم ہوگیا ہے اور لانے کی توفیق ابھی تک نہیں ہوئی۔

تمہارا سلیم

۲۵-۶-۶۷

(۱۱)

نظیر کئی دن سے تمہارے خط کا انتظار تھا۔ آج بھی کافی دیر کر کے دفتر گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج بھی تمہارا خط نہ آیا تو شام کو تمہیں خط لکھوں۔ دفتر سے لوٹ کر آیا تو تمہارا لفافہ ملا۔ اسی وقت جواب لکھنے بیٹھ گیا مگر گرمی نے باؤلا بنا رکھا ہے۔ ایک لفظ نہ لکھ سکا۔ کراچی میں اب کے ایسی گرمی پڑی ہے کہ برسوں سال میں نہیں پڑی۔ کل کچھ بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے تھوڑا سا سکون ہوگیا تھا۔ لیکن آج پھر حال خراب ہے۔ اس وقت بادل ہو رہے ہیں۔ بارش ہوگئی تو شاید موسم کچھ بہتر ہو جائے۔

پرانے موضوعات پر نئے سوالات کہاں سے لاؤں۔ پھر فلسفہ تو ویسے بھی گنتی کے چار لفظوں سے سر پھوڑتا رہا ہے۔ میں فلسفہ کا طالب علم نہیں ہوں میں نے تو اس کی کسی ایک تاریخ کا بھی باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا۔ یوں کوئی ایک آدھ کتاب نظر سے گزر گئی ہو تو اور بات ہے۔ لیکن مجھے یہ شوق

ضرور رہا ہے کہ میں زندگی کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں، اسے اپنے ٹھوس اور حقیقی تجربات سے مربوط و ہموار رہوں۔ اس لیے میری اور تمہاری گفتگو کی ایک شرط یہ ہو گی کہ مجھ سے حوالے طلب نہ کرنا۔ دوسرے جب کوئی نظریہ بیان کرو تو صرف ناموں پر قناعت نہ کرنا بلکہ نظریہ کی مختصر تفصیل بھی دے دینا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم فلسفہ میں میرے باقاعدہ استاد بن جاؤ۔ جو کچھ پڑھتے رہو اس کا خلاصہ مجھے بھی لکھتے رہو۔ مجھے اگر کوئی سوال سوجھے تو کروں گا اس کا جواب دے دینا —— لیکن مذہب پر تم نے جو بحث اٹھائی ہے شاید دور تک نہ جا سکے۔ مذہب بہرحال عقیدہ کا معاملہ ہے۔ اور میرے لیے کئی چیزیں اتنی معنی خیز ہیں کہ میں ان پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔

جمیل مظہری پر تمہارا مضمون اوراق کہیں سے منگوا کر پڑھوں گا۔ تم نے مظہری صاحب کے جو اشعار لکھے ہیں ان کی زبان تو واقعی نئی ہے۔ خیال بھی نیا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ میں ابھی نہیں کر سکا۔ دوسرا شعر دلچسپ ہے۔ قرآن حکیم کی ایک آیت میں کفار کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے۔ کتنی حیرت کی بات ہے محمدؐ نے اتنے بہت سے خداؤں کو جوڑ کر ایک خدا بنا دیا ہے۔ کفار کثرت پرستی یا شرک میں مبتلا تھے اس لیے انہیں توحید حیرت انگیز نظر آتی تھی۔ توحید کے معنی ہیں کثرت کو وحدت میں بدلنا یا کثیر کو واحد بنانا یہ اشتراک کی ضد ہے۔ معلوم نہیں مظہری صاحب نے توحید کو صنم تراشی کس دلیل کی بنا پر کہا ہے۔ شاید اس کا جواز انہیں "سو بتوں کو جوڑا ہے ٹکڑے ٹکڑے سے ملا" لیکن اس سے شعر میں ایک پہلو تو پیدا ہوا فکر پیدا نہ ہوئی صنم یا بت کیا ہے؟ خدا کا صفاتی تصور ہے۔ جب تک یہ ذات کی علامت رہتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جیسے ہی اسے ذات سے جدا کر کے اپنی جگہ مستقل موجود بنا دیا جاتا ہے یہ کفر بن جاتا ہے۔ علامت جب تک حقیقت کی علامت ہے درست ہے۔ جب علامت ہی حقیقت بن گئی گمراہی ہو گئی۔ بت پرستی کے معنی ہیں علامت کو حقیقت کی جگہ دے کر اس کی پرستش کرنا۔ مسلمان مرتبہ صفات میں خدا کو سمیع کہتے ہیں، بصیر کہتے ہیں۔ غور سے دیکھو تو بندوں کا خدا کے کان بنانا اور آنکھیں بنانا اس عمل سے بالکل مشابہ ہے۔ اسی لیے صفات کو کبھی کبھی بت کدہ بھی کہا گیا ہے (غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں) لیکن مقام ذات میں ہر صفت کا انکار کیا جاتا ہے۔ یہ تنزیہہ مطلق کا مقام ہے۔ اقبال نے بڑی ٹھوکر کھائی جب یہ مصرعہ لکھا۔ (میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں) مظہری صاحب نے دوسرے شعر میں صنم تراشی کا لفظ درست استعمال نہیں کیا ہے یعنی منطقیت کے اعتبار سے کیونکہ شاعری میں تو سب روا ہے۔ اور تیسرے شعر میں حرم اور بت کدہ کا سمبلزم ان کی گرفت میں نہیں آیا ہے۔ حرم مقام ذات

ہے اور بت کدہ مقام صفات ۔ مقام صفات کی رنگا رنگی سالک کو اسیر کر لیتی ہے اس لیے وہ اس مقام کو چھوڑ کر مقام ذات تک نہیں پہنچنا چاہتا جو یکسر بے رنگ ہے ۔ اس کیفیت کے غلبہ کو اردو شاعری میں کفر اور کفر پرستی کہا گیا ہے ۔ یہی اردو شاعری کی "بت پرستی" ہے ۔ یہی "صنم پرستی" ہے ۔ جمیل مظہری صاحب نے "منزل ارتقاء" کی ترکیب رکھ کر شعر کو بنانا چاہا مگر مطلب غائب ہے ...... معاف کرنا یہ بالکل سرسری خیالات ہیں جو خط لکھنے کے دوران ذہن میں پیدا ہوئے ابھی اشعار پر پورا غور نہیں کیا ہے ۔ بعد میں کچھ اور سوجھا تو لکھوں گا ۔

سردار جعفری صاحب کا خط آیا تو انشاء اللہ انہیں ضرور جواب دوں گا ۔ ان کے پرچہ کا شہرہ تو بہت سن رہا ہوں مگر زیارت کا شرف ابھی نصیب نہیں ہوا ۔

ماہ نو میں تمہاری درخواست کا افسوس ہے کہ کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ جہاں تک میری اطلاع ہے وہ کسی صاحب کا ایڈہاک تقرر کر چکے ہیں جنہیں بعد میں مستقل کر دیا جائے گا ۔ درخواست اور انٹرویو وغیرہ سب ڈھونگ ہے ۔

سیپ کا آئندہ شمارہ ناولٹ نمبر ہے ۔ لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے بعد کا شمارہ ایک ماہ کے اندر اندر لے آئیں گے ۔ تمہارا مضمون لیٹ ہو رہا ہے مگر کوئی اور اچھا پرچہ بھی تو موجود نہیں ہے ۔

تصویریں جلدی بھیجوں گا ۔ بھابی کو سلام

تمہارا ــــــ سلیم

۹ - ۷ - ۶۷

نظیر، کئی دن سے تمہارے خط کا انتظار تھا ۔ کل کام سے واپسی پر تمہارا خط ملا ۔ آج کل میں بھی بہت مصروف ہوں ۔ بیچ میں ملیریا بھی ہو گیا ۔ ۱۰۴ بخار میں پڑا رہا ۔ اب ٹھیک ہوں ۔ کام دوبارہ شروع کر دیا ہے ۔ میں ان لوگوں میں ہوں جو کام سے اکتاتے یا گھبراتے نہیں ۔ کام مجھے زندگی کا اتنا لازمی لازمی جز محسوس ہوتا ہے کہ ایک دن بھی مصروفیت کے بغیر گزارنا پڑے تو کوفت ہوتی ہے ۔ یہ صرف روزی کمانے کا مسئلہ نہیں ہے کچھ اس سے زیادہ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی احساس شکست کے لمحوں میں ہر عمل بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے ۔ میں سوچتا ہوں کہ زندگی تو میرا خام مواد ہے اپنے شعور پر کیوں پابندی

بتھاؤں جو کچھ آتا ہے آسنے دو۔ زندگی میری ہے تو زندگی سے ناآسودگی بھی میری ہے۔ اپنی کسی کیفیت سے آنکھیں چرانے کے کیا معنی؟ یہاں تو میٹھا کڑوا سب ایک ہے۔ خدا جانے تم زندگی کو یا زندگی کے عمل کو کس طرح محسوس کرتے ہو۔ خط میں فلسفہ تو ہوتا ہے گا مجھے تو اس "خیال" سے زیادہ دلچسپی ہے جو تم نے بسر کیا ہے۔ کتابیں مجھے اس سے زیادہ کیا سکھائیں گی جو میری زندگی نے مجھے سکھایا ہے کتاب کو بھی میں زندگی کے حوالے ہی سے سمجھ سکتا ہوں اور اس زندگی کے حوالے سے جو میرے تجربے میں آئی ہے۔ اپنے تجربات سے آگاہ کرتے رہو۔

میرے اور تمہارے درمیان بقول تمہارے جو فکری مراسلت ہو رہی ہے اسے تم ٹالتے رہے تو کیسے جاری رہے گی؟ خط لکھنے کی یہ شرط تو نہیں ہے کہ میں یا تم فلسفہ ضرور بگھاریں۔ یار کوئی بھی بات لکھو۔ ایک موضوع نہ سہی دوسرا سہی۔ مربوط بات نہ سہی غیر مربوط سہی۔ ہم کوئی مضمون نگاری تو کرنے نہیں بیٹھے۔ قائل معقول کرنا بھی مقصود نہیں۔ تم میری مذہب پرستی سے مذہبی نہیں ہو جاؤ گے۔ میں تمہاری تشکیک سے دہریہ نہیں ہو جاؤں گا۔ زندگی نے ہمیں جو کچھ بنانا تھا بنا دیا اب تو ہم صرف اپنا اپنا نامۂ افکار (اور نامۂ اعمال بھی) ایک دوسرے کو دکھا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا بس میں ہے۔ خیالات میں اتفاق ہماری دوستی کی شرط نہیں۔ ہم اختلاف کے باوجود بلکہ شاید اس کی بناء پر زیادہ دلچسپ اور بھرپور دوستی کر سکتے ہیں۔

تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ معنی خیز باتیں کیا ہیں جن پر میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ پوچھنے کے انداز میں یہ شبہ موجود ہے کہ شاید میں کسی پیر صاحب کے چھو چھکا سے متاثر ہو گیا ہوں۔ یا اپنے کسی نفسیاتی تجربے کو "روحانی تجربہ" سمجھ بیٹھا ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ کوئی صاحب اگر ہمالیہ کو ہاتھ پر اٹھا لیں تو اس سے میں ان کی روحانیت کا قائل نہیں ہو سکتا۔ خارجی معجزوں پر ایمان لانے کا ایسا ہی شوق ہوتا تو اپنی سائنس کیا بری ہے۔ چاند پر پہنچنا کوئی معمولی خارجی عمل نہیں ہے۔ مجھے روحانی تجربات بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود میرے اندر بہت گہرائی میں کوئی چیز ہے جو خدا کا اثبات کرتی ہے اور اپنی زندگی کی تمام معنویت کا مرکز اسی کی ذات کو قرار دیتی ہے۔ تم اس کا نفسیاتی تجزیہ کر سکتے ہو۔ اسے بچپن کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ قرار دے سکتے ہو۔ ماحول کی دین کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے میں بحث کروں ممکن ہے کہ خاموش ہو جاؤں۔ مگر میں جو کچھ ہوں بس وہ ہوں۔ اور جو کچھ ہوں اسی کو مکمل کرنا چاہتا ہوں اسی لیے میں نے بحث سے انکار کیا۔ ہر شخص کو اپنا مذہب اپنے اندر ڈھونڈنا چاہیے چاہے وہ مذہب دہریت ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ہماری بحث تہذیبوں پر چل سکتی ہے۔ ابتداً ہمارا موضوع

گفتگو بھی یہی تھا۔

وجدان پر تم نے جو کچھ لکھا ہے مجھے اس سے اتفاق ہے۔ وجدان کچھ بھی نہیں ہے۔ آدمی کی طبیعت میں تجربات کا ایک نچوڑ سا قائم ہو جاتا ہے جس کی مدد سے وہ تعقل کے بغیر بھی بعض اوقات صحیح نتائج پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ وجدان کی حقیقت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اتبال اور برگساں کچھ بھی کہیں۔ الہام البتہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو شاعری اور مذہب میں مشترک ہے۔ شاعری میں تو اسے ایک چوچلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کے معنی ہیں کسی فوق الفطرت عنصر کا مثل نفس انسانی پر یا ایک رابطہ ہے جو فرد کی ذات اور کسی ما فوق الفطرت قوت کے درمیان قائم ہو جاتا ہے۔ یہ قوت رحمانی بھی ہو سکتی ہے اور شیطانی بھی۔ اس لیے الہام کی مذہبی حیثیت غیر متعین ہے اور اس کا حکم الہام کی نوعیت پر ہے۔ قدیم عقیدہ یہ تھا کہ شاعری الہامی ہوتی ہے یعنی اس وقت شاعر کا ربط کسی فوق الفطرت قوت سے قائم ہو جاتا ہے خواہ یہ قوت عیسائیت میں روح القدس کی ہو یا یونان میں میوز کی۔ بہرحال ایک بات طے شدہ تھی کہ یہ رابطہ ایک ایسی حقیقت سے قائم ہوتا ہے جو فرد کی ذات سے باہر ہے۔ نفسیاتی تعبیروں میں ایک خرابی یہ ہے کہ وہ اس چیز کو جو فرد کی ذات سے باہر ہے۔ فرد کی ذات میں کھینچ لاتے ہیں۔ یعنی اسے خارجی سے داخلی بنا دیتے ہیں۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ یہ لوگ اسے داخلی، غیر شعوری وغیرہ کیوں سمجھتے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ اس کے لیے الہام یا انسپریشن کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں کیونکہ ان الفاظ کے معنی کچھ اور ہیں۔ آپ کو اپنے "معنی" بیان کرنے کا حق ہے مگر متعین لفظوں کو بگاڑنے یا ان میں اپنے معنی ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

جدید تہذیب پر میرا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے الفاظ و مفاہیم کا بیڑا غرق کر دیا ہے اور کوئی قدیم اصطلاح ایسی نہیں ہے جسے مسخ نہ کر دیا ہو۔

جمیل مظہری پر تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ محبوب خزاں اور تم لوگ ان کا بہت تذکرہ کرتے رہتے ہو اس لیے مجھے بھی ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے اشعار پر میں نے جو کچھ لکھا وہ سرسری خیالات تھے جو خط کے دوران قلم سے نکل گئے۔ معلوم نہیں کوئی معقول بات کہی بھی یا نہیں۔

سردار جعفری صاحب مجھے شاید ہی خط لکھیں۔

"اردو ادب اور شعبہ اردو" پر تم اپنا مضمون مجھے بھیج دو۔ ممکن ہے نیا دور والے چھاپنے پر راضی ہو جائیں یا سیپ والے تیار ہو جائیں۔

جواب جلد دینا۔ بھابی کو آداب کہو!

تمہارا ــــ سلیم

۱۹-۷-۶۷

پیارے نظیر۔ آج دوپہر اچانک تمہارا بہت پیارا خط ملا۔ تم نے کتنی محبت سے یاد کیا ہے۔ اس کے لیے تہ دل سے تمہارا ممنون ہوں۔ ساقی میں تمہارا خط پڑھ کر تمہیں ایک خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں ملا تو مایوس ہو گیا تھا۔ پھر آخر نے تمہارا نیا پتہ دیا۔ میرا مجموعہ "بیاض" کے نام سے آرہا ہے۔ اس میں نئی نظم پورا آدمی کا اشتہار تمہاری رائے کے ساتھ دیا ہے۔ مجموعہ انشاءاللہ ستمبر کے پہلے دوسرے ہفتہ میں تم تک پہنچ جائے گا۔ مضامین کی دوسری کتاب بھی تیار ہے مگر اس کی اشاعت میں ۳-۴ ماہ لگیں گے۔

حریت کے کالم کی تم نے جس طرح تعریف کی ہے اس کے لیے تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ میں اس کالم کے سلسلہ میں خاصی ذہنی الجھن کا شکار رہا ہوں۔ اخبار والے اور انٹیلکچول حضرات مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ میں اس قسم کی چیزیں لکھوں جیسی اخبارات میں چھپتی ہیں۔ وہ کام میں کرنا نہیں چاہتا۔ آخری فیصلہ یہ کیا ہے کہ جب تک اس قسم کا کالم چلے گا چلاؤں گا ورنہ بند کر دوں گا۔ تم میری طرف سے فکرمند مت ہو۔ ایسی تحریریں مجھے میرے اصل کام سے نہیں روکتیں۔ ورنہ ریڈیو اور فلم مجھے پہلے ہی کھا چکے ہوتے۔ جس دن اس قسم کا کوئی خطرہ محسوس ہوا۔ اسی دن کالم بند کر دوں گا۔ ایک بات اور ہے۔ میں بہت سی باتیں عام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ادبی رسالوں کا جو حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں صحافت میں صحافت کے لیے نہیں آنا چاہتا۔ میں سچ سچ کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے اخبار ہی ایک ذریعہ نظر آتا ہے۔ میں نے تعلیم کے مسئلہ پر مفید کالم لکھے تھے۔ کیا وہ تمہاری نظر سے نہیں گزرے اگر دیکھے ہوں تو اپنی رائے سے مطلع کرو۔

نئی نظم اور پورا آدمی پر تمہارا مضمون میرے خیال میں اب تک بہترین مضمون ہے۔ تم نے اس میں جتنے خلوص اور سنجیدگی سے میری بات سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اس سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔ پھر تم نے دیانت داری سے اپنا اختلاف بھی ظاہر کیا ہے۔ اس پر میرے اور تمہارے درمیان گفتگو ہو سکتی ہے خطوں میں بھی اور رسالوں میں بھی۔ "تاثرات اور تعصبات" کے سلسلے میں بقول تمہارے

میرے "تعصبات" کا کیا ہوا۔ اسے گولی مارو۔ اب میں دوسرا مضمون لکھ رہا ہوں۔ تم کہو تو کسی رسالے میں چھپوا دوں، ورنہ اپنے مجموعہ میں شامل کر لوں۔ فوراً لکھو۔

تم نے اپنی شادی کی اطلاع اتنی دیر سے دی ہے۔ بہت نالائق ہو۔ خیر مبارکباد قبول کرو۔ اور بھابی کو بہت بہت سلام کہو۔ تمہاری بھابی سے میں نے تمہارا سلام کہہ دیا ہے۔ وہ بھی وعلیکم السلام کہہ رہی ہیں۔ ہاں تمہارے ایک بھتیجی ہوئی ہے۔ اب ماشاءاللہ دو ماہ کی ہو گئی۔ قرۃ العین احمد نام رکھا ہے۔ تم ہمیں چچا بننے کا موقع کب فراہم کر رہے ہو۔

جواب فوراً دینا۔ میں بہت بے چینی سے منتظر رہوں گا۔

تمہارا ــــــ سلیم

خزاں کی شاعری کی اپنی دانست میں تو میں نے تعریف ہی کی ہے۔ تعریف کا انداز البتہ فرقہ ملامتیہ والا ہے۔ جب تک کوئی چیز مجھے پسند نہ آئے میں اس پر تبصرہ نہیں کرتا۔ شرط اوّل پسندیدگی ہے۔ پھر برائی بھی حسب توفیق کر لیتا ہوں۔

۶۷-۷-۲۱

(۱۴)

پیارے نظیر!

تمہارا خط کافی دن ہوئے ملا تھا۔ ان دنوں کام بہت ہے اور فرصت بالکل نہیں ملتی۔ اس لئے خواہش اور کوشش کے باوجود جواب فوراً نہیں دے سکا۔ پھر ایک خیال یہ بھی تھا کہ تم بھی کافی مصروف ہو اور امتحان کی فکر الگ ہے۔ میری خطوط بازی سے بیکار وقت ہی ضائع ہوتا ہے۔ آج ایک ڈرامہ لکھنے کے سلسلہ میں دفتر نہیں گیا۔ لکھنے بیٹھا تو تمہارا خط نظر آگیا اور طبیعت کچھ لکھے بغیر نہیں مانی۔

بھئی تم اپنا علاج کیوں نہیں کراتے۔ صحت کی طرف سے بے پروائی ٹھیک نہیں۔ ابھی سے بیماری آزاری میں مبتلا ہو جاؤ گے تو بڑھاپے میں کیا کرو گے۔ میری جان علاج کراؤ اور رحم کے کرداؤ یہ بلڈ پریشر وغیرہ کی بات سخت نامعقول ہے۔

ارے بھئی یہ ہم خدا کے وجود اور عدم وجود کی بحثوں میں کہاں پھنس گئے۔ چھوڑو یہ مسئلہ ہمارے بس کا نہیں ہے۔ تم اپنے انکار پہ قائم رہو۔ میں اپنے اقرار پر قائم رہوں۔ خدا نہیں ہے تو تمہیں نقصان

نہیں پہنچے گا۔ اور ہے تو میری عاقبت بینی کی داد دو۔ لیکن تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ایک بات پر جمتے نہیں۔ الجھے چلے جاتے ہو۔ ابھی تم نے لکھا ہے۔ "اگر ایک طرف میں خدا کے وجود پر ایمان لانے سے معذور ہوں تو دوسری طرف اس کے وجود سے انکار بھی میرے بس میں نہیں"۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہو کہ "عقلی اور اخلاقی نقطہ نظر سے مجھے خدا کا وجود ناممکن معلوم ہوتا ہے"۔ تم سے تو لاادریت کے حصار عافیت میں بھی چین سے بیٹھا نہیں جاتا۔ شاید یہ تنہا تمہارا معاملہ نہیں یہ انسانی فطرت ہے کہ لاادریت کے مسلک سے مطمئن نہیں ہوتی۔ انکار اور اقرار، دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا اسے گوارا نہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہوتا ہے کہ "انکار و اقرار" دونوں سے دستبرداری کے بعد "انکار" کی طرف رجحان زیادہ ہو جاتا ہے۔ تم میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ لاادریت کے مسلک میں تفصیلی طور پر نہیں جانتا جو اجمالی علم مجھے ہے اس سے کچھ ایسا خیال گزرتا ہے کہ اس کا تعلق "حقیقت" سے نہیں "علم حقیقت" سے ہے لاادریت اس بات سے بحث کرتی ہے کہ ہم حقیقت کا علم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں، اور وہ بھی عقل کے ذریعہ لاادریت کہتی ہے کہ حقیقت کا علم عقل کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انکار اور اقرار دونوں کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ میرے لیے یہ مسلک اس لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ میں عقل کو حقیقت تک رسائی کا حتمی ذریعہ نہیں سمجھتا۔ اور "وحی" پر یقین رکھتا ہوں۔ خیر یہ تو عقاید کی بات ہوئی۔ تمہیں لاادریت کو ماننے کے بعد اپنے "انکار" کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔ شاید مسئلہ کا کوئی حل پیدا ہو۔

آخری علت کی علت ...... یہ سوال غالباً کانٹ کا ہے۔ علت العلل کا تصور یہ ہے کہ اس کی کوئی علت نہ ہو۔ کیونکہ اگر اس کی بھی کوئی علت ہوگی تو پھر اس علت کی علت کا سوال پیدا ہوگا۔ اور اس طرح یہ مسئلہ لامتناہی ہو جائے گا۔ ارسطو نے کہا کہ کوئی سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا۔ یعنی خود عقل انسانی سلسلہ لامتناہی سے ایک طرح کا انقباض محسوس کرتی ہے۔ اس لیے خود عقل کا تقاضہ ہے کہ علتوں کا سلسلہ ایک علت العلل پر ختم ہو جائے۔ بہرحال خدا کے جو عقلی دلائل دیے گئے ہیں ان سب میں نقص ہے کیونکہ وہ انفرادی عقل کا نتیجہ ہیں اور انفرادی عقل کتنی ہی بڑی ہو کامل نہیں ہو سکتی اس پر پھر کبھی گفتگو کریں گے۔

اخلاقیات کے بارے میں تم نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ "کوئی چیز کیوں اچھی ہے"۔ "ارضی تجربات" اگر اخلاقیات کی بنیاد ہیں تو یہ "ارضی تجربات" ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ "عمل خیر" کا نتیجہ ہمیشہ "خیر" اور "عمل بد" کا نتیجہ ہمیشہ "بد" نہیں نکلتا۔ اسی لیے ارضی تجربات کی بنیاد پر خیر و شر کا

مطلق تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ اور خیر و شر جب تک مطلق نہ ہوں ان سے کوئی اخلاقیات پیدا نہیں ہو سکتی۔ خیر و شر کی بدلتی ہوئی اقدار کے معنی میں نے ہمیشہ "ابن الوقتی" ہی دیکھے ہیں۔

بروہی صاحب سے میری ملاقات نہیں۔ کاش ہوتی۔ میں ویسے بھی سیاسی ٹائپ کے لوگوں سے بدظن رہتا ہوں۔ بروہی صاحب کی فکر سے میری بدگمانی ان کے سیاسی کردار کی وجہ سے رہی ہے۔ خدا کرے وہ واقعی کام کے آدمی ہوں۔

میرے خیال میں آئندہ ہمیں "خدا" کے مسئلہ پر جھگڑنے کے بجائے کوئی اور معقول بات کرنی چاہیے کیونکہ "خدا" ایک لفظ ہی تو ہے۔ اس لفظ کو درمیان سے ہٹا کر ہمیں سوچنا چاہیے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی اس "کثرت" کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اور اسے "ایک" اصول واحد سے حل کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور کیا اس کثرت میں کوئی ربط ہے۔ اگر ربط ہے تو کیا ہے۔ اور ربط نہیں ہے تو فطرت کے قوانین انسانی ذہن کے قوانین سے ہم آہنگ کیوں ہیں۔ وجودیوں کا اگر یہ خیال صحیح ہے کہ کائنات میں کوئی معنی نہیں اور انسان اپنے معنی آپ پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قطعی ایک داخلی عمل ہے اور داخلی عمل حقیقت کی کسوٹی نہیں ہوا کرتا۔ پھر تو سارا تر کی سیاست اور میری شطرنج ایک چیز بن جاتی ہے۔ معنی کی تلاش کو موضوعی نہیں معروضی ہونا چاہیے۔ حقیقت اسے نہیں کہتے کہ میرے لیے کچھ ہو اور تمہارے لیے کچھ۔ حقیقت کو سب کے لیے ایک ہونا چاہیے۔ اس طرح ہم خدا تک تو شاید نہیں پہنچ سکیں گے لیکن کائنات و حیات کا ایک تصور قائم کرنے میں شاید کامیاب ہو جائیں۔

اگر ہو سکے تو جواب جلد دینا

میں نے پچھلے دو ہفتوں میں جوش پر سلسلہ مضامین کے تین مضامین مکمل کیے ہیں۔ (۱) جوش اور جوشن (۲) جوش اور آدمی (۳) جوش اور عشق۔ پہلے دو مضمون نیا دور میں اور آخری مضمون "فنون" میں آئے گا۔

بھابی سے سلام کہو۔ تمہاری بھابی تمہیں اور بھابی کو سلام کہتی ہیں۔ تمہاری بھتیجی تمہیں آداب کہتی ہے۔

تمہارا ــــ سلیم

۱۹ - ۸ - ۶۷

نظیر، بہت دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ کیا بات ہے مصروف ہو؟ خفا ہو؟ خدانخواستہ طبیعت ناساز ہے؟ اب تو انتظار کی کلفت کے ساتھ ساتھ تمہاری طرف سے تشویش بھی ہوگئی ہے۔ خدا کرے بالکل بخیریت ہو۔

نگار میں "بیاض" پر فرمان صاحب کا تبصرہ دیکھا ہوگا۔ کیا خیال ہے؟ تمہارا تبصرہ آنے میں تو ابھی دیر ہے۔ قاسمی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ وہ اس مرتبہ فنون میں بھی تبصرہ کر رہے ہیں خواہ خود لکھیں خواہ کسی سے لکھوائیں۔ دیکھو کیا لکھتے ہیں۔

میرے تمہارے درمیان جو گفتگو چل رہی تھی۔ اس کے بار بار منقطع ہو جانے کا افسوس ہے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ تم لاادریت کے مسلک کے قائل ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو انکار کا مجاز بھی سمجھتے ہو۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لاادریت جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ایک ایسا مسلک ہے جو انکار اور اقرار دونوں سے گریزاں ہے۔

دوسری بات جس کا جواب تم نے نہیں دیا یہ ہے کہ اخلاقیات کی بنیاد کائنات کے ایک تصور پر ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا ہے کہ کوئی چیز کیوں اچھی ہے اور کیوں بری ہے؟ تم اس کی اساس انسانی تجربہ پر رکھنا چاہتے ہو مگر انسانی تجربہ میں اچھائی برائی کی حیثیت بالکل اضافی ہے تو کیا تم اضافی اخلاق کے قائل ہو؟ آلڈس ہکسلے نے اخلاقیات اور مابعدالطبیعیات کے بارے میں ایک خیال آفریں بحث کی ہے اس کا ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں

Men live in accordance with their philosophy of life, their conception of the world. This is true even of the most thoughtless. It is impossible to live without a metaphysics. The choice that is given us is not between some kind of metaphysics and no metaphysics; it is always between a good metaphysics and a bad metaphysics.

تمہارا ان خیالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟

بھابی کو سلام کہو!

تمہارا سلیم

۱۸-۹-۶۷

(۱۹)

۱۸/اپریل ۸۶ء

نظیر، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو۔ میں نے تمہیں دو خط لکھے تم نے ان کی رسید بھی نہیں دی۔ ایک خط میں ایک غزل بھیجی اس کا جواب بھی نہیں آیا مانا کہ تم بہت مصروف ہو لیکن اتنی مصروفیت کہ دو سطریں بھی نہ لکھ سکو سمجھ میں نہیں آتی۔

یا پھر کوئی اور بات ہے۔ بگڑ گیا؟

مظفر علی سید سے تمہاری خیریت معلوم ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ تو اطمینان رہا کہ خط نہ آنے کا سبب خدانخواستہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اب تو غصہ آ رہا ہے اور خاصا شدید قسم کا۔ ارے بھئی اس پاکستان میں میری خط و کتابت ہی کس سے ہے۔ صرف ایک تم سے اور تم نے اتنے نخرے دکھانے شروع کیے ہیں کہ خدا کی پناہ!

پچھلے دنوں میں نے ۴،۵ سال کے بعد چند غزلیں کہیں ہیں۔ ازادہ تھا کہ ابتدائی "تاثرات" کے لیے تمہارے پاس بھیجوں گا مگر تم اس کا موقع ہی نہیں دے رہے ہو۔ میری شاعری پر تمہارا مضمون "سیپ" میں شائع ہو گیا ہے اور اب میں نے دوبارہ پڑھا تو محسوس ہوا کہ خاصا سخت ہے۔ "ہماری زبان" میں ایک مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا بھی شائع ہوا تھا۔ شاید تمہاری نظر سے گزرا ہو۔ انہوں نے مضمون میں تمہارا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس کے علاوہ فرمان فتحپوری صاحب نے نگار میں ایک تبصرہ لکھا تھا اور اب کی مرتبہ بیاض کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ فرمان صاحب نے خاصا ہمدردی آمیز تبصرہ لکھا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کسی رسالہ میں تمہاری کتاب "میرے خیال میں" کا اشتہار پڑھا تھا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ یہ کتاب مارچ میں منظر عام پہ آ رہی ہے لیکن اب اپریل بھی نصف ہو گیا اور تم نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ باقی تمہارا جواب آنے پر۔ بھابی کو سلام کہو۔

تمہارا ——— سلیم احمد

(۱۷)

پیارے نظیر!

تمہارا اور بھابی کا عید کارڈ ملا۔ بھئی بہت بہت شکریہ۔ خدا تم دونوں کو بھی عید مبارک کرے۔ تم نے یہ عید کارڈ کے ساتھ خط بہت اچھا بھیجا ہے۔ مجھے آج تک کسی نے ایسا خط نہیں لکھا۔ اس میں تو میں اپنی پسند اور دلچسپی کی ہر وہ عبارت پڑھ سکتا ہوں جو میرے دل میں ہے۔ اسے میں نے احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا ہے کہ جب جی چاہے گا ایک نئی تحریر پڑھتا رہوں گا۔

پیارے شرمندہ ہوں، تمہارے دو خطوں کا جواب نہ دے سکا (ویسے عزیز سے تمہاری خیریت معلوم ہو گئی تھی) جواب نہ دینے کی جتنی وجوہات کہو میں بیان کر دوں۔ مصروف بھی تھا اور ذہنی طور پر بہت تھکا ہوا بھی۔ لیکن اصل وجہ تو بس اتنی ہی تھی کہ خط لکھنے کو دل نہیں چاہا۔ معلوم نہیں کیوں طبیعت یوں ہی بیٹھے بیٹھے ہر کام، ہر بات سے اچاٹ ہو جاتی ہے۔ میری دنیا میں خط و کتابت ہی کس سے ہے ایک آدھ کاروباری یا رسمی خط کے سوا میں برسوں کسی کو خط نہیں لکھتا سوائے تمہارے۔ پھر تم سے بھی یہ ربط ٹوٹ جائے تو بالکل ہی بے تعلق ہو جاتا ہوں۔ بقول شخصے نے غم دزد نے غم کالا

آج کل یہاں مجنوں صاحب آئے ہوئے ہیں، شہر میں بڑی دھوم دھام ہے۔ ان سے ملاقات کے لیے کئی بڑے اجتماعات ہو چکے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے تو شاید بہت ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ پورا شہر انہیں باولا بنائے ہوئے ہے۔ شاعروں کے گروہ۔ نقادوں کے گروہ۔ افسانہ نگاروں کے گروہ۔ صبح سے شام تک ان کے پاس پہنچتے رہتے ہیں۔ ان سے ایک غزل سنی جاتی ہے تو چھ غزلیں نئی کہی انہیں سنائی جاتی ہیں۔ اب تک ڈیڑھ سو کتابیں انہیں خصوصی مطالعے کے لیے پیش کی جا چکی ہیں۔ افسوس کہ میں ابھی تک شرف ملاقات نہ حاصل کر سکا۔ ایک آدھ جگہ مدعو بھی تھا مگر کسی وجہ سے جانا نہیں ہو سکا۔ دیکھو ممکن ہے کہ ایک آدھ دن میں کہیں ملاقات ہو جائے۔

بھئی میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی اس کا تقریب ملاقات کے سوا تو کوئی مطلب نہیں تھا۔ لیکن یہ شاید زیادہ نتیجہ خیز ہو جاتی اگر اس کا تعلق خدا سے نہ ہوتا۔ خدا کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جسے رد نہ کیا جا چکا ہو۔ اس لیے میں نے تمہیں لکھا تھا کہ میں اپنا عقیدہ تو تمہیں بتا سکتا ہوں لیکن اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ میں خود کو مانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ رویہ غیر عقلی ہو۔ مگر غیر عقلی بات تو یہ بھی ہے کہ میں اپنی بچی سے محبت کرتا

ہوں۔ غیر عقلی باتوں سے میں ڈرتا نہیں۔

اور کہو، تم نے ان دنوں کیا لکھا ہے؟ کسی صاحب نے بتایا کہ نقوش میں تم نے ضیا جالندھری کی کتاب پر تبصرہ کیا ہے اور ان کا مقابلہ جوش سے کیا ہے۔ نقوش میرے پاس نہیں آتا۔ اس لیے میں تبصرہ پڑھ نہیں سکا۔ کہیں مل گیا تو پڑھوں گا۔

جوش پر نیا دور میں میرے مضمون تم نے دیکھے ہوں گے۔ اس سلسلے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا تم جوش کے سلسلہ میں کوئی اور عنوان میرے لیے تجویز کرتے ہو؟ "جوش اور عشق" میں تمہیں اختلاف کی کوئی بات نہیں ملی؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اختلاف کے قابل نہیں؟

بھابی سے بہت بہت سلام کہو۔ تمہاری بھابی تم دونوں کو سلام لکھواتی ہیں۔ جواب جلدی دینا۔

تمہارا ــــ سلیم

۶۸ - ۴ - ۲۰

(۱۸)

پیارے نظیر! کوئی ساڑھے تین بجے دفتر سے آیا تو یہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی کہ میز پر تمہارا لفافہ رکھا ہوا ہے۔ ارادہ تو اسی وقت جواب لکھنے کا تھا مگر گرمی بہت سخت ہو رہی تھی اس لیے ہمت نہیں پڑی۔ اب رات کو گرمی سے ذرا امن ہوا ہے تو تمہارا خط دوبارہ پڑھ کر جواب لکھنے بیٹھا ہوں۔

خوشی ہوئی کہ میری غزل تمہیں پسند آئی۔ تمہارا یہ خیال درست ہے کہ غزل کسی نئے رنگ میں نہیں ہے اور اس رنگ کی غزلیں بیاض میں موجود ہیں لیکن اپنے بکھرتے ہوئے تجربات کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری نئی غزلوں میں شدت اور ارتکاز کے سبب ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو بیاض کی غزلوں کے منفرد اشعار میں تو ہے لیکن پوری غزلوں میں نہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ غزلیں نقل کر کے تمہیں بھیج دوں لیکن وہ سب نیا دور میں آ رہی ہیں اور نیا دور بالکل تیار ہے چند دن میں تمہیں پہنچ جائے گا اس کے بعد تمہاری جو رائے ہو تفصیلاً لکھنا۔ تم نے لکھا ہے کہ میں بیاض پر تمہارے مضمون سے اپنے اختلافات تمہیں لکھوں۔ لیکن مجھے تم سے غزل پر کوئی گفتگو کرنی ہو گی تو وہ اپنی غزل کے حوالے سے نہیں کروں گا۔ یہ شعر کہنا اور پھر اس کے بچے کر کے دکھانا مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ویسے مجھ سے تو بیاض کا پیش لفظ بھی نہیں لکھا جا سکا۔

قاسمی صاحب کا خط اطہر نفیس کے پاس آیا تھا جس میں انہوں نے مجھ سے "جدید غزل نمبر" کے لیے مضمون طلب کیا ہے۔ میرا ارادہ ویسے بھی لکھنے کا تھا اب یہ معلوم کرکے کہ تم اور رسید بھی لکھ رہے ہو ارادہ کو اور مہمیز ملی۔ انشاءاللہ ضرور کچھ لکھوں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے جدید غزل کے نمائندوں کی ایک فہرست بنا کر بھیج دو کیونکہ مجھے ان حضرات کو پڑھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ تم جو نام لکھو گے انہیں توجہ سے دیکھ لوں گا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا مضمون بہت تلاش کیا مگر نہیں ملا۔ میں اطہر نفیس سے کہہ رہا ہوں وہ شہریار صاحب کو لکھ کر مضمون کا تراشہ منگوالیں گے۔

سکھر کے یوم اقبال میں میں نے ایک ہنگامی موضوع پر مختصر سا مضمون پڑھا تھا۔ یعنی فیض صاحب کی اقبال والی نظم پر۔ مضمون وہاں کافی پسند کیا گیا۔ گو بعض حلقے بہت ناراض بھی ہوئے پھر یہی مضمون یہاں کراچی میں بھی ایک جگہ پڑھا اور خاصا ہنگامہ رہا۔ ممتاز احمد صاحب میرے مخلص اور کرم فرما ہیں ان کے تقاضے پر "چراغ راہ" میں دے دیا ہے۔ اگر تمہارے پاس آتا ہو تو ایک نظر ویسے ہی دیکھ لینا۔

ہاں بھئی تمہیں ایک اور بھتیجی مبارک ہو۔ قرۃ العین کے بہن ہوئی ہے۔ تمہاری بھابی تمہیں اور بھابی صاحبہ کو سلام کہتی ہیں۔ بھابی سے میرا بھی سلام کہو۔ بیار بھابی کے لیے اب تصویریں کھنچوانی ہی پڑیں گی۔

تم آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟

تمہارا ــــ سلیم احمد

۶۸-۵-۲۰

⑲

نظیر! ابھی ابھی تمہارا لفافہ ملا۔ میں تقریباً ایک ہفتہ سے بیمار تھا۔ بخار میں مبتلا تھا۔ اب بخار تو اتر گیا ہے، مگر کمزوری ابھی باقی ہے۔ آج بھی دفتر نہیں گیا اور نہ جانے کیوں تمہارے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ خوشی ہوئی کہ تم نے بہت دنوں کے بعد ایک اچھا سا خط لکھا۔ میرا مضمون تمہیں اور تمہارے دوستوں کو پسند آیا تو یوں سمجھو کہ بات بن گئی۔ یہاں تو لوگ اس مضمون سے خوش نہیں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بربنائے تعلقات مداحی کی گئی ہے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ چونکہ نظیر صدیقی نے سلیم احمد پر دو مضامین لکھے ہیں۔ اس لیے سلیم نے بھی ان پر مضمون کھینچ مارا ہے۔

کالم کے بارے میں بھی یہ کہا جارہا ہے کہ نظیر کا تذکرہ خواہ مخواہ کیا گیا ہے۔ البتہ ہم سب کو نفس کے شرور سے محفوظ رکھے۔ یہ سب لوگ "اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا" کے مصداق ہیں اور ہر معاملہ کو اپنی ذلیل نفسی کیفیات کے مطابق دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات بیزاری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ نہایت تشدد کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خدا کی قسم یہ بدترین حیوان ہیں۔ ویسے سارے شہر میں اس کالم کا بڑا ہنگامہ ہے۔ کئی وفد حریت کے ایڈیٹر سے مل چکے ہیں۔ اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک احتجاجی میٹنگ ہو چکی ہے اور جواب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مکرمی ممتاز حسین صاحب کالم بند کروا دینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ مضمون کے اختلافی حصے سے تمہارا اختلاف فطری ہے۔ لیکن اس پر میرے اور تمہارے درمیان گفتگو کے ہزاروں موقع آئیں گے۔ اقبال کے بارے میں تمہارا یہ کہنا صحیح ہے کہ "ان کے نزدیک بہترین ضابطۂ حیات اسلام ہی ہے" لیکن مجھے خودی کی تربیت کے لیے اسلام کی شرط سے اب بھی اتفاق نہیں ہے۔ اقبال نے "اہلِ گرفتہ چینی" کی خودی کے بلند ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اس کا اسلام سے کیا تعلق ہے۔ اقبال نے موسیلینی کی خودی کو سراہا ہے۔ اس کی تربیت کا اسلامی ضابطوں سے کیا تعلق ہے؟ خیر بہرحال اتنا تو طے ہے کہ اسلام کے پیغام کا تعلق مسلمانوں سے ہے اور مسلمانوں کے لیے تکمیل خودی کا انحصار اسلام ہی کے اصولوں اور ضابطوں پر ہے۔ یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

ابہام کے بارے میں میرا سوال وہی ہے جو تم نے دہرایا ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن میرا اعتراض یہ تھا کہ مضمون میں اس پہ غور نہیں کیا گیا۔ ویسے ابہام ایک ادبی طریقۂ کار بھی ہے اور غالباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا ادب۔ گوئٹے نے لکھا ہے کہ دنیا کے بہترین فن پارے وہی ہیں جن کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ذہن انسانی الخ۔ کے ابہام کے باعث بار بار ان سے ٹکراتا ہے۔ مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ابہام اور اہمال کے درمیان فرق کیسے کیا جائے۔ ناسخ کی مثال مناسب نہیں ہے۔ غالباً بیدل کی مثال درست ہوتی جس نے یہاں تک لکھا ہے کہ "شعر خوب معنی ندارد"۔ ویسے ناسخ پر تمہارا مضمون میں دیکھ چکا ہوں۔ کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ ناسخ کو ایک زمانے میں اتنے زوردں کا شاعر کیوں سمجھا گیا۔ اور غالب اور مومن تک اس سے کیوں متاثر ہوئے؟ اور پھر ایسا کیوں ہے کہ اسی ناسخ کو آج "غیر شاعر" سمجھا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ناسخ ہماری ادبی تاریخ کا ایک معمہ ہے جس کے بارے میں مکتبی آراء سے متاثر ہونے کے بجائے تم جیسے صاحب نظر نقادوں کو اسے حل کرنے کی کوشش کرنی

چاہیے۔ خرابیاں، خرابیاں خرابیوں کا جواز نہیں ہیں۔ لیکن خرابیاں صرف خرابیاں نہیں ہوتیں۔ ان کا بہت گہرا تعلق خوبیوں سے بھی ہوتا ہے۔ میر کا "نہایت پست" کلام ان کے "نہایت بلند" کلام سے ایک تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ اس پستی میں نہ اتر سکتے تو اس بلندی تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ اس پر بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے پست ترین تجربات سے کیا سیکھتے ہیں اور پستی کا تجربہ کرنے کے بعد بلندی سے ہمارا کس قسم کا رابطہ قائم ہوتا ہے۔ میرا یہ ایک محکم یقین ہے کہ اردو غزل پچھلے سو پچاس سال سے ایک بہت مضمحل قسم کی شرافت یا "میاں پن" کی شکار رہی ہے۔ اس میں اتنی نسائیت، اتنا پتلاپن اور اتنی ناطاقتی اس سبب سے پیدا ہوئی ہے کہ یہ زندگی کے ہر قسم کے تجربات سے آنکھیں چار کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔ اور ہمارے شریف بزرگوں کی طرح اس کے پاس سفید کالر کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا ہے۔

ممتاز حسین صاحب کے تبصرہ کے بارے میں ہمدانی صاحب سے کئی تقاضے کر چکا ہوں۔ کل اگر دفتر گیا تو مزید تقاضا کر دوں گا۔ ہمدانی صاحب تمہیں خط بھی لکھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ فروغ صاحب تمہارے دوستوں میں ہیں۔ وہ تو مجھے بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوئے اور انہوں نے میرا مطالعہ بہت ہمدردی اور توجہ سے کیا ہے۔ ان کے مضمون کے بارے میں تم اپنی رائے سے مجھے ضرور مطلع کرنا۔ برنی صاحب کے کیا حال ہیں؟ انہوں نے تو وہاں پہنچ کر بھلا ہی دیا۔ تم نے یہ نہیں لکھا کہ ہم سفر کب تک شائع ہو رہا ہے۔

تمہارے دونوں کالم ابھی خط ختم کرنے کے بعد پڑھوں گا۔ اور آئندہ خط میں تمہیں اپنی رائے لکھوں گا۔ جو پتے تم نے دریافت کیے ہیں وہ شمیم سے پوچھ کر لکھوں گا۔ مجھے معلوم نہیں ہیں۔ جواب فوراً دینا۔

تمہارا ——— سلیم

۵-۹-۶۸

(۲۰)

پیارے ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ اس سے پہلے تمہارے خط کا جواب واجب تھا۔ میں پچھلے دنوں خاصی پریشانیوں میں رہا اس لیے تمہیں خط نہ لکھ سکا۔ ان دنوں تمہاری طرف سے بہت تشویش تھی لیکن عذرا ہاشمی سے ایک صاحب نے جو ڈھاکہ سے آئے تھے تمہاری خیریت بتا دی تھی جس کی وجہ سے اطمینان ہو گیا تھا۔ خدا تم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا

اب ادھر آجانا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ تم آجاؤ۔ میری رسائی تو کچھ بھی نہیں ہے اور اس زمانہ میں لوگ اسی کے کام آتے ہیں جو ان کے کام آسکتا ہے۔ لیکن بہر حال جتنی امکانی کوشش ہے وہ کی جائے گی۔ ضیا جالندھری صاحب اکثر تمہارا تذکرہ کرتے رہتے ہیں امید ہے میرے ساتھ وہ بھی کوشاں ہوں گے۔ انشاء اللہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

فنون کا غزل نمبر مجھے مل گیا تھا لیکن میں اپنی مصروفیات میں اسے ابھی تک نہیں دیکھ سکا۔ ایک سرسری سی نظر تمہارے مضمون پر ڈالی تھی۔ ادھر اُدھر سے صفحات پلٹ کر دیکھے۔ پورا پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ دوسروں کو سرسری بھی نہیں دیکھا۔ اب دو ایک دن سے فرصت ملی ہے تو پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ میرا مضمون تمہیں پسند آگیا، چلو محنت وصول ہو گئی۔ خلیل الرحمن اعظمی صاحب اور شہریار نے بھی اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی تعریف کر رہے ہیں لیکن لاہور کے اکثر حضرات مطمئن نہیں ہیں۔ انتظار صاحب کی رائے معلوم ہوئی انہوں نے کہا ہے کہ مضمون جم کر نہیں لکھا۔ خیر پسند ناپسند تو چلتی ہی رہتی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارا کب تک آنے کا ارادہ ہے۔ چلنے سے پہلے مجھے تار دے دینا تاکہ میں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤں۔ بھابی کو آداب کہو جواب فوراً دینا۔

تمہارا ــــ سلیم

۲-۴-۶۹

بنام شمیم احمد

پیارے شمیم۔ ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ تمہارا گلا کیوں خراب ہو رہا ہے۔ غالباً سگریٹ کی زیادتی ہو گی۔ دس پندرہ دن پہلے مجھے بھی گلے سے خون آ گیا تھا۔ سگریٹ پر کچھ کنٹرول ہونا چاہیئے۔ اور ڈاکٹر کو ضرور دکھا لو۔ میں دو تین عرق ملا کر آدھی پیالی ہی پی رہا ہوں۔ حکیم صاحب سے پوچھ کر لکھو کہ یہ دوائیں کب تک پینی ہیں۔

پاکستان کے حالات سے تو میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔ کیا حکومت، کیا ادیب سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ضمیر نام کی چیز نہ ان میں ہے نہ اُن میں۔ سب اپنے اپنے مفادات کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔ ان حالات میں لکھنے پڑھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اب میں اپنا زیادہ وقت شاعری میں صرف کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میری تلخیاں اور مایوسیاں شاید شاعری ہی میں تسکین پا سکتی ہیں۔ نثر سے تو کسی فائدہ کی امید نہیں ہے اور خاص طور پر وہ نثر جو قومی مقاصد کے لیے لکھی جاتی ہے۔

ایک ہفتہ ہوا جب انجم اعظمی ملے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ میں آپ کے خلاف بول رہا ہوں کیونکہ صرف آپ سے اختلاف کر سکتا ہوں۔ اور اختلاف سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ فائدہ ہی پہنچے گا۔ میں نے کہا، بہت بہت شکریہ۔ کاش یہ لوگ اختلاف کرنے کے ساتھ اختلاف برداشت بھی کر سکتے۔

جمال کی طبیعت ہفتہ عشرہ سے خراب ہے۔ میرے پاس بھی نہیں آ رہے ہیں لیکن ٹیلیفون پر روز گفتگو ہو جاتی ہے۔ آج شاید وہ آئیں تو تمہارا پیغام کہہ دوں گا۔ یونس بھائی تو اب تجزیہ پہنچ گئے ہوں گے وہ تمہیں ضرور خط لکھیں گے۔ تنویر کی دعا۔ نعمان، سلمان، نشاط، ارسلان اور ریحان کو پیار۔

تمہارا

بھائی صاحب

پیارے ثمیم۔ ابھی ابھی تمہارا خط ملا میں نے تو جواب سے مایوس ہو کر تمہیں خط لکھنا ہی چھوڑ دیا اور اب انتظار کر رہا تھا کہ تم جب خط لکھو گے تو تمہارا جواب دوں گا۔ ویسے تمہاری خیریت دوسروں کے ذریعے معلوم ہوتی رہی۔ بچوں کو معلوم نہیں تم لوگ کیا کر رہے ہو کہ مسلسل ان کی بیماریوں کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ خدا سب کو صحت دے اور عمر دراز عطا فرمائے۔ ان کی بہت نگہداشت کی ضرورت ہے۔ عزیز ماشاءاللہ بہت افاقہ محسوس کر رہے ہیں اور ہم کو ان کی حالت بہت بہتر نظر آتی ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اپنے حبیب پاک کے طفیل انہیں ساتھ زندگی کے صحت کاملہ عطا فرمائے۔ کالموں کی یہاں بہت تعریف ہو رہی ہے۔ اور مختلف حلقوں سے ردعمل مل رہا ہے پڑھے لکھے لوگ خاص طور پر بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ بات ظاہر ہے کہ مختلف ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں انہی مختصر باتوں کو زیادہ مفصل طور پر لکھا جا سکتا ہے۔ ابھی تو صرف دیکھو کہ ان کالموں کا تجربہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ یعنی پڑھے لکھے لوگوں سے نکل کر عوام تک پہنچتے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح میں نے اپنے ڈراموں کے لیے اپنے سامعین الگ پیدا کیے۔ اسی طرح اپنے کالم کے قارئین بھی الگ پیدا کروں۔ اس سلسلہ میں سب دوستوں سے میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھ سے کھل کر بات کریں اور جن کالموں کا موضوع پسند آئے ان کی نشاندہی کریں۔ اور بتائیں کہ کیا اس پر تفصیل سے کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ تم بھی اس سلسلہ میں اظہار رائے کرتے رہو تو مناسب ہے۔ صورت یہ ہوگی کہ جس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت محسوس ہوگی اسے "جھلکیاں" سے اٹھا کر "گفتگو" میں لے آؤں گا۔ یہ دو کالم اسی غرض سے رکھے گئے ہیں۔ جھلکیاں مختصر اظہار رائے کے لیے اور گفتگو تفصیلی گفتگو کے لیے مجھے کالم لکھتے ہوئے کوئی بار محسوس نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں بیٹھ کر تین چار کالم لکھ دیتا ہوں۔ ابھی تو بہت مزے سے کام چل رہا ہے۔ عزیزہ کو دعا۔ نعمان، سلمان، شائستہ، ارسلان اور ریحان کو پیار۔ جواب جلد دینا۔ تمہارا بھائی صاحب

۳

پیارے ثمیم! آج پورا دن بھاگ دوڑ میں گزر گیا۔ واپس ہوا تو تمہارا خط ملا۔ اسی وقت زاہدہ آ گئی اور رونے لگی۔ میں بھی دس پندرہ روز سے اس کے پاس نہیں گیا تھا مجھے بھی رونا آ گیا۔ عزیز کی طبیعت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ زاہدہ کے ساتھ عزیز کے پاس چلا گیا۔ عزیز بھی رو رہے تھے۔ دل بہت بھاری ہو گیا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ بس دعا ہی کا آسرا ہے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کا سبب یہ تھا کہ آج ممتاز احمد کی طرف سے سیمینار کا دعوت نامہ آ گیا۔ سیمینار ۲۶ مارچ کو ہے۔ دعوت نامہ اتنی تاخیر سے ملا ہے کہ رسمی کارروائی کا مکمل ہونا بہت مشکل ہے۔ بہرحال سارے فارم بھر کر شام کو چھ بجے پی آئی۔ اے سے

اسلام آباد جا رہے ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ دوسری طرف دہلی میں میر پر سیمینار ہو رہا ہے۔ اس کی تاریخ ۲۵ مارچ ہے۔ وہاں سے بھی بلاوا ہے۔ اتفاق سے یہی تاریخیں ابوظہبی کے مشاعرے کی ہیں۔ میرا جی اس صورت حال سے اتنا الجھ گیا ہے کہ آج میں سوچ رہا تھا کہ لات ماروں اور بستر پر لیٹ جاؤں۔ نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا۔ ممنون صاحب کا پتہ میں نے مشفق خواجہ سے منگا لیا تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں شمیم صاحب کو خط لکھ رہا ہوں پتہ بھیج دوں گا۔ مظفر سے دوسری ملاقات نہیں ہوئی۔ خواہش کے باوجود جانا نہیں ہو سکا۔ ایک آدھ دن میں جاؤں گا تو تمہارا سلام کہہ دوں گا۔ اور تمہاری طرف سے مزاج پرسی کروں گا۔ فراق صاحب پر ضرور کچھ لکھو۔ میں نے ان پر دو کالم لکھے تھے۔ شاید تم نے پڑھے ہوں۔ عسکری صاحب کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ ہوا اور بہت بڑا نقصان
پتہ نہیں تم نے بی بی سی کے کس پروگرام کا ذکر کیا ہے۔ میں نے تو نہیں سنا۔ کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ پروگرام میں مجتبیٰ صاحب کا کیا ذکر تھا۔ ذرا تفصیل سے لکھو۔ وارث علوی کی کتابیں نہیں آئیں۔ ان کی ایک کتاب "اے پیارے لوگو" ابھی ابھی مشفق خواجہ صاحب دے کر گئے ہیں۔ اکادمی اگر اپریل کے دوسرے ہفتے تک نہ آئی تو میں نومبر ہی کو لاہور جاؤں گا اور اس کی کتابت لے آؤں گا۔ لیکن امید ہے کہ آ جائے گا باقی اللہ مالک ہے۔
زہرہ صاحب کا پیغام ہمدانی کو پہنچا دوں گا۔ زہرہ صاحب سے میرا سلام کہو اور مزاج پوچھو۔ خدا انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ تنویر کو اب کام نہیں کرنا چاہئے۔ خدا انہیں خیریت کے ساتھ فراغت عطا فرمائے۔ میری دعا کہو۔ نعمان، شائستہ، سلمان، ارسلان اور ریحان کو پیار ہو۔ میں اگر امریکہ جا ہی گیا تو تمہیں مطلع کروں گا۔ عزیز کے لیے دعا کرو۔ پرسوں میں انہیں لے کر ڈاکٹر زیدی کے پاس جاؤں گا۔

تمہارا

بھائی صاحب

۴

پیارے شمیم۔ تم بیکار اتنے پریشان ہوتے ہو۔ میں اور آپا خدا کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہیں۔ میں تمہیں ہر بات کی اطلاع اس لیے دے دیتا ہوں کہ تمہیں کوئی بات کسی اور ذریعے سے معلوم ہوتی ہے تو تم اور پریشان ہو جاتے ہو۔ میں نے چیک اپ کرایا تھا۔ سب بالکل ٹھیک ہے۔ سگریٹ کی زیادتی کی وجہ سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ آپا کمزور ہو گئی ہیں مگر ماشاء اللہ اب اچھی ہو رہی ہیں۔ تم ہر بات پر اتنے فکرمند ہو گئے تو کام کیسے چلے گا۔ میرے بیٹے۔ زندگی جیسی ہوتی ہے بسر کرنی پڑتی ہے۔ اور زندگی میں سینکڑوں باتیں کنٹرول سے باہر ہوتی ہیں۔ تمہارا ہم لوگوں سے اتنی دور ہونا ایک ایسی ہی بات ہے۔ مجبوری نہ ہوتی تو تم ٹرکی کیوں جاتے۔ عالی نے تمہارے لیے کوشش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ جلد از جلد کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ تم کراچی آ جاؤ اور یہاں تمہاری نوکری کا انتظام ہو

جائے ۔۔۔ آپا کوئٹہ آنے کی بے انتہا ضد کر رہی ہیں لیکن میں ان کی مسلسل علالت کی وجہ سے ان کے کوئٹہ جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ وہاں سردی بھی اب بڑھ گئی ہوگی۔ اور چھ سات سو میل کا سفر ہے۔ اس لیے انہیں بھیجتے سے ڈرتا ہوں۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں تو مجبوری ہے۔ تم نے دسمبر میں کراچی آنے کے لیے لکھا ہے۔ ضرور آؤ ۔۔۔ لیکن پریشان ہوکر نہ آؤ۔ یہاں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اطمینان سے جس طرح آنا چاہو آؤ ۔۔۔ یہ بات میں تمہاری تسلی کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ حقیقتاً یہی بات ہے کہ ہم لوگ اللہ کی مہربانی سے بالکل ٹھیک ہیں۔ میرے یہ لکھنے کے بعد تمہارا اطمینان ہوجانا چاہئے۔ تمہارے مرسید والے مضمون پر لاہور میں جو ردعمل ہوا وہ سراج منیر سے معلوم ہوا تھا۔ اور انہوں نے بتایا تھا کہ دوسری قسط چھپنی مشکل ہے۔ ایک اچھی کوئی سچی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ منافقت اور جھوٹ نے ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ میرے اقبال والے مضمون کے بارے میں ملا جلا ردعمل ظاہر ہوا ہے تم دیکھو لوگ کس طرح کا جھوٹ کتنی آسانی سے بول رہے ہیں اور انہیں صداقت کو دکھانے کی کوشش کی جائے تو لعن طعن کرنے لگتے ہیں۔ تمہاری کتاب کب تک آرہی ہے؟ میں بے چینی سے منتظر ہوں۔ میری کتاب نومبر کے آخر تک شاید چھپ جائے گی۔ ٹیلیفون پر ضیا جالندھری صاحب سے بات ہوئی تھی۔ تمہارے مضمون اور ملاقاتوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ شمیم نے اتنی مخالفت نہیں کی جتنی متوقع تھی۔ سجاد میر ابھی لاہور سے واپس نہیں آئے۔ جمال کو ٹیلیفون پر پیغام دیا تھا کہ آٹھ دس روز میں آجاؤں گا۔ مگر یہ مدت بھی گزر گئی۔ ان کی رپورٹ بھی یہی ہے کہ تمہارے مرسید والے مضمون پر بڑا جھگڑا ہوا ہے۔ وہ مضمون میں نے ابھی نہیں دیکھا تم آؤ تو پورا مضمون اپنے ساتھ لے کر آؤ ۔۔۔ میری غزلوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ۔۔۔ عزیزہ کو دعا کہو۔ نعمان، سلمان اور شائستہ کو بہت سے پیار۔ مجتبیٰ صاحب کا کیا حال ہے؟ میرا سلام کہہ دینا۔

تمہارا

بھائی صاحب

(۵)

پیارے شمیم، آج تمہارے دو خط ایک ساتھ ملے۔ اس سے پہلے میں اقبال کے سلسلہ میں تمہیں دو خط لکھ چکا ہوں۔ پہلے خط میں میں نے غالباً تمہیں یہ بتایا تھا کہ مجھے اقبال کی اسلام دوستی میں کوئی شبہ نہیں۔ اور ان پر اعتراضات کے باوجود میں انہیں اسلام کی ایک قوت اور ایک دردمند آواز سمجھتا ہوں جس کی بنا پر مجھے ان کی شخصیت سے محبت بھی ہے اور عقیدت بھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تمہیں یہ بھی لکھا تھا کہ اچھی شاعری اور بُری شاعری کے مسائل کو اقبال کے "خیالات" سے مت الجھاؤ۔ اقبال کی شاعرانہ حیثیت

کچھ اور ہے۔ میں اس پر گفتگو نہیں کر رہا۔ گفتگو اس مواد پر ہے جس سے اقبال نے شاعری بنائی ہے۔ پتہ نہیں میرے ان جوابات سے تم مطمئن ہوئے یا نہیں۔ بہر حال اس خط میں تم نے میرے پہلے جواب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ دوسرے خط میں میں نے اپنے نقطۂ نظر سے تمہارے زیادہ اہم سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی تھی لیکن تمہارے تازہ خط سے اندازہ ہوا کہ تمہاری تشفی نہیں ہوئی۔ اب تم نے بات پھر "زمانے" کی کی ہے۔ تمہارے سوال کا اہم ترین حصہ یہ ہے "مذہب اور دین کی گرفت دن بدن ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے یا اس کی معنویت کا شعور کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا ہم اس کی روشنی میں اپنے ادعائے ایمان کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اگر رکھ سکتے ہیں تو اس کے خطوط کیا ہوں گے؟" ظاہر ہے کہ مذہب اور دین کی گرفت اس وجہ سے ڈھیلی پڑ رہی ہے کہ کافرانہ خیالات عام ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی بدترین دنیا پرستی اور نفس پرستی رونما ہو رہی ہے۔ اس سے مقابلہ کرنے کی یہ صورت تو نہیں ہو سکتی کہ اسلام اور کفر کی تفریق مٹا دی جائے یا کافرانہ خیالات کو قبول کر کے اسلام میں ان کے لیے جگہ نکالی جائے یا کم از کم جزوی طور پر اسلام اور کفر میں صلح کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسلام کے ذریعے دنیا پرستی اور نفس پرستی کا جواز پیش کیا جائے۔ یہ طریقہ کار تدریجی طور پر باطل ہوگا۔ اگر تم اس خیال سے متفق ہو تو خود فیصلہ کر دو کہ سر سید سے لے کر اقبال تک جن بزرگوں نے زمانے کے نام پر اسلام کی تعبیر جدید کی ہے وہ کس بات کی کوشش کر رہے ہیں اور اسلام کو زمانے سے ہم آہنگ بنانے میں ان کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جو علمائے دیوبند اور علمائے بریلی (خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے) نے اختیار کی۔ یعنی اصول میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جائے گا اور اصل دین سے سر مو انحراف بھی گوارا نہیں ہوگا۔ اسلام ویسا ہی پیش کیا جائے گا جیسا کہ وہ ہے خواہ کوئی اسے قبول کرے یا نہ کرے کیونکہ اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے۔ رسول کا کام بھی صرف پہنچا دینا ہے دنیا بھر کو مسلمان بنانا فرائض نبوت میں شامل نہیں ہے میں اسی نقطہ نظر کا قائل ہوں۔ البتہ اس میں ایک اضافہ کا خواہشمند ہوں وہ یہ کہ ہمیں اسلام کو پیش کرنے کے ساتھ کافرانہ خیالات اور رجحانات کی تنقید شدت سے کرنی چاہیے۔ یہ تنقید اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہم "جدید کفر" کی حقیقت کو نہ سمجھیں۔ چنانچہ میرا مسلک یہ ہے کہ (۱) کافرانہ فکر کی اساس پر حملہ کیا جائے۔ اس کے تضاد کو واضح کیا جائے۔ اس کے نتائج پر روشنی ڈالی جائے (۲) دنیا پرستی اور نفس پرستی کی ساری نئی شکلوں کو کھول کر دکھایا جائے کہ ان کی بنا پر انسانیت کس بحران کا شکار ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں میں یہ ثابت کرنے کے بجائے کہ اسلام جدید رجحانات کے مطابق ہے، یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جدید رجحانات ساری دنیا کو جہنم بنا رہے ہیں اور اس کا

حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ اقبال اس کام میں جہاں تک ہمارے ساتھ ہیں ہم ان کو قبول کرتے ہیں، جہاں ان کا رخ دوسری طرف ہے ہم ان کو رد کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگوں کا مسلک اسلام کو زمانے سے "ہم آہنگ" کرنا نہیں ہے بلکہ زمانے کی ضرورت کے مطابق اسلام کو پورا کا پورا پیش کرنا ضروری ہے کیا مراد ہے یہ میں نے ابھی ایک تحریر میں واضح کیا ہے وہ تمہیں روانہ کر رہا ہوں۔ مختصراً اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام کو نئی نفسیاتی اور ذہنی ضرورت کے مطابق اس طرح پیش کیا جائے کہ اصول میں کسی تبدیلی کے بغیر "نیا ذہن" اسے قبول کر سکے۔

اب تم یہ سوال کر سکتے ہو کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔ میرا جواب اثبات میں ہے اور بالفرض ایسا نہ ہو سکے تو بھی کوئی نقصان نہیں۔ میری کوشش کا اجر اللہ کے پاس ہے۔

اقبال والے مضمون کی اشاعت پر مجھے سوچنے کی ضرورت صرف اس لیے محسوس ہو رہی ہے کہ یہ "حکمتِ عملی" کا سوال ہے ورنہ اقبال کی میں نے جو تنقید کی ہے اس کے بارے میں میرے اپنے دل میں کوئی شبہ یا اضطراب نہیں ہے۔ میں انہیں سرسید کے کام کی ایک توسیع سمجھتا ہوں اور ہرگز یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اخلاص کے اعتبار سے سرسید اور اقبال میں کوئی ایسا فرق ہے کہ سرسید تو گردن زدنی ٹھہریں اور اقبال کلیجے سے لپٹائے جائیں۔ بہرحال یہ ایک ضمنی بحث ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ اقبال والے مضمون کو سرسید والی کتاب میں شائع کیا جائے، اس سے الگ نہیں حالانکہ اس سے پہلے تم لکھ چکے ہو کہ اسے نیا دور یا فنون میں شائع کر دیا جائے۔ کیا تم نے اپنی رائے بدل لی ہے؟

رضی فاروقی صاحب کا مضمون میں نے پڑھ لیا۔ اسے دو ایک روز میں جمیل کو پہنچا دوں گا۔ کرار صاحب کی رائے معلوم کر کے خوشی ہوئی۔ ان سے میرا آداب کہہ دینا۔ قیام اب ٹھیک ہیں۔ باقی سب لوگ بھی خیریت سے ہیں۔ نعمان پیارے اور سلمان کو بہت بہت پیار۔ تنویر کو دعا۔ مجتبیٰ صاحب کا چیک اگر تیار ہو گیا ہوا تو بھجوا دوں گا لیکن ضمیر علی صاحب آج کل چھٹی پر ہیں۔ آپا صاحبہ پرسوں زاہدہ کے یہاں گئی ہیں۔

تمہارا

بھائی صاحب

(۶)

پیارے شمیم۔ تمہارا خط میں نے بہت غور سے پڑھا اور کئی مرتبہ پڑھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم کتنے بڑے اضطراب میں مبتلا ہو۔ اضطراب مجھے بھی ہے مگر اس کی نوعیت مختلف ہے۔ میرا اضطراب صرف اتنا ہے

کہ دینی مصلحت اس وقت اقبال کی تنقید کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اقبال کی تنقید سے اسلام دشمن قوتیں فائدہ اٹھائیں۔ غلط یا صحیح یہ حقیقت ہے کہ اقبال کو اسلام کی ایک بہت بڑی قوت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اقبال اسلام کے ایک مخلص سپاہی ہیں اور ان کا رعب و دبدبہ اتنا بڑا ہے کہ اسلام دشمن قوتیں ان سے سہمی ہوئی ہیں اور مسلمانوں کے دلوں کو ان سے بہت بڑی تقویت ہے۔ ایسی حالت میں اقبال کا امیج گرانے سے مخالفوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن دوسری طرف ایک اور اہم سوال ہے وہ یہ کہ اقبال پر بات کی جائے یا نہ کی جائے؟ میری مشکل یہ ہے کہ اقبال پر بات کروں تو میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ باتیں کہوں جنہیں میں غلط سمجھتا ہوں۔ اور بات نہ کروں تو لوگ کہتے ہیں کہ سلیم احمد اپنے ہر ادبی جائزہ میں اقبال کو چھوڑ کر نکل جاتے ہیں بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ سلیم احمد سب سے زیادہ اہم شخصیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میرا سوال تم سے یہ تھا کہ حکمت عملی کے طور پر کیا پھر اس مضمون کا شائع ہونا مناسب ہوگا؟ تم نے جواب دیا کہ اس کی اشاعت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جمیل جالبی مضمون لے گئے ہیں۔ اب دوبارہ غور کرو کہ آیا اس کا شائع ہونا مناسب ہے یا نہیں اور فوراً جواب دو۔ جمیل کا کہنا ہے کہ مضمون نہایت اہم، غور طلب اور فکر انگیز ہے اور اقبال پر نہیں ہے بلکہ ہند اسلامی تہذیب پر ہے اور غالب، سرسید، اکبر اور حالی سے لے کر اقبال تک ایک مخصوص تہذیبی صورتحال کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کا چھپنا ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ بہرحال مختلف رائیں ہیں اور ان پر بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔

اب رہ گئے وہ سوالات جو میرے مضمون سے تمہارے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان سوالات کو غور سے دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ چند بنیادی مسائل کی توضیح کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں کبھی زبانی سمجھاؤں گا۔ اس وقت مختصراً صرف اتنا کہوں گا کہ میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا ہوں جس کے بارے میں تیرا دعویٰ ہو کہ "اصل بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں"۔ میرے عقائد میرے اپنے نہیں ہیں بلکہ حنفیوں کے مسلّمہ عقائد ہیں یہاں "میں" کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز "تقلیدی مذہب" ہے جس پر ساری دنیا کے حنفی متفق ہیں۔ اب یہ بحث کہ روایت اور درایت کیا ہے اور اجتہاد و تقلید کے کیا معنی ہیں، ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ بحثیں "غیر مقلدوں" نے اٹھائی ہیں اور وہ ایک الگ فرقہ ہیں۔ ہم غیر مقلد نہیں ہیں اس لیے اجتہاد و تقلید کی صرف اس تعبیر کو تسلیم کرتے ہیں جسے حنفیوں نے قبول کیا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ تقلید کے بارے میں اپنا ذہن صاف کر لو۔

۲۔ دین کی بہت سی تعبیریں کی گئی ہیں انہیں تعبیروں کے اختلاف سے مختلف فرقے پیدا ہوئے ہیں۔

شیعہ، سنی، قادیانی سب اصل اصول پر متفق ہیں۔ وہ ہے کلمہ طیبہ۔ لیکن ہمارا اعتقاد ہے کہ سب فرقوں میں اہل سنت والجماعت کا مسلک درست ہے۔ ان کے چار فرقے ہیں۔ مالکی، حنبلی، شافعی، اور حنفی اور یہ سب تقلید پر متفق ہیں۔ یہ چار فرقے حق ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مگر جس کو اختیار کیا جائے اس کی مکمل پیروی کی جائے۔ ان فرقوں میں ہمارا تعلق حنفیہ سے ہے اور حنفیہ کے عقائد، شریعت اور فقہ ہماری اجتماعیت کی بنیاد ہے۔ اور مسلمانوں کا سواد اعظم یہی ہے۔ چنانچہ بحث یہ نہیں ہے کہ دین کا کون مدعی کون سے حقائق پیش کرتا ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم کس مدعی کی تعبیر حق کو انفرادی اور اجتماعی طور پر درست سمجھتے ہیں۔

۳۔ زمانہ کی ضروریات جو زمانے کی تبدیلیوں سے پیدا ہوتی ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید سے اقبال تک سب کا مسلک یہ ہے کہ اسلام کو جدید زمانے کی ضروریات کے مطابق بنا کر پیش کیا جائے۔ اس میں سرسید اور اقبال میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سرسید نے اپنے زمانے کے اعتبار سے کام کیا اقبال نے اپنے زمانے کے اعتبار سے۔ مجھے تو اب سرسید کے خلوص پر بھی شبہ نہیں ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ زمانے کی ضروریات کا مطلب کیا یہ ہوگا کہ دین کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔ اس صورت میں تو نتیجہ وہی نکلے گا جو مسیحیت میں نکلا یعنی انجام کار دین ختم ہو جائے گا۔ میرے نزدیک زمانے کی ضروریات کو تسلیم کرنے کا صرف اتنا مطلب ہے کہ حقائق کو نئی زبان میں اس طرح پیش کیا جائے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔

تم سرسید سے پرویز تک سب کی تنقید کو جائز سمجھتے ہو سوائے اقبال کے لیکن اقبال کو تنقید سے بچانا ہے تو پھر سرسید سے پرویز تک سب کے ساتھ رویہ تبدیل کرنا پڑے گا اور ان کے "کیس" کو اسی ہمدردی کے ساتھ دیکھنا پڑے گا جس ہمدردی سے اقبال کو دیکھا جا رہا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ ان لوگوں کے یہاں اسلام "ثانوی" بن جاتا ہے اور اقبال کے یہاں نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پورے مسئلہ کو پوری توجہ سے بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ ایک بات اور ہے —— دین سے پیوستہ رہنے کے کیا معنی ہیں اگر وہ دین "اصل دین" نہیں ہے۔ ایسا دین جو اصلی دین نہ ہو، اس سے پیوستہ رہنا جھوٹے مذہب کی پرستش کرنا ہے اور جھوٹے مذہب سے تو کفر اچھا ہے کیونکہ اس سے کم از کم دنیا تو بن جاتی ہے جھوٹا مذہب تو دنیا بھی نہ بننے دے گا اور آخرت میں بھی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

۵۔ اقبال کے اخلاص میں شبہ نہیں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جب دین کو مسخ کرنے کی ہزاروں کوششیں ہو رہی ہیں اور کافرانہ نظریات ذہنوں پر محیط ہیں اور چولا بدل بدل کر دین

پر حملہ آور ہو رہے ہیں وہ اس وقت صرف "اخلاص" سے کام نہیں چلے گا بلکہ "اصل دین" کو جاننا اور اس کی پوری آگہی حاصل کرنا ہوگا۔ ہمیں مخلص مسلمان ضرور چاہییں مگر وہ لوگ زیادہ ضروری ہیں جو اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہیں۔

یہ تمہاری باتوں کے مختصر جوابات ہیں۔ تفصیل زبانی گفتگو میں بتاؤں گا۔ تنویر کا خط مل گیا۔ دعا گو۔ انشاء اللہ انہیں جلد جواب دوں گا۔

تمہارا

بھائی صاحب

بنام ساقی فاروقی

پیارے ساقی۔ تمہارے خط کے جواب میں ایک مفصل خط تمہیں لکھ چکا ہوں۔ اس خط سے تمہیں اندازہ ہوا ہوگا کہ میں کلاسیکیت یا روایت کے بارے میں کیا موقف رکھتا ہوں اور کس طرح غزلوں کی شاعری میں میرا "شعوری مقصد" ماضی کے اسالیب اور ان کے ذریعہ ماضی کے تجربہ کو جذب کرنا تھا یعنی نئے سے پرانا بننا۔ اس جملہ میں "شعوری مقصد" کے الفاظ اہم ہیں اور تھوڑی سی وضاحت چاہتے ہیں۔ اس وضاحت کے ذریعے میں شاید اپنے بارے میں وہ بات کہہ سکوں گا جو کلاسیکیت میں میری کامیابی اور ناکامی دونوں کو ظاہر کرے گی۔ آؤ پہلے یہ دیکھو کہ ایک کلاسیکی یا روایتی تہذیب میں نئے اور پرانے کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایک لمحۂ موجود میں ایک نومولود بچے سے زیادہ "نیا" اور کوئی نہیں ہوتا۔ بچہ اپنے جوہر کے ساتھ ایک کھلا ہوا امکان ہوتا ہے جس میں اپنے جوہر کے مطابق ہر قسم کے اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے جوہر میں اتنا نیا اور منفرد ہوتا ہے کہ کسی اور سے اس کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ مستقبل کی طرف ایک نیا اشارہ ہوتا ہے جس کی پُراسرار اکائی تجزیہ سے ماورا ہوتی ہے۔ لیکن پیدا ہوتے ہی ماں باپ اس میں اپنا ماضی، اپنی روایت داخل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ان کی زبان سیکھتا ہے۔ ان کے طرزِ خیال، طرزِ احساس اور طرزِ عمل سے اثر لیتا ہے۔ مذہب، اخلاق اور معاشرتی آداب میں ان کی پیروی کرتا ہے اور اس طرح کسی ایک خاندان، ایک معاشرہ، ایک روایت کا فرد بنتا ہے۔ اس عمل کے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک بچہ کی شخصیت کے اندر اور دوسرا اس کے باہر۔ وہ اپنے معاشرہ کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی

اور تہذیبی روایوں کو اپنے اندر جذب کر کے ایک طرف اپنے اندر منظم اور مربوط ہوتا ہے دوسری طرف اپنے معاشرہ سے مثبت تعلق پیدا کرتا ہے۔ کلاسیکیت کے نزدیک فرد کا اپنی ذات میں منظم اور "سالم" ہونا اور پھر مثبت طور پر اپنے معاشرہ سے مربوط ہونا شخصیت کی تعمیر اور تکمیل کی لازمی شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کو پورا کر کے شخصیت وہ پختگی حاصل کرتی ہے جس کے بارے میں شیکسپیئر نے کہا ہے کہ "پختگی ہی سب کچھ ہے"۔ اب یہ شخصیت چونکہ ایک مخصوص "جوہر" کے تحت بنتی ہے اس لیے بیک وقت نئی بھی ہوتی ہے اور پرانی بھی۔ منفرد اور یکتا بھی ہوتی ہے اور ایک "کل" کا حصہ بھی۔ ماضی سے بھی تعلق رکھتی ہے اور مستقبل سے بھی۔ ایک روایتی تہذیب میں شاعری کا زندگی سے یہ تعلق ہوتا ہے کہ وہ ایسی پختہ شخصیت بننے میں مدد دیتی ہے اور اس کا ایک اہم ذریعہ "بنتی ہے۔ شاعر کے لیے بھی اور شاعری کے قاری کے لیے بھی۔ ایک ایسی تہذیب میں جو ظاہری اور باطنی طور پر ایک اکائی ہو بچے کے "شخصیت" اور پھر "پختہ شخصیت" بننے میں بچہ کا شعور اور لاشعور دونوں حصہ لیتے ہیں اور ان میں ایک ایسی ہم آہنگی اور توازن ہوتا ہے کہ بچہ آسانی سے اپنی تکمیل کے مختلف مراحل طے کر لیتا ہے۔ ہماری تہذیب جب تک ایک "اکائی" کی حیثیت سے قائم تھی اس میں یہ عمل اپنے فطری انداز میں جاری تھا۔ لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد اس تہذیب میں ایک اجنبی تہذیب کی مداخلت شروع ہوئی اور ہماری تہذیب اندر اور باہر سے ٹوٹنے لگی۔ سو ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل کئی مختلف مراحل سے گزرا اور جدیدیت کی تاریخ دراصل اسی شکست و ریخت کے مختلف مرحلوں کی تاریخ ہے۔ اس کا پہلا عمل سرسید تحریک میں ظاہر ہوا جو اپنی تہذیب سے ٹوٹنے اور جدید مغربی تہذیب سے جڑنے کا ایک شعوری عمل تھا۔ شعوری عمل میں اسے اس لیے کہتا ہوں کہ سرسید تحریک پرانے لوگوں کی تحریک تھی۔ یہ ان بڈھوں سے شروع ہوئی جو روایتی تہذیب کے پروردہ تھے لیکن جدید مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر "جدید" بننا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی جدیدیت صرف ذہنی اور شعوری ہے وہ اپنے پورے وجود میں "پرانے" تھے۔ لیکن ان کے دماغ میں یہ خواہش موجود تھی کہ وہ جدید بنیں چنانچہ اس دور میں جو شاعری پیدا ہوئی وہ شعور اور لاشعور دونوں کی پیداوار نہیں تھی بلکہ صرف شعور کی۔ اسی وجہ سے اس کی جدیدیت سطحی، ظاہری اور خارجی قسم کی جدیدیت ہے لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر جب زندگی میں جدیدیت کی نئی شکلیں پیدا ہونے لگیں تو وہ نسل پیدا ہوئی جس کے اندر جدیدیت ذہن سے نیچے اترنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ پہلے جذبات میں اتری، پھر محسوسات میں، یہاں تک کہ

شعور اور لاشعور دونوں اس کی زد میں آ گئے اور ایسی نسلیں پیدا ہونے لگیں جو اپنے ماضی اور روایت سے زیادہ سے زیادہ دور اور اس لیے جدیدیت سے زیادہ سے زیادہ قریب تھیں۔ ۱۹۴۷ء تک ادب میں یہ جدیدیت تین تحریکوں میں ظاہر ہوئی۔ حالی اور آزاد کی تحریک، ۱۹۳۰ء کے جمال پرستوں کی تحریک، ۱۹۳۶ء میں نیا ادب یا ترقی پسند تحریک، تقسیم ہند کے بعد جدیدیت کا عمل اور زیادہ تیزی سے گہرا ہونا شروع ہوا اور ایسے افراد پیدا ہونے لگے جو اپنے ماضی اور روایت سے نہ صرف بیگانہ ہیں بلکہ اس کو مکمل طور پر رد کرنا چاہتے ہیں۔ اس نقشہ میں تم اپنے آپ کو بھی کہیں دیکھ لو غور سے دیکھو تو جدیدیت کی اس ترقی میں معاشرہ سے ٹوٹنے اور خود اپنے اندر بکھرنے کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور شاعری میں وہ جدید "حسیت" زیادہ سے زیادہ نمودار ہوتی جا رہی ہے جو پارہ پارہ ہونے کے اس عمل کے کسی نہ کسی ایک پہلو کا اظہار کرتی ہے۔

لیکن صورت حال کی یہ تصویر یک رخی ہے۔ اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وہ دوسرا رخ یہ ہے کہ معاشرہ میں جہاں ایک طرف ماضی اور روایت سے ٹوٹنے کا عمل ہو رہا ہے۔ وہاں دوسری طرف ماضی اور روایت سے جوڑنے کا عمل بھی جاری ہے۔ اقبال، جوش، فراق یہاں تک کہ غزلوں والے فیض تک اس عمل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ "جدید" لوگ ہیں جو جدیدیت کے زیر اثر ہونے کے باوجود اپنے اندر ماضی کو جذب کرنے اور روایت سے ربط پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ حسرت، جگر، فانی اور یگانہ کے یہاں ایک اور عمل ہوا ہے۔ ان کے شعور اور لاشعور پر جدیدیت اور روایت دونوں کے اثرات ہیں۔ اور وہ ان کے ایک ایسے Synthesis کو ظاہر کرتے ہیں جس میں جدیدیت اور روایت کی کشمکش ایک ہم آہنگی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ۱۹۳۶ء کی تحریک کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ توڑنے پر زور دیتا ہے دوسرا حصہ توڑنا چاہتا ہے مگر تسلسل کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے اس کا نعرہ یہ ہے کہ جدیدیت کے ساتھ روایت کو بھی برقرار رکھنا چاہیے۔ مختصر لفظوں میں جوش نے حافظ کبیر اور خیام کا اثر لیا۔ اقبال نے عرفی، نظیری اور مولانا روم کو جذب کیا۔ فیض سودا تک پہنچے لیکن دوسری طرف توڑنے کا عمل میراجی اور راشد سے گزر کر افتخار جالب تک پہونچتا ہے۔ میں یہ بات غالب رجحانات کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں ورنہ توڑنے والوں میں جوڑنے کا عمل بھی موجود ہے اور جوڑنے والوں میں توڑنے کے آثار بھی تھے۔ اب اس ساری بحث میں یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ ہماری تہذیب میں ایک غیر تہذیب کی مداخلت کے بعد جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں توڑنے اور جوڑنے کا عمل مرکزی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور ہمارے شعور اور لاشعور کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ اسکی

وجہ سے ہم ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں جو کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتی۔ عسکری اسی مقام پر ہمارے کام آتے ہیں۔ ہمارے وجود کے اندر جو جنگ جاری ہے اس کا حقیقی شعور ہمیں جتنا عسکری کے ذریعے حاصل ہوتا ہے کسی اور کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا۔ بہر حال اس سارے نقشے میں میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں۔ میں ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا جب جدیدیت معاشرہ میں اپنی جگہ بنا چکی تھی اور میں لاشعوری طور پر اس کے زیر اثر تھا۔ لیکن بچپن میں بعض مخصوص حالات کے تحت جن کی تفصیلات میں پھر کبھی بتاؤں گا میرے اندر یہ "شعور" پیدا ہو گیا کہ مجھے اپنے ماضی اور روایت کی حفاظت کرنی ہے اور پوری قوت سے خود کو ان سے جوڑے رکھنا ہے۔ اس شعور نے مجھے حد درجہ چوکنا اور خود آگاہ بنا دیا اور یوں میرے وجود کے دو حصے ہو گئے ایک شعوری حصہ جو واضح طور پر روایت اور ماضی کے حق میں ہے دوسرا لاشعوری حصہ جس پر جدیدیت کے اتنے ہی اثرات ہیں جتنے کسی اور ایسے فرد پر جو میری تاریخ پیدائش کے لگ بھگ پیدا ہوا ہو۔ میں کبھی شعور کی گرفت میں ہوتا ہوں اور کبھی لاشعور کی۔ ۱۵ سے ۱۹ سال تک کی عمر تک مجھ پر ایک ایسا وقت گزرا جب میں شعور کی گرفت سے نکل کر لاشعوری اثرات سے مغلوب ہوا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے جدید ادب کے وہ اثرات لاشعوری طور پر قبول کیے جن کا اظہار "نئی نظم اور پورا آدمی" میں ہوا ہے۔ عسکری سے ملتے ہی میں پھر چوکنا ہو گیا اور شعور کی دنیا میں لوٹ آیا چنانچہ جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے میں نے اپنا آغاز "توڑنے والوں" کے زیر اثر کیا اور ابتدا میں ایسی ہی شاعری کی جو ۴۰ کی دہائی کے ایک نوجوان کو کرنی چاہیے۔ اس زمانہ میں اقبال کی شاعری کے ذریعہ مجھے شعور اور لاشعور دونوں کی تسکین کا ایک نمونہ نظر آیا اور میں اس کی پیروی کرنے لگا۔ ٹھیک یہی زمانہ تھا جب عسکری سے میری ملاقات ہوئی اور ان کے زیر اثر میں جوڑنے کے زیادہ شعوری عمل میں مبتلا ہوا اور ماضی کو جذب کرنے کے عمل میں فراق، اقبال، حسرت، یگانہ اور حالی سے ہوتا ہوا اردو کے بدنام زمانہ لکھنوی شعرا تک پہنچ گیا اور مصحفی، آتش، انشا یہاں تک کہ رند، صبا، اسیر اور ناسخ تک کے رویوں اور اسالیب اپنے شعور میں سمونے لگا۔ ۵۷ تک میری یہی کیفیت تھی، ۵۸ء سے ۶۱ء تک مجھ پر لاشعوری اثرات غالب آ گئے اور تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میں نے "نئی نظم اور پورا آدمی" لاشعور کی مکمل گرفت کی حالت میں لکھی ہے۔ لیکن لاشعوری اثرات میری شاعری پر اس وقت پڑنا شروع ہوئے جب میں نے وہ شاعری کی جسے تم ردِ عمل کی شاعری کہتے ہو۔ عسکری صاحب کو یہ شاعری (اس چہار عنصر کو چھوڑ کر جو غالب کے قصیدہ کی زمین میں ہے اور جس کے بارے میں عسکری صاحب کہا کرتے تھے

کہ اس میں تم نے غالب سے الگ ذائقہ پیدا کر کے دکھا دیا ہے) پسند نہیں تھی لیکن اس کا آغاز ان کی ایک فرمائش سے ہوا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ "راپنی شاعری کے ذریعے تم نے درد، کسک اور نشاطیہ لہجہ پر قابو پا لیا ہے۔ اب غصہ اور طنز کے اسالیب کو بھی آزماؤ۔" میں نے یہ کام شروع کیا تو میرے اندر نہ جانے کیسے کیسے "بھوت" جاگ اُٹھے اور میں بالکل "از خود رفتہ" ہونے لگا۔ عسکری صاحب کہتے تھے کہ اگر تیری یہ کیفیت قائم رہی تو لوگ تجھے سڑک پہ پتھر مارنے لگیں گے۔ بہت جلد اس کی نوبت آگئی اور میری داخلی کیفیت کا کلائمکس ذہنی اختلال کا وہ دورہ تھا جو ۶۲ء میں مجھ پر پڑا۔ تب سے چھوٹے بڑے سات دورے مجھ پر پڑ چکے ہیں اور مستقبل نامعلوم ہے۔ یوں وہ نظمیں جو تمہارے مطالعہ میں آئی ہیں ایک ایسے وقت میں کہی گئیں جب میں ایک ہلکے سے دورے کے زیر اثر تھا۔ میری نظم مشرق اور بعض اخباری کالم بھی اسی قسم کے دوروں کی پیداوار ہیں جن میں میں ایک طرف لاشعور کی گرفت میں تھا اور دوسری طرف اس سے نکلنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ میں ان سارے دوروں کی تحلیل نفسی تو نہیں کر سکتا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "لاشعور" کے غلبہ کی وجہ سے میری شخصیت کا داخلی توازن بہت بڑی حد تک بگڑ گیا تھا۔ یہ دورے اس توازن کو بحال کرنے کا حیاتیاتی عمل تھے۔ ان کے ذریعے لاشعور نے مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن لاشعور کا غلبہ کیا معنی رکھتا تھا اس کے تصور ہی سے میں لرز جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کلاسیکی شاعری سے پیدا کردہ نظم و ضبط میرے پس پشت نہ ہوتا تو میں ان دوروں سے نکل کر شعوری زندگی میں واپس نہیں آسکتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ پہلے دورہ کے دوران مجھ پر "شریعت" کا غلبہ تھا۔ یہ اُسی شعور کا دوسرا نام ہے جس میں میری پوری روایت جذب ہے۔ شریعت یا شعور ہی نے مجھے بحران میں مبتلا کیا اور اسی نے مجھے بحران سے بچا لیا۔ معلوم نہیں یہ باتیں کہہ کر میں نے کچھ کہا بھی ہے یا نہیں لیکن ایک بات تو مجھے واضح طور پر نظر آتی ہے۔ میرے شعور اور لاشعور میں ایک "فصل" ہے اور میری شخصیت پر شعور کا غلبہ ہے اس حد تک کہ مجھے بعض اوقات گمان ہونے لگتا ہے کہ "میں فقط ہوں دماغ میں زندہ" اور اس غلبہ کی وجہ میرے وہ مخصوص حالات ہیں جن سے بچپن ہی میں میں ایک "شعوری" شخصیت بن گیا۔ لیکن لاشعور کی تہ میں ایک ایسا لاوا ایک رہا ہے جو آتش فشاں کی طرح میری پوری شخصیت کو توڑ کر باہر نکلنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں توازن اور ہم آہنگی کیسے پیدا ہو اور لاشعور کس طرح میری شخصیت کو ضرر پہنچائے بغیر شعور سے رابطہ پیدا کر کے ایک نیا توازن حاصل کر سکے۔ یہ سوال میری زندگی اور شاعری کا سب سے بڑا سوال ہے۔ میری کلاسیکی شاعری

کی ناکامی یہ نہیں ہے کہ وہ کلاسیکی ہے یا ماضی اور روایت کے زیرِ اثر ہے یا اس میں پرانے الفاظ اور تراکیب ہیں۔ اس کی ناکامی یہ ہے کہ یہ میرے شعور کی کوشش ہے اور اس میں لاشعور صرف کہیں کہیں شریک ہوا ہے دیکھو تم نے کتنی کھری بات کہی ہے کہ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ اردو کا سارا کلاسیکی ادب آپ کے "شعور" میں زندہ ہے...... جب تک یہ ساری چیزیں اندر اتر کر (لاشعور میں پہنچ کر) دور نہیں ہو جائیں گی آپ اپنی آواز کے تعاقب میں دیوانہ وار پھرتے رہیں گے۔" تمہاری تشخیص بالکل درست ہے۔ لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ علاج کے سوال پر تمہاری نظر بھٹک جاتی ہے اور تم عام جدیدیوں جیسی فضول باتیں کرنے لگتے ہو۔ علاج یہ نہیں ہے کہ جدیدیوں کی طرح اپنی تاریخ، کلچر اور روایت کو کاٹ کر شاعری کی جائے۔ علاج یہ ہے کہ بقول تمہارے "تاریخ، کلچر اور تجربہ شعور کے پل سے گزر کر لاشعور تک پہنچیں اور پوری شخصیت میں سرایت کریں۔" میں نے کلاسیکیت کی پہلی منزل طے کر لی ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے شعور کا جزو بنا لیا۔ دوسری منزل یعنی ان کا لاشعور میں اترنا۔ یہ کیسے ہو؟ کیا شعور اور لاشعور کے توازن کی جو شدید جد و جہد میرے وجود میں جاری ہے اس کے ذریعہ یہ ممکن ہے؟ میں نہیں جانتا کہ اس کا جواب اثبات میں ہے یا نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ایسا ہو سکا تو میں دوسری منزل بھی طے کر لوں گا اور اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ میں کلاسیکی شاعر نہیں رہوں گا بلکہ زیادہ کلاسیکی ہو کر زیادہ زندہ شاعر بن جاؤں گا۔ یعنی مجھے اپنی شخصیت کا توازن اور اپنی "آواز" دونوں مل جائیں گے۔

تمہارا

سلیم بھائی

۲

پیارے ساقی۔ اگر میں تم سے سوال کروں کہ تمہاری شاعری میں "آج" کیا مسئلہ ہے تو تم عہدِ حاضر کے بیسیوں جذباتی اور نفسیاتی مسائل کا حوالہ دو گے اور مجھے ماننا پڑے گا کہ تمہاری شاعری "آج" سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی سوال اگر میں راشد اور میرا جی کے بارے میں کروں تو بھی اس کا جواب واضح اور آسان ہوگا۔ حتیٰ کہ اقبال اور حالی کی شاعری کے بارے میں بھی ان کے زمانے کے "آج" کے تعلق سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال دنیائے اسلام کے زوال اور بیداری، انقلاب روس اور انقلاب چین، برصغیر کی آزادی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے تھے اور نہ حالی غدر اور سرسید کے بغیر وجود میں آ سکتے تھے۔ ان سب لوگوں کے یہاں یقیناً ان کے آج کا معیار ہے اور ہم اسے دوسرے شاعروں کے "آج" سے ممیز کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساقی کا "آج"

حالی کے "آج" سے بالکل مختلف ہے۔ اچھا اگر اب میں یہی سوال تم سے اردو کی قدیم شاعری کے بارے میں کروں تو تمہارا جواب کیا ہوگا۔ مثلاً اگر میں یہ پوچھوں کہ ولی سے داغ تک آج کے مسئلہ کی نوعیت کیا ہے تو تمہارا جواب کیا ہوگا۔ کیا تم ولی کے آج اور میر کے آج میں کوئی فرق کرسکتے ہو۔ ولی میر، سودا، مصحفی، آتش، مومن، ذوق، داغ کی غزلوں میں ان کے "آج" کے نقطۂ نظر سے کیا فرق ہے۔ میرا خیال ہے کہ کلاسیکی شاعری کے ہر پڑھنے والے کا فوری جواب یہ ہوگا کہ انہیں اس سوال کی روشنی میں دیکھا ہی نہیں جاسکتا کہ ان کی شاعری ان کے زمانے کے "آج" کے مسائل سے نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس شاعری کا رویہ "لازمانی" اور "لاتاریخی" ہے۔ وہ انسان معاشرہ اور کائنات کو "حرکت" کی روشنی میں نہیں دیکھتی بلکہ ان کے مسائل، اقدار اور رویوں کو ایسے "سکون" کی حالت میں دیکھتی ہے جسے ایک زمانہ میں منجمد کر لیا گیا ہو۔ یہاں عشق، وفا، ستم، کرم، ناز، نیاز اور تمام انسانی رشتوں کی شکلیں ملتی ہیں اور شاعری انہیں سانچوں میں اپنا عمل کرتی ہے۔ کلاسیکی تہذیب کی بنیاد جس مذہب پر ہے اس میں بھی خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں بنیادی حوالے طے شدہ ہیں اور ان سے کسی حالت میں بھی تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا مذہب، ہماری کلاسیکی تہذیب اور ہماری کلاسیکی شاعری کا مسئلہ "آج" نہیں ہے بلکہ "ابدیت" "لاعصریت" نہیں ہے بلکہ "ماورائے عصریت" یہاں روح عصر نہیں بولتی، وہ روح بولتی ہے جو ہر "عصر" سے ماورا ہے اس لیے کلاسیکی شاعروں کے بارے میں "آج" کا سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔ وہ "آج" کے بجائے "ہمیشہ" کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن عہد جدید کے آغاز کے ساتھ ہی "آج" کا مسئلہ شروع ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جدیدیت ایک ایسے انسان کی پیدائش اور ارتقاء کا عمل ہے جو "زمانے" کا ایک مختلف تصور رکھتی ہے۔ کلاسیکی تہذیب میں زمانہ کا تصور دوری ہے۔ (Cyclic) جبکہ جدید تہذیب میں Linear کلاسیکی تہذیب میں زمانہ کی علامت دائرہ ہے۔ جدید تہذیب میں Cyclic دائرہ ایک مرکز کے گرد گھومتا ہے۔ خط کا کوئی مرکز نہیں ہوتا وہ ایک سمت سے دوسری سمت کو بڑھتا ہے۔ بہرحال جدیدیت کے آغاز میں کلاسیکی شاعری پر جو اعتراضات کیے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اس میں ہمارے زمانے کی ضرورت کے مطابق کچھ نہیں۔ تب سے ہر شاعر اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق لکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک نسل کے بعد پرانا ہوجاتا ہے۔ جدیدیت کے آغاز کے ساتھ ہماری شاعری میں بنیادی مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ شاعر کو عصریت کا اظہار کرنا چاہیئے یا لاعصریت کا۔ غزل کا کام کسی نہ کسی حد تک لاعصریت کے

بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لیے غزل کسی نہ کسی طرح Static رویّوں کے قریب رہی جبکہ نظم عصریت کے سلسلے سے تیز رفتاری کے ساتھ Static رویّوں سے بھاگی اور آئے دن طرح طرح کے چولے بدلتی رہی۔ میں نے اپنی غزل میں اپنے ہم عصر غزل گویوں کی نسبت کلاسیکی رویّوں کو زیادہ سمونے کی کوشش کی۔ اور اسی نسبت سے عصریت سے دور تر ہوتا گیا۔ کبھی کبھی میں کہا کرتا ہوں کہ حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کے بعد ہماری شاعری "کل کی کل" جدید ہے۔ حسرت، فانی، جگر، فراق سب جدید ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان میں سے ہر ایک جدیدیت کی کسی ایک منزل پر رُک گیا ہے۔ اسی اعتبار سے تابش دہلوی اور شاعر لکھنوی کا شمار بھی جدیدیوں میں ہوتا ہے۔ ان میں صرف میں ایسا ہوں جس نے شعوری طور پر جدیدیت اور کلاسیکیت کے فرق کو جانا اور کلاسیکیت کو شعوری طور پر قبول کرنے کی کوشش کی بھائی میرے آل رضا بھی ایک جدیدیے تھے اور تم میں اور ان میں صرف اتنا فرق ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش اور ذہنی ماحول، تمہاری تاریخ پیدائش اور ذہنی ماحول سے مختلف تھا ورنہ عصریت کے وہ بھی اتنے قائل تھے جتنے تم۔ شاعری میں "آج" کے مسئلے سے جمالیات کا ایک سوال پیدا ہوا جس کا جواب بڑے برادران کے پاس نہیں ہے۔ وہ یہ کہ شاعری کا تعلق جب "آج" سے ہے اور ہر "آج" اگلے دن "کل" بن جاتا ہے۔ تو کل کی شاعری ہمیں "آج" کیوں متاثر کرتی ہے یعنی ہم ماضی کی شاعری سے کیوں لطف اندوز ہوتے ہیں جبکہ عصریت کے اعتبار سے ہم میں اور ان میں کوئی بات مشترک نہیں ہے؟ اس سوال کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ جب ہماری آج کی شاعری کل کل کی شاعری بن جائے گی تو ہماری شاعری سے کون لطف اندوز ہوگا کچھ لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہم "آج" کے شاعر ہیں۔ کل کوئی ہمیں پڑھے یا نہ پڑھے یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ مگر اس جواب میں "دلیری" تو ہے نفس انسانی کی بصیرت نہیں ہے کیونکہ انسان صرف آج ہی نہیں کل بھی زندہ رہنا چاہتا ہے اور ابدیت ہر شاعر کا فطری مسئلہ ہے۔

اچھا اب مسئلے کو ایک اور زاویہ سے دیکھو۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ صرف و محض اپنی پیدائش کے "آج" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے قریبی ماحول اور عمومی رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔ اب اگر وہ شاعر بچہ ہے تو فطری طور پر اپنے عصری ادب سے متاثر ہوتا ہے اور اس انداز کی شاعری کرتا ہے جو اس کے ماحول میں ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ جب زیادہ باشعور ہوتا ہے تو ایک مسئلے سے دوچار ہوتا ہے کہ اس کے "آج" کا گزرے ہوئے "کل" سے کیا تعلق ہے۔ یعنی ماضی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ کلاسیکیت اسی مقام پر اس کے سامنے

آتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ اس کا "آج" صرف ماضی کے تسلسل ہی میں بامعنی بن سکتا ہے وہ اسے بتاتی ہے کہ اس کا "ذہن" ایک وسیع تر ذہن کا حصہ ہے جس میں پچھلی بہت سی نسلیں شریک ہیں اور اس ذہن میں شرکت کے بغیر اس کا اپنا ذہن پوری معنویت نہیں حاصل کر سکتا۔ کلاسیکی شاعری ماضی اور روایت میں اسی شرکت کے دروازے کھولتی ہے اور انفرادی ذہن کو ایک اجتماعی ذہن کا وارث بناتی ہے۔ یوں وہ "آج" سے نکل کر زمانے کے تسلسل میں داخل ہوتا ہے۔ اور مستقبل کی طرف اپنے سفر میں ماضی کے بہترین اجزا کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ایک کلاسیکی تہذیب میں یہ عمل بیشتر غیر شعوری طور پر ہی انجام پاجاتا ہے کیونکہ اس کا مخالف رویہ ایک سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا۔ ہماری تہذیب میں جو شاعری پیدا ہوئی وہ اسی رویے کا نتیجہ تھی۔ اور آج کسی شاعر کا شعوری مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن جدیدیت کے آغاز کے ساتھ ہی ماضی کو مسترد کرنے کا جو رویہ پیدا ہوا اس میں آج کے مسئلے نے نمایاں اہمیت حاصل کر لی اور ماضی سے رشتہ جوڑنے کا عمل نہ صرف ساقط ہو گیا بلکہ مذموم قرار دیا گیا۔ اب شاعر زیادہ سے زیادہ "آج" پر زور دینے لگے ہیں اور ایسے ذہنی رویے پیدا ہوئے جن میں عصریت سے ماورا جانے کا عمل بالکل مشکل ہو گیا۔ میں نے جب شعر کی ابتی منزلیں طے کریں جہاں ماضی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میرا عمل ماضی کو جذب کرنے کا عمل تھا لیکن اس عمل کی حقیقی مشکلات کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا۔ ایک کلاسیکی تہذیب میں جو مخالف اثرات سے محفوظ ہو ماضی کو جذب کرنا ایک ایسا فطری عمل ہے جیسے سانس لینا لیکن ایک ایسی تہذیب میں جو اندر اور باہر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہو اور مخالف اثرات کی زد میں آکر ماضی سے اپنا تسلسل توڑ رہی ہو اس میں ماضی کو جذب کرنا صرف لاشعور کے ذریعے ممکن نہیں ہوتا کہ "لاشعور" تو اپنے زمانے کے سارے موجود اثرات کی زد میں ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں یہ کام کرنے کے لیے "شعور" پر زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔ اور چونکہ ماضی زندگی سے کٹ کر اپنے تسلسل میں باقی نہیں رہتا اسی لیے اپنے تجربے میں ماضی کو سمونا ایک حد درجہ مشکل عمل بن جاتا ہے۔ اور صرف تخیل کی قوت کے ذریعہ ہی ماضی کی بازیافت کی جا سکتی ہے۔ بیسویں صدی کی کراچی میں رہتے ہوئے ولی اور میر کے رویوں کو جذب کرنا اور اس کو اپنے شاعرانہ عمل کا حصہ بنانا ایک ایسے تخیل کے بغیر ممکن نہیں ہے جو "آج" کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہو۔ میرے نزدیک موجودہ ماحول میں ایک کلاسیکی شاعر کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ کیا وہ اپنے تخیل میں ماضی کو زندہ کر سکتا ہے اور آج سے نکل کر اس زندگی کا حصہ بن سکتا ہے جو صدیوں کی تاریخ اپنے پیچھے رکھتی ہے

پیارے ساقی۔ یہ اس سلسلے کا آخری خط ہے۔ اب جو کچھ لکھنا ہے وہ تمہارا جواب ملنے پر لکھوں گا۔

تمہارا

سلیم بھائی

۳

میں نے اس خط کو جان بوجھ کر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جن غزلوں کے ۹۰ فیصد کو تو مسترد کر چکے ہو ان کی تعریف کی کڑوی گولی تمہارے حلق سے اتر جائے تو آگے بڑھوں۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ شاعری کی پسندیدگی کا معاملہ "ذائقہ" کا معاملہ ہے۔ آپ کو ایک چیز اچھی نہیں لگتی تو بس اچھی نہیں لگتی اور کوئی چیز اچھی لگتی ہے تو بس اچھی لگتی ہے۔ لیکن پسند ناپسند کا معاملہ جب "شخصی" نہ رہے اور دو نسلوں کا معاملہ بن جائے، جیسا کہ میرے کیس میں ہوا ہے، تو اس کو ایک خارجی منظر کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرے نزدیک جدیدیوں میں میری ناپسندیدگی کے اسباب تین ہیں:

(۱) وہ باتیں جو تم نے اپنے خط میں لکھی ہیں یعنی پرانے الفاظ اور پرانی علامات کا استعمال۔

(۲) جذبات کے بارے میں ایک مخصوص رویہ۔ ۳۔ ذہن کا استعمال۔ ان میں سے پہلے سبب کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اب آؤ باقی دو اسباب کا جائزہ بھی لے لیں۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں روایتی غزل پر جو اعتراضات کیے تھے ان میں یہ اعتراض سرفہرست تھا کہ ان میں "جذبات" نہیں ہیں۔ حالی کے علاوہ اس وقت کے اور دوسرے لکھنے والوں نے بھی یہ اعتراض بار بار دہرایا ہے۔ پہلے اس سے اردو کا کوئی کلاسیکی شاعر نہیں بچا تھا بالخصوص لکھنوی شاعری تو پوری کی پوری مردود ٹھہری تھی۔ لیکن بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوتے گئے جنھوں نے جذبات کی موجودگی کا ثبوت پیش کر کے اپنے بعض پسندیدہ شعرا کو بچا لیا۔

عسکری صاحب نے لکھا کہ کلاسیکی غزل کے ان معترضوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ اس میں جذبات نہیں ہیں تو جذبات کی جگہ کیا ہے۔ بس انگریزی خیالات کا جو کچا پکا اثر لیا تھا اس کی بنا پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ جذبات نہ ہوں تو شاعری نہیں ہوتی۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ خیال اس وقت کی رومانی تنقید سے ماخوذ تھا، اور نو کلاسیکی شعرا کے خلاف گھڑا گیا تھا۔ یہ خیال اتنا مقبول ہوا کہ حالی نے "تاثیر" کی بنا پر ایک پورا نظریۂ شعر وضع کر لیا اور اس کا اثر لکھنؤ تک پہنچا تو لکھنوی روح کے بالکل برعکس وہ وجود میں آیا جس کا آغاز عزیز لکھنوی سے ہوتا ہے۔ ان لکھنوی شعرا نے

جذبات کے معنی "رونا دھونا" سمجھے اور باقاعدہ ماتمی شاعری کا ایک اسلوب پیدا ہو گیا۔ تب سے یہ جذبات پرستی مختلف شکلیں اختیار کر چکی ہے۔ اور میرے نزدیک نئی اردو غزل کی زبان میں جو بعد بعد تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وہ اسی جذبات پرستی کا نتیجہ ہیں۔ یہ جذبات کیا چیز ہیں، میں انہیں شاید واضح طور پر بیان نہ کر سکوں۔ لیکن یوں سمجھو کہ یہ وہ چیز ہے جو جگر میں زیادہ اور یگانہ میں کم۔ یہاں تک کہ فراق میں بھی "ذہن" زیادہ ہے۔ "جذبات" کم مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ فراق تو "سوچ سوچ" کر شعر کہتے ہیں جذبات وہ ہیں جو ذہن کی مداخلت کے بغیر ابل پڑتے ہیں۔ اور جذبات پرستی کا اولین نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شعریات کو مسترد کر دیا گیا اور سارے صنائع بدائع رخصت ہو گئے۔ حالی نے کہا تھا "اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں، پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو" چنانچہ دل گدازی کے نام پر شعر سے "صنعت" کو ختم کر دیا گیا۔ اور صرف جذبات کو کافی سمجھ لیا گیا۔ پھر یہ جذبات بھی ایک مخصوص نوعیت کے تھے۔ جذبہ تو خوشی بھی ہے لیکن رومانوی شاعری کے زیر اثر جذبہ کے معنی صرف "غم" سمجھے گئے اور غم کو جذبات کی پہچان سمجھا جانے لگا۔ رومانیت کے خلاف ردعمل کی مغربی تنقید اگر تم نے پڑھی ہوگی تو اس میں یہ سب باتیں بہت وضاحت سے مل جائیں گی۔ خود ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ نے صنعت اور فن کو بحال کرنے کی جو کوشش کی وہ اسی جذبات پرستی کے خلاف ردعمل ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری شاعری جذبات پرستی کے اس رجحان سے دور رہی اور میں صرف شاعری ہی میں نہیں زندگی میں نظم و ضبط کو جذبات کے کھلے ڈلے اظہار پر فوقیت دیتا ہوں اور جذبات کی روک تھام کو ایک بہتر عمل سمجھتا ہوں۔ نئی نسل کو میری شاعری میں ویسے جذبات نہیں ملتے جن سے وہ خود کو Identify کرتے ہیں تو وہ مجھ سے مایوس ہوتی ہے۔ لیکن تربیت یافتہ جذبات کی قلب ماہیت کا عمل میری غزلوں میں بہت ہوا ہے۔ اور میں اسے اپنا ایک کارنامہ سمجھتا ہوں۔ تیسرا سبب "ذہن" کا استعمال ہے۔ نئی نسل جس پر رومانویت کا غلبہ ہے ذہن کے استعمال سے بدکتی ہے اور اسے کوئی غیر شاعرانہ عنصر تصور کرتی ہے پتا نہیں یہی نسل غالب کی "وٹ" کو کس طرح برداشت کرتی ہے

ایک رومانوی شاعر کا کہنا ہے کہ شاعری میں شاعر "ذہن" سے نہیں سوچتا بلکہ "روح" سے یہاں روح کے معنی جذبات کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ نئی نسل اسی روح کی قائل ہے اور کلاسیکی Detachment کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے نزدیک شاعری Detachment کے بجائے Involvement کا نتیجہ ہے۔ بہرحال یہ بحث لمبی ہے اور تمہارے لیے اشارہ کافی ہے۔ نتیجہ بہرحال ان سب اسباب کا یہ ہے کہ میری وہ بہترین شاعری بھی جسے میں اپنی

عمر کا حاصل سمجھتا ہوں نامقبول ہوئی۔ اور جن غزلوں میں بقول عسکری صاحب کے میں حقیقی کلاسیکیت تک پہنچ گیا تھا ان کا کسی پر بھی اتنا اثر نہیں ہوا کہ وہ ان کا ایک شعر بھی دہرا دیتا۔ مجھ پر اس ناکامی کا شدید ردعمل ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں میں نے عسکری صاحب سے کہا کہ میری ان غزلوں کو نئی نسل تو کیا آل رضا بھی پسند نہیں کرتے۔ عسکری صاحب نے کہا وہ تو عزیز لکھنوی کے لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کلاسیکی شاعری کیا ہے۔ ٹھیک یہی زمانہ تھا جب عسکری صاحب نے مجھ سے طنز اور غصہ کے اسالیب کو آزمانے کے لیے کہا۔ اور اس سے جو بھوت" میرے اندر جاگ اٹھے، ان میں ایک بھوت اپنی "ناکامی" کا بھی تھا۔ شدید غم و غصہ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور میں ایسی شاعری کرنے کا خواب دیکھنے لگا جسے سن کر لوگ رات کو سو نہ سکیں۔ خاتمہ وہی ذہنی اختلال کا دورہ تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس کے بعد میرے اندر ردِ عمل کی شاعری کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی اور رفتہ رفتہ میں سمجھوتہ کی طرف لوٹا۔ میری نئی غزلیں اسی سمجھوتہ کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اس دوران نظموں کی طرف توجہ نے کسی حد تک اس نقصان کی تلافی کر دی ہے۔ اب تم نے لکھا ہے کہ "غزل سالی بند" تو غزل سالی تو اپنے آپ بند ہوتی جا رہی ہے۔ ۵۸ء سے ۸۰ء تک بائیس سال کے عرصہ میں میں نے یہ چند غزلیں کہی ہیں جو تم اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تاہم میں اس وقت کا منتظر ہوں جب میری کلاسیکیت میرے اندر از سرِ نو زندہ ہو اور میں اس غزل سے آگے شعر کہہ سکوں جہاں ۵۸ء تک پہنچا تھا۔ عسکری جیسے انسان کے سہارے کے بغیر کیا یہ ممکن ہے، یہ میں نہیں جانتا۔

تمہارا

سلیم بھائی

بشکریہ <u>بنیاد</u> در کراچی

(۴)

پیارے ساقی! انہیں دوسرا خط لکھنے کے بعد میں بیاض لے کر بیٹھا اور پہلی بار اس نظر سے اپنی غزلوں کو دیکھا کہ ان میں کہاں کہاں میرا شعور اور لاشعور ہم آہنگی کی حالت میں ہیں یعنی میں کہاں کہاں ماضی کے تجربہ کو اس طرح جذب کر سکا ہوں کہ وہ میرا اپنا تجربہ بن گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میں کہاں تک ماضی کے تجربہ کو جذب کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اور کہاں تک اسے اپنا بنانے یا اس میں اپنی انفرادیت پیدا کرنے میں ممکنہ کامیابی حاصل کر سکا ہوں۔ کیونکہ ماضی اور روایت کے لاشعور میں جذب ہونے کا قصہ یہی انفرادیت ہے۔ یہاں "سانچے سمٹ کر" ایک نئے سانچے میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو بیک وقت نئی بھی ہوتی ہے اور پرانی بھی کلاسیکی شاعری میں شاعر کے قد و قامت سے الگ اس کی قدر و قیمت کا تعین روایت اور انفرادیت کے اسی امتزاج سے ہوتا ہے۔ بے روایت میں رہنے والے شاعر اس سے زیادہ اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور نہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی بات ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ یہ تین شعر دیکھو ؎

میرے تغیرِ حال پر مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے

میرے تغیرِ حال کو مت دیکھ
یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

میرے تغیرِ رنگ پر مت جا
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یہ شعر ایک ہی مواد سے بنائے گئے ہیں، اور پہلے مصرعوں کے الفاظ تک ایک ہیں۔ لیکن روایتی شاعری کا ذوق رکھنے والے پہچان سکتے ہیں کہ دوسرے مصرعوں نے ہر شعر میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے اور ان کی کیفیت میں جو فرق ہے وہ شاعروں کی شخصیت کے فرق سے پیدا ہوا ہے اور الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ مواد ایک ہونے کے باوجود "تجربہ" مختلف ہو گیا ہے۔ عسکری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں سرشار کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔ "جہاں چراغ میں بتی پڑی اس نیک بخت نے چادر تانی"۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ اس جملہ کو اگر ہم یوں کہیں "وہ شام ہوتے ہی سو گیا" تو ممکن ہے کہ بات ایک ہی ہو لیکن تجربہ بالکل بدل گیا کیونکہ "بتی پڑنا" اور "چادر تاننا" میں ایک پورا معاشرتی منظر اور اس سے فرد کی بے تعلقی بلکہ تعلق قطع کرنے کی شعوری کیفیت سمٹ آئی ہے جبکہ دوسرا جملہ صرف ایک انفرادی فعل کا اظہار ہے۔ اس نقطۂ نظر سے

انقلابات ہیں زمانے کے

یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے۔

بالکل الگ الگ تجربات ہیں کیونکہ ان کے پیچھے شاعر کا ذہنی، جذباتی، نفسیاتی رویہ مختلف ہے اور وہ زندگی کو مختلف طور پر قبول یا رد کرتے نظر آتے ہیں۔ فراق صاحب نے ایک بار تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جن اشعار کو سرقہ کہا جاتا ہے اگر ہم انہیں بھی صحیح طور پر دیکھ سکیں تو سرقہ اور توارد کے بارے میں ہمارے خیالات میں انقلاب آجائے یعنی ہم دیکھ سکیں کہ "سرقہ" کے عمل میں تجربہ کتنا مختلف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ ساری بحثیں اس وقت مفید ہیں جب ہم یہ سمجھ سکیں کہ شاعری میں الفاظ کے ذریعے سے تجربہ کس طرح تشکیل پذیر ہوتا ہے، یا بہتر الفاظ میں "شعر کے لفظ کس طرح تجربہ بنتے ہیں"۔ ہمارے یہاں جدیدیت کی پہلی بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس نے "مواد" ہی کو سب کچھ سمجھا اور تجربہ اور الفاظ کے رشتے کو بھول کر شاعری پڑھنا ہی بھول گئی۔ چنانچہ کچھ جدیدیوں نے کلاسیکی شاعری پر جو اولین اعتراض کیے وہ مواد ہی سے متعلق تھے۔ مثلاً کلاسیکی شاعری میں سماجی شعور نہیں ہے یا افادیت نہیں ہے، یا یہ قوم کے کام نہیں آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اعتراضات الفاظ بدل بدل کر اب بھی دہرائے جاتے ہیں۔ تم جب کہتے ہو کہ "تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی" اور "جمع تفریق میں گرطاق ہے جعفی کی مشین"۔ دونوں رد عمل کے اعتبار سے ایک ہیں۔ تو تم صرف مواد کو دیکھتے ہو تجربہ نہیں دیکھتے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں مصرعوں میں "بات" ایک

ہی کہی گئی ہو۔ لیکن ان کے پیچھے تجربہ کی دو مختلف کائناتیں ہیں۔ کاش تم یہاں ہوتے تو ہم دونوں میر اور جرأت کو ایک ساتھ پڑھتے۔ اور یہ دیکھتے کہ جرأت جرأت کیوں ہے اور میر میر کیوں ہے۔ بہر حال کلاسیکی شاعری میں انفرادیت نہ "نئے مواد" کی تلاش کرتی ہے۔ نہ "نئے الفاظ" کی لیکن اس کے باوجود شخصیت اور انفرادیت کا اظہار "تجربہ" کی تشکیل میں ہو جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات ان لوگوں سے نہیں کہی جا سکتی جن کے نزدیک ہر میٹھی چیز میٹھی ہوتی ہے چاہے گاجر کا حلوہ ہو، چاہے گڑ کے لڈو۔ بیاض میں سے کم از کم پندرہ غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں میں نے کلاسیکی انفرادیت حاصل کر لی ہے۔ اور ان تمام شعراء سے الگ ذائقہ، رویہ اور تجربہ پیدا کر کے دکھایا ہے جن سے میں نے اثر لیا ہے۔ ایک چہار غزلہ کا میں ذکر کر چکا ہوں جو غالب کے قصیدے کی زمین میں ہے اور عسکری صاحب کہا کرتے تھے کہ اس میں غالب سے مختلف ذائقہ موجود ہے۔

اس طرح کم از کم پچاس شعر ایسے ہیں جن میں شعور اور لاشعور ایک ہو کر ایسی انفرادیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو صرف کلاسیکی شاعری ہی میں ممکن ہے۔ تم جاہو گے تو ان غزلوں اور اشعار پہ تفصیل سے گفتگو ہو گی۔ اور شاید میں کچھ ایسی باتیں کہہ سکوں جو کلاسیکی شاعری کے مطالعہ میں مفید ثابت ہوں۔ مثال کے طور پہ دو شعر تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں،

عشق کو شاد کرے غم کا مقدر بدلے
حسن کو اتنا بھی مختار نہ سمجھا جائے

اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

"گرفتار" ایک ایسا لفظ ہے جسے تم نے استعمال کرنے سے منع کیا ہے۔ لیکن اس شعر میں اس لفظ کا ذائقہ اگر تمہیں نہیں محسوس ہو رہا ہے تو کم از کم میرے لیے یہ ایک قابل افسوس بات ہے۔ اچھا پہلے یہ دیکھو کہ دونوں شعروں میں بات کیا کہی گئی ہے۔ یعنی دونوں کا "مواد" کیا ہے۔ پہلے شعر میں اگر کچھ کہا گیا ہے تو یہ کہ عشق کے غم کا مداوا حسن کے پاس بھی نہیں ہے اور اگر حسن چاہے بھی تو بھی عشق کی تقدیر نہیں بدل سکتا۔ میں "تجربہ" کی انفرادیت کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن کیا تم بتاؤ گے کہ یہ "بات" کسی اور کلاسیکی شاعر نے کہی ہے۔ مجھے تو غالب کے ایک شعر کے سوا ایسا "مواد" بھی کہیں نہیں ملا۔

تیرے کرم سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا کچھ اور بھی ہم پر ستم ہوئے

لیکن غالب کے شعر کی فضا اس کا داخلی رویہ میرے شعر سے بہت مختلف ہے۔ اچھے برے کی بات میں نہیں کرتا لیکن "حسن کو اتنا بھی مختار نہ سمجھا جائے" میں ایک ایسی خوشدلی، ایک ایسی Light heatedness ہے جو غالب کے شعر میں نہیں ہے۔ غالب کی شکایت بہت گمبھیر شکایت ہے۔ جس میں کرم سے زیادہ دہر کے ستم پر زور ہے۔ جبکہ میرے شعر میں حسن کی مجبوری کا احترام اور اس مجبوری کی ایسی محبوبیت موجود ہے جو غم میں نشاطیہ کیفیت تک پہنچ رہی ہے۔ داخلی رویہ نے ایک شعر کو المیہ اور دوسرے کو طربیہ بنا دیا ہے اور تکلیف دہ تجربات میں نشاط کا یہ رنگ پیدا کرنا اتنا آسان نہیں ہے کہ میں خود کو اس کی داد دینے میں بھی شرما جاؤں۔ میرے شعر میں ایک اور خوبی بھی ہے۔ صرف ایک لفظ "اتنا" کے استعمال سے اپنے تجربہ اور رویہ کو پوری کلاسیکی شاعری کے مقابل رکھ دیا گیا ہے۔ اور یوں ایک پوری روایت کو اپنے تجربہ کے Contrast میں دیکھا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں جو "بات" کہی گئی ہے وہ "نئی" ہے اس "مواد" کے شعر یاد کرنا چاہو تو شاید کوئی شعر مشکل ہی سے یاد آئے گا۔ لیکن شعر میں جو اصل خوبی ہے وہ یہ ہے کہ ایک نئے نفسیاتی زاویے کے علاوہ حسن اور عشق کے رویے مل کر ایک بالکل نیا نقش بنا رہے ہیں۔ خدا مجھے معاف کرے خودستائی کا الزام مجھ پر نہ آئے۔ لیکن مذکورہ پندرہ غزلوں میں میں نے کلاسیکی شاعری کے اندر ایسی چھوٹی سی کائنات کا اضافہ کیا ہے جس پر رنگ نشاط کی ایسی چھوٹیں پڑ رہی ہیں کہ جدیدیت کی کابوس زدہ خود رحمی اور سطحی غم پرستی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ میں ان میں کامیاب ہوں تو کلاسیکی شاعری ہی کی ذریعہ کامیاب ہوا ہوں۔ اس کے بغیر تو ایسا ایک مصرعہ بھی لکھنا ناممکن تھا۔

کلاسیکی شاعری میں حسن و عشق کا انسان اور کائنات، انسان اور خدا کے رشتے متعین اور مقرر ہیں لیکن ان میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے داخلی رویوں کی کیمیا سے داخلی رویے ہر شاعر کے تجربہ کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ مثلاً یہ مضمون کہ محبوب آوارہ ہے کلاسیکی شاعری کا ایک مقررہ مضمون ہے اور اس سے رشک کی جو صورت حال پیدا ہوتی ہے اس سے غزلیں کی غزلیں بھری پڑی ہیں۔ غالب نے بھی رشک کے پہلو پر شعر کہے ہیں مگر آتش جیسا مہذب شعر کسی کو آسانی سے ہاتھ نہیں آتا ہے

مصری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے

نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بُو تیری

ان داخلی رویّوں میں مشکل ترین کام تکلیف دہ تجربات کی قلب ماہیت کرنا ہے۔ اور غم کو جھٹلائے، نظر انداز کیے یا کم کیے بغیر اس میں نشاطیہ قبولیت پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے جو کسی شخصیت کو آسانی سے ملتا ہے نہ کسی شعر کو۔ ان پندرہ غزلوں میں بیشتر یہ ہوا کہ منفی یا کرب ناک یا تخریبی تجربات مثبت نشاطیہ اور تعمیری تجربات بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شعر دیکھو۔

تُو جس طرح سُنے یہ ہے تیرا معاملہ

غم امر واقعہ بھی ہے اور داستاں بھی ہے

تمہارے جیسے حساس شاعر اور قاری کو یہ بتانا کہ کس شعر میں کیا تجربہ تشکیل پذیر ہوا ہے میرے نزدیک خود بتانے والے کی توہین ہے۔ لیکن ایک بات میں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح کسی اچھی نظم میں بہت سے تجربات مل کر ایک ہم آہنگ کُل بناتے ہیں اور کئی نقش مل کر ایک نقش بنتے ہیں اسی طرح غزل کے شعر کی حقیقی کامیابی بھی یہی ہے کہ اس میں کئی تجربات مل کر ایک ہو جائیں اور شاعر تجربہ کے مختلف پہلوؤں کو ایک ساتھ ایک نظر میں دیکھ اور دکھا سکے اور ان کے تقابل سے ایک نئی کلیت پیدا کر سکے۔ جدیدیت کے اثر سے نئی غزل یہ کام بالکل بھول گئی ہے اور صرف ایک جذبہ یا ایک احساس کے شعر پیدا ہو رہے ہیں۔ عسکری صاحب نے ایک جگہ میر کے بارے میں لکھا تھا کہ پوری زندگی پر بیک وقت غور کرنے اور اسے ایک شعر میں سمیٹ لینے کی جیسی قوت میر میں پائی جاتی ہے اس کے مقابلے میں غالب جیسا شاعر بھی بول جاتا ہے۔ ایلیٹ نے بھی ایک جگہ ایسی ہی بات کہی ہے کہ شاعری وقتی یا لمحاتی غم کا اظہار نہیں ہے بلکہ Life time burning کو ایک لمحے میں سمیٹ لینے کا نام ہے۔ میرے ہمعصر شعراء میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے (مدنی کو چھوڑ کر) جس میں کئی نقش ملا کر ایک نقش بنا دینے کی صلاحیت میرے برابر ہو۔ تو یہ درست ہے کہ اپنی پوری زندگی پر بیک وقت غور کرنے کی صلاحیت مجھ میں ابھی پیدا نہیں ہو سکی۔ تاہم ایک شعر میں میں اس کے قریب قریب پہنچ گیا ہوں ؂

تو کوئی اور ہے، میں اور ہوں، ایسا کیوں ہے یہ سوال آج محبت نے اٹھایا کیوں ہے

پیارے ساقی معاف کرنا میں نے یہ باتیں اپنی انا کو بہلانے کیلئے نہیں کی ہیں۔ تم نے چونکہ انتہائی ہمدردی، دل سوزی اور سنجیدگی سے بات کی ہے اسلئے میں نے بھی وہ باتیں کہہ دی ہیں جو شاید میں کسی اور حالت میں کبھی نہ کہتا

باقی آئندہ، تمہارا سلیم احمد

بنام احمد جاوید

پیارے جاوید۔ کویت میں مشاعرہ بہت زوردار رہا اور میری ایک تقریر بھی اچھی خاصی ہوگئی دونوں کے کیسٹ آ رہے ہیں جب کراچی آئے تو سن لینا۔ جمال بھی ۲۶ کو کراچی پہنچ گئے اور سجاد میر بھی کل آ گئے ہیں۔ وہ حریت کے نیوز ایڈیٹر ہو گئے ہیں اور آتے ہی چارج لے لیا ہے۔ خدا سے ان کی کامیابی کی دعا کرو۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب سے تم نے جو گفتگو کی کاش میں اسے سن سکتا۔ تم نے جس اصول کا ذکر کیا ہے اس کا تو مجھے بھی علم نہ تھا۔ مگر مولانا کے حوالے سے تم نے بہت اچھی بات نکالی ہے اللہ تمہاری ذہانت کو نظر بد سے بچائے اور اپنے دین کی خدمت و حمایت کی توفیق عطا فرمائے۔ مولانا سے ملاقات ہو تو میرے لیے دعا کے لیے کہو اور بہت عاجزی سے سلام عرض کرو۔

میری طبیعت کویت جانے سے پہلے خراب ہو گئی تھی۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا اور دونوں ٹانگوں پر ورم ہو گیا تھا۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا ہے۔ اور دل، جگر، گردوں، سینہ سب کا معائنہ کرایا ہے۔ خدا کے فضل سے سب کے سب نارمل ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وزن بڑھ جانے کی وجہ سے ورم آ گیا ہے واللہ اعلم بالصواب خدا سے دعا کرو کہ مکمل صحت عطا فرمائے اور کوئی تردد اور تشویش باقی نہ رہے۔

تمہارے ذمے میں جو کام لگانا چاہتا ہوں اس کے بارے میں آئندہ خط میں تفصیل سے لکھوں گا۔ سراج منیر کے لیے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ وہ بہت صلاحیتوں کا نوجوان ہے اور اللہ نے اسے سعید روح عطا کی ہے۔ اللہ اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح فرمائے گا۔ وہ کراچی تو نہیں آیا مگر شاید جلد آنے والا ہے۔ آئے گا تو تمہاری شکایت اسے پہنچا دوں گا اور وہ تمہیں

خط لکھے گا ویسے وہ اس معاملہ میں اتنا لاپروا ہے کہ مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود اس نے آج تک مجھے کوئی خط نہیں لکھا ہے۔

بچے تمہیں یاد کرتے ہیں۔ سب تمہیں سلام کہہ رہے ہیں اور تمہاری بھابھی دعا کہہ رہی ہیں

تمہارا ــــ سلیم بھائی

○

پیارے جاوید تمہیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ نوجوانوں میں میں تمہیں کتنی اہمیت دیتا ہوں اور مجھے اس بات کی کتنی شدید خواہش ہے کہ تم کچھ لکھو اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا اظہار کرو۔ میں تمہارے سامنے اور تمہارے پیچھے تمہاری ذہانت، قابلیت، اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ لیکن مجھے تم سے یہ شکایت ہے کہ تم نے اب تک خود کو ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی آدمی مجھ سے کچھ سیکھتا ہے یا نہیں اور میں کسی کو کچھ سکھانے کا اہل ہوں یا نہیں لیکن میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ تم مجھ سے گفتگو کرو۔ بحث مباحثہ، اختلاف واتفاق، تائید اور تردید جو کچھ تمہارے دل میں ہے اسے باہر نکالو۔ لیکن تم میرے پاس آتے ہو اور خاموش بیٹھ کر چلے جاتے ہو۔ اس سے میری طبیعت الجھتی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی یک طرفہ بک بک کو کب تک جاری رکھوں۔ میرا خیال ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے ہو اور اس سے زیادہ "ذمہ دار" بننے کی خواہش میں مبتلا ہو۔ یہ بھی 'غرور' کی ایک قسم ہے۔ تم انکسار ظاہر کرنا چاہتے ہو جب کہ اسی کی تم میں شدید کمی ہے۔ ارے بھئی نوجوانوں کی طرح غیر ذمہ دار ہو جاؤ۔ جو سمجھ میں آئے کہو۔ جو محسوس کرتے ہو لکھو۔ کل خیال اور احساس بدل جائے تو تم بھی بدل جاؤ۔ اور اپنی کہی ہوئی ہر بات کی تردید کر دو۔ یہ خیال کہ جب عرفان یا نروان حاصل ہو جائے گا تب لکھیں۔ ایک بوگس خیال ہے۔ ایک غلطی کرنے والا، اور غلطیاں کر کے اس کی اصلاح کرنے والا اس سے بہتر ہے جو غلطی کرنے کے ڈر سے کوئی کام ہی نہ کرے۔

نقالی کا مسئلہ یہ ہے کہ نقالی کے ڈر سے آزاد ہو جاؤ۔ جیسا لکھا جاتا ہے ویسا لکھو خواہ اس میں نقالی ہی کیوں نہ نظر آئے۔ نہ جب وہی لکھو گے جیسا لکھ سکتے ہو تو کچھ دن میں دیکھو گے کہ خود بخود تمہارا اسلوب ابھرنے لگے گا۔ نہ بالقصد نقالی کی ضرورت ہے۔ نہ نقالی کے خوف میں مبتلا رہنا کوئی اچھی بات ہے۔ بس کاغذ اور قلم اٹھاؤ اور فطری طور پر جو کچھ سوچتے یا محسوس کرتے ہو اسے

لکھنا شروع کرو۔ اسلوب کا خیال کیے بغیر۔ البتہ نقالی۔ شعوری نقالی اس وقت کرو جب مختلف اسالیب پر قابو پانے کا ارادہ کرو۔ مثلاً دو صفحے محمد حسین آزاد اور دو صفحے رتن ناتھ سرشار کی نقل میں لکھ کر دیکھو۔ یہ مشقیں میں نے بہت کی ہیں۔ نثر میں اور شاعری میں بھی۔ تم چاہو تو تم بھی کرو۔

پتہ نہیں تم کراچی کب تک واپس آؤ گے۔ اب کی آؤ تو یہ سوچ کر کہ تمہیں مجھ سے لڑنا ہے۔ جھگڑنا ہے۔ اختلاف کرنا ہے۔ یہ سب باتیں محبت اور عزت کو کم کیے بغیر ہو سکتی ہیں۔

تم نے لکھا ہے کہ تم کٹر قسم کے مقلد ہو۔ کاش کہ تم ہوتے۔

تمہارا ــــــ سلیم بھائی

○

پیارے جاوید، پرسوں تمہارا خط ملا تھا۔ جواب میں دو دن کی تاخیر ہو گئی۔ تم خط ہی ایسے لکھتے ہو جن پر غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم نے روایت اور شعریات کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ نہ صرف درست ہیں بلکہ بہت خیال انگیز اور غور طلب بھی۔ تم اس پر اپنے خیالات جمع کر کے ضرور لکھو۔ اردو تنقید کو ایسے مضامین کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا اسلوب ادبی ہونا چاہیے۔ تمہارے اسلوب میں ادبیت ذرا کم ہے گو اس کی تلافی علمیت سے ہو جاتی ہے۔ تاہم ادبیت پر زیادہ زور دو تو مناسب ہے۔

تمہارا انتظار تو پہلے بھی تھا اب اور شدید ہو گیا ہے۔ تم آؤ تو کام شروع ہو۔ شاعری کے بارے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا قول جدید شعریات کی ساری بنیادوں کو ڈھا دیتا ہے۔ میں اپنے طور پر اسی نتیجہ پر پہنچ چکا تھا اور "اقبال ایک شاعر" میں اس پر کچھ لکھ بھی چکا تھا۔ اب شاہ صاحب کے حوالے سے اس بات کو سند حاصل ہو گئی۔

الفاظ اور معنی کے رشتہ پر بھی بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں بھی بہت سے اوٹ پٹانگ خیالات لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ہو سکے تو اس پر کچھ لکھو۔ میرے نزدیک معنی بمنزلہ روح کے ہیں اور الفاظ بمنزلہ جسم کے۔ اور جسم پر روح کی فوقیت ظاہر ہے۔ لیکن عالم اجسام اور مرتبۂ ظہور میں الفاظ کو روح پر تقدم حاصل ہے تم اس پر کچھ لکھو گے تو میں اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کروں گا۔

تمہارا ــــــ سلیم بھائی

○

پیارے جاوید - دعائیں - ابھی سو کر اٹھا ہوں - اٹھتے ہی معلوم ہوا کہ تمہارا خط آیا ہے - میں شدت سے اس کا انتظار کر رہا تھا خوش ہو گیا اور خط ختم کرتے ہی تمہیں جواب لکھنے بیٹھ گیا - کل جمال بھی آئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ تمہارا کوئی جواب آیا ہے یا نہیں - وہ بھی تمہارے خط کے منتظر ہیں میری طبیعت کی طرف سے تم زیادہ فکر نہ کرو - اب اللہ کا فضل ہے ٹھیک ہوں - مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کو میں جانتا ہوں اور وہ میرے کسی رشتے سے بزرگ بھی ہیں - اب خدانخواستہ کوئی ضرورت ہوئی تو ان کے پاس چلا جاؤں گا۔

میں نے جس کتاب کے بارے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا ہے - وہ اصلاً غزل سے متعلق ہے جس میں روایتی غزل اور جدید غزل دونوں کا احاطہ کیا جائے گا لیکن غزل بھی بہرحال شاعری ہے - اس لیے شاعری کی بحث کا آنا بھی ناگزیر ہے - پہلا سوال تو یہی ہے کہ شاعری ہے کیا - اور شعر اور غیر شعر میں کیا فرق ہے - دوسری بحث یہ ہے کہ غزل کی شاعری کیا ہے - اور غزل کی ہیئت کی روایتی معنویت کیا ہے - تیسری بحث غزل کے رموز و علائم کی ہے - فارسی غزل اور اردو غزل کے فرق کی بحث بھی جیسا کہ تم نے لکھا ہے ضروری ہے - جو فرق تم نے نکالے ہیں وہ اہم ہیں لیکن صرف فرق بتانے سے کام نہیں چلے گا - یہ بھی بتانا ہوگا کہ فرق کیوں پیدا ہوا - میں ان سب باتوں پر کہیں نہ کہیں کچھ بحثیں کر چکا ہوں مگر وہ صرف میرے قیاسات تھے - اب قیاسات سے کام نہیں چلے گا - مستند لوگوں کی سند چاہیے - اس ضمن میں تمہاری مدد درکار ہے کہ ان مباحث سے متعلق جو باتیں تمہارے علم میں ہوں ان کے حوالے مجھے فراہم کرو - مثلاً تم نے ایک بار بتایا تھا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے نفسِ شاعری کے بارے میں کچھ کہا ہے - اس کا حوالہ چاہیے - مشکل یہ ہے کہ مغربی شعریات پر تو سب کچھ مل جاتا ہے - روایتی شعریات اور ان کے حوالوں کا پتہ نہیں چلتا اور اصل کام یہی ہے اس میں میری جتنی مدد کر سکو کرو۔

لفظ اور معنی کی جو بحث تم نے چھیڑی ہے اور میرے کسی فقرہ کا حوالہ دیا ہے - مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے نہیں کیا لکھا تھا - پوری عبارت لکھ کر بھیجو تو پتہ چلے - ویسے تم نے یہ ٹھیک لکھا ہے کہ لفظ اور معنی کی نسبت، معنی اور استحضارِ ذہنی کی نسبت سے زیادہ قوی ہے - لیکن اس کے باوجود میرا یہ خیال بھی ہے کہ معنی ذہن میں مستحضر ہوں تو انہیں الفاظِ مختلفہ میں بیان کیا جا سکتا ہے

کلیاتِ میر کی ضرورت ابھی نہیں ہے ابھی تو میں بنیادی بحثوں میں الجھا ہوا ہوں - انشاء اللہ جب تم آؤ گے تو کلیات بھی مل جائے گی - کتابیں تمہیں دینا بند کرنے کا کیا سوال ہے - میری ساری

کتابیں تمہاری ہیں۔ میں تم سے کوئی کتاب مانگتا ہوں تو اس لیے نہیں کہ وہ میری ہے بلکہ صرف اس لیے کہ اس کی ضرورت ہے۔ جواب جلد دینا۔

تمہارا ــــــ سلیم بھائی

○

پیارے جاوید۔ کل تمہارا بہت دلچسپ خط ملا۔ میں نے کئی دفعہ پڑھا اور پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ چلو تمہیں احساس تو ہوا کہ تم نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بالکل غیر فطری اور نادرست تھا۔ اب کانٹو ہر خول اتار کر آنا۔ عزت اور محبت مجھے بھی لوگوں سے ہے۔ عسکری صاحب کرار حسین صاحب سے میرا جو رشتہ تعلق اور رویہ رہا ہے وہ تمہیں معلوم ہے مگر میں تو دونوں سے بات بھی کرتا تھا سوال جواب بھی کرتا تھا اور جب ضرورت پڑتی تھی تو لڑتا بھی تھا۔ تعلقات کو فطری انداز میں قائم کرنا اور قائم رکھنا سب سے مشکل کام ہے۔ ہم سب ایک میکانکی رویہ بنا لیتے ہیں اور اس کے نتیجہ کے طور پر حقیقی تعلق نہیں پیدا ہونے دیتے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہاری ذہانت کا کتنا قائل ہوں اور اس کے ساتھ تم بہت کچھ پڑھتے بھی رہتے ہو اور تمہیں جو کچھ تم پڑھتے ہو وہ مستحضر بھی رہتا ہے۔ اتنی بہت سی خوبیوں کے بعد مجھے صرف تم سے "خاموشی" ملی تو یہ میرے ساتھ کتنا ظلم ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب تم آؤ گے تو گھنٹوں مجھ سے باتیں کرو گے۔ اور تمہارے دل و دماغ میں جو کچھ آتا ہے وہ مجھ سے بیان کرو گے میں اور جمال ۱۹ جون کو کویت جا رہے ہیں ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے۔ وہاں ہفتہ عشرہ قیام رہے گا۔ اس وقت تک انشاء اللہ تمہارا جواب بھی آجائے گا۔ لفظ اور معنی کے رشتے پر تم نے ابھی تک کچھ لکھا یا نہیں۔ جو کچھ لکھنا ہے جلدی لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ لکھنے بیٹھ جاؤ اور جو کچھ ذہن میں آئے بلکہ قلم سے ٹپکے وہ لکھتے جاؤ۔ جب لکھ چکو تو دیکھو کہ جو لکھا ہے وہ وہی ہے جو تم لکھنا چاہتے تھے۔ ترمیم کی ضرورت ہو تو ترمیم کر لو۔ ورنہ دوبارہ لکھو اور اس وقت تک لکھتے رہو جب تک تمہارے ذہن کی ہر بات لفظوں میں نہ آجائے۔ اور ادھر جمال نے تین مضمون بہت اچھے لکھے ہیں۔ کاش تم۔ میں۔ جمال۔ شمیم اور سراج مل جل کر ایسا کام کر سکتے جو وقت کا تقاضہ ہے کہ کیا جائے۔

تمہارا ــــــ سلیم بھائی

○

پیارے جاوید، ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ بھئی تم بھی کمال کے آدمی ہو، خود ہی خوش ہو جاتے ہو خود ہی ناراض ہو جاتے ہو اور دوسرے کو کچھ پتہ بھی نہیں چلنے پاتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں اب تم نے مجھے لکھا ہے تو مجھے ہنسی آ رہی ہے کہ تمہیں شکایت تھی کہ تم نے اظہار کیوں نہیں کیا۔ میں تو تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں اور اولاد کی طرح تمہیں عزیز سمجھتا ہوں یہ الگ بات ہے کہ تم سے مجھے جو توقعات تھیں وہ تم نے پوری نہیں کیں جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا رہتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم کچھ کام کرو۔ خدا نے تمہیں ذہانت دی۔ لکھنے کی صلاحیت دی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق دیا ہے۔ تم اس سے بہت کام لے سکتے ہو۔ دیکھو تمہارے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ تمہارا دین، تمہاری روایت، تمہاری قوم اور ملت سب خطرہ سے دوچار ہیں اور ایک بحران سے گزر رہے ہیں۔ ذرا سوچو کہ ان حالات میں تمہارا فریضہ کیا ہے۔ تم اگر کچھ کرتے تو ہم سب کو تقویت ہوتی اور فائدہ پہنچتا۔ بہر حال اس شکایت کے باوجود مایوس کبھی نہیں ہوا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ضرور ہے اور کوئی چیز اپنے وقت مقررہ سے نہ پہلے ہو سکتی ہے نہ بعد میں مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ تم سے کسی نہ کسی وقت کوئی کام ضرور لے گا۔

اقبال کے خطبات میرے پاس نہیں ہیں۔ اس لیے فی الحال میں وہ عبارتیں نہیں بھیج سکتا جن پر فتوے کی ضرورت ہے۔ مولانا   حج سے واپس آجائیں تو انشاء اللہ عبارتیں جمع کر کے انہیں بھیج دوں گا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتابوں کی فہرست کا شکریہ۔ انشاء اللہ یہ کتابیں میں جلد ہی منگوا لوں گا۔

تمہارا ـــــ سلیم بھائی

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم دانتے، رومی اور ملٹن کا تقابلی مطالعہ کر رہے ہو۔ میرے پاس ایک کتاب ہے جس میں دانتے پر کچھ اہم مضامین ہیں۔ تم جب کراچی آؤ تو یہ کتاب تمہیں مل جائے گی۔ ایک کتاب ملٹن پر بھی ہے وہ بھی تمہیں دے دوں گا۔ میرے پاس جتنی کتابیں بھی ہیں ان پر تمہیں پورا حق ہے۔ جو کتاب تم چاہو لے سکتے ہو۔ یہ خیال بھی ذہن میں نہ لاؤ کہ میں اس میں کسی ہیر پھیر سے کام لوں گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے بچے تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ خدا تم لوگوں کے درمیان اس محبت کو ہمیشہ قائم رکھے۔ میں ہمیشہ تمہارے لیے دست بدعا رہتا ہوں۔ خدا تمہیں ہمیشہ زندہ سلامت رکھے اور زندگی اور آخرت کے حسنات عطا فرمائے۔ آمین۔ جواب جلد دینا۔

تمہارا ـــــ سلیم بھائی

۱۲ جولائی ۸۲ء

بنام سہیل عمر

سلام علیکم

پیارے سہیل عمر! ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ زندیقی پر تمہارا مضمون چھپا ہے۔ لیکن جمال صاحب نے اس کی ایسی خبر لی ہے کہ تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔ ان کا مضمون فنون کو بھیج دیا گیا ہے۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ اس کی ایک کاپی تمہیں بھی بھیج دیں تاکہ تمہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔ فنون والوں نے عسکری صاحب کے خلاف جو مہم چلائی ہے انشاء اللہ وہ عسکری صاحب کے ہر مخالف کو ذلیل و رسوا کر کے ختم ہو گی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ جو لوگ عسکری صاحب اور ان کے مقصد سے متفق ہیں وہ کچھ کام کرنے پر تیار ہوں۔ ان کے شاگردوں سے مجھے کوئی امید نہیں۔ عسکری صاحب نے ان پر جو کچھ کام کیا وہ سب کا سب ضائع ہو گیا۔ اب تو جو کچھ کرنا ہے وہ ہمیں آپ کو کرنا ہے۔ سراج، آپ، جمال، احمد جاوید، شمیم احمد اگر کمر ہمت باندھیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور انشاءاللہ عسکری صاحب اور عسکری صاحب کے مقصد دونوں کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک طرف تو اشتراکی دہریوں سے فکری محاذ پر جنگ کی جائے، دوسری طرف جدیدیوں کی خبر لی جائے اور تیسری طرف ان لوگوں کا پردہ چاک کیا جائے جو بظاہر مسلمان بنتے ہیں مگر جن کا اسلام مغربیت کا ایک چربہ ہے جیسے محمد عثمان وغیرہ۔ زبیر بن عمر کی قسم دوسری ہے۔ لیکن ان لوگوں کی غلط فکری کا علاج بھی ہونا چاہیے۔ زبیر بن عمر صاحب کا جو جواب جمال صاحب نے دیا ہے وہ آپ نے پڑھ لیا ہو گا۔ آپ لوگ بھی اسی طرح ہر قابل ذکر بات کا نوٹس لیجئے اور ہر قسم کے عالمانہ، محققانہ، مناظرہ بازانہ (جس وقت جیسی چیز کی ضرورت ہو) مضامین لکھیے۔ میں اپنے طور پر جو کچھ کر رہا ہوں اس کے طریق کار میں یقیناً کچھ غلطیاں ہوں گی لیکن آپ سب مل کر کام کریں گے تو میری خامیوں سے ہمارے مشترک مقصد کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں، میں نے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ صرف ایک مضمون میں جو عسکری صاحب کی زندگی میں عسکری صاحب کو مخاطب کر کے یہ سوال ضرور اٹھایا تھا کہ آپ کی فکر کی روشنی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کیا ہو گا۔ ایک اور مضمون میں میں نے یہ ذکر کیا کہ عسکری صاحب نے میرے مضمون کا تحریری جواب نہیں دیا لیکن زبانی کہا کہ نماز پڑھو۔ اس کے سوا یہ بحث کسی مضمون میں نہیں اٹھی ہے اور اس معاملہ میں میری رائے محفوظ ہے۔ زبیر بن عمر صاحب کا یہ کہنا کہ میں نے کوئی ایسی بات کی ہے، صرف غلط بیانی ہے۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ عسکری صاحب اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے سائنس اور ٹیکنالوجی کے خلاف ہے اس لیے سلیم احمد کی رائے بھی یہی ہو گی۔

تمہارا سلیم بھائی

انور سدید

سلیم احمد۔ خطوط کے آئینے میں

سلیم احمد اردو ادب کی ان معدودے چند شخصیات میں سے تھے جن کے پاس کہنے کے لیے وسیع علمی مواد کا وسیع ذخیرہ موجود تھا بلکہ جو بات کرنے کے لیے اپنا ایک منفرد انداز بھی رکھتے تھے۔ ان کے اظہار کی اولین تخلیقی صنف تو شاعری تھی لیکن انہوں نے تنقید کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی۔ وجہ یہ کہ سلیم احمد ادب اور زندگی کے بارے میں ہمہ وقت سوچنے والے ادیب تھے۔ وہ درست اور نادرست، صحیح اور غلط کے درمیان جو وسیع خلیجیں حائل ہیں انہیں پاٹنے کی کوشش کرتے اور اس سفر میں صداقت کی کوئی چھوٹی سی کرن تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو طمانیت محسوس نہ کرتے بلکہ تازہ مطالعے کی روشنی میں اس کرن کو تشکیل دینے والے مختلف رنگوں کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ چنانچہ ان کے ہاں صحیح کی جستجو اور غلط کی تکذیب ایک مسلسل عمل ہے۔ اس عرصے میں اگر وہ کسی بڑے خلا سے دوچار ہو جاتے تو اس خلا کو پر کیے بغیر آگے نہ بڑھتے خواہ اس عمل میں انہیں اپنی عمر عزیز کے کئی سال ہی کیوں نہ صرف کرنے پڑتے۔ اس تمام عرصے میں وہ بظاہر Hibernation کے عمل سے گزرتے لیکن ان کا ذہن الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں مصروف رہتا۔ وہ نئی نئی کتابیں تلاش کرتے، مفکرین عالم سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ محمد حسن عسکری کا فیض صحبت اٹھاتے اور دلیلوں و وضاحت طلب باتوں کو فکر کے درجے پر پہنچا کر دم لیتے۔ کھوج کے اس سفر میں شاعری سے زیادہ تنقید نے ان کی مدد کی۔ چنانچہ شاعری میں جو سلیم احمد ہمارے سامنے آئے ہیں وہ تنقید نگار سلیم احمد سے خاصے مختلف ہیں۔ ان کی شاعری میں بعض اوقات فحش اور سطحی جنسی باتیں بھی در آتی ہیں لیکن ان سے اختلاف کرنے والے ادبا بھی ان کی تنقید کے بارے میں برملا کہتے ہیں کہ

"ان کی تنقیدیں چاہے نظری ہوں یا عملی —— نقطۂ نظر کے اچھوتے پن سے کبھی خالی نہیں

ہوتے ہیں اور ان کا کمال نقطۂ نظر کے اچھوتے پن میں نہیں بلکہ نظر کی گہرائی میں ہے"۔

مجھے یہ بات بالخصوص متاثر کرتی ہے کہ قلم کو معاش کا ذریعہ بنانے کے باوجود سلیم احمد نے ادب کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دی، وہ فکر میں ہمہ وقت مستغرق رہنے والے ادیب تھے اور بعض اوقات تو مجھے یہ شبہ بھی ہوتا کہ انہوں نے اپنی شہری شخصیت کو یکسر تیاگ دیا تھا۔ وہ کراچی جیسے بڑے شہر کے باسی تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی بے معنی اور بے زبان کارروائیوں میں سلیم احمد کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے کراچی سے بھی ایک بڑا شہر ادب اپنے دل میں بسا رکھا تھا، ان کے افکار کی دنیا الگ تھی، ادبا و شعرا جو اس شہر کی صنعتی، تجارتی اور کاروباری تاریکیوں سے نکلتے تو سلیم احمد کے گھر کا رخ کرتے۔ دو چار گھڑی آرام کرتے۔ ادب کے مختلف موضوعات پر ان کی باتیں سنتے ان سے تبادلۂ خیالات کرتے، دن بھر کی مشقت کا زنگ اتارتے اور پھر اپنی اپنی راہ لیتے۔ محمد حسن عسکری کے بعد سلیم احمد کراچی کے ادیبوں کا ملجا اور ماوا تھے۔ پورا کراچی انہیں سلیم بھائی کہتا اور تسلیم کرتا تھا۔ گزشتہ چند سالوں کے عرصے میں کراچی سے جتنے ادبی اور علمی ہنگامے اٹھے ہیں ان میں سے بیشتر کے پس پشت سلیم احمد کا متجسس اور فکر مند چہرہ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

سلیم احمد ان خوش قسمت نقادوں میں سے تھے جن کے تنقیدی افکار پر ان کی زندگی میں بحث ونظر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا۔ ہمارے ہاں ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو تنقید کی اساس غلط مفروضوں پر رکھتے ہیں لیکن جب غلطی ہائے مضامین کا شمار کیا جاتا ہے تو اپنی تنقید کو زائل ہونے کا اعزاز بھی خود ہی عطا کر دیتے ہیں۔ سلیم احمد حقیقی معنوں میں نزاعی نقاد تھے کہ ان کی تنقید نے مقبولِ عام نظریات سے انحراف کیا تو اس کے لیے ٹھوس اور بامعنی دلیل بھی فراہم کی اور اس عمل میں ذاتیات کو قریب پھٹکنے کی اجازت نہ دی ان کے ہاں بلاشبہ ایک مخصوص عصبیت موجود تھی لیکن وہ اس عصبیت کو موضوع کو کھنگالنے اور حقیقت کے نئے گوشے آشکار کرنے میں صرف کرتے۔ چنانچہ وہ چونکاتے بھی تھے اور حیرت زدہ بھی کر دیتے تھے۔ ان کا نیا مضمون شائع ہوتا تو خیبر سے راس کماری تک غلغلہ بپا ہو جاتا، ان کا چٹ پٹا استدلال کسی ایک جملے میں مرتکز ہو کر ادب کی کائنات کو لرزہ براندام کر دیتا اور پھر کئی دنوں تک سلیم احمد کی بازگشت ادبی دنیا میں گونجتی رہتی۔

ادبا کے ایک وسیع حلقے نے سلیم احمد میں دلچسپی لی اور ان کی تنقیدوں کو موضوعِ بحث بھی بنایا۔ سلیم احمد کو پسند کرنے والے انہیں چٹخارے لے لے کر پڑھتے اور ان کے مخالفین قروتی نکال کر ان پر چڑھ دوڑتے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دور میں جتنا کچھ سلیم احمد کے خلاف لکھا گیا ہے اتنا ان کے حق میں شاید

نہیں لکھا گیا۔ چنانچہ وہ سلیم احمد جو گوشت پوست سے بنا ہوا اور حواس خمسہ کے علاوہ چھٹی حس اور تیسری آنکھ کو بیدار رکھنے والا ادیب تھا ہماری نظر سے پوشیدہ ہی رہا۔ وجہ یہ کہ سلیم احمد نے ادب اور زندگی کے بیشتر الجھے ہوئے مسائل پر تو کھل کر اظہار خیال کیا لیکن اپنی ذات کو کبھی موضوع نہیں بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیم احمد اپنے لمحۂ رحلت تک معاشرے کے Odd man out ہی رہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سلیم احمد معاشرے سے کٹے ہوئے انسان تھے یا وہ ایک ادبی راہب کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور انہوں نے اپنی ذات کو پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلیم احمد نے آزادی کے بعد کے ہنگامی دور میں بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ ادبی، سیاسی اور ثقافتی مسائل پر بلا خوف و خطر قلم اٹھایا تو اپنی ذاتی زندگی کو بھی منکشف کیا۔ اول الذکر عمل میں ان کا روئے سخن عوام کی طرف تھا لیکن مؤخر الذکر عمل میں ان کے شریک کلام چند خاص الخاص دوست تھے اور اظہار کا وسیلہ رسائل و اخبارات کے بجائے خطوط تھے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور بے تکلف انداز میں لکھے[*] اور ان میں اپنے جملہ مسائل اور ذہنی کیفیات کا ذکر کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔

مجھے علم ہے کہ سلیم احمد کے دوستوں اور چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ کراچی کے ادبا تو ان کے ارباب مجلس تھے اور بالعموم ہر شام ان کی محفل میں شریک ہوتے تھے۔ کراچی سے باہر کے دوستوں سے ان کی گفتگو کا ایک وسیلہ خطوط نگاری بھی تھا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ سلیم احمد کے دوستوں نے تا حال ان کے خطوط منظر عام پر لانے کی طرف توجہ نہیں کی[*]۔ ادبی دنیا کو پروفیسر نظیر صدیقی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے سلیم احمد سے ایک طویل عرصہ تک خط و کتابت کی اور ان کے بیشتر خطوط کو محفوظ رکھا[*]۔ نظیر صدیقی کے نام سلیم احمد کے خطوط کا ایک قابل قدر ذخیرہ حال ہی میں جناب مصطفیٰ راہی کی مرتبہ کتاب ''نامے جو مرے نام آئے'' میں چھپ کر سامنے آ گیا ہے[*] اور فی الحال یہ واحد ماخذ ہے جس سے ہم نہ صرف سلیم احمد کی زندگی کے بعض غیر روشن گوشوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کی نفسیات کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ ان خطوط میں اس عہد کی بعض ادبی شخصیات اور مسائل پر سلیم احمد کی غیر روایتی اور خالصتاً ذاتی آرا بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔

میں نے زیر نظر مضمون میں سلیم احمد کو سمجھنے اور ان کی شخصیت تک رسائی حاصل کرنے کی جو مقدور بھر کوشش کی ہے اس میں خطوط کے متذکرہ دستیاب ذخیرے کو ہی روزن کے طور پر استعمال کیا ہے اور مجھے اس بات پر قطعاً حیرت نہیں ہوئی کہ ان کی سماجی زندگی اور ادبی زندگی میں کوئی نمایاں تضاد نہیں تھا۔ ان کے بیشتر لمحات زندگی مطالعہ اور مشاہدہ میں صرف ہوتے تھے۔ علم ان کے نزدیک عرفان کا وسیلہ

تھا، وہ عرفان کی تلاش میں ہمہ وقت محو رہنے اور کبھی نہ تھکنے والے ادیب تھے۔ اہم بات یہ کہ انہوں نے ادبی مسائل پر اظہارِ رائے میں اپنی ایک مخصوص بوطیقا مرتب کر رکھی تھی۔ اور وہ اس بوطیقا کے اصولوں پر بڑی سختی سے عمل کرتے۔ ستائش باہمی ایک قابلِ مذمت رجحان ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس رجحان کی افزائش ہمارے اس عہد میں سب سے زیادہ ہوئی ہے اور آج کا ادیب جتنا بڑا ہے۔ ستائش طلبی میں اتنا ہی حریص ہے اور وہ منافقت کے اس جھوٹ کو قبول کرنے پر بھی آمادہ ہے جو اس سے کمتر درجے کے ادیب کتابوں، تعارفی تقریبوں اور "ایک شام" کی محفلوں میں برملا مصنف کے سامنے بولتے ہیں سلیم احمد اس قسم کی بے معنی مبالغہ آمیز، غیر مدلل اور بے جواز مداحی سے گریز کرتے تھے۔ وہ دوستوں کو ایک دوسرے کی خامیاں عیاں کرنے کی دعوت دیتے اور اگر ان کے خلاف کوئی دوست قلم اٹھاتا یا ترکی بہ ترکی جواب دیتا تو خفا نہ ہوتے۔ نظیر صدیقی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ”قابلِ تعریف باتوں کے سلسلے میں ہمارے درمیان ایک ان لکھا معاہدہ ہونا چاہیے کہ ان کے وجود کو تسلیم شدہ سمجھا جائے ان باتوں کا ذکر ہم کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کریں گے اور وہ بھی حاشیے میں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی خامیوں کو بے دھڑک ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔“ [illegible]

سلیم احمد کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ رائے کا آزادانہ اظہار خوفِ فسادِ خلق کے علاوہ دوستوں کا ناطہ توڑنے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دوسروں کو بھی دعوت دیتے کہ وہ ان کا منہ توڑ جواب دیں اور ان کے اعتراضات کو من و عن تسلیم نہ کریں۔ لکھتے ہیں کہ:

> ”یہ گفتگو میرے اور آپ کے درمیان ہے۔ ہم اس پر بحث کر سکتے ہیں اور تبدیلیِ رائے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ آپ میرے اعتراض کی سختی سے تردید کیجیے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں بھی انشاءاللہ سخت جواب دوں گا۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کو اپنے خیالات لکھتے رہیں گے۔ باہمی خط و کتابت کا مقصد اگر یہ نہیں ہے تو پھر اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ دو لکھنے والوں کو جب وہ ایک دوسرے کو سچ مچ کا لکھنے والا ہی سمجھتے ہوں تو اس سے کم پر راضی نہ ہونا چاہیے۔ خدا کرے آپ برا مان جائیں اور مجھے کوئی ایسا خط لکھ دیں جو آپ کے مضامین کی طرح متوازن نہ ہو۔ پھر ہم ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک آجائیں گے!“ [illegible]

بالفاظِ دیگر اختلافِ رائے اور خامیوں کی نشاندہی سلیم احمد کے نزدیک ایک صحت مند عمل ہے۔ وہ اس عمل کو خود بھی آزماتے تھے اور دوسروں کو استعمال میں لانے کی کھلی اجازت بھی دیتے تھے۔ اپنی بات کہنے کے لیے وہ مکمل آزادی کے طلبگار تھے، لیکن انہیں دوسروں کی زبان بندی بھی گوارا نہیں تھی اور اگر ان کی

تنقید کا کسی گوشے سے جواب آجاتا تو جیسے شانت ہو جاتے کہ ان کی بات سنی گئی۔ اس پر غور کیا گیا اور تنقید نگار نے اس کا مناسب جواب فراہم کر کے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی۔ دوسری طرف ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی بے حد تعجب انگیز ہے کہ ان کے اختلاف رائے کا جواب نہ آتا تو وہ قدرے پریشان بھی ہو جاتے اور سوچنے لگتے کہ ان کی تحریر سے شاید فریق مخالف کو تکلیف پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ وہ قطع تعلق کی بجائے مکالمے کی راہ نکالتے اور تعلقات کی ڈور کو ٹوٹنے نہ دیتے۔ نظیر صدیقی کا مضمون "اظہار یا ابلاغ" شائع ہوا تو سلیم احمد نے اس کے بہت سے نکات سے شدید اختلاف کیا۔ اس اختلاف کے پس پشت بھی ایک صحت مند جذبہ کام کر رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے نظیر صدیقی کو لکھا:

"میں تمہاری طرف سے کافی تشویش میں ہوں یعنی تمہاری تحریروں کی طرف سے جب سے تم کراچی آئے ہو اور تم نے جو کچھ لکھا اس میں واضح طور پر ایک انحطاط تھا۔ میں اسے شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ جس نفسیاتی کیفیت میں ہو اگر اس پر قابو نہیں پاؤ گے تو اندیشہ ہے کہ تحریر پر بھی اثر پڑے گا اور مطالعے کی رفتار بھی متاثر ہو گی۔ سچ پوچھو تو جو مضمون میں نے تمہارے خلاف لکھا ہے اس کے پیچھے میرا ایک تجزیہ ہے جس کی روشنی میں میں تمہیں ایک شاک لگانا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اندر جو محرکات برائے عمل ہیں ان میں ایک عملی ناآسودگی ہے جسے تم علمی تشنگی سمجھتے ہو اور زندگی کی تلافی ادب سے کرنا چاہتے ہو۔ یہ ذہنی کیفیت میرے نزدیک خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اسی لیے میں تم سے بار بار کہتا رہا کہ کچھ عرصے کے لیے ارادی طور پر لکھنا پڑھنا دونوں بند کر دو۔ اس میں ارادی کی شرط ہے۔ تم نے میرے تجزیے سے اتفاق نہیں کیا۔ دوست کون ہے اس کا اندازہ آگے چل کر ہی ہو سکے گا۔ بہرحال میری تمہاری دوستی کسی منافقت پر تو قائم ہے نہیں جو کوئی اندیشہ ہو۔ میں تم سے ہر بات کہہ سکتا ہوں اور تمہاری ہر بات کو سن سکتا ہوں۔ زندگی میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن سے میرا اتنا کھلا ہوا ذہنی تعلق ہے۔"[۱۳]

خوبی کی بات یہ ہے کہ سلیم احمد اختلاف رائے کا پس منظر بیان کرنے اور مکتوب الیہ کے انحطاط کا تجزیہ کرنے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوئے اور نظیر صدیقی کو دعوت دی کہ وہ اس کا سخت سے سخت جواب لکھیں۔ تاکہ سلیم احمد کے دل سے یہ کھٹک نکل جائے کہ متذکرہ اختلافی مضمون سے نظیر صدیقی کو تکلیف پہنچی ہے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے سلیم احمد لکھتے ہیں:

"جب سے گئے ہو بہت یاد آ رہے ہو۔ افسوس اس کا ہے کہ تم ایک ایسے وقت میں روانہ

ہوئے۔ جب میں یہ نامعقول مضمون[۱۶] لکھ چکا تھا۔ کچھ لوگ اسے طرح طرح کے رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا سخت سے سخت جواب دے دو، تاکہ میرے دل سے یہ خیال نکل جائے کہ میں نے تمہیں کوئی تکلیف پہنچائی ہے اور ایسی تکلیف جو میرا منشا نہیں گالیاں کھانا تو میرا پیشہ ہے۔ جتنی چاہو دو، اور اب تو یہ تمہارا حق ہے۔"[۱۷]

اور ایک دفعہ[۱۸] سلیم احمد نے یہ اعتراف بھی کیا کہ

"اس میں شک نہیں ہے کہ تم جتنے بڑے میرے نکتہ چیں ہو، اتنے ہی بڑے میرے قدر دان بھی ہو، مجھے تمہارے اختلافات سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن میں نے انہیں ہمیشہ پرخلوص دیانتدارانہ اور قابل توجہ سمجھا ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ خدا نے مجھے ایک ایسا دوست دیا ہے جو میرا اتنا کڑا ناقد اور میرا اتنا کڑا مداح ہے"[۱۹]

سلیم احمد کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر صدیقی نے سلیم احمد کی سب باتوں کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اپنے نقطۂ نظر کا دفاع اپنے ہتھیاروں سے کیا اور یہ اختلاف چونکہ فکری اور علمی تھا اور ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہوتا تھا اس لیے ترکِ تعلق پر منتج ہونے کے بجائے دوستی کے رشتے کو مضبوطی سے قائم رکھنے میں بھی معاون بنا۔ وجہ یہ تھی کہ سلیم احمد بامعنی اختلاف کو بے معنی اتفاق سے زیادہ قیمتی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے مضامین کے بارے میں تمہاری جو کچھ رائے ہو اسے معلوم کر کے مجھے خوشی ہوگی، میرے اور تمہارے درمیان بہت سے اختلافات ہیں اور ہونے بھی چاہئیں، لیکن بامعنی اختلاف بے معنی اتفاق سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی کچھ تحریروں سے تمہیں دکھ پہنچایا ہے۔ لیکن شاید یہ اچھا ہوا کہ تم نے جواب دے دیا اور بات وہیں ختم ہوگئی۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ میں تمہیں دوست اور عزیز رکھتا ہوں۔"[۲۰]

سلیم احمد کے نزدیک ذاتی خط کا مقصد صرف مداحی نہیں تھا بلکہ وہ خط کو حقیقت کا آئینہ بنانے اور دوست کو اس آئینے میں وہ چہرہ دیکھنے کی دعوت دیتے جو سلیم احمد پر منعکس ہوا تھا۔ اپنی رائے کے اظہار میں سلیم احمد بہت کھرے، بے ریا، بے دھڑک اور بے باک نظر آتے ہیں اور اکثر اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ادب کی قدروں کو دوسری تمام قدروں پر فوقیت دے رکھی ہے اور دوستوں کی تحریروں کے مطالعے کے دوران انہیں جہاں بھی خامی نظر آتی ہے، اس پر فوراً انگلی رکھ دیتے ہیں، یہ

صورت نظیر صدیقی کے نام لکھے گئے خطوط سے بھی عیاں ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب "تأثرات اور تعصبات" شائع ہوئی تو ایک خط میں انہوں نے اس کتاب کی رسید ان تحسین آمیز الفاظ میں دی :

"کتاب کا نام مجھے پسند آیا اور چونکہ رسم کا صاحب رسم پر گہرا اثر پڑتا ہے اس لیے یقین ہے کہ خود کتاب بھی پسند آئے گی۔ ویسے آپ کی نثر و نظم اکثر رسالوں میں دلچسپی سے دیکھتا رہتا ہوں۔ سادگی تو اس زمانے کی بہت سی نثر میں مل جائے گی مگر فقرے میں جان ہونا اور بات ہے۔ آپ کی تحریر جاندار ہے اور آپ متوازن رائے رکھتے ہیں۔"

لیکن جب سلیم احمد اس کتاب کے مطالعے سے گزرے تو انہیں مصنف کی کئی ناہمواریاں بھی نظر آگئیں اور ایک دوسرے خط میں انہوں نے ان ناہمواریوں کو بھی بلا کم و کاست اجاگر کر دیا۔ انہوں نے لکھا

"میں نے "تأثرات و تعصبات" کے کئی مضامین دیکھ ڈالے۔ یگانہ، ماتسیح، فیض اور عالی تفصیلاً پڑھ چکا ہوں۔ باقی پر ابھی سرسری نظر ڈالی ہے۔ خیر دیگ کا اندازہ تو ایک چاول سے بھی ہو جاتا ہے ...... مجھے آپ کی کتاب میں تأثرات تو ملے مگر تعصبات ہاتھ نہیں آئے تعصب غیر منطقی اور غیر استدلالی چیز ہے۔ یہ اتنی شدت سے بھیجا جاتا ہے اور بیشتر جوہری یا عنصری ہوتا ہے۔ آپ انسان کا استدلال اس سے نہیں چھین سکتے۔ تعصب نہیں چھین سکتے۔ آپ کے تعصبات اگر ہیں بھی تو آپ نے انہیں پالتو قسم کی چیز بنا دیا ہے۔ جو مضامین میں نے پڑھے ہیں ان کی سب سے بڑی خوبی توازن ہے۔ لیکن اس توازن کی آپ نے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اس نے آپ کے خیالات کو اور ساتھ ہی طرز بیان کو بہت رسمی بنا دیا ہے۔ ان سے مصنف کی معقولیت کا اظہار تو ہوتا ہے لیکن ادب کی کسی بھی صنف کو صرف معقولیت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ ان میں کسی اضطراب کا، تلاش کا، جمی جمائی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دینے کا تاکہ نئی معنویت کا سراغ ملے یا اس سنت ابراہیمی کا جو ادب میں مسلّم اقدار کے بتوں کی ناک کاٹتی ہے تاکہ کسی نئی وحدت کی طرف اشارہ کرے کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سب معلوم باتیں کہی گئی ہیں، کہنے کا انداز سلجھا ہوا ہے۔ سلاست، روانی، وضاحت سب کچھ موجود ہے۔ مگر کوئی ایسی چیز غائب ہے جس کے بغیر تحریر نون جاتی ہے وہ چیز نہیں بنتی جسے میں ادب میں ڈھونڈتا ہوں۔ پتا نہیں میں اپنی بات کہہ سکا ہوں یا نہیں۔ لیکن اپنا مجموعی تأثر میں ایک جملے میں ادا کر سکتا ہوں۔ ان مضامین میں مجھے "درسی مضامین" کی بو آتی ہے۔ رائیں صحیح اور درست ہیں، محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ

لکھنے والے کا ذوقِ سلیم ہے۔ وہ کیاب چیز بھی موجود ہے جسے ادبی دیانت کہتے ہیں۔ زبان اور بیان پر بھی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ مگر مضامین کی روح مدرسانہ ہے۔ یہ بڑا سخت آزار ہے۔ کیا آپ اس سے نکل نہیں سکتے؟"[۵۹]

نظیر صدیقی کی کتاب "حسرت اظہار" شائع ہوئی تو انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنی رائے بے دھڑک لکھ دی۔

"حسرت اظہار" پر میری رائے تمہیں معلوم ہے۔ شاعری تمہاری طاقت نہیں کمزوری ہے"[۶۰]

ایک اور جگہ اپنی رائے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"یار! میں نے یہ کب کہا کہ سیدھی سادی باتیں بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں۔ کہا ہو تو مجھے یاد نہیں، میں تمہیں کند ذہن تو نہیں سمجھتا۔ سمجھتا تو کہہ دیتا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ نظیر صدیقی سیدھی سادی باتوں کا بادشاہ ہے"[۶۱]

سلیم احمد کے ان اقتباسات میں خاصی جراحت ہے ان کا ذائقہ کڑوا ہے۔ ان کی باتیں پڑھنے والے کے تالو سے چپک جاتی ہیں لیکن یہ اس مدلل مداحی سے یقیناً بہتر ہیں۔ جس کے تحت مصنف کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ ہنٹیل کی بڑی پلیٹ میں رکھا ہوا سونے کا ڈلا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ سلیم احمد، ورد و تنقیص کرنے ہی کے عادی تھے اور ان کے ہاں اچھے نکتہ پر کھل اٹھنے کا انداز موجود نہیں۔ سلیم احمد نے نفی اور اثبات سے اپنی رائے کو متوازن بنانے کی شعوری کوشش کبھی نہیں کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مطالعے کے دوران انہیں صداقت کی کرن جس انداز میں بھی نظر آتی اس کا اظہار اس کرن کی نوعیت کے اعتبار سے کر دیتے۔ چنانچہ معاصر ادبا کے بارے میں ان کی آرا نفی اور اثبات کی نہایتوں پر ہی سفر کرتی ہیں اور وہ ان کی پردہ پوشی ہرگز نہیں کرتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زمانے کے پل سے بہت سا پانی ڈھلوان کے زیریں طرف بہ جانے کے بعد بھی جب ہم سلیم احمد کی آرا کو پڑھتے ہیں تو یہ حقیقت سے بعید نظر نہیں آتیں اور ان میں صداقت کا خطیر عنصر موجود ملتا ہے چنانچہ شخصیت کو پہچاننے میں سلیم احمد نے جو غیر معمولی صلاحیت ظاہر کی ہے۔ اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ "نثری نظم" کا غلغلہ بپا ہوا تو اس شور میں کئی معروف شعرا نے بھی اپنی آواز شامل کرنے کی کوشش کی۔ سلیم احمد نے اس قسم کی شعری نثر پر اظہار رائے کیا تو ان معروف شعرا کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ لکھتے ہیں کہ

"پروز پوئم کے بارے میں تمہارا یہ خیال درست ہے کہ وہ پورے ملک کے شاعروں میں بہت مقبول ہو رہی ہے۔" اوراق" میں وزیر آغا صاحب نے اس پر باقاعدہ بحث

بھی کروائی۔ سنا ہے کہ فیض صاحب بھی ایک انٹرویو میں "پروز پوئم" پر بولے۔ انہوں نے کہا "پروز پروز ہے اور پوئٹری پوئٹری ــــــ اس لیے پروز پوئم کوئی چیز نہیں ہے لیکن اگر ہمیں اسے لاعروضی نظم کہہ لیں تو فیض صاحب کا اعتراض رفع ہو جائے۔ راشد صاحب نے بھی کئی لاعروضی نظمیں لکھیں مگر بالکل بیکار۔ افتخار جالب، عباس اطہر، انیس ناگی ان سب کی کوششیں بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن میرے خیال میں سب سے اچھی لاعروضی نظمیں احمد ہمیش نے لکھی ہیں"[۲۲]

اس ضمن میں انہوں نے اپنے ایک معاصر قمر جمیل پر بھی تبصرہ کیا اور یہ تبصرہ قینچی کی کاٹ کی طرح تیز اور ریزو کے بلیڈوں کی طرح کرارا ہے لیکن بین السطور دیکھئے تو سلیم احمد نے قمر جمیل کی متزلزل مزاجی کا تجزیہ بے ساختہ انداز میں کر دیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"قمر جمیل بیچ میں خواہ مخواہ کود پڑے ہیں اور ابھی تک ایک بھی قابل ذکر لاعروضی نظم نہیں لکھ سکے ہیں۔ ویسے کراچی میں انہوں نے اس کے نظریہ ساز کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جو میرے خیال میں ان کے استحقاق سے زیادہ ہے۔ ایک زمانے میں جب وہ محبوب خزاں کے اثر میں تھے تو موسیقی ہی کو شاعری کا اہم ترین جزو تصور کرتے تھے۔ اب وہ اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کسی سچے ادیب اور شاعر کے نظریات اس طرح جمعرات کے جمعرات بدلا نہیں کرتے"[۲۳]

محب عارفی کی کتاب "چھلنی کی پیاس" پر رائے زنی کرتے ہوئے سلیم احمد نے اگرچہ پھولوں کا قلم پکڑ رکھا ہے لیکن ان کی انفرادیت اور آزادی پر کوئی حرف نہیں آیا۔ اور وہ نظیر صدیقی کے دکھائے ہوئے جادے پر چلنے کے بجائے اپنا راستہ خود تراشتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسرے اقتباس میں تو ان کی رائے مرچیلی بھی ہو گئی ہے:

"چھلنی کی پیاس" میں نے الٹ پلٹ کر دیکھی، تمہاری رائے درست ہے کہ یہ ذرا مختلف قسم کی شاعری ہے لیکن مجھے زیادہ مزا نہیں آیا۔ میں محب صاحب کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان کے علمی ذوق اور ذہنی تجسس کا قائل ہوں۔ لیکن ان کی شاعری مجھ سے زیادہ نہیں چلتی"[۲۴]

محب صاحب کی کتاب "چھلنی کی پیاس" کے بارے میں شمیم احمد نے مجھے بھی لکھا تھا کہ

اس پر فرخ جمیل کا فلیپ نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ میری اچھی بھی سمجھ آگئی ہے۔ بہر حال یہ سالے بہنوئی کا معاملہ ہے۔[۲۵]

سلیم احمد معاصر آرا کو نہ صرف غور سے سنتے تھے بلکہ انہیں اہمیت بھی دیتے تھے لیکن جب دیکھتے کہ ادب ادب کے منصب سے گر کر سیاسیات اور ذاتیات میں الجھنے لگا ہے تو وہ اس پر تشویش کا اظہار کرتے اور اس کے پس پردہ چھپے ہوئے محرکات کو بھی تلاش کرتے لیکن جب انہیں یقین ہو جاتا کہ ادیب منافقت کا شکار بن گیا ہے تو جھنجھلانے کے بجائے صبر و شکر سے کام لیتے۔ اس قسم کی صورت فضیل جعفری اور صفدر میر اور دیگر معاصرین کے ذکر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"صفدر میر کا کالم میں نے پڑھ لیا۔ بڑی واہیات اپروچ ہے۔ انہوں نے میرے مضامین کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور علمی بات کرنے کے بجائے صحافتی اشتعال انگیزی سے کام لیا ہے۔ صفدر میر سے یہ امید نہیں تھی۔ بہر حال اللہ مالک ہے۔"[۲۶]

"فضیل جعفری صاحب کا مضمون پڑھ چکا ہوں۔ اس مضمون میں میرے خلاف اتنا جوش اور جذبہ تھا کہ جس سے شخصی عناد کی بو آتی تھی۔ انہیں مجھ سے یہ عناد کیوں پیدا ہوا اس کی وجہ نامعلوم ہے۔ لیکن بہر حال مجھے تو اس سے بھی خوشی ہوئی کہ صرف پاکستان ہی میں نہیں ہندوستان میں بھی میرے کرم فرما موجود ہیں۔"[۲۷]

"گزشتہ اتوار کو میں نے حلقہ ارباب ذوق میں ایک مضمون "ضمیر کا بحران" کے عنوان سے پڑھا تھا۔ اس ہفتے یا اگلے ہفتے "اداکار" میں شائع ہو رہا ہے۔ ذرا ایک نظر دیکھتا رہیاں اس مضمون پر بڑی لے دے ہوئی اور یہ اب تک مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں اس سے طرح طرح کے مقاصد منسوب کیے جا رہے ہیں۔"[۲۸]

"یہاں "غالب کون" پر غم و غصہ کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس کی توقع بھی تھی۔ اردو تنقید سچ بولنے کو گناہ سمجھتی ہے۔"[۲۹]

"جسارت" میں میرے خلاف جو ہنگامہ ہو رہا ہے اس نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ جس طرح

میری آدھی زندگی ترقی پسندوں سے لڑتے گزری ہے شاید اسی طرح باقی آدھی زندگی نام نہاد
اسلام پسندوں سے لڑتے گزرے گی۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے بہت سے
روگ پال لیے ہیں اور ہر ایک سے انصاف کرنے کے لیے نہ میرے پاس قوت ہے،
نہ وقت، اللہ مالک ہے۔"[۴۱]

اور اب صفدر میر کے متذکرہ الزام پر ان کا "عذرِ گناہ" اور سلیم احمد کا ردِعمل ملاحظہ کیجئے، صاف نظر آتا ہے
کہ سلیم احمد اس سے اکتسابِ مسرت کر رہے ہیں:

"صفدر میر صاحب کا پیغام آیا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد میری مخالفت نہیں
ہے بلکہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مولانا مودودی کی مخالفت میں لکھا گیا ہے۔ ہے نا مزے کی بات؟"[۴۲]

سلیم احمد کی ثابت نفس اور صبر و شکر کے ضمن میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ سلیم احمد زندگی کی
مادی منفعتوں کے پیچھے گھٹ بھاگنے والے ادیب نہیں تھے۔ ان کے داخل میں ایک نفسِ مطمئنہ موجود تھا۔
وہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ زمانہ خبطِ عظمت میں مبتلا ہے، ادیب اپنی خود اشتہاریت کے
لیے ذات کے گرد ریشم کے عنکبوتی تاروں کا جال سا بُن رہا ہے۔ ایسے تار جو ہوا کے ایک خفیف سے جھونکے
سے ٹوٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس رکھ ورہ زمانہ پر انہیں مایوسی اور بے دلی کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ ایک
خط میں انہوں نے اپنے عہد کا تجزیہ ان واشگاف الفاظ میں کیا:

"زرپرستی، شہرت طلبی اور منافقت نے پورے معاشرے کے ساتھ ادیبوں کو بھی اپنی
لپیٹ میں لے لیا ہے۔ خدا ہی اس قوم پر رحم کرنے والا ہے۔ میری مایوسی اور بے چینی
اور بے دلی کا سبب یقیناً وہ بھی ہوگا جو تم نے لکھا ہے[۴۲] مگر میرے نزدیک اس کا
اصل سبب وہ منافق معاشرہ ہے جو انسانیت کی بنیادی قدروں کو بھی بھول چکا
ہے۔"[۴۳]

چنانچہ سلیم احمد عہدِ جدید سے خاصے ناخوش تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور یہ اظہار ایسا تھا جس
سے قدرے مایوسی بھی عیاں ہوتی تھی اور اضطراب بھی!

"میں اپنی روح کی گہرائیوں کو جانتا ہوں کہ میں عہدِ جدید سے خوش نہیں ہوں۔ اس
نے مجھے توڑ دیا ہے اور میرا دشمن بن کر خود میرے اندر بیٹھا ہوا ہے۔"[۴۴]

چنانچہ سلیم احمد اپنے باطن میں اترتے تو اپنے آپ سے لڑنے بھی لگتے۔ مبارزت کے اس عمل میں ان
کی ملاقات حالی، غالب اور اقبال سے ہوئی تو وہ ان سے بھی برملا اختلاف کرتے۔ کم نظر لوگوں نے یہ سمجھا کہ

وہ عظمت کے اُن آستانوں پر تھوکنے میں مصروف ہیں اور مبارزت آرائی سے اپنی دکانِ شہرت سجا رہے ہیں لیکن سلیم احمد تو خود اپنا تجزیہ کرنے والے ادیب تھے، انہوں نے اس بات پر بھی غور کیا کہ وہ غالب کو کیوں قبول نہیں کرتے۔ حالی سے کیوں لڑ رہے ہیں اور اقبال کو کیوں ایک مستقل بنا رکھا ہے انہوں نے اپنی تحلیل نفسی کی تو اس کے نتائج مختلف نکلے۔ آئیے ان نتائج کی ایک جھلک سلیم احمد کے ایک خط کے آئینے میں دیکھیں کہ وہ کس طرح اپنی شخصیت کے مرکز کا خود مطالعہ کرتے ہیں۔

"میں حالی سے لڑا۔ ترقی پسندوں سے لڑا۔ رومان پرستوں سے لڑا اور غالب سے لڑا مگر میں کسی سے نہیں لڑا۔ میں تو اپنے آپ سے لڑنے میں مصروف ہوں اس لیے کہ جن عناصر سے لڑ رہا ہوں اور جو میرے اندر موجود ہیں میں جانتا ہوں کہ وہ غیر تخلیقی اور غیر انسانی ہیں اب اس لڑائی میں میں اپنے مورچوں کا بس جائزہ لیتا ہوں اور اپنے دشمن کے کمزور پہلوؤں کو بھی دیکھتا ہوں۔ غالب کہتا ہے "دین بزرگاں خوش نکرد"۔ فراق صاحب کہتے ہیں "ہر بانی مذہب لامذہب ہوتا ہے"۔ "غالب کون ہے"؟ ــــــ میں اس سے بحث کر لیتا ہوں۔ یہ بغاوت کے لمحات میں کی ہوئی تعمیمات ہیں، غالب اور فراق اور سو برس بعد پیدا ہونے والے "تمام باغی" مع نظیر صدیقی کے ایسی ہی تعمیمات سے پیدا ہوئے ہیں، یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ غالب نے باغیوں کی ہمت افزائی کی ہے اور وہ باغیوں میں پہلا باغی ہے۔ یہ غالب کی بھی تعریف ہے اور فراق کی بھی[۳۳] اور تمہاری بھی۔ مگر پیارے اس بغاوت کا دور گزر چکا ہے۔ یہ بغاوت اپنا کام کر کے اب اپنے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ اب یہ مردہ دور آؤٹ آف ڈیٹ ہے، اب اس میں کوئی انسپریشن نہیں۔ اب یہ گندے انڈے کی طرح کوئی بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اب بغاوت کے خلاف بغاوت کی ضرورت ہے"[۳۴]

سلیم احمد کی کتاب "چراغ نیم شب" کے دیباچے میں سراج منیر نے ایلیٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "لکھنے والوں کی رائج الوقت تفریح To fix in a Formulated phrase ہے۔ ترقی پسند، رجعت پسند، کلاسیکی، رومانی، جدیدیت پرست، روایت پسند۔ گویا کیا مہریں ہیں جو الگ الگ لفافوں پر لگی ہوتی ہیں اور یہ سب لفافے اپنے اپنے پوسٹ بکسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ لفافے کے اندر کاغذ کے ٹکڑے پر کیا لکھا ہے۔ نگاہ صرف پوسٹ بکس نمبر دیکھتی ہے اور ہاتھ مہر لگاتے ہیں"[۳۵] لیکن سلیم احمد ان معدودے چند ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے "نو ساختہ" اصطلاح کی قید

قبول کی اور نہ پوسٹ بکس نمبر پر نگاہ جما کر مہر لگانے کی ضرورت سمجھی۔ سلیم احمد کے لیے ادب تفریح نہیں تھا انہوں نے بلا شبہ کمرشل کام میں بہت مشقت اٹھائی لیکن ادب کو پیسہ اُگلنے والی مشین نہیں بنایا ادب ان کے لیے سچائی کی دریافت کا عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے روایتی معنوں میں ادیب، شاعر یا نقاد کہلوانے یا تسلیم کیے جانے کی آرزو یا خواہش نہیں کی بلکہ ان زخموں کو دکھانے کی سعی کی جو ادب کی رزم گاہ میں ان کی ذات پر پیہم وارد ہو رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھ لڑائی لڑی تو وہ ماحول کے ساتھ نبرد آزما ہوئے، اور دوستوں کو دعوت دی کہ وہ ماحول سے مفاہمت کرنے کے بجائے اس سے مبارزت آرا ہوں، اپنے باطن میں اتریں اور مسائل کی پرتوں کو کھولنے کی کوشش کریں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں سلیم احمد نے ایک تخلیقی انسان بن کر زندہ رہنے اور ادب کو احوال و تلاش وجود کا وسیلہ بنانے کی طرح ڈالی ہے۔

"پیارے اپنے باطن میں اتر کے دیکھو کہ نظیر صدیقی کے اصل مسائل کیا ہیں، وہ ادیب بننا چاہتا ہے، ایک تخلیقی انسان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا ماحول اسے کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ یہ ماحول کیا ہے؟ یہ وہ قوتیں ہیں جو اسے اندر سے اور باہر سے توڑ رہی ہیں۔ ان قوتوں کو سمجھو ان کا تجزیہ کرو اور پھر اپنے وجود کی بچائی کے لیے ان سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اب شاید میں نوحہ خوانی کی بجائے رجز خوانی پر اتر آیا ہوں۔ اچھا بھائی! میں میدان جنگ میں ہوں تو نوحہ خوانی میں کروں گا۔ رجز خوانی میں کروں گا۔ زخموں سے کراہوں گا میں، اور چیخوں اور تڑپوں گا میں اور اپنے زخموں پر پٹیاں باندھ کر تیر اندازی بھی کروں گا۔ تم نے مجھے تنقید کا صحیح فرض یاد دلا دیا ہے۔ کیا میں نقاد کہلانا چاہتا ہوں؟ لعنت ہو مجھ پر۔ میں تو صرف اپنے وجود کا حال لکھنا چاہتا ہوں۔ چاہے وہ تنقید ہو یا شعر ہو یا ڈرامہ ہو یا کچھ ہو، اور بس!"

سلیم احمد کو ان کی اس داخلی آویزش نے ہی ادیب بنایا تھا۔ وہ چاہتے تو دستیاب مواقع سے فائدہ اٹھا کر مال و منال جمع کر لیتے لیکن اس کے لیے انہیں اپنی ذات اور اپنی انفرادیت کو تیج کر زمانے میں جذب ہونا پڑتا اور بحیثیت ادیب اپنی تخلیقی شخصیت کی قربانی دینی پڑتی۔ چنانچہ معاشرتی حقیقت سے کماحقہٗ آگہی رکھنے کے باوجود انہوں نے ادب تخلیق کرنے کا فریضہ اختیار کیا۔ اس ادبی زندگی کو بھی اپنی شرطوں پر قبول کیا اور تادم مرگ اپنے داخل کے شعلۂ اظہار کو بجھنے نہ دیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میاں ادیبوں کی زندگی اس ملک میں جو ہے سو ہے۔ نہ الہ دین کا چراغ ملے گا نہ زندگی تبدیل ہوگی۔

کسی کو کچھ کرنا ہے تو اسی زندگی میں رہ کر کرنا ہے۔ تمہیں ایک بازی کھیلنے کے لیے دی گئی ہے۔ سارے مہرے پٹ چکے ہیں، مگر بازی تو کھیلنی ہے۔ ہار جیت سے بے نیاز ہو کر۔ پچھلے سولہ سترہ سال سے میرے دماغ پر بیماری کے سبب جو کچھ گزرا تمہیں معلوم ہے۔ چھ دورے اب تک پڑ چکے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ ذہن کی چولیں ہل گئی ہیں۔ مگر اس کے باوجود میں اچھا برا جیسا کچھ ممکن ہے کچھ نہ کچھ کام کرتا رہتا ہوں۔ مگر یہ کوئی اپنی بڑائی نہیں جتا رہا ہوں۔ صرف تمہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم ادیب ہو اور تمہیں ادیب کی حیثیت میں زندہ رہنا ہے۔ اس کے لیے تمہیں اپنی کیفیات کو بدلنا پڑے گا اور یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اپنی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور ان کے تجزیہ کو اپنا موضوع بناؤ۔

یہ اقتباس سلیم احمد کی ادبی زندگی کا منشور بھی ہے اور ان کا نظریہ حیات بھی۔ ان کا ادب اور ان کی زندگی کا پورا منظر اسی منشور کی عملی صورت ہے۔ اور اس میں ان کا جسم ہی نہیں روح بھی شامل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات کی نامساعدت ان پر بھی یورش کرتی رہی، مایوسی نے ان پر بھی پینترے بدل بدل کر وار کیے۔ تنگ دستی نے ان کے سامنے بھی مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔ روٹی کمانے کے لیے "دھندوں" کو بے دلی کی مشقتوں سے گزرنا پڑا اور اس سب سے گھبرا کر سلیم احمد کبھی کبھی ٹوٹ کر ہارتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ طرز تپاک اہل دنیا سے اکتائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

"میں بھی پچھلے دنوں خاصا بیمار رہا اور اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا ہوں۔ دماغی حالت کچھ ایسی ہے کہ لکھنا پڑھنا آسان معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی یہ کام اب تکلیف دہ حد تک بیکار اور فضول معلوم ہونے لگا ہے۔ شاید یہ کام میرے بس کا نہیں تھا اور نہ میرے حالات ایسے تھے کہ میں اس عیاشی کا بوجھ اٹھا سکتا۔ میرے دوست اختر علی خاں کہا کرتے تھے کہ شعر و ادب بھرے پیٹ کی ڈکار ہے۔ اس خیال سے پچیس تیس سال لڑنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ صحیح کہتے تھے۔ ادب اور فاقہ مستی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔"

"ادب بازی سے بھی دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ ہر چیز ایک مسخرہ پن معلوم ہوتی ہے۔ شعر کہتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا۔ مضمون لکھنا اور پہاڑ کاٹنا برابر معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ حالت کب تک رہے گی اور مجھے کہاں لے جائے گی۔"

"تمہیں 'نیا دور' والے مضامین پسند آئے۔ میں شکر گزار ہوں کہ تم نے اپنی رائے لکھی ورنہ

"گونج بھی لوٹ کر نہیں آتی"

والا معاملہ ہے۔ ان موضوعات اور مسائل سے کس کو دلچسپی ہے۔ الٹا لوگ خفا ہوتے ہیں
ہر لحاظ سے خسارہ ہی خسارہ ہے۔ میں زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوا تھا جو کچھ ممکن
ہوتا تھا کرتا ہی رہتا تھا۔ مگر اب ناامیدی ہو گئی ہے۔ کوشش کرتا رہوں گا کہ ناامیدی
کے باوجود لکھنا یکسر ترک نہ کروں۔"[۴۳]

لیکن اس قسم کے مایوس کن لمحات کو سلیم احمد کی زندگی میں دوام حاصل نہیں تھا۔ ان کا نفس مطمئنہ جب
انہیں اپنی طرف متوجہ کرا لیتا تو یہ قنوطیت چھٹ جاتی انہیں احساس تھا کہ

"فارغ البالی ابھی تک میرے لیے کوئی ناممکن مسئلہ نہیں ہے۔ میں چاہوں تو فلموں کے
ذریعے اتنا پیسہ کما سکتا ہوں کہ دو چار سال میں میرے پاس وہ سب کچھ ہو جائے جسے
تم فارغ البالی کی علامت سمجھتے ہو۔"[۴۴]

لیکن وہ "فارغ البالی" کی اس بے معنی دلدل میں پھنسنے کی بجائے اپنے دل کی آواز پر کان دھرتے اور ان
کی طبیعت اس ڈگر کو اختیار کرنے کے بجائے اس سے متنفر ہو جاتی حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے
کام کرنا بھی انہیں برا لگتا اور سلیم احمد وہی بنے رہنے پر قناعت کر لیتے جسے ان کے فیصلوں اور ارادوں
نے بنایا۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء کے ایک خط میں واضح طور پر لکھتے ہیں کہ

"تمہارا خط پڑھ کر دکھ ہوا۔ مگر پیارے بندگی بے چارگی والا معاملہ ہے۔ تم اپنی زندگی اور
حالات کے خالق نہیں ہیں جیسے حالات اور جیسی زندگی ہمیں دی گئی ہے۔ چار و ناچار اسی
کو بسر کرنے پر مجبور ہیں اور اب بسر کرنے میں بھی کتنی دیر باقی ہے۔[۴۵] بہت گزر گئی، تھوڑی
رہ گئی ہے

"ہنس کر اسے گزار کہ رو کر گزار دے"

ایک بات البتہ کہتا
ہوں، ذرا سوچو کہ اگر تم ادیب نہ ہوتے، تمہیں لکھنے پڑھنے کا شوق نہ ہوتا تو کیا یہ زندگی کچھ
آسان ہوتی؟ حالی نے کہا ہے

"ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں"

دیکھو کتنے ادیب ہیں کہ لکھ پتی بن گئے۔ ادب نے انہیں روکا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم
معاشرے کو اپنی شرائط پر قبول کرنا چاہتے ہو یا معاشرے کو اس کی شرائط پر ماننے
کو تیار رہو؟ معاشرہ تمہیں سب کچھ دینے کو تیار ہے اور دے سکتا ہے مگر اس کے

لیے تمہیں اس کے شرائط نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔ ادب کو میں نے کبھی صرف لکھنا لکھانا نہیں سمجھا۔ ادب ایک طرزِ حیات ہے اور اپنی تکمیل کے لیے صوفیوں جیسی ریاضتوں اور مجاہدوں کا طالب ہے۔ زندگی میں کامیابی کا راستہ ادب کا راستہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف منزلیں ہیں اور دونوں کے راستے جدا جدا ہیں اور دونوں کے درمیان انتخاب کا مسئلہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے ادب کو طرزِ حیات بنانے کے بجائے کاروبار بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ تم بھی ایسے ادیب بننا چاہو تو شوکت صدیقی جیسے لوگوں کی پیروی کرو۔ یہ صلاحیت نہیں ہے تو ان سے چھوٹے لوگ بھی زیادہ بڑے نہیں رہے۔ ان میں کسی کے راستے پر چل نکلو۔ میرے لیے فلم کا راستہ کھلا تھا اور کھلا ہے میں اپنا سب کچھ اسے دے دوں تو وہ مجھے سب کچھ دے سکتا ہے جس کی تمنا بہت سے لوگوں کو ہوتی ہے۔ مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا اور عزت کے ساتھ دو وقت کی روٹی کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح میں نہیں کہہ سکتا مگر میں جو کچھ ہوں اپنے فیصلوں اور ارادوں کا نتیجہ ہوں۔“[۵۶]

اسی خط میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

”پیارے! زندگی کا رونا رونے سے کچھ حاصل نہیں ہے ـــــ تم ادیب بنے، ادیب ہو، یہ صلیب اٹھائی تو اب ہائے وائے کیوں کرتے ہو۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ادب جہاں ہماری کمزوری ہے۔ وہاں ایک سہارا بھی ہے۔ ادب نہ ہوتا یا مجھے اس سے اتنا گہرا لگاؤ نہ ہوتا تو زندگی کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی۔“[۵۷]

زندگی کو آرام و آسائش سے بسر کرنا سلیم احمد کا مسئلہ نہیں تھا۔ انہیں تو سانس کی آمد و شد کو جاری رکھنے، سوچنے، لکھنے اور جسم کی توانائیاں برقرار رکھنے کے لیے دو وقت کی باعزت روٹی درکار تھی اور اس کے لیے انہیں مناسب وسائل دستیاب تھے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے ان کے مسائل عام لوگوں اور کاروباری ادیبوں سے بہت مختلف تھے انہوں نے اپنا ادبی سفر شعر و شاعری سے شروع کیا اور اقبال کو اپنا راہنما بنایا۔ لیکن بہت جلد ترقی پسندوں سے ان کی ٹھن گئی تو انہیں احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں مروجہ خیالات درست نہیں۔ بظاہر یہ اپنے عہد سے سلیم احمد کی پہلی بغاوت نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اپنے مسائل پر غور کرنے کا نقطۂ آغاز تھا اور یہیں سے وہ سلیم احمد ابھرنا شروع ہوا جو اپنی رہائی کی تلاش میں سرگرداں ہونے والا تھا۔ تلاش کے اس سفر میں سلیم احمد نے

اقبال کی انگلی چھوڑ دی، ان کی ملاقات محمد حسن عسکری سے ہوئی اور انہوں نے سلیم احمد کی ملاقات جن ادیبوں سے کرائی اور جن مقامات سے گزرنے کی ترغیب دی ان میں ڈی ایچ لارنس اور رینے گینوں دو اہم شخصیات بھی ہیں اور دو اہم منزلیں بھی۔ سلیم احمد کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے عسکری صاحب کی شاگردی اختیار کی اور اس کا اعتراف بھی کیا اور اپنے ذہن سے ابھرنے والے مسائل سے الجھنا شروع کیا تو تشکیک کے اس دور میں رہنمائی عسکری صاحب سے ہی حاصل کی چنانچہ لکھتے ہیں:

"ڈی ایچ لارنس اور رینے گینوں میرے اس سفر کی بڑی بڑی منزلیں ہیں جو سفر میں نے محمد حسن عسکری کی شاگردی میں کیا تھا عسکری صاحب بڑے آدمی ہیں، انہیں جن نتائج پر پہنچنا تھا پہنچ کر مطمئن ہو گئے ہیں، مگر میں ایک "نیم جاہل" کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔"[۴۸]

مغربی تہذیب کی تنقید سلیم احمد کے ہاں ایک مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس مسئلے کے حل میں وہ کئی سالوں تک سرگرداں رہے، تلاش و جستجو کے اس سفر میں انہوں نے جو مراحل طے کیے اور جن سرچشموں سے فیض اٹھایا سلیم احمد نے ان کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا۔ لکھتے ہیں:

"ترقی پسندوں سے لڑائی جھگڑے میں مجھے محسوس ہوا کہ ادب کے بارے میں مروجہ خیالات درست نہیں ہیں اور ادب کی ماہیت، طریق کار اور حاصل کے بارے میں جو کچھ بتاتے ہیں وہ غلط ہے۔ پھر یہ سلسلہ اور آگے بڑھا اور ادب سے باہر زندگی کے بارے میں بھی مروجہ تصورات مجھے غلط معلوم ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں ایک خلا سے دوچار ہو گیا یعنی مجھے یہ تو معلوم تھا کہ غلط کیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ صحیح کیا ہے۔ نو برس تک میری یہ حالت رہی کہ میں نثر بات کرنے کے قابل تھا نہ لکھنے کے۔ کیونکہ مجھے یہ محسوس ہو چکا تھا کہ ہر بولنے والا (اور ہر لکھنے والا) جو بات بھی کر رہا ہے اس کی بنیاد ایک غلط مفروضے پر ہے۔ اتفاق سے یہ تمام تصورات وہی تھے جو صحیح یا غلط طور پر مغربی تصورات سے مستعار لیے گئے تھے۔ اس دوران میں مجھے حسن عسکری صاحب کے ذریعے رینے گینوں کی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جو چیز میرے احساس میں ایک دھند کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ وہ رینے گینوں کے یہاں مغربی تہذیب کی تنقید بن گئی ہے۔ رینے گینوں نے میرے احساس کی تصدیق کی اور اسے بہت وضاحت سے فکر کے درجے تک پہنچا دیا رینے گینوں کی مدد سے اب میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کی فکر (اور اس میں فلسفہ، ادب، نفسیات، علم الانسانی سب شامل ہے) حقائق کی غلط تعبیر اور

اس پر عمل اور ردِ عمل کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے لیے اتنا ہی کتنا کافی ہے۔ لیکن اریے گینوں نے مجھے یہ سمجھنے میں بھی مدد دی کہ حقیقت کی صحیح تعبیر کیا ہے اور کہاں کہاں ملتی ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے رینے گینوں کو پورا سمجھ لیا ہے یا سمجھ بھی سکتا ہوں مگر یہ شخص میرے ہر روز کا مطالعہ ضرور بن گیا ہے۔ اور اپنی محدود ذہنی صلاحیتوں اور اس سے بھی محدود تر معلومات کے ذریعے میں اسے زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور ساتھ ساتھ اپنے تجربات سے ربط دینے کی بھی۔"[۵۹]

رینے گینوں سے ہی سلیم احمد نے مغرب کی کڑی تنقید کی طرف قدم بڑھایا۔ اس سفر میں ان کی ملاقات لارنس سے ہوئی تو اس کا اثبات ان الفاظ میں کیا:

"لارنس کی ایک اور خوبی ہے۔ وہ مغرب کی غلطی کو محسوسات تک میں دکھا دیتا ہے۔ مثلاً لارنس نے مجھے یہ بتایا کہ مغرب کا انسان "نامکمل" ہے جس کی وجہ سے ایک طرف اس کی جبلی زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ دوسری طرف وہ انسانوں اور فطرت سے صحیح تعلق پیدا کرنے میں ناکام ہو گیا ہے اور لارنس چونکہ ناول نگار ہے لہٰذا اس بات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔"[۶۰]

سلیم احمد نے اقبال سے جو شدید اختلاف کیا ہے تو اس میں بھی مغرب ایک اہم حوالے کے طور پر موجود ہے۔ لیکن اقبال سے سلیم احمد کے اختلافات کی داخلی نوعیت بڑی عجیب ہے۔ سلیم احمد ایک زمانے میں اپنا شمار اقبالیوں میں کرتے تھے اور اس کا اعتراف بھی انہوں نے یوں کیا ہے۔

"میں نے ۱۶ برس کی عمر میں انہیں (اقبال کو) پڑھنا شروع کیا اور اٹھارہ سال کی عمر تک ان کا دیوانہ ہو گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ مذہب، عالم اسلام اور ہندی مسلمان میری تمام مرکزی دلچسپیوں میں شامل ہیں۔ اقبال کے یہاں مجھے یہ موضوعات ملے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری روح کو آئینہ مل گیا ہے۔ میں ان کے رنگ میں شعر بھی کہنے لگا اور گھنٹوں ان کے بارے میں دھواں دھار تقریریں کرنے لگا۔ پھر عسکری صاحب کے اثر سے آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا ہوئی۔ تاہم ۵۶۔۱۹۵۵ء تک میں اپنا شمار اقبالیوں ہی میں کرتا تھا اور اب بھی میرا یہ حال ہے کہ بعض اوقات اقبال کی نظمیں پڑھ کر مجھ پر گریہ کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔"[۶۱]

اور اب عشقِ اقبال اتنا بڑھ جاتا ہے کہ خود اقبال سلیم احمد کے لیے ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے اور وہ پاکستانی ادب کے ایک سریع الحس منطقے میں بے محابا قدم رکھتے ہوئے اقبال شکنی کے مرتکب بھی ہوتے

لگے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

"اقبال بنیادی طور پر ایک مغربی آدمی ہیں مگر وہ اپنی تعبیرات میں مشرقی بننے کی کوشش کرتے ہیں جس کا فوری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دو قسم کے تصورات آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور یک ختم ہونے والے کنفیوژن کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اقبال نے مغرب کی جو تنقید کی ہے وہ بھی جزوی اور جذباتی ہے کو کسی حقیقی اصول پر مبنی نہیں۔"[۵۲]

"میرے نزدیک خطبات اور اقبال کی شاعری میں عشق اور عقل کا جو تضاد نظر آتا ہے وہ اتنا واضح اور واشگاف ہے کہ اس پر کسی تاویل کے پردے نہیں ڈالے جا سکتے۔ تمہارا یہ کہنا کہ شاعر کو مبالغے کا حق ہے درست ہونے کے باوجود ان لوگوں کے رویے کی توجیہہ نہیں کرتا جو اقبال کے خیالات کو شاعرانہ قسم کی موضوعی صداقت کی بجائے معروضی حقائق کہتے ہیں۔"[۵۳]

اقبال کے بارے میں سلیم احمد کے خیالات متنازعہ ہیں اور ان سے اختلاف اس لیے بھی کیا جانا چاہیے کہ سلیم احمد اہل ادب کو اختلاف رائے کا حق دیتے ہیں۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے اقبال سے ذاتی اقبال سے عشق کے وفور میں اختیار کی اور ملال اس بات پر کیا کہ اقبال سے ان کے تعلق کو اقبال کے تاجر اور مجاور سمجھنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ انہوں نے صمیم قلب سے دعا کی کہ

"کاش پاکستان کا ماحول ایسا ہو تاکہ اقبال اور اسلام سستی نعرہ بازی کا شکار ہو کر نہ رہ جاتے۔"[۵۴]

مذکرہ بالا مسائل کے علاوہ سلیم احمد کا ایک ذاتی مسئلہ یہ بھی تھا کہ

"ادب کے بیے میں جو کچھ اپنی بساط بھر کر سکا ہوں اسے لوگوں تک کیسے پہنچاؤں اور اس کام کو ضائع ہونے سے کیسے بچاؤں۔"[۵۵]

چنانچہ ایک غم جو تمام عمر ان کے محیط جان رہا وہ یہ تھا کہ ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مناسب ناشر دستیاب نہیں تھے اور اس کام کو انہوں نے اپنے ذاتی وسائل سے سرانجام دینے کی کوشش کی تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں انہوں نے حقائق کی پردہ پوشی نہیں کی بلکہ لکھا کہ

"اس وقت میرے پاس چھ سات کتابیں تیار ہیں۔ ان کی اشاعت نہ ہو سکی یا بعد از وقت ہوئی تو میری محنت کا ضیاع ہوگا۔ "غالب کون؟" میں نے خود چھاپی۔ تین ہزار روپے لگانے پڑے۔ صبر رہی ہے۔ اپنا پیسہ لگا کر بھی مقصد پورا نہیں ہوا کتاب پڑھنے والوں تک نہیں

پہنچی، اب دوسری کتاب کو چھاپنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ کیا فائدہ؟ تقسیم بھی نہیں ہوگی۔ پبلشنگ اور ڈسٹری بیوشن دونوں کام ناممکن نظر آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لکھنا اور لکھتے رہنا بھی ایک فعل عبث بن گیا ہے۔"[۲۵]

مایوسی اور قنوطیت کے متذکرہ بالا دورے سلیم احمد پر اکثر پڑتے تھے اور پھر وقت کے ریلے کے ساتھ بہ جاتے تھے۔ لیکن جب پاکستان کا مشرقی بازو لوٹ گیا تو سلیم احمد ایک غم جاوداں میں مبتلا ہو گئے۔ ۲ جنوری ۱۹۷۲ کو انہوں نے نظیر صدیقی کو جو خط لکھا وہ سقوط ڈھاکہ پر بہ نکلنے والا وہ بے اختیار آنسو ہے جو سلیم احمد کے دل سے نکل کر کاغذ پر مجسم ہو گیا ہے:

"مشرقی پاکستان کے بارے میں ایک ایک اندیشہ اس طرح پورا ہوا جیسے خاکہ پہلے بنا دیا گیا تھا، رنگ اب بھر گیا ہے۔ ایک ایک واقعہ پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مگر افسوس صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، کس کس چیز کو روؤں، بہاری مارے گئے تو وہ بھی ہمارے تھے۔ بنگالی مارے گئے تو وہ بھی ہمارے تھے۔ اور اب تو بہاری اور بنگالی سب ایک ہو گئے۔ دونوں کے خون میں کیا فرق ہے۔ مولوی فرید احمد کی موت نے دل ہلا دیا۔ اخباروں میں تصویریں چھپی ہیں کہ مظلوموں کو سنگینوں سے ہلاک کیا جا رہا ہے اور سنگدل تماشائی ہنس رہے ہیں۔ انسان بھی کیا چیز ہے نظیر! پاکستان ختم ہو گیا سب سے بڑی اسلامی مملکت ختم ہو گئی۔ قائداعظم کے مزار کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔ قائداعظم تب نہیں مرے تھے، اب مرے ہیں۔"[۲۶]

اور دسمبر ۱۹۷۴ میں یعنی سقوط ڈھاکہ کے تین سال بعد سلیم احمد پاکستان کے بارے میں مندرجہ ذیل خطوط پہ سوچ رہے تھے۔ اور اپنے ملال کا اظہار کر رہے تھے۔

"پاکستان اپنا نظریاتی اور ثقافتی جواز خود اپنے ہاتھوں کھو چکا ہے۔ یہ کتنے ماتم کی بات کیوں نہ ہو مگر سچی بات ہے۔ اب دیکھو رفاہی مملکت کی حیثیت سے بھی یہ اپنا جواز پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ زندگی کی ذاتی تلخیاں کیا کم تھیں کہ پاکستان کے معاملے نے پورے وجود میں زہر گھول کر رکھ دیا۔ افسوس صد افسوس کہ متاع زیاں کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔"[۲۷]

میں نے عرض کیا تھا کہ سلیم احمد نے اپنی زندگی بھرپور انداز میں بسر کی۔ نظیر صدیقی کے نام لکھے گئے خطوط میں انہوں نے اپنی بزم خلوت آراستہ کی اور ایک عالم وارفتگی میں اپنے ساتھ باتیں کرتے چلے گئے اور اب یہ خطوط چھپ گئے ہیں تو اس خلوت میں ایک عام قاری کو جھانکنے کی اجازت بھی مل گئی ہے۔

لیکن دیکھئے کہ یہ خلوت گوشۂ چمن یا کمرۂ استراحت کی خلوت نہیں بلکہ یہ سلیم احمد کے دارالمطالعہ کی خلوت ہے۔ جہاں سلیم احمد مصنفین کی جلو میں اپنی سبھا جمائے بیٹھے ہیں، وہ اداس اور ملول نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی بے اختیار ہنسنے بھی لگتے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ وہ اکتسابِ مسرت بھی مصنفین، کتب اور مضامین کے ذکر ہی سے کرتے ہیں، اچھی کتاب پڑھ کر، قریبی دوست کو مل کر اور خیال انگیز مضمون کے مطالعے سے ان کی ذہنی کائنات پر شگفتگیٔ گل کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ اس کا ذکر پورے کیف انبساط سے کرتے ہیں:

"محبوب خزاں سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی اور میں نے کچھ قطعات انہیں سنائے تھے جن میں سے چند انہیں پسند بھی آئے۔ یار! اس خزاں کا دم غنیمت ہے، جب ملاقات ہو جاتی ہے تو کچھ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ اس شخص کا ذوقِ شعری بہت منفرد قسم کا ہے مگر قابلِ اعتبار ہے۔"[۵۹]

"کرار صاحب کی تقریریں سنی، بہت اچھی، خیال انگیز اور بصیرت آموز تقریر تھی، انہوں نے کئی باتیں صاف صاف کہیں اور خطرہ مول لے کر اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔۔۔ انہوں نے زبان، مذہب اور تاریخ کے بارے میں جو کچھ کہا بہت اہم اور غور طلب ہے اور بمبئی میں تو ان کی تقریر کم سن رہا تھا انہیں دیکھ زیادہ رہا تھا۔"[۶۰]

"سجاد باقر رضوی آئے ہوئے ہیں اور خوب دلچسپ باتیں ہو رہی ہیں۔"[۶۱]

"پرسوں جوش صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میرے قطعات سنے اور بہت پسند کیے۔ گو غزل سن کر ناک بھوں چڑھاتے رہے۔"[۶۲]

"عسکری صاحب کی کتاب "جدیدیت" میں نے پڑھ لی ہے۔ میرے لیے تو یہ کتاب "الہامی" کا درجہ رکھتی ہے اس کا ایک ایک ورق بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہاں اکثر جدیدیئے کتاب کے بارے میں مخالفانہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں لیکن کتاب ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔"[۶۳]

"ایک صاحب ہندوستان سے آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ علی گڑھ میں 'اقبال ——— ایک شاعر' کا بہت چرچا ہے۔ مخالفت اور موافقت میں لمبی چوڑی بحثیں ہو رہی ہیں۔"[۵۴]

———

"میں نے تمہارا مضمون ایک سانس میں پڑھ ڈالا یہ میری کتاب (اقبال ——— ایک مطالعہ) پر بہترین مضمون ہے اور میں اس کے لیے تہ دل سے تمہارا ممنون ہوں۔"[۵۵]

سلیم احمد کے خطوط سے جو انسان ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک بھرپور شخصیت کا مالک اور راست گو انسان ہے۔ یہ خطوط اس حق پرست انسان کے داخل اور خارج کا پورا انعکاس کرتے ہیں سلیم احمد نتائج کی ڈگر پر مستقیم انداز میں سفر کرتے ہیں اور کانٹوں میں الجھ کر راستے کو صاف کرتے چلے جاتے ہیں۔ منزل کا صحیح تعین نہ ہو تو وہ راستہ تبدیل بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن نیا راستہ اختیار کرنے کے لیے ان کے پاس مستحکم دلیل اور مضبوط جواز بھی موجود ہوتا ہے۔ سلیم احمد کی شاعری میں ان کی شخصیت کے نقوش دھبوں کی صورت میں موجود ہیں لیکن یہ دھبے بکھرے ہوئے اور بے ترتیب ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین میں شخصیت کی لکیریں گہری اور نمایاں ہیں لیکن یہ لکیریں بھی غیر منظم ہیں، ان کے خطوط پڑھیں تو یہ دھبے اور لکیریں باہم مل کر ایک واضح تصویری نقش ابھارتی ہیں۔ اس تصویر پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ——— سلیم احمد

حواشی

۱ "میرا تخلیقی سفر شعر و شاعری سے شروع ہوا تھا" سلیم احمد۔ "نامے جو میرے نام آئے" ——— نظیر صدیقی کے نام سلیم احمد اور دیگر معاصرین کے خطوط۔ مرتبہ مصطفےٰ راہی۔ راولپنڈی۔ جون ۱۹۸۴ء — ص ۱۲۴

۲ سلیم احمد نے ریڈیو۔ ٹی وی اور فلم کے لیے بہت سے ڈرامے بھی لکھے لیکن تا حال یہ ڈرامے چھپ کر سامنے نہیں آئے

۳ یہ عمل بطن ماہی میں پناہ لینے کے عمل سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔

۴ اشارہ سلیم احمد کی ابتدائی شاعری کی طرف ہے جس میں جنس سلیم احمد کی معنویت کا ایک استعارہ نظر آتی ہے۔ "اکائی" اور "چراغ نیم شب" میں سلیم احمد نے ارتقا کی طرف مسلسل قدم بڑھایا اور جنس کا استعارہ آہستہ آہستہ پس منظر میں چلا گیا۔

۵ ایک دفعہ سلیم احمد نے بتایا تھا کہ انہیں سمندر دیکھے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں

۶ (۱) "اے بھائی نظیر کیسی باتیں کرتے ہو، کہاں عیش بر فی کہاں تمہارا خط میں تو خود تمہارے جواب کے انتظار میں سوکھ گیا" (مکتوب سلیم احمد مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۷۵ء حوالہ ایضاً) — ص ۱۳۵

ب۔ "تم ایک دوست کی حیثیت میں میری نالائقیوں پر جتنا چاہو خفا ہو سکتے ہو۔ مگر خدا کے لیے میرے تعلق خاطر پر شک نہ کرو" (مکتوب ۲۰ اگست ۱۹۷۰ء) — ص ۱۵۲

۷ گزشتہ چند سالوں کے دوران مولانا غلام رسول مہر، یگانہ چنگیزی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وزیر آغا اور ابن انشا کے خطوط کے مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ان سے تذکرہ احباب کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

۸ "نامے جو میرے نام آئے" کے پیش لفظ "از راہ اعتراف" میں نظیر صدیقی نے لکھا ہے کہ انہیں سلیم احمد کے وہ خطوط نہیں مل رہے جو انہوں نے نظیر صدیقی کو ڈھاکے کے قیام کے دوران لکھے اور جن میں فلسفیانہ نما در خیال

کا ایک سلسلہ تھا حوالہ ایضاً ص ۱۰

۹ اس کتاب میں سلیم احمد کے ۳۵ خطوط شائع کیے گئے ہیں۔ پہلا خط ۵ فروری ۱۹۶۲ء اور آخری خط ۲۴ اگست ۱۹۸۳ء یعنی وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل لکھا گیا۔ یہ خطوط سلیم احمد کی زندگی کے آخری ۲۱ سالوں کا آئینہ ہیں۔

۱۰ حوالہ ایضاً ص ۱۱۲

۱۱ حوالہ ایضاً ص ۱۱۳-۱۱۴

۱۲ نظیر صدیقی نے لکھا ہے کہ "سلیم احمد نے ادب میں ابلاغ کے مسئلہ پر چار یا پانچ مضامین لکھے تھے جن میں سے ایک میں انہوں نے میرے مضمون "اظہار یا ابلاغ" سے شدید اختلافات کیے تھے"۔ اس اقتباس میں سلیم احمد نے اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نظیر صدیقی کا یہ مضمون ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ "اوراق" میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان کی کتاب "میرے خیال میں" میں بھی شامل ہے۔

۱۳ "نامے جو میرے نام آئے" مرتبہ مصطفیٰ راہی ص ۱۱۵-۱۱۶

۱۴ نظیر صدیقی کے خلاف لکھے گئے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ صدیقی صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مضمون کی بنا پر سلیم احمد کے دل میں ایک "مجرمانہ" خلش پیدا ہو گئی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ درست ہو لیکن انہوں نے اس تجزیے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جو سلیم احمد کے ذہن نے تراشا اور جو اس مضمون کے پس پردہ صحت مند انداز میں موجود تھا۔ میرا خیال ہے کہ جب مختلف لوگوں نے اسے نئے معانی دینے کی کوشش کی تو سلیم احمد پریشان ہو گئے۔

۱۵ ایضاً ص ۱۱۷-۱۱۸

۱۶ ایضاً ص ۱۲۰-۱۲۱

۱۷ ایضاً ص ۱۲۷

۱۸ ایضاً ص ۱۱۱

۱۹ ایضاً ص ۱۱۲-۱۱۳

۲۰ ایضاً ص ۱۵۳

۲۱ ایضاً ص ۱۴۵

۲۲ ایضاً ص ۱۴۳

۲۳ ایضاً ص ۱۴۴

۲۴ ایضاً ص ۱۴۷

۲۵ ایضاً۔ ”صاحب عارفی قمر جمیل کے بہنوئی ہیں“ ص ۱۴۹

۲۶ ایضاً ص ۱۴۶

۲۷ ایضاً۔ فضیل جعفری نے سلیم احمد کے خلاف رسالہ ”جواز“ مالیگاؤں (بھارت) میں ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون بعد میں رسالہ ”اردو زبان“ میں بھی شائع ہوا۔ ص ۱۷۴

۲۸ ایضاً ص ۱۴۳

۲۹ ایضاً ص ۱۱۹

۳۰ ایضاً ص ۱۷۲

۳۱ ایضاً ص ۱۴۴

۳۲ یہاں نظیر صدیقی صاحب کو بے دلی اور مایوسی کے اسباب کی وضاحت کرنی چاہیے تھی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا جس سے یہ بات وضاحت طلب رہ گئی ہے

۳۳ ایضاً ص ۱۴۴

۳۴ ایضاً ص ۱۴۱

۳۵ ۳۴۔ یہاں ”فراق“ کے بجائے ”فراز“ لکھا گیا ہے جو سہوِ کتابت نظر آتا ہے فراز کا ذکر اس خط میں کہیں نہیں آیا اور یوں بھی فراز بغاوت کے بجائے فرار کی مثال ہے۔ دیکھیے ”نامے جو میرے نام آئے“ ص ۱۴۱

۳۶ سراج منیر۔ دیباچہ ”چراغ بزم شب“ کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱۱

۳۷ ”پڑھنا لکھنا سب معطل ہے۔ صرف کمرشل کام کرتا ہوں۔ وہ بھی بہت مشکل سے اور معیار سے بھی دل مطمئن نہیں ہوتا جی چاہتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے بالکل خاموش ہو جاؤں۔ وہ بھی ممکن نہیں۔ روٹی تو کسی طور کمانے پڑتی ہے“ —

۱۹۷۵ء کا ایک خط۔ حوالہ ایضاً ص ۱۲۷

۳۹ سلیم احمد نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ انہوں نے پسماندگان کے لیے جائیداد یا بنک بیلنس کچھ نہیں چھوڑا۔ ان کا اثاثہ وہ کتابیں تھیں جن کے لیے سلیم احمد کو اپنی زندگی میں ناشر نہیں ملے۔

۴۰ ایضاً ص ۱۴۲

۴۰.۸ ایضاً ص ۱۴۹

۴۱۔ ایضاً۔ ص ۱۳۱

۴۲ ایضاً ص ۱۲۷

"ادب بازی" سلیم احمد کی ایک مخصوص اصطلاح تھی جو بالعموم "چھیڑ خوباں سے" قسم کے مضامین کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ سلیم احمد اس قسم کے مضامین میں بہت مزا لیتے تھے۔ حریف کلام پر جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ "ادب بازی" خون گرم رکھنے کا بہانہ تھا

۴۳ ایضاً ص ۱۶۵

۴۴ ایضاً ص ۱۴۴

۴۵ سلیم احمد کی اس تحریر میں پیشگوئی کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس خط کے بعد سلیم احمد صرف تین برس زندہ رہے۔

۴۶، ۴۷ ایضاً ص ۱۶۳۔ ۱۶۴

۴۸ ایضاً ص ۱۲۶

۴۹ ایضاً ص ۱۲۴۔ ۱۲۵

۵۰ ایضاً ص ۱۲۹

۵۱ ایضاً ص ۱۷۲۔ ۱۷۱

۵۲ ایضاً ص ۱۳۰

اقبال کے بارے میں سلیم احمد نے زیادہ وضاحت سے اپنی کتاب "اقبال۔ ایک شاعر" میں لکھا ہے۔ اس کتاب سے ملک بھر میں وسیع پیمانے پر اختلاف کیا گیا۔ سلیم احمد نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب میں نے صرف چودہ دن میں لکھی اور جو کچھ لکھا ہے صرف حافظے سے لکھا ہے۔ کوئی کتاب جم کر لکھنے کی نہ تو

مجھے توفیق ہے نہ فرصت۔ میں تو ایک وقت کی چائے پینے میں جتنا لکھ سکتا ہوں لکھ لیتا ہوں۔ یہ سارے مضامین صبح کی چائے پیتے ہوئے لکھے گئے ہیں اور ان کی تحریر کا کل دورانیہ سولہ سترہ گھنٹے سے زیادہ نہیں۔"

۵۳ ایضاً ص ۱۰۳

اس مسئلہ کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی تصنیف "تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" سائنٹیفک انداز اور عملی استدلال سے حل کرنے کی کاوش کی ہے۔

۵۴ ایضاً ص ۱۶۲

۵۵ ایضاً ص ۱۶۵

۵۶ ایضاً ص ۱۶۴

نظیر صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ سلیم احمد کے مضامین کا ایک مجموعہ احمد ندیم قاسمی شائع کر رہے تھے اور اس کتاب کی کتابت بھی ہو چکی تھی لیکن اس دوران میں دونوں کے درمیان سیاسی اختلافات میں شدت پیدا ہو گئی اور سلیم احمد اور قاسمی صاحب دونوں مختلف نقطۂ نظر کے اخباروں میں کالم لکھنے لگے۔ نتیجۃً قاسمی صاحب نے سلیم احمد کی کتاب شائع کرنے کا خیال ترک کر دیا (دیکھیے ص ۱۵۴۔ حوالہ ایضاً)

۵۷ ایضاً ص ۱۲۱، ۱۲۲

۵۸ ایضاً ص ۱۳۵

۵۹ ایضاً ص ۱۲۷

۶۰ ایضاً ص ۱۳۷، ۱۳۸

کرار صاحب نے ٹیلیوژن پر پاکستانی کلچر کے موضوع پر تقریر کی تھی۔

۶۱ ایضاً ص ۳۹

۶۲ ایضاً ص ۱۵۰

۶۳ ایضاً ص ۱۵۷

۶۴ ایضاً ص ۱۵۷

۶۵ ایضاً ص ۱۶۹

سلسلے ہیں کبھی جوابوں کے
ہیں قطاریں کبھی سوالوں کی
قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
میں گزرگاہ ہوں خیالوں کی

ترتیب و تلخیص: قمر مشتاق

رُوبرو ـــ سلیم احمد سے ایک گفتگو

قمر مشتاق: حضرات آج کے پروگرام کی نوعیت کچھ یوں ہے کہ ہم جناب سلیم احمد اور جناب شمیم احمد سے ادب، ادیب اور ادبی مسائل کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ میں معزز مہمانان سے گزارش کروں گا کہ وہ پوچھے جانے والے سوالات کا واضح جواب دیں اور سوال کنندگان سے بھی میری درخواست ہوگی کہ سوال مختصر اور To the point ہوں تاکہ ہم کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معاملات اور مسائل پر گفتگو کر سکیں۔

◎

جوہر حسین: ۔ قمر صاحب! آپ نے بات کو ادب، ادیب اور ادبی مسائل کے دائرے میں محدود رکھا۔ آپ اگر ادیب کی پوری زندگی کو مدِنظر رکھتے تو بہتر تھا۔ مثلاً میں تو سلیم بھائی سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے ذاتی طور پر کہ خاکسار تحریک سے لے کر موجودہ نظریات کا جو سفر ہے وہ کن مراحل سے گزرا۔ وہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ اس لیے کہ جو اساتذہ ادب کے حوالے سے موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی آدمی ان نظریات کا حامل نہیں جن کے اب سلیم بھائی ہیں۔

سلیم احمد: ۔ خاکسار تحریک کا جو حوالہ آیا ہے وہ میری طالب علمی کا دور تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا جس وقت میں میرٹھ آیا اور پروفیسر کرار حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے جو گفتگو ہوئی اس کا بنیادی حوالہ یہ تھا کہ ہماری زندگی میں اسلام ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت سے نافذ ہو اور ہمارے جتنے مسائل ہیں وہ اسلام کے حوالے سے حل ہوں۔ کرار حسین صاحب سے جب

میری ملاقات ہوئی تو وہ خاکسار تحریک سے الگ ہو کر ایک رسالہ "الامین" کے نام سے میرٹھ سے نکالتے تھے۔ اور اس کو ادارہ "الامین" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور اس کے اندر بہت سے لوگ جو پاکستان کے علاقوں کے ہیں اور بہت سے لوگ جو ہندوستان کے علاقوں کے تھے اس میں شریک ہو گئے تھے۔ دو آدمی اس کے اندر بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک اختر حامد خاں صاحب اور دوسرے اختر حمید خاں صاحب۔ اختر حمید خاں صاحب سابق ICS تھے اور انہوں نے خاکسار تحریک کے سلسلے میں نوکری سے استعفا دیا تھا۔ اتنی بڑی قربانی دے کر وہ آئے تھے خاکسار تحریک میں، اس وقت ان کی قربانی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جو آدمی اتنے بڑے عہدے پہ فائز رہا ہو ——— وہ دودھ بیچتے تھے اور دودھ بیچ کر وہ اپنی زندگی کے لیے معاش کماتے تھے۔ اور ان کے چھوٹے بھائی اختر حامد خاں تھے۔ یہ سب لوگ تھے اور ان کی جو فکر تھی ——— اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اسلام کے حوالے سے ملکی معاملات پر غور کیا جائے اور اسی سے اپنی زندگی کے سارے معاملات کو حل کیا جائے ——— اسی زمانے میں محمد حسن عسکری میرٹھ تشریف لائے اور ان سے میرے بہت جلد قریب کے مراسم ہو گئے۔ بالکل روزمرہ۔ روزانہ ملاقاتیں ہونے لگیں وہ بھی اسی خیال کے آدمی تھے اور وہ جب ان لوگوں سے ملے تو بہت خوش ہوئے۔ عسکری صاحب نے مجھے اس بات کا قائل کیا کہ جناح صاحب کی قیادت میں جو مسلم لیگ کی تحریک چل رہی ہے اور پاکستان کا جو خیال ہے وہ یقیناً مسلمانوں کے مسائل کا حل ہے لیکن میں اس بات سے بہت زیادہ متاثر نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یہ تو سمجھتا تھا کہ پاکستان اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کے مسائل کا حل ہے لیکن میرے سامنے سب سے بھیانک سوال یہ تھا کہ اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کا کیا ہو گا۔ اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں کے مسائل تحریک پاکستان میں جہاں کہیں حوالہ تھے یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے کلچر کو، ان کی زبان کو اور ان کے تمدن کو محفوظ کیا جائے گا۔ اقلیتی علاقوں میں کیا ہو گا۔ اس کا جواب یہ تھا کہ اکثریتی علاقوں میں پاکستان بنایا جائے اور یہ Logic میری سمجھ میں نہیں آتی تھی چنانچہ میں الجھن میں تھا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی میرٹھ تشریف لائے۔ وہ اس زمانے میں جمعیت علمائے ہند کے خلاف اپنی مہم پہ نکلے ہوئے تھے اور اس مہم کا آغاز انہوں نے میرٹھ ہی سے کیا تھا اور وہ ان سارے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ انہوں نے ٹاؤن ہال میں ایک مدلل تقریر کی جس سے گویا مسلمانان میرٹھ میں ایک Conversion پیدا ہوا اور وہ مسلم لیگ کی طرف بہت تیزی سے مائل ہوئے۔ حالانکہ وہ علمائے دیوبند سے متاثرہ علاقہ تھا مگر لوگ بہت کثرت سے

مسلم لیگ کی طرف آئے۔ میں اس جلسے میں گیا۔ میں نے اپنا سوال علامہ شبیر احمد عثمانی کے سامنے رکھا تو انہوں نے کہا کہ آپ اپنی زندگی کا کیا مشن قرار دیتے ہیں۔ میں نے کہا صاحب میں خاکسار تحریک میں شامل ہوں اور اسلام کے قیام اور اس کے نظام کے برپا کرنے کو اپنا مشن سمجھتا ہوں انہوں نے کہا کہ یہ بتایئے اگر آپ غلبۂ اسلام کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں تو وہ اقلیتی علاقوں میں ممکن ہے یا ان علاقوں میں ممکن ہوگا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو ——— یہ سوال ——— یہ جواب نما سوال جو تھا یہ اتنا واضح تھا کہ میں نے سر جھکا دیا۔ اور کہا کہ آپ صحیح کہتے ہیں یہ تو اسی علاقے میں ممکن ہوگا جہاں مسلمان اکثریت میں رہتے ہوں۔ اس کے بعد مسلم لیگ سے میری وابستگی ہوگئی اور پھر تحریک پاکستان اور قائداعظم کے حوالے سے ان کی وفات تک یہ سلسلہ رہا۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ میں مسلم لیگ کی قیادت سے مایوس ہو گیا جس سے مجھے پہلے بھی کوئی ایسی ہمدردی نہیں تھی اور میں قائل ہوا تھا تو علامہ شبیر احمد عثمانی اس کام کرنے کی حوالہ تھے۔ اور قائداعظم ان کے بعد سب سے بڑی شخصیت تھے اور میں سمجھتا تھا کہ ان دونوں کے اشتراک ہی سے پاکستان کی کوششوں کو کامیابی ہو سکتی ہے۔ اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر آپ کا شبہ اس بلیے ہے کہ یہ انگریز طرز کے لوگ یا انگریزی تمدن اور انگریزی کلچر کے پروردہ لوگ اسلام نہیں قائم کر سکیں گے تو ہم اسے قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیں لیکن آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ ہمارے علماء بھی اس جدوجہد میں شامل ہیں۔ یہ بہت Satisfactory بات تھی ——— میں کراچی آ گیا ——— ۱۱ نومبر ۴۷ء کو میں کراچی پہنچا تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی مجھ سے پہلے یہاں آ چکے تھے ——— یہاں آ کر بھی ہم ملتے رہے ——— وہ واقعات افسوسناک ہیں۔ لیکن وہ ریکارڈ پر رہیں۔ اس بلیے میں ان کو بے جگری اور صفائی سے بیان کرنا چاہتا ہوں ——— علامہ شبیر احمد عثمانی وہ شخص جنہوں نے اس سارے علاقے میں جس کو علمائے دیوبند کا علاقہ کہا جاتا تھا مسلم لیگ کی فتح کے بلیے جو کام کیا اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوگا کہ یوم فتح جب منایا گیا تو اس میں قائداعظم بنفس نفیس تشریف لائے۔ اس موقع پر بینروں پر صرف دو نام تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ شبیر احمد عثمانی اور جتنے دروازے لگے ہوئے تھے اور جتنے بینر لگے ہوئے تھے ان پر دو افراد کے سوا اور کسی کا نام نہیں تھا، تو میرے بلیے یہ ایک ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں علامہ شبیر احمد عثمانی پر اندھا اعتقاد رکھتا تھا۔ ایک موقع تو ایسا آیا، میں نے ان کو بے تحاشا روتے ہوئے دیکھا انہوں نے جو صورت حال بتائی اور میں نے ان کی جو حالت دیکھی تو میرا تو ایمان بہت متزلزل ہوا۔ میں نے کہا کہ جب آپ کا

یہ عالم ہے تو ہم لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت سے میری فکر کا ایک محور تھا کہ میں مسلم لیگ کی قیادت سے مایوس سے مایوس تر ہوتا گیا۔ اور ایوب خاں کی آمد کے بعد مجھے یہ پتا چل گیا کہ یہ جماعت یا اس قسم کی کوئی چیز جس کی نظریاتی اساس واضح نہ ہو وہ اس ملک میں اسلام کے نظریے کے لیے کام نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ میں حالات کا تجزیہ کروں اور اس میں دیکھوں کہ میں کس کے قریب ہوں۔ چنانچہ ایک جماعت مجھے نظر آئی جس کی نظریاتی اساس بہت واضح تھی اور جس کا نعرہ بھی ایک لحاظ سے وہی تھا جس کے لیے میں ۱۴۔۱۵ سال کی عمر سے بے تاب رہا کرتا تھا —— اور وہ جماعت اسلامی تھی۔ لہٰذا میں نے جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھا —— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو پڑھا —— مولانا مودودی صاحب سے مجھے بہت سے فکری اور ذہنی اختلافات تھے اور بہت سے اب بھی ہیں۔ گویا ان کے لٹریچر کا پورا مطالعہ کرنے کے باوجود رہے۔ جماعت کی پالیسیوں سے بھی اختلاف تھا مجھے اور اب بھی ہے لیکن اس کے باوجود میں جماعت کو ایسی نظریاتی جماعت سمجھتا تھا جو اس مقصد کے لیے کام کر سکتی تھی۔ جو میرا بھی مقصد تھا۔

جب "جسارت" نکلا ۶۹ء میں —— اس سے پہلے میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ اس سے پہلے میرے مضامین اسلام کے حوالے سے اور اسلامی ادب کے حوالے سے چھپتے رہے۔ کچھ نوجوان جن میں کچھ اس وقت ملک سے باہر ہیں اور اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن تھے، سرگرم رکن تھے منور الحمد وغیرہ وہ میرے پاس آنا شروع ہوئے اور انہوں نے یہ کہا —— خورشید احمد صاحب کے حوالے سے کہ وہ آپ کے مضامین چھاپنا چاہتے ہیں۔ اور خورشید احمد بھی میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے رسالے "چراغ راہ" کے لیے کچھ لکھوں۔ میں نے کہا صاحب بات یہ ہے کہ میں ادبی آدمی ہوں اور میری زندگی کا یہ مقصد ہے لیکن میں کسی جماعت سے کسی طرح وابستہ ہونا اپنے ادبی کار کے لیے نقصان رساں سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ ایک رسالہ ہے اس میں علمی ادبی مضامین چھپتے ہیں۔ آپ لکھیے۔ چنانچہ میں نے "چراغ راہ" میں کچھ مضامین لکھے۔ میرے استاد کرار حسین صاحب جو گویا میرے لیے ہمیشہ آئیڈیل کی صورت رکھتے رہے اور ان کی زندگی کا ان کے خیالات اور نظریات کا ان کی سیرت و کردار کا میری زندگی پر اتنا گہرا اثر ہے کہ شاید اتنا اثر میرے باپ کا بھی میرے اوپر نہ ہو —— تو ان کو میں نے ہمیشہ اپنا روحانی مرشد سمجھا۔ اور دوسرے صاحب میں نے آپ کو بتایا کہ محمد حسن عسکری صاحب تھے اور یہی میری زندگی کے دو مرشد میری ادبی زندگی میں بھی مرشد کی حیثیت رکھتے تھے

اتفاق سے یہ دونوں حضرات جماعت اسلامی کے بے حد خلاف تھے۔ کرار حسین صاحب جب خاکسار تحریک میں تھے تو اس جماعت کو بردہ فروشوں کی جماعت کہتے تھے اور کہتے تھے کہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کی جماعت ہے اور گویا یہ اسلام کے لیے کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکتی ——— تو میں اس کو یہ سمجھتا تھا کہ چونکہ خاکسار تحریک ایک جارحانہ جماعت ہے ایک عسکری جماعت ہے اس تناظر میں کرار صاحب یہ باتیں کہتے ہیں ——— بہر حال میں سنتا رہتا تھا یہ باتیں ——— عسکری صاحب بھی اس پالیسی کے خلاف تھے۔ یہ اس جماعت کے گویا نقاد تھے۔ شدید ادر جماعت اسلامی کے بھی تھے اور کچھ ان کے ترقی پسندانہ رجحانات بھی تھے جس کی وجہ سے وہ جماعت کو ناپسند کرتے تھے تو مجھے بھی اس وقت جماعت سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔ میں نے بتایا کہ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان آنے کے بعد ۴۸-۴۹ء میں، میں نے ایک رسالہ نکالا کراچی سے "ماہ نیم ماہ" کے نام سے اس میں عسکری صاحب کا مضمون اسلام کی معاشی منصوبہ بندی اور جماعت اسلامی کے نام سے میں نے شائع کیا تھا.......... جو جماعت اسلامی کی معاشی پالیسی کے خلاف تھا ——— تو یہ اسی کا پس منظر تھا ——— اب جب میں نے "چراغ راہ" میں لکھنا شروع کیا تو میرے دونوں استاد مجھ سے بے حد خفا ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ جو سالنامہ نکلا تھا "چراغ راہ" کا اس کے اندر میرا ایک مضمون چھپا تھا ——— عسکری صاحب آئے تو وہ سالنامہ میری میز پر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے اٹھا کر پلٹ کر دیکھا اور اس میں سے انہوں نے میرا مضمون پڑھا ——— جب وہ پڑھ چکے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے مضمون میں کوئی غلطی ہو تو بتائیں ——— انہوں نے کہا کہ اس میں اس کے سوا کوئی غلطی نہیں ہے کہ یہ غلط رسالے میں چھپا ہے ——— یہ کہنے کے بعد انہوں نے اس سالنامے سے اس مضمون کو پھاڑ لیا اور سالنامہ نیچے پھینک دیا اور مضمون اپنے پاس رکھ لیا۔ خیر ——— ! یہ میرے اور ان کے درمیان کا معاملہ تھا۔ کرار حسین صاحب سے میری کبھی اس معاملے پر بحث نہیں ہوئی۔ لیکن عسکری صاحب سے میری بحث ہوتی رہتی تھی۔ جب "جسارت" نکلا اور ہمارے الطاف حسین قریشی صاحب نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں "جسارت" کے لیے لکھوں۔ اس وقت پورے ملک میں کوئی ادیب اس معاملے میں شریک ہونے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ جسارت کے اندر ادیب کی حیثیت سے لکھ سکے لیکن ہم نے اس دعوت کو قبول کیا اور ساری مخالفتوں کے باوجود اس کے اندر لکھا۔ اس مخالفت میں سب سے زیادہ نقصان جو ہوا وہ یہ ہوا کہ یہ خبر عسکری صاحب

کو پہنچ گئے اور وہ بے انتہا ناراض ہوئے اور یہاں تک کہا کہ "میرا جی سلیم احمد سے ملنے کو نہیں چاہتا" ــــ تو یہ صورت حال جاری رہی۔ یہاں تک کہ الیکشن کا زمانہ آ گیا ــــ اور عسکری صاحب بہت زیادہ گویا "پیپلز پارٹی" سے متاثر ہو گئے اور بھٹو صاحب سے ان کی عقیدت بہت بڑھ گئی اور کرار صاحب کے پاس بھی میں جاتا تھا اور اس بات پر بحث و مباحثہ جاری رہتا تھا اور عسکری صاحب تو خاموش ہو جاتے تھے لیکن کرار صاحب مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ بات میری کبھی سمجھ میں نہ آ سکی ــــ تو یہ ایک صورت ہے میرے ذہنی سفر کی۔

محمود صمد یقفی :۔ پہلی بات تو یہ کہ قمر مشتاق صاحب نے یہ کہا تھا کہ سوال بھی چھوٹے ہوں اور جواب بھی لیکن پہلے ہی سوال کے جواب میں بد پرہیزی ہو گئی۔

جوہر حسین :۔ سوال تو چھوٹا ہی تھا

محمود صمد یقفی :۔ میرا سوال یہ ہے کہ سلیم بھائی نے کہا کہ ۱۰۔ ۱۵ سال کی عمر سے ہی انہیں اسلام کی فکر ہے الحمد للہ بہت اچھی بات ہے۔ ہر مسلمان کے اندر یہ چیز ہونی چاہیے تو اس حوالے سے شاعری کے وہ حصے جن سے تائب ہونا پڑا تو وہ کس ضمن میں شمار کیے جائیں گے۔

سلیم احمد :۔ بہت اچھا آپ کا سوال ہے۔ اس کے اندر دو غلطیاں ہیں پہلی غلطی یہ کہ آپ نے یہ کہا کہ مجھے تائب ہونا پڑا۔ لیکن الحمد للہ مجھے کبھی تائب نہیں ہونا پڑا۔ وہ شاعری میرے مجموعے میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ بلکہ ایسی شاعری کرنے کا اب بھی ارادہ اور استطاعت دونوں رکھتا ہوں (قہقہے) ــــ وہ کوئی مسئلہ میرے لیے نہیں تھا ــــ دوسری چیز یہ کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی غلط چیز ہے تو بس اس بات کو بالکل درست نہیں سمجھتا۔ یہ ایک بہتان ہے اسلامی شاعری کے تصور پر ــــ کیونکہ یہ شاعری ہمیں بڑے سے بڑے مسلمان شعراء کے ہاں ملتی ہے۔ شیخ سعدی جیسا مصلحِ اخلاق مشرق نے ــــ مسلمانوں نے نہیں ــــ مشرق نے پیدا نہیں کیا۔ لیکن ان کے ہاں آپ کو یہ شاعری ملے گی ــــ مولانا روم کی مثنویاں[1] جنھیں ہست قرآن در زبان پہلوی کہا جاتا ہے۔ وہ آپ نے پڑھی ہوں گی۔ اس میں ملیں گی ــــ کوئی اردو کا شاعر لے لیجیے ــــ مومن کو دیکھیے وہ سید احمد بریلوی کے خلفاء میں سے ہیں اور "تحریک جہاد" انہوں نے لکھی ہے۔ تحریک میں وہ شامل رہے ہیں ان کی آپ مثنویاں دیکھیے تو میرے خیال میں دونوں مفروضے غلط ہیں۔

حبیب ارشد :۔ کیا ہی اچھا ہو کہ شمیم احمد صاحب کا ذہنی سفر بھی ہمارے سامنے آ جائے

[1] مثنویاں نہیں بلکہ مثنوی (ادارہ)

شمیم احمد :- ایک بات تو یہ ہے۔ اس میں بنیادی بات ہے کہ سلیم احمد صاحب کا میں چھوٹا بھائی ہوں۔ جب والد کا انتقال ہوا تو تین سال میری عمر تھی۔ تو بھائی صاحب میرے لیے والد کی جگہ تھے تو جیسے جیسے یہ ادب اور زندگی کے دوسرے معاملات میں دخیل ہوتے گئے میرے لیے ایک چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ایک مشابیے کی حیثیت اختیار کرتے گئے۔ اور اسی حوالے سے تمام ان کتابوں کو جنہیں سلیم احمد صاحب نے پڑھا تھا میں نے پڑھا ـــــ انہیں شخصیات کو جن کو سلیم احمد صاحب نے دریافت کیا تھا ان سے میرا عمر کے اسی تقاضے کے اعتبار سے معاملہ رہا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ تھوڑا سا فرق ان معنوں میں تھا کہ میں نے جب آنکھ کھولی تو میرے سامنے ہندوستان کی جو سیاسی صورتحال تھی وہ ذرا مختلف تھی۔ یعنی اس سے پہلے خاکسار تحریک اور جمعیت علمائے ہند اور احرار کا دور گزرا تھا ـــــ مسلم لیگ اس وقت، مطلب یہ کہ اپنی جنگ لڑ رہی تھی۔ اپنی دفاعی جنگ ـــــ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ دفاع کر رہی تھی۔ بلکہ یہ کہ دفاعی پوزیشن میں اگر بھی ان سوالات کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ مطلب یہ کہ جیسے جیسے میرا شعور پختہ ہوتا گیا اور میں اپنی خالہ کے پاس زیادہ رہا جو کہ اتفاق سے بہت زیادہ مسلم لیگی خیالات کی خاتون تھیں اور خاکسار تحریک اور دوسری جو جماعتیں تھیں ان کا اعتراض تو میرے سامنے رہا ان کا Role میرے سامنے نہیں تھا ـــــ پھر وہ لمحہ آیا جب مسلم لیگ کے لیے میرا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اعتراض جو مسلم لیگ پر ہوتا تھا وہ دو قومی نظریے کے سلسلے میں ہوتا تھا مسلم لیگ اور کانگریس کے دو بنیادی رویے تھے۔ سیاسی تحریکات میں۔ اس میں مسلم لیگ پر یہ الزامات تھے کہ یہ انگریزوں کی لائی ہوئی جماعت ہے اس کے کچھ مفادات ہیں، یہ متوسط طبقے کی جماعت ہے۔ میں آپ کو بتاؤں میں نے سب سے پہلے مولانا مودودی کی سیاسی کشمکش جیسے وہ اسی بچپن میں پڑھی اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں پہلی بار مذہبی جماعتوں کے جو اعتراضات تھے خصوصاً دو قومی نظریہ کے متعلق ان کو زیادہ فکری طور پہ اور سیاسی طور پر زیادہ مستحکم طور پہ پیش کیا گیا تھا اور اس کا دفاع بھی کیا تھا.......... اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ دو قومی نظریہ جو ہے۔ یہ واقعی ہندوستان کے تقاضوں کے مطابق ہے ـــــ تو اس صورتحال میں میں نے یہ دیکھا کہ جس وقت یہ کتاب آئی۔ تو وہ حضرات بھی مسلم لیگ کے جو کہ اکثر Shy ہو جاتے تھے بعض سوالات سے وہ اس Base پر اس کا جواب دینے لگے ـــــ اور جیسے جیسے کانگریس کے رد عمل میں مسلمانوں پہ ـــــ چاہے وہ فسادات کی صورت میں ہو چاہے وہ شدھی اور سنگٹھن کی شکل میں ہو ـــــ وہ اثرات نمودار ہوتے گئے اور کانگریسی رویہ بروئے کار

آثار ہا مسلم دشمنی کی صورت میں تو مسلم لیگ کا نقطۂ نظر بہت زیادہ ابھر گیا اور اس کے لیے چونکہ Base تھی تو میں نے انہی مجلسوں میں اپنے بزرگوں کی جہاں کانگریسی بیٹھتے تھے، خاکسار بیٹھتے تھے۔ بعض کمیونسٹ نوجوان ہوتے تھے میں نے پہلی بار مسلم لیگی نقطۂ نظر کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا تو وہ اس کا جواب دینے لگا تھا۔ اور ایسا جواب کہ جو سوائے تحریک پاکستان کے یا ایک منطقی نتیجے کے جس کا حاصل پاکستان ہی تھا — اور پاکستان کے سوا جس کا کوئی نتیجہ نکلتا ہی نہیں تھا — لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جیسا کہ بھائی صاحب نے اس زمانے کی سیاسی صورتِ حال کے بارے میں کچھ باتیں بتائی ہیں — اس میں مسلم لیگ کی ایک کمزوری مجھے شروع ہی سے محسوس ہوتی تھی۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ سیاسی کشمکش کا ہی اثر ہو کہ انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت کے سلسلے میں چند بنیادی سوال اٹھائے تھے کہ جس کی بنا پر میں اس انداز سے بھی سوچتا رہتا تھا اور وہ یہ کہ ایک تو مسلم لیگ کی قیادت کے پاس اس کا کوئی حتمی جواب نہیں تھا کہ پاکستان میں کیا ہو گا۔ یعنی جب بھی کوئی سوال کیا جاتا تھا کہ مثلاً پاکستان کا معاشی نظام اور سیاسی نظام — تو جذباتیت تو ہوتی تھی، یہ منطق تو ہوتی تھی کہ جیسے کہا کہ پاکستان جو بنے گا وہ اکثریتی علاقوں میں بنے گا لیکن اس کا کوئی Concrete جواب نہیں دیا جاتا تھا۔ جس کی بنا پہ یہ خدشات برابر بڑھتے جا رہے تھے کہ پاکستان ایک خام تجربہ نہ ثابت ہو جائے — لیکن اس پہ جتنا غور کرنے لگے۔ اس میں ایک صورت یہ پیدا ہوئی کہ مسلم لیگ کا جو نقطۂ نظر تھا وہ دراصل معاف کیجیے گا — میں نے مسلم لیگ کے وہ جلسے دیکھے ہیں جو اس جواز پہ کہ پاکستان مسلم اکثریتی علاقوں میں بنے گا، تو جو لوگ مسلم اقلیتی علاقوں میں ہیں ان کا کیا بنے گا — اور وہ ساڑھے تین کروڑ مسلمان کہاں جائیں گے؟ — تو میں اس کا گواہ ہوں — میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا ایک ادنیٰ کارکن تھا۔ یہ کہا گیا کہ اگر وہ ۲/۱۴ کروڑ بچتے ہیں اکثریتی علاقوں کے مسلمان تو ہم ۲/۱۴ کروڑ اگر قربان بھی ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا — ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ مسلمان بچ جائیں — یہ نعرہ گلا پھاڑ پھاڑ کر ان کے جلسے کے اندر لگایا گیا — یہ میں — اس صورت کو اپنی صداقت میں محسوس کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ ایک متوسط طبقے کی جس طرح جماعت اسلامی کے بارے میں ہمارے کرار صاحب نے بات کہی، مسلم لیگ بھی خود ایک موقع پرست گروہ تھا — اور ایک متوسط طبقے کا ایسا ڈھکوسلہ تھا کہ جس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ دراصل بنیادی طور پر سیاسی سفر کون سا سوال پیدا کرنے والا ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں

اور وہ یہ ہوگا کہ مسلمان اپنے تحفظ کے بے آزادی کے بعد جب سوچیں گے تو ہمارے پاس ان کے
سوال کا حل ہے باقی مذہبی جماعتیں ان کے سوال کا جواب نہیں دے سکیں گی کہ آزادی کے بعد
مسلمانوں کا کیا ہوگا ــــ ؟ ــــ نہ اس کا جواب کانگریس کے مسلمانوں کے پاس
تھا، نہ احرار کے پاس تھا۔ نہ خاکساروں کے پاس تھا۔ نہ کسی اور کے پاس تھا کہ اس صورت
میں کیا ہوگا؟ ــــ تو اس وقت مسلم لیگ نے یہ بھانپ لیا تھا اور اس نے ایک نہایت اہم
موڑ پر اس کا جواب دیا کہ ــــ تقسیم ہند ہو جائے ــــ اور اتفاق سے حالات کا دھارا یہ تھا
کہ سارے تضادات کے باوجود۔ حالانکہ وہ فکر پیدا کی تھی مذہبی جماعتوں نے اور اس سے قطعاً
مسلم لیگ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور نہ مسلم لیگ نے اس فکر کو پیدا کیا تھا ــــ لیکن یہ اس
سیاسی دھارے کا عمل تھا کہ مسلم لیگ نے نہ صرف اس سوال کو لاکر تمام برصغیر کو پاگل کر دیا بلکہ
تمام جماعتیں عاری ہوگئیں اپنی فکر سے ــــ اور مولانا مودودی کے سامنے یہ سوال ضرور تھا۔
لیکن میں آپ کو یہ بات بتاؤں کہ وہ اسی بنیادی سوال سے ٹکرا کر صاحب اگر تقسیم نہیں ہوگی تو آپ
کا اسلامی نظام نافذ کہاں ہوگا؟ ــــ ایک دوسری پوزیشن میں آگئے تھے۔ تو جس وقت پاکستان
بنا تو میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت مسلم لیگ جو ہے وہ ایک ایسی تحریک پیدا کر آئی تھی کامیابی کے
ساتھ کہ ــــ جس کے پیچھے اس کے پاس کوئی پس منظر نہیں تھا ــــ کوئی کام نہیں تھا اور مذہبی
جماعتیں چونکہ پاکستان کی مخالفت کر چکی تھیں۔ لہٰذا وہ ساری اس پوزیشن میں نہیں تھیں کہ وہ ان
سوالات کا جواب دے سکتیں کہ ان پر غداری کے چارج اور لیبل لگ چکے تھے۔ تو گویا میرا ذہنی
سفر تو سلیم احمد صاحب کے ساتھ اس طرح چلتا رہا کہ میں مسلم لیگ کا ہمیشہ وفادار رہا اور کسی جماعت
کے ساتھ نہیں گیا ــــ ایک دھوکا مجھے بعد میں لگا ــــ مطلب یہ کہ پاکستان کے قیام
کے بعد ــــ اور وہ دھوکا یہ تھا کہ مسلم لیگ نے جس طرح قیادت کے بعد ان نعروں سے جن
کی آوازیں آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ جن جلسوں میں کہا گیا تھا کہ یہ ایک اسلامی مملکت
ہوگی راتوں رات اس کو وہ بھول گئے اور ایک ایک سوال کو فراموش کر دیا کہ انہوں نے برصغیر
کے مسلمانوں سے کیا بات کی تھی۔ تو اس وقت جماعت اسلامی کا جو رول تھا۔ وہ یقیناً محل نظر تھا۔
میں اتنا ہی دور تھا جماعت اسلامی سے جتنا کوئی مسلم لیگی ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ بات تھی کہ اگر
کوئی جماعت معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتی ہے تو اسے بڑے منظم طور پر تحریک کو اٹھانا پڑتا ہے
اس اعتبار سے جماعت اسلامی، اسلامی جماعتوں میں واحد جماعت تھی جو ایک تحریک کے ذریعے

اور منظم طور پر معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ اس بات کو بائیں بازو کی جماعتیں خوب اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ چنانچہ جب بھی انہیں اسلام پر تنقید کرنا ہوتی یا پاکستان میں اسلامی نظام کی کوششوں کو گالی دینا ہوتی تو وہ بس جماعت کو گالی دے کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ یہ صورت حال اب بھی ہے
میں کبھی ترقی پسند تھا ـــــ اب بھی ترقی پسند رسالوں میں لکھتا ہوں ـــــ میں نے دیکھا کہ ادبی پرچوں میں بھی جماعت اسلامی کو ایک علامت بنا کر گالی دی جا رہی ہے۔ اس سے مجھے جماعت کے مرکزی کردار کے بارے میں احساس ہوا کہ جماعت واقعی کوئی ایسا کام کر رہی ہے جس سے یہ تمام بائیں بازو کی قوتیں خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی ہمنوائی بند کر دی اور جماعت کے پرچے میں لکھنا شروع کر دیا۔ بلکہ بھائی صاحب اور مشفق خواجہ کو بھی آمادہ کر لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جماعت کو موضوع بنا کر میں نے کوئی بات نہیں کی۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں، کہ جماعت کے بارے میں یہ ساری خوش فہمیاں اس وقت میری حد تک ختم ہو گئیں جب وہ ضیاء الحق صاحب کی حکومت میں شریک ہو گئی۔ میں جماعت سے بالکل مایوس ہو گیا۔ یعنی مجھے یقین ہو گیا کہ جماعت کوئی انقلابی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ میری مایوسی اس حد تک ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ خیال انتہا پسندانہ لگے کہ ۱۹۷۷ء سے قبل تک جماعت انقلابی راستہ اختیار کر سکتی تھی لیکن اب اس کی وفاداری پہلے اسلام اور پاکستان سے نہیں ـــــ کسی اور چیز سے ہو گئی ہے ـــــ اور جہاں تک ادب کا معاملہ ہے تو آپ جانتے ہیں کہ "التحریک پاکستان" میں نے قسط وار لکھی۔ تو اس میں کچھ مسائل پر۔ اور طبقات پر جو مفادات کے حامل ہیں ـــــ ان کا ذکر سراغ ملے گا۔ لیکن اس کے باوجود مطلب یہ کہ ایوب خان کے بالکل دور آخر میں لکھی تھی۔ لیکن اس سے الگ کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ جس طرف وہ صورتحال جا رہی تھی بالکل وہی نتیجہ بر آمد ہوا ـــــ اور یہ عنصر کسی حد تک میرے ادبی مضامین میں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ میں اس حد تک یعنی سچائی کے ساتھ جس کو میں سمجھتا ہوں ـــــ اور اب میں آپ کے سامنے بتا دوں کہ مجھے در اصل کس چیز کی تلاش تھی۔ وہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اگر دنیا کے اندر کہیں بھی اسلامی انقلاب حقیقی معنوں میں ـــــ حقیقی سوسائٹی کہیں پیدا ہوئی تو اس کو ایران کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا ـــــ تیرہ سو برس میں اس تجربے نے یہ بتا دیا کہ سوائے اس کے باقی ساری اسلام کی جو بھی شکلیں ہیں وہ سب Fraud ہیں ـــــ وہ کسی نہ کسی دھوکے پر قائم ہیں ـــــ آپ کہیں گے کہ یہ تو شیعہ مملکت ہے ـــــ ٹھیک ہے ـــــ آپ لوگ سُنی ہیں ـــــ آپ سُنی مملکت قائم کریں ـــــ لیکن انقلاب کی صورت میں اگر آپ

تبدیلی چاہتے ہیں تو تبدیلی کا راستہ صرف وہی ہوگا - اسی طرح ممکن ہوگا ۔ خدانخواستہ ایران ناکام بھی ہوجاتا ہے تو اس کی ناکامی بھی اہم ہے ـــــ جب بھی کوئی تحریک چلے گی تو اُسے دیکھنا پڑے گا کہ ایران ناکام کیوں ہوا ؟

محمود صدیقی :۔ ویسے یہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے - میں سلیم بھائی سے کہوں گا کہ وہ شمیم صاحب کے آخری نکتے پر اپنی رائے کا اظہار کریں ۔

سلیم احمد :۔ جی میں ابھی عرض کرتا ہوں - کہا تو یہ گیا تھا کہ ادب ۔ ادیب اور ادبی مسائل پر گفتگو ہوگی لیکن گفتگو کا جوہر حسین نے یہ ڈھب ڈالا کہ یہ گفتگو زیادہ سے زیادہ سیاسی ہوتی جا رہی ہے ـــــ خیر ! میرا چونکہ نقطۂ نظر واضح ہے - لہٰذا میں بہت وضاحت سے اس معاملے پر گفتگو کروں گا ۔ جماعت سے مجھے نہ پہلے مایوسی ہوئی تھی نہ اب کوئی مایوسی ہے - جماعت کے کچھ فیصلے ایسے ہیں جن پر میں نے .... Criticize کیا اور جن پر میں اب بھی Criticize کرتا رہتا ہوں ـــــ باوجود اس کے میرا مسلک ادبی ہے ـــــ میں گورنمنٹ سرونٹ ہوں ۔ ـــــ اور میں کسی جماعت سے وابستہ نہیں ہوں - لیکن میں نے حکومت کو ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ جب پاکستان کا اور اسلام کا سوال ہوگا تو آپ مجھے گورنمنٹ سرونٹ نہ سمجھیں ۔ ـــــ میں وہ بات کہوں گا جو کہنا چاہتا ہوں - خواہ میں گورنمنٹ سرونٹ رہوں یا نہ رہوں میں اس ملک میں ایک Ideology میں آیا ہوں کسی حکومت کا بندہ بن کر نہیں آیا ہوں - میں اپنی Ideology سے وفادار رہوں ـــــ تو یہ ایسی چیز ہے جو ریکارڈ پر موجود ہے اور آپ نہ یڈیو پاکستان کے اگر فائل دیکھیں گے - میرا پرسنل فائل تو اس میں آپ یہ ساری چیزیں لکھی ہوئی پائیں گے ـــــ اچھا ـــــ اس حکومت سے میرا ربط کتنا مثبت ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہوگا کہ بھٹو صاحب جن کا میں بدترین دشمن تھا، اب شاید اتنا نہیں رہا - ان کے خلاف میں نے اتنی چیزیں لکھیں اور ان کو بتا نہیں میں نے کیا کیا "جسارت" میں لکھا اس کا فائل آپ اٹھا کر دیکھیں - وہ برسرِ اقتدار آئے تو مجھے ترقی دے کر پروڈیوسر بنا دیا گیا اسٹاف آرٹسٹ سے ـــــ میری تنخواہ میں دُگنا ـــــ ڈھائی گنا اضافہ ہوا ـــــ مجھے بیشمار اور مراعات دی گئیں اور باوجود اس کے کہ میرے مخالف اور میرے دشمن وقتاً فوقتاً ان کے پاس جاتے رہے کہ سلیم احمد نے آپ کے خلاف یہ لکھا ـــــ وہ لکھا - ان کو فائلیں دکھائیں ان کو اور مولانا کوثر نیازی صاحب کو ـــــ لیکن اس حکومت نے میرے خلاف کبھی کوئی اقدام نہیں

کیا ـــــــ یہ ہماری امیر المومنین کی حکومت ہے جس نے ۳۲ سال میں پہلی بار مجھ پر کمیٹی بٹھائی ـــــــ اور اس کے جواب میں، میں نے یہ لکھا کہ خدا کے فضل سے جس اسلام کا نام میں لے رہا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ ۳۲ سال کے بعد وہ حکومت آئی ہے جو اسی آئیڈیل کے لیے کام کرنا چاہتی ہے تو اسے چلنے کے لیے سب سے پہلے میں ملا ہوں ـــــــ اس ملک میں اور اس کو کوئی نہیں ملا ـــــــ تو یہ اس حکومت سے میرا تعلق ہے۔

جب جماعت اسلامی اس فیصلے پر جا رہی تھی ـــــــ جس سے نسیم احمد صاحب اتنے مایوس ہوئے ـــــــ تو شاید آپ کو اس وقت کے بیانات جماعت اسلامی کے لیڈروں کے معلوم ہوں کہ وہ ہمیشہ اس کو یہ کہہ رہے تھے۔ غفور صاحب کے بیانات کے شاید آپ کو الفاظ بھی یاد ہوں کہ ہم سُولی پر ٹنگے جا رہے ہیں ـــــــ ہمارے ایک طرف کنواں ہے۔ ایک طرف کھائی ـــــــ ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کدھر جائیں۔ میرے پاس جب یہ حکومت میں جا رہے تھے تو خورشید احمد صاحب تشریف لائے اور انہوں نے مجھ سے گفتگو کی۔ اس سے پہلے منور حسن صاحب اور فاروقی صاحب مجھ سے گفتگو کر چکے تھے۔ اور میں نے بہت شدت سے مخالفت کی تھی کہ آپ لوگ حکومت میں شریک نہ ہوں ـــــــ اس پر منور صاحب سے اور خورشید صاحب سے جو گفتگو ہوئی۔ وہ بہت طویل ہے۔ بہر حال جب خورشید صاحب میرے پاس تشریف لائے اور میں نے وہ دلائل پیش کیے تو انہوں نے کہا کہ سلیم صاحب میں آپ کا ہمنوا ہوں اور میں خود حکومت میں جانا نہیں چاہتا تھا اور نہ چاہتا ہوں کہ جاؤں ـــــــ لیکن یہ مجھے مولانا کا حکم ہے اور یہ حکم لے کر میں آپ کے پاس بھی آیا ہوں ـــــــ اگر آپ کے دل میں مولانا کا احترام ہے تو جس طرح میں انہیں انکار نہیں کر سکتا آپ بھی اس کو قبول کر لیں۔ اس پر میں نے خاموشی اختیار کر لی ـــــــ میں نے کہا جیسا آپ مناسب خیال کریں ویسا کیے جائیں ـــــــ مولانا کے بارے میں سارے ذہنی اختلافات کے باوجود جس کے بارے میں، میں نے کسی تفصیل میں جائے بغیر کہا کہ مجھے ان سے ذہنی و فکری اختلافات رہے اور اب بھی ہیں۔ اور جب کبھی ان کی ضرورت ہوگی، اس کو میں عامۃ المسلمین کے بہے اور اسلام کے کاز کے لیے مناسب نہیں خیال کرتا کہ میں اس بات کو بیان کروں ـــــــ تو اختلاف ہمیشہ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس آدمی کو جو تحریک اسلامی کا برصغیر میں داعی تھا میں کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کسی مفاد سے صلح کر لی یا کسی طبقے سے صلح کر لی یا کسی خوف سے صلح کر لی۔ ان کی صوابدید میں غلطی ہو سکتی ہے یعنی میں اس کو

میلانا کا فیصلہ سمجھ رہا ہوں اور اس لیے میرا جو نقطۂ نظر ہے وہ یہ ہے کہ ان حالات میں یہ غلطی ہوئی ۔
——— یہ ایک نتیجہ اس کشمکش کا ہے کہ دو بدترین صورت حال میں کس صورت حال کو قبول کیا جائے
——— تو میرا نقطۂ نظر اتنا انتہا پسندانہ نہیں ہے، جتنا شمیم احمد صاحب کا ہے۔ رہ گیا ایران کا اسلامی
انقلاب تو اس کے میں شدید مداحوں میں ہوں ——— خمینی صاحب اور وہاں کے عوام نے اس
انقلاب کو جس طرح برپا کیا اور میں اس بات کی بھی شمیم صاحب کی تائید کروں گا کہ اگر کوئی راستہ اسلامی انقلاب
کا ہے تو ہمیں کسی نہ کسی طرح اسے ایران کے خطوط پر چلانا پڑے گا۔ لیکن یہ بات کہ میں اس کو ایک
Absolute Truth کے طور پر قبول کر لوں، جس طرح شمیم احمد صاحب اس کو کرتے ہیں ———
تو شمیم احمد صاحب اس کا تجزیہ مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے اندر ایک بات یہ ہے کہ یہ سچائی
کے اتنے زبردست دلدادہ ہیں کہ یہ موت، یعنی انفرادی موت تو شاید ہمیں بھی قبول ہو لیکن یہ اجتماعی
موت کے لیے بھی تیار ہو سکتے ہیں ——— مجھے تو اس وقت یہ چیزیں جو دین میں رخصت کی ہیں۔ اور
دین میں مصلحت کی ہیں ——— یاد آنے لگی ہیں۔ اور ان کے پیچھے جو دانائی بہت بڑے بانیان
مذاہب کی اور صحابہ کرامؓ کی رہی ——— آپ نے ابھی سنا کہ ۱۴ سو سال میں وہ کچھ ایسا نہیں ہوا
——— تو میں اسلام کو منقطع نہیں سمجھتا میرے بہت سے بزرگ ہیں اور چودہ سو سال میں بہت سے
لوگ ہیں جن کی میں خاکِ پا کے برابر نہیں ہوں ——— میں ان کی عزت کرتا ہوں اور ان کے فیصلوں کو
بہت سی دینی اور ملی مصلحتوں پر مبنی سمجھتا ہوں اور اس طرح کا الزام میں ان کو نہیں دے سکتا۔

انوار احمد زئی :۔ اب ذرا ادب پر بھی گفتگو ہو جائے ——— پہلے میں یہ پوچھنا چاہوں گا
کہ شمیم احمد صاحب سے کہ ان کی کتابوں میں یہ انتباہ شائع ہوا ہے کہ اس کتاب کو Guild کے
انعام کے لیے نہ رکھا جائے اور تجویز بھی نہ کیا جائے ——— اور اگر کوئی صاحب انعام کے لیے
تجویز کریں گے تو قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ تو میں پوچھنا چاہوں گا کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے
کیا ان کے خیال میں Guild کے انعامات انصاف پہ مبنی نہیں ہوتے یا اس کام کے لیے
مناسب نہیں ہے وہ ادارہ ۔

شمیم احمد :۔ آپ نے ایسا سوال کر دیا ہے کہ میں اپنی طبیعت کے مطابق یا بقول کلیم عمر
انتہا پسندی کے مطابق، اس سے پہلے خود بیان کر سکتا تھا لیکن کچھ تعلقات کی نوعیت ایسی تھی، بھائی
صاحب کے ذریعے سے کہ جس کی وجہ سے میں اس کو سامنے نہیں لاتا تھا ——— جمیل الدین عالی
صاحب جو گلڈ کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے ——— میں سمجھتا ہوں کہ ایوب خاں نے ادیبوں کو

Trap کرنے کے لیے، اپنے سیاسی مقاصد کے لیے قدرت اللہ شہاب سے مل کر یہ گلڈ بنایا تھا ـــــ تو لوگ دھوکے میں آجاتے تھے مگر جب وہ آتے تھے یعنی بھائی صاحب کے پاس، تو گفتگو کرتے بہت درد مندی کے ساتھ بلکہ جذباتی ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ بتاتے تھے کہ ہم لوگ ایک ایسا پلیٹ فارم قائم کرنا چاہ رہے ہیں جہاں ادیب وہ رول ادا کرے جو ماضی میں مسلم فلسفیوں کا رہا ہے اور جو سیاست دانوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے تو گویا کہ ایک پلیٹ فارم ایسا بن رہا ہے جس میں ہم مل کر ملک کی خدمت کر سکیں ـــــ تو اس دھوکے میں ـــــ شاید سوائے عسکری صاحب کے میں دوسرا نام نہیں لے سکتا جنھوں نے شعوری طور پر گریز کیا۔ اور گلڈ میں نہیں آئے۔ یعنی عالی صاحب کی اپیل کا اثر یوں ہوا ـــــ میں تو ان کے حلقے میں خردوں میں شمار ہوتا اور ان کو بڑے بھائی کی طرح سمجھتا تھا تو میں ان کے قریب چلا گیا اور سارے معاملات میں میں خود شریک رہا ـــــ اس میں دو باتیں میں آپ کو بتا دوں کہ مثال کے طور پر جب عالی صاحب نے یہ بات ہوئی تھی کہ ادیب کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ انعام حاصل کرے ـــــ اپنے مسلم معنوں میں ایمان کی یا اپنی ادبی اقدار کی قیمت اس کو دی جائے اور وہ بھی آدم جی اور داؤد جی کے حوالے سے تو یہ جس طرح خود میرے لیے ناممکن ہے اسی طرح دوسرے ادیبوں کے لیے بھی اس کو ایک بڑی المناک اور رہوناک راہ سمجھتا ہوں ـــــ تو وہ اس بات کو اہمیت بھی دیتے تھے کہ بالکل صحیح ہے لیکن ہم تو کچھ معذور ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں یہ تو فلاحی سی ایک چیز ہے۔ جب کمیٹیاں بنیں اور قواعد مرتب ہونے لگے تو اس میں انہوں نے رکھا تھا کہ صاحب! ادیب فارم بھرے گا اور اس پر Sign ہونے چاہییں ـــــ تو آپ کو معلوم ہے کہ کراچی کی جو منتخبہ مجلس عاملہ تھی اس میں خادم موجود تھا اور "ہم قلم" کا جو پہلا پرچہ تھا اس کا ایڈیٹر تھا ـــــ اور شاید ایک نام کے بعد یعنی ممتاز حسین کے بعد سب سے زیادہ ووٹ میں نے ہی حاصل کیے تھے ـــــ تو میں نے وہاں یہ معروضہ پیش کیا کہ اس تذلیل میں ادیب کو نہ ڈالیں کہ وہ خود فارم پر دستخط کرے، کتابیں پیش کرے آپ کو چاہیے کہ خود ہی کمیٹی مقرر کریں ـــــ وہ تمام کتابوں کا جائزہ لے اور جس کو چاہے انعام کا مستحق قرار دے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے اور ہم اس پر عمل کریں گے۔ لیکن عمل تو ایک دن بھی نہیں ہوا۔ اور کہا گیا کہ شمیم احمد کچھ تنقید کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں جو فکر ہے وہ اس بات کی کہ اگر کسی ادیب نے انکار کر دیا ـــــ تو میں نے کہا "عالی صاحب آپ شاعر ہیں ـــــ ادیب نے اگر انکار

کر دیا تو اس میں ادیب کا، ادبی اقدار کا اور اس کی جان داری کا احساس ہو گا مطلب یہ کہ کسی سرمایہ دار یا کسی اور کی توہین نہیں ہے — یہ تو بہت فخر کی بات آپ کے لیے ہونی چاہیے۔ وہ کون سا ادیب ہے کہ جو ۲۰ ہزار یا دس ہزار کے انعام کو علی صاحب انکار کر سکتے ہیں — لیکن اس پر نہیں سوچا گیا پھر ان کا یہ لگتا کہ آنکھوں نے یہ بھی دیکھا — دس دس ہزار روپے کے انعامات اس لیے رکھے گئے تھے کہ ادیب اس زمانے میں کچھ سستا نہ مانہ تھا اگر وہ اپنا مجموعہ چاہے یا مکان کے لیے پلاٹ چاہے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہے تو ہم دس ہزار روپے مکمل طور پر اس کو دے دیں لیکن پہلے سی انعام میں وہ فیصلہ بدل دیا گیا اور ایک کی جگہ دو کتابیں — معلوم ہوا کہ صاحب چونکہ مختلف صوبوں کے لوگوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے — لہٰذا پانچ پانچ ہزار میں اس انعام کو تقسیم کر دیا گیا — یہ مصلحت تھی۔ پھر یہ مصلحت یہاں تک گئی کہ وہ چار چار جگہ تقسیم ہوا — ستم یہ کہ اس میں یہ Jugglery بھی کی گئی۔ علی صاحب قسم کھا سکتے ہیں کہ انھوں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ اس کتاب کو انعام دیا جائے — لیکن یہ باقاعدہ پریکٹس رہی ہے — کہ مثال کے طور پر سلیم احمد کو انعام دینا مقصود ہے تو ڈاکٹر جمیل جالبی — سلیم احمد کے دیگر مداحین کو جج مقرر کر دیا جائے — یہ میں نے باقاعدہ اس عمل کو مسلسل ہوتے دیکھا اور اس وقت یہ میری جو انتہا پسندی ہے ظہور میں آئی کہ جس وقت یہ ہمارے مزاح نگار جو ہیں مشتاق یوسفی، ان کا پہلا مجموعہ جو ہے "چراغ تلے" تو میں نے علی صاحب سے یہ کہا کہ صاحب اس عہد کی سب سے خوبصورت کتاب ہے — ایک تو ہمارے ہاں مزاح ویسے ہی نہیں لکھا جا رہا ہے اور یہ ایسی اعلیٰ ترین کتاب ہے کہ اس کو آنکھ بند کر کے کسی کمیٹی وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے — آپ اعلان کر دیں انعام کا — انھوں نے کہا ٹھیک ہے" — اسے انعام تو نہیں ملا لیکن رقم جو ہے انعام کی وہ چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور اب جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک بنک کے ڈائریکٹر ہیں — یعنی اس وقت تک انہیں نہیں معلوم تھا کہ کون ہیں یہ — (قہقہے) جب معلوم ہوا تو ان کی دوسری کتاب جو پست ترین کتاب تھی۔ اس کو پورا کا پورا انعام دیا گیا — تو یہ ساری Jugglery میں دیکھتا ہوں اور اپنے مزاج کے مطابق اسی بیے گلڈ کے انعام وغیرہ لینے کو جی نہیں چاہتا۔

انوار احمد زئی : آپ کے مضامین کے عنوانات خاص طور پر بہت نئے انداز کے ہوتے ہیں لیکن خصوصیت سے بعض کتابیں اور ایک کتاب جو ابھی آئی ہے۔ مارکیٹ میں ۲ + ۲ = ۵ تو اس میں ایک تجریدیت ہے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف اپنی بات کو منوانے کے ۲ + ۲ = ۵ ہو سکتا ہے۔

شمیم احمد : میں یہ کہوں گا معاف کیجیے گا کہ آپ نے اس کتاب کا حرف آخر جو ہے وہ

شاید توجہ سے نہیں پڑھا ورنہ تو اس میں اس سوال کا پورا جواب موجود ہے ——— بلکہ اس میں اس سوال کا خدشہ بھی ہے ——— پہلے ہی بتا دیا کہ لوگ اسے جدیدیت کی ایک چیز سمجھیں گے ——— لیکن یہ تو مطلب یہ کہ میرا ایمان ہے کہ جو میں نے کہا ہے اور وہ قصہ یہ ہے کہ اس میں جو بحث میں نے کی تھی کہ صاحب ہم ترقی پسند ادب سے آئے تھے تو زیادہ زور آپ کو معلوم ہے کہ ۲+۲=۴ کے فلسفے پر تھا ——— اور مادیت کی طرف تھا ——— کہ انسانی زندگی میں کوئی ایسی سرگرمی نہیں ہے موجود کوئی حقیقت اس کی نہیں ہے کہ جس کی تعبیر کیا جا سکے۔ ادب کے حوالے سے یا سیاست کے حوالے سے یا نظریات کے حوالے سے جو چیز ہے وہ ۲+۲=۴ کی طرح کہ جو آپ کے تجربے میں آرہا ہے، جس کا آپ مشاہدہ کر رہے ہیں وہ مادی حقیقت ہے ——— صرف وہ حقیقت رہنی چاہیے۔ یہ مجھے ترقی پسند تحریک سے بات ملی تھی ——— تو اس کا جواب بجائے اس کے میں خواہ مخواہ کی دلیلیں اور مارکسی فکر کے جواب میں دیتا، میں نے ...... اس کا زیادہ بہتر طریقہ یہ سمجھا کہ میں دوسری حقیقت کا اعتراف اس طرح کروں کہ جو ۲+۲=۴ نہیں ہے۔ کلی طور پر وہ بھی حقیقت ہے ——— صداقت ہے۔

جوہر حسین: شمیم بھائی میں ایک سوال آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ سرکار، اور ادب کا جو رشتہ ہے ——— سلیم بھائی تو کبھی کبھی شامل ہو جاتے ہیں۔ آپ نہیں ہوتے تو اس میں کچھ خاص نقطہ نظر آپ کا سلیم بھائی سے مختلف ہے یا آپ کو Time نہیں ملتا ان Activities کے لیے

شمیم احمد: نہیں، خاص نقطہ نظر تو اس میں کوئی نہیں ہے ——— بھائی صاحب بھی تقریباً یہی سوچتے ہیں، عمل کرتے ہیں اس پہ ——— لیکن میرے ساتھ جیسا کہ انہوں نے کہا کہ انتہا پسندی میرے اندر ہے تو میں جس چیز کو سچ سمجھتا ہوں یا جس چیز کو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ چیز نہیں ہے ——— میرے لیے کوئی معنی رکھتی یا میرے لیے ایمان اور نظریات اور اقدار کے خلاف ہے ——— تو میں اس پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں ہر قیمت پہ ——— پھانسی پہ چڑھ کر ——— وہ مجھے مار سکتے ہیں ——— مگر اس سے ٹلا نہیں سکتے ——— بھائی صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک بہت ذمہ دار زندگی گزار رہے ہیں ——— جس میں سرکاری ملازمت بھی شامل ہے ——— تو وہ اس طرح سے کبھی کبھی مصلحتوں کا ——— جیسا کہ انہوں نے کہا کہ ماضی کی مصلحتیں بھی ان کے پیچھے رہتی ہیں ——— جوہر حسین صاحب کے حوالے سے ——— بڑے بڑے بزرگوں کا اصرار ——— تو میں اسے غلط نہیں سمجھتا یہ ایک انسانی تقاضا ہے ——— تو وہ اپنے معاملات، مطلب یہ کہ خود طے کریں ——— میں اس

کا بھی گواہ ہوں کہ بعض کام انہوں نے دوستی میں کیے یعنی ان کا بالکل جی نہیں چاہتا تھا لیکن چند دوست آگئے ہیں اور انہوں نے مجبور کیا ہے کہ سلیم بھائی! یہ تو کرنا پڑے گا۔ یا ہم یہ سمجھتے ہیں آپ کے لیے — تو یہ اُن کا مزاج ہے۔

عنایت علی خاں: پچھلے دنوں حکومت کی جانب سے ایک اجتماع کیا گیا تھا ادیبوں کا — قومی ادبی مذاکرے کے عنوان سے — اس میں سلیم احمد صاحب کا ایک مضمون تھا — "نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار" — یہ میں نے پڑھا — اس سے قبل کہ وہ سوال جو میرے ذہن میں پیدا ہو رہا ہے، پیش کروں آپ کی خدمت میں پہلے اس مضمون کا ماحصل اگر سامعین کے سامنے پیش کر دوں۔ اس میں کہیں غلطی کروں تو آپ اصلاح فرما دیجیے — یہ ایک بہت ہی کلی مسئلہ ہے — کہ نظریاتی مملکت ہے پاکستان — ایک وہ ادیب جس کا نظریہ بھی اسلام ہے اور وہ اس نظریاتی مملکت میں قطع نظر اس کے کہ بالفعل ہے یا بالقول — بالفعل اگر یہ نظریاتی مملکت بن جاتی ہے تو پھر ادیب کا کیا کردار اس مملکت میں ہوتا ہے — پہلے تو آپ نے یہ فرمایا اس مضمون میں کہ نظریاتی مملکت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک دینی مملکت ہے۔ نظریہ ایک غیر ثابت شدہ چیز ہوتی ہے۔ اور دین ایک ثابت شدہ حقیقت — اس ملک میں ادیب کا اور مملکت کا، دونوں کا مشترک مقصد ہے کہ خدا کی رضا حاصل کی جائے اور دنیا میں خدا کے احکام کو نافذ کیا جائے — یہ آپ نے فرمایا ہے کہ حکومت کا خاصہ ہے عدالت اور ادیب کا خاصہ ہے صداقت — حکومت کا دائرہ کار عدالت ہے اور ادیب کا دائرہ کار صداقت ہے میں اس بحث میں فی الحال نہیں پڑتا کہ کیا صداقت، عدالت سے مختلف دائرہ رکھتی ہے یا عدالت، صداقت کے بغیر رہ سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ میں نے تسلیم کیا کہ دونوں کے نمایاں وصف یعنی ان کے تشخص کی علامت مملکت کی عدالت زیادہ ہے اور ادیب کی صداقت — پھر آپ نے فرمایا ادیب اپنی صداقت کے اظہار سے قبل صداقت کو اپنا تجربہ بنائے گا اور جب تک وہ صداقت کو اپنا تجربہ نہیں بنا لیتا یعنی اسلام کی صداقت کو جب تک وہ اپنا ذاتی تجربہ نہیں بنا لیتا اس وقت تک وہ صداقت کا اظہار یا پرچار نہیں کر سکتا اور نہیں کرنا چاہیے — تو اس منزل پر مملکت اور ادیب ہم پلہ ہو جاتے ہیں — دونوں کا اپنا اپنا ایک رول ہے جو کسی ایک کے تابع نہیں — دونوں ہم پلہ ہیں — تو ایک سوال تو یہ کہ دینی مملکت میں جب مملکت کا اور ادیب کا، دونوں کا ایک مقصد ہے تو ادیب عام شہری سے آپ نے فرمایا مختلف ہے — عام شہری Submit کر دے گا مملکت

کے سامنے لیکن ادیب میں وہ کیا خصوصیت ہے کہ مملکت کے سامنے Submit کرنے کو تیار نہیں ہے۔ مملکت اس کے Ideal کے لیے کام کر رہی ہے اور دینی مملکت ہے وہ اپنے آپ کو اس دائرے سے باہر کیوں دیکھنا چاہتا ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو ــــ اور جو تم میں سے سربراہ مملکت ہے اس کی اطاعت کرو ــــ دینی مملکت وہ ادارہ ہے کہ جتنے بھی ادارے ہیں وہ اس کے تابع ہونے چاہییں، تب ہی ہم آہنگی ہو سکتی ہے مملکت کے نظام میں ــــ تو ادیب اپنے آپ کو اس سے برتر کس لحاظ سے سمجھتا ہے۔

سلیم احمد: عنایت صاحب! آپ نے بہت اچھی تلخیص کی اور جو باتیں میں بھول گیا تھا وہ آپ نے مجھے یاد دلا دیں ــــ صاحب! ایک بات اور کہی ہے میں نے، اور چونکہ وہ آپ نے بیان نہیں کی لہٰذا سارا عدم تفہیم جو ہے وہ اسی چیز میں پوشیدہ ہے جس کو آپ Omit کر گئے ہیں اور وہ یہ کہ عدالت و صداقت کا اتنا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ــــ مملکت، ریاست اور حکومت، یہ دین کے ظاہر کی حفاظت کریں گے اور ادیب اس کے باطن کی حفاظت کرے گا ــــ ایک داخلی ہے اور ایک خارجی ہے اور جب تک یہ داخل اور خارج ملیں گے نہیں اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہو گی ــــ حکومت کا کام کیا ہے، وہ قانون بنا دے گی، نفاذ کر دے گی، شریعت پر عمل کرائے گی ــــ یہ سارے خارج ہیں، ان کا باطن کہاں ہے؟ اس داخل کی نمائندگی ادیب کرے گا اور چونکہ یہ داخلی ہو گی لہٰذا اس کا Principle .... صداقت ہو گا۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں نماز پڑھ سکتا ہوں جبکہ میرا سر نہ جھکا ہو ــــ میں ظاہر میں تو اسلام کا دعویٰ کر سکتا ہوں جبکہ میرے دل میں نفاق ہو ــــ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے ملک میں یہ ہو رہا ہے اور اس کی طرف میں بڑی شدت سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بات شدت سے بڑھتی ہی جائے گی ــــ تو جب تک اس کا باطن نہیں ہو گا تو بات نہیں بنے گی ــــ اب باطن کے معنی اس Stage پر اگر یہ ہیں کہ ممکن ہے میرے باطن میں شک ملکی ہو میرے باطن میں اعتراضات ہوں۔ ممکن ہے میرے باطن میں پوری قبولیت کسی چیز کے لیے نہ ہو ــــ تو کیا میں اس چیز کی قبولیت کا اعلان کرنے لگوں جس کو میں نے اپنے ذاتی تجربے اور ذاتی حوالے اور ذاتی صداقتوں سے نہیں پایا ہے تو وہ ادب بھی جھوٹا ہے، وہ ایمان بھی جھوٹا ہو گا ــــ ہم کوئی خلا میں باتیں نہیں کر رہے ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ عہد رسالتؐ ہے اور ہم عہد رسالتؐ کو سامنے رکھ کر باتیں کر رہے ہیں ــــ اسلامی فکر کی ایک بہت بڑی ناکامی جس پر میں ان اعتراضات کو بیان کروں گا

تو کبھی بیان کروں گا۔ Historical Perspective کا نہ ہونا ہے۔ مولانا مودودی
جب گفتگو کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالتؐ سامنے ہے اور مسلمان جو ہیں وہ عہدِ
رسالتؐ کی طرح Behave کر رہے ہیں میرے نزدیک یہ ایک Idealistic
Thinking تو ہے لیکن یہ Correct vision کی Thinking نہیں
ہے۔ ہمارے درمیان ۱۴۰۰ سال کا فصل ہے اور ہمارے معاشرے میں بیشمار ایسے عناصر کام کر
رہے ہیں۔ ہمارے اندر اور باہر جو اس وقت موجود نہیں تھے بلکہ آج سے دو سو سال --- تین
سو سال بلکہ آج سے پچاس سال پہلے بھی موجود نہ تھے —— ہم ان کے درمیان ہیں تو ان سب
کا اس Historical Reality کا ہمارے اندر احساس نہیں ہوگا۔ تو ہم
کسی چیز کو Define نہیں کر سکیں گے —— آپ تو مسلمانوں سے توقع یہ رکھیں کہ یہ تو
حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح Behave کرنے لگیں یا حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح
Behave کرنے لگیں۔ یا حضرت عمر فاروقؓ کی طرح Behave کرنے لگیں۔ تو آپ کی نظر
کا ایک دھوکا ہو جائے گا —— میرا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ میں ایک طرف اس کو مادر پدر آزاد
ریاستوں سے جس کو Free world کہتے ہیں اس سے، اس لٹریچر سے اس کو محفوظ
کر دوں۔ اسلامی ادب کو اور دوسری طرف جو اشتراکی نظریاتی ریاستیں ہیں۔ جہاں جبر ہے، استبداد
ہے۔ جو Imperial رجحان ہے اس سے میں اس کو الگ کر دوں —— آپ نے دیکھا
ہوگا کہ بعض مسلمان جب گفتگو کرتے ہیں —— اسلامی ادب کو جب Define کرتے ہیں
تو وہ اشتراکی ادب کا ایک چربہ معلوم ہوتا ہے جس طرح وہاں جبراً State ایک کام کر رہی ہے
اور ہر ادیب اس کو کرتا ہے اس طرح کی صورت ہے، ان دونوں سے الگ کر دینا چاہتا ہوں میں۔
اس لیے میں نے اس کی بنیاد صداقت اور داخلیت پر رکھی اور وہ بات میں نے کہی کہ اگر State
کا صرف کوئی ظاہر ہوگا۔ تو اس کا باطن بھی ہونا چاہیے اور باطن میرے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے۔
سوائے اس چیز کو جس کو ہم وہ .... Cultural Activity کہتے ہیں ــ جو اپنا اظہار
ادب اور فنون میں کرتی ہے۔ اس کے سوا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ اس کے
باطن کی صداقت کو بھانپ سکے۔

عنایت علی خاں : میری الجھن ابھی دور نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ مملکت دینی نہیں ہے
—— مسلم نہیں ہے تو پھر تو ادیب کا کوئی اور Role ہوگا۔ اس لیے کہ اس کا مقصد کچھ اور

ہوگا، مملکت کا مقصد کچھ اور ہوگا۔

سلیم احمد : نہیں، نہیں!! ——— کوئی بھی ریاست ہو ——— یہ نہیں ہے ——— یہ اگر کا سوال نہیں ہے۔ کوئی بھی ریاست ہو ——— وہ ظاہر کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتی ——— وہ کیا کرلے گی؟ وہ آپ سے کہے گی کہ آپ صلوٰۃ قائم کریں ——— وہ آپ سے کہے گی کہ نظام زکوٰۃ قائم کیجئے ——— وہ آپ سے کہے گی کہ جہاد کرو ——— یعنی خارجی قوانین بنائے گی تمام چیزوں کے ——— اس کے سوا وہ کیا کرسکتی ہے؟

عنایت علی خاں : اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ ہم خلا میں بات نہیں کر رہے ہیں ——— ہمارے پاس مملکتیں قائم رہی ہیں اور ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ادیب کا رول کتنا ہے ——— اور حکمرانوں کے اپنے کردار کا Role کتنا ہے ——— کیا ادیب ہی متاثر کرتا رہا ہے، راج روحانی کو، یا انسان کا کردار متاثر کرتا ہے ——— ایک سربراہ مملکت جب خادم بن کر لوگوں کی خبر گیری کرتا ہے۔ رات کو جاگتا ہے اور دن کو جاگتا ہے تو لوگوں پر اچھے ——— سے اچھے شاعر کا شعر وہ اثر نہیں کرسکتا جو لوگوں کے ذہنوں کی تربیت میں اور ایمانی کیفیات کی نشوونما میں ایک شخص کا کردار کرسکتا ہے ——— کیا واحد ادیب ہی نے ٹھیکہ لیا ہے اس بات کا، کہ وہ اذہان کی تربیت کر سکے اور ایمان کی جہت متعین کر سکے؟

سلیم احمد : یہ ——— یہ ——— یہ دوسری بحث ہے ——— یہ دوسری بحث ہے کہ انسان کے قلوب و اذہان کو کیا کیا چیزیں متاثر کرتی ہیں اور اس کے اندر انسانی کردار کا اور انسانی عمل کا ——— جو فنی اظہار چاہتا ہے اس کا ——— کیا مقام ہے ——— یہ ایک ایسی بحث ہے کہ اس پر Debate کرنی چاہیئے ——— یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ اس پر Debate یہاں رکھتے ہیں۔ تو باوجود اس کے کہ سفر کرنے سے میں بہت گھبراتا ہوں اور نہیں آسکتا، لیکن میں آؤں گا اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا ——— یہاں آپ Pin Point کریں کہ صاحب! انسانی کردار اور اس چیز کو جس کو ہم فنی صداقت کہتے ہیں ——— اس کے اندر کیا Relationship ہے اور انسانوں کو متاثر کرنے میں کس کا کیا کردار ہے؟ میں کہتا ہوں کہ انسان کی صداقت جب Action میں Turn ہو جاتی ہے تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ جب وہ احساس میں Turn ہو جاتی ہے Motion میں Turn جاتی ہے تو وہ آرٹسٹ پیدا کرتی ہے۔

(واہ واہ! سبحان اللہ کی آوازیں)

عنایت علی خاں: آپ نے فرمایا کہ صداقت جب تک جزوِ فکر نہ بن جائے ——— جزوِ ذہن نہ بن جائے ——— اس وقت تک وہ صداقت نہیں بنتی ——— اور جزوِ فکر اور جزوِ ذہن بننے کے لیے ایک شخص کا اپنا انفرادی انداز ہوتا ہے، اسے جزوِ ذہن بنانے کا ——— اس کے اپنے تجربات ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا پس منظر ہوتا ہے۔ اس کی تعریف، ہوتی ہے۔ اس کی پسند و ناپسند تو کیا وہ صداقت جسے ہم دینی صداقت کہتے ہیں ——— کیا اس طریقے سے ہر شخص نے اگر اپنے تجربات اور اپنے پس منظر میں اپنانا چاہا تو صداقت ایک رہ سکے گی یا جتنے انسان ہوں گے اتنی صداقتیں بن جائیں گی۔

سلیم احمد: حضرات! اس سوال و جواب سے آپ مطمئن ہیں؟ ——— مطلب یہ ہے کہ ہیں اس بحث کو آگے بڑھاؤں۔

(جی ہاں ——— جی ہاں ——— یقیناً ——— ضرور ——— کئی آوازیں)

جہاں جہاں، کہیں کوئی لفظ ہے ——— قول ہے ——— وہاں اس کا ایک Interpretation ہے۔ جہاں ایک عمل ہے، وہاں اس کا ایک Interpretation ہے ——— اسی کو آپ ——— آپ ایک عمل کرتے ہیں ——— میں دیکھتا ہوں کہ یہ ایک صادق مسلمان کا عمل ہے ——— دوسرا دیکھتا ہے ——— کہتا ہے کہ یہ ایک منافق مسلمان کا عمل ہے ——— آپ کو معلوم ہے ایسی تعبیرات میں فرق ہے ——— یعنی آپ کے بہت سے فرقے ایسے ہیں جو اس سے پیدا ہوئے ہیں ——— جناب!

عنایت علی خاں: میں عرض کروں گا کہ منافق کی پہچان بہت واضح ہے اور ایمان کی علامت بھی بہت واضح ہے۔

سلیم احمد: اچھا اس کے باوجود تاریخ مسلمانوں کی یہ کہہ رہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو چھوڑ کر کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو Controversy سے بچا ہو ——— اور مختلف طرح کی Controversy ان کے بارے میں موجود ہے ——— اور کیا آپ چاہیں گے کہ میں یہاں شیعہ سنی سوال ——— خارجی اور سنی سوال ——— اور دیگر سوال اٹھا کر آپ سے واضح الفاظ میں گفتگو کروں ——— مجھے اس میں کوئی عذر نہیں ہے ——— میں ہر وقت تیار ہوں ——— اس کے لیے ——— لیکن کیا آپ اس گفتگو کو چاہیں گے؟ ——— تو اس لیے اس

اصول کو سمجھ جائیے کہ جہاں قول ہے وہاں Interpretation ہے ــــ میں نے قول کہا، اس کے معنی ومفاہیم نہیں کہے ــــ اس سے قرآن کی بیشمار تفسیریں پیدا ہوئیں ــــ اس سے قرآن کی بیشمار تشریحات پیدا ہوئیں ــــ اس سے بیشمار مسالک پیدا ہوتے ــــ پھر کوئی فرقہ قرآن و سنت سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ وہی عمل جو رسول نے کیا، اسی کو جب Interpret کیا تو شافعی پیدا ہوئے، مالکی پیدا ہوئے، حنفی پیدا ہوتے، خارجی پیدا ہوئے ــــ سب کی بنیاد ایک ہے ــــ پتا یہ چلا کہ جہاں کہیں قول ہے اور جہاں کہیں عمل ہے ــــ تو انسانی اذہان کے آئینوں میں اس کے انعکاس مختلف ہیں۔

(واہ وا ــــ بہت عمدہ! ماشاءاللہ! ــــ کئی آوازیں)

اور انعکاس جب ایک سے زیادہ میں مشترک ہو جاتا ہے، تو ایک فرقہ وجود میں آجاتا ہے ــــ جو اس سے اتفاق کرتا ہے، وہ اس فرقے میں شامل ہو جاتا ہے اور جو اس سے اختلاف کرتا ہے وہ دوسرا فرقہ بنا لیتا ہے ــــ یہ فرقوں کی تاریخ ہے ــــ تو جب آپ نے سوال کیا کہ صداقت جو ہے، دینی صداقت ــــ اس کا رُخ ایک حق کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دینی صداقت کو جانتا ہے کہ وہ کیا ہے ــــ دوسرا اس کا رُخ خلق کی طرف ہے اور خلق میں ہم اس کو جانتے ہیں، یہ ہے Interpretation ۔ میں ایک سُنّی حنفی مسلمان ہوں ــــ میرے لیے یہ ایک صداقت ہے ــــ کیونکہ یہ میرے امام کا قول ہے ــــ ایک شافعی ہے ــــ ایک حنبلی ہے ــــ ایک مالکی ہے ــــ ان کے لیے ان کے امام کا قول صداقت ہے۔ ــــ ایک اہلِ حدیث ہے، اس کے لیے کسی کا قول نہیں ہے وہ احادیث کو Refer کرتا ہے ــــ تو میرا مطلب یہ تھا کہ اصولاً آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ خلق کی طرف جو اس کا رخ ہے اس کی بے شمار Interpretaions ہیں۔

عنایت علی خاں: آپ کی بات سے جو ایک بات . . . . . .

انوار احمد زئی: عنایت صاحب ایک بات ــــ قطع کلامی معاف ــــ اصل میں اس بحث کا جو موڈ ہے کہ ہم سوال کر کے ان حضرات کے نقطۂ نظر سے واقف ہو جائیں ــــ ہم کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہتے ــــ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو سوال میں کر رہا ہوں ــــ میرے اطمینان کی حد تک جواب دیں ــــ ان تمام باتوں سے ہم ان کے نقطۂ نظر تک پہنچنا چاہتے ہیں ــــ یہ میرا خیال ہے ویسے آپ جیسا چاہیں۔

(چند لمحوں کی باہمی گفتگو ـــ سلیم احمد، قمر مشتاق سے کہتے ہیں کہ انہیں ایک گلاس پانی پلوایا جائے۔)

محمود صدیقی : ایک وضاحت میں سلیم بھائی سے یہاں چاہوں گا۔

عنایت علی خاں : وضاحت آپ چاہ رہے ہیں تو اس کا حق پہلے مجھے ہے۔

سلیم احمد : قمر صاحب! ـــ اب مجھے پانی کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے ـــ اب پانی بعد میں ہی پیوں گا ـــ ہاں عنایت صاحب، فرمائیے؟

عنایت علی خاں : میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے بات کی ہے تعبیرات کی۔ لیکن یہ سب تعبیرات قرآن مجید کے دائرے میں آتی ہیں۔ اگر اس دائرے سے تجاوز ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ صداقت نہیں ہے۔

سلیم احمد : حضور! ان کا تجاوز تو قادیانیوں میں نہیں ہے ـــ غلام احمد قادیانی اس سے تجاوز نہیں کرتا ـــ دیکھیں نا ـــ انکار نہیں ہے ختم المرسلینؐ ہونے کا Interpretation کہ خاتم کے معنی کیا ہیں ....

عنایت علی خاں : لیکن آپ کی اپنی عقل سلیم اور ساری دنیا کی عقل سلیم۔

سلیم احمد : وہ۔ وہ میرے سامنے ہے

عنایت علی خاں : اور آپ کی Interpretation ....

سلیم احمد : وہ میرے ساتھ ہے ـــ اور لندن میں ہزاروں آدمی قادیانی ہوئے ہیں۔ ان کی ان کے ساتھ ہے ـــ وہ فرقہ پیدا ہوا ہے اور بڑھ رہا ہے ـــ ان کی عقل سلیم کہہ رہی ہے کہ ٹھیک ہے۔

عنایت علی خاں : ایک عقل سلیم ایک فرقے کی اور ایک پوری امت کی ہے۔ اور چودہ سو سال کی عقل سلیم ہے ـــ تو آپ Negation کریں گے۔

سلیم احمد : نہیں Negation نہیں ـــ میں Negation نہیں کر رہا ـــ میں نے اصولی بات آپ کو بتائی ہے ـــ کہ یہ Interpretation ہی ہے، انکار نہیں ہے ـــ انکار جب وہ کر دیں گے رسالتؐ کا ـــ تو پھر وہ یہ نہیں کہیں گے کہ ہم مسلمان ہیں۔

عنایت علی خاں : یہ دوسرا نکتہ ہے بحث کا کہ آیا قادیانی مسلمان ہیں یا نہیں؟

سلیم احمد : (جلدی سے) نہیں وہ مسلمان نہیں ہیں ــــ بات یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ جو ہمارے نبی کو نہیں مانتا وہ کافر ہے ــــ بس یہاں سے وہ کافر ہو گئے ــــ سمجھ رہے ہیں آپ؟ یہاں سے وہ کافر ہو گئے۔

عنایت علی خاں : میں آخری سوال آپ سے پوچھ لوں ــــ اگر آپ اجازت دیں ــــ اسی مضمون کے حوالے سے ــــ وہ ہے کہ نظریاتی مملکت میں یا دینی مملکت میں ادیب کا کیا کردار ہوگا؟ ــــ وہ یہ ہے کہ جب تک صداقت کو اپنے ذہن کا حصہ نہ بنا لیا جائے، اس وقت تک جو تجربات وہ کرتا رہے گا۔ اس کے اظہار میں وہ آزاد ہوگا ــــ یہ آپ کا مطالبہ ہے کہ ــــ اگر میں صحیح سمجھا ہوں تو ــــ خواہ وہ تشکیک ہی کیوں نہ ہو ــــ اگر اس کا تجربہ تشکیک پر مبنی ہے تو اپنی تشکیک کا اظہار ــــ اس کا اعلان ــــ اس کا ابلاغ بھی ضروری ہوگا ــــ یہاں اگر مملکت آڑے آتی ہے۔ اس کے تشکیک کے عمل میں

سلیم احمد : میں نے کہا کہ میں مملکت سے لڑوں گا۔

عنایت علی خاں : تو آپ مملکت سے لڑیں گے؟ ــــ سوال یہ ہے کہ آپ نے جب خود اس کو تشکیک کہہ دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ذہن میں جو چیز ہے وہ تشکیک سے بالا ہے اور اس تک آپ پیش قدمی کر رہے ہیں۔ جب تک ایک شخص منزل تک نہ پہنچ جاتے اس وقت تک اپنی بھٹکنے والی راہوں پر لوگوں کو بلانا کہ تم بھی بھٹکو

سلیم احمد : میں آپ سے عرض کروں کہ اس میں تھوڑا سا فرق جو ہے وہ Literature کی ماہیت اور Literature کے Role کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے Literature جو ہے وہ ــــ جب آپ نے کہا کہ بلائے حق کی طرف ــــ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے یہ کہا کہ Literature کا فریضہ Preaching ہے Teaching ہے ــــ تو آپ کا گمان ہے ــــ وہ جو تشکیک کا اظہار کر رہا ہے تو وہ تشکیک teach کر رہا ہے ــــ نہیں ایسا نہیں ہے ــــ یہ ادب کی بات نہیں ہے ــــ اور اس کی وجہ سے ایک اور دھوکا لوگوں کو ہو گیا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ادب کسی عمل کے لیے لوگوں کو اکساتا ہے ــــ یہ بھی ادب کی ماہیت کا مسئلہ ہے ــــ میں نے خودکشی پر ایک نظم لکھی ہے تو میں لوگوں کو خودکشی پر آمادہ کر رہا ہوں ــــ یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے ــــ اس کا مفہوم یہ ہے ــــ تو مطلب یہ کہ خودکشی پر نظم پڑھ کر کتنے لوگ خودکشی کر لیتے ہیں ــــ ایسا نہیں ہے ــــ ادب کی

ماہیت کو نہ سمجھنے سے یہ سب مسئلہ ہوا ہے — اور یہ بہت لمبی چوڑی بحثیں ہیں اور اس میں ہمارے...

عنایت علی خاں : تو یہ کہ اگر موثر نہیں ہے ادب تو......

سلیم احمد : نہیں وہ کسی — دیکھیے! — وہ میرا مطلب یہ ہے کہ — دیکھیے! — میری پوری زندگی گزر گئی ہے اس کی تشریحات کرتے ہوئے — میں چاہوں گا کہ آپ میرے استاد محمد حسن عسکری — میرے استاد پروفیسر کرار حسین اور خود میری تحریریں پڑھیں — اور یہ پوری زندگی کا مسئلہ ہے — اور یہ اُلجھا ہوا مسئلہ ہے جو افلاطون سے لے کر اس عہد تک چلا آرہا ہے۔ آپ تو پروفیسر ہیں — آپ تو جانتے ہیں — کہ اس کو میں دو ٹوک انداز میں بیان نہیں کرسکتا — آپ اختلاف کریں — بے شک — آپ کو یہ حق حاصل ہے — لیکن میرے مضامین آپ پڑھیں — میرے استاد محمد حسن عسکری کے مضامین آپ پڑھیں اور ابھی جو کتاب "جھلکیاں" آئی ہے، وہ آپ دیکھیں — تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا اس میں موقف کیا ہے؟

جوہر حسین : شمیم بھائی! میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ سلیم بھائی نے جو یہ مقالہ پڑھا ہے "ادب اور مملکت" کے عنوان سے، اس میں انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ ادب کا مقصد کوئی نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہوں گا۔ کہ آپ بھی کیا یہ سمجھتے ہیں کہ...

شمیم احمد : اس نقطۂ نظر سے کوئی اختلاف شاید ان معنوں میں تو نہ ہو کہ جو بھائی صاحب کا موضوع ہے — لیکن ادب اور ادیب کے تعلق سے ایک بات تو بالکل واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے — کہ مقصد ادیب کا ہوتا ہے ادب کا نہیں — یعنی کسی بھی معاشرے میں رہتے ہوئے کسی بھی مملکت میں رہتے ہوئے ایک ادیب ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو بحیثیت ایک شہری کے اس پر عاید ہوتی ہیں، چاہے وہ کوئی مملکت ہو — چاہے وہ دینی مملکت ہو — اور وہ انہیں چیزوں کو بیان کرے گا جو اس کے رگ و پے میں معاشرے کی طرف سے — اس کے ماحول کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں — اور وہاں وہ اپنے کردار کے ذریعے یہ بتائے گا کہ وہ جو مملکت کا نظام ہے یا معاشرہ ہے یا مملکت کی جو Demand ہے اس پر وہ پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اس سے وفادار ہے یا نہیں — اگر وہ اس سے انکار کرتا ہے تو بیشک آپ اسے پھانسی پر چڑھا دیں — لیکن بحیثیت ادیب اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جو کچھ اندر ہے — وہ اس کو ظاہر کرے — اس کی وفاداری ادب سے ہے نہ کہ کسی مقصد سے ہے — یعنی پہلے ادب ہونی چاہیے وہ تحریر، تب وہ جا کر مقصد بنے گی — اچھا! اب رہ گیا یہ کہ مملکت کسی ادیب کو یہ

ذمہ داری ادا کرنے سے روکتی ہے ـــــ تو بھائی صاحب تو شاید اس کے ساتھ کچھ گزر کر لیں ۔ میں
تو اس صورت میں یہ کہہ سکتا ہوں ـــــ کہ ادیب کا اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ کھوکھوپ
چھوڑ کر کھڑا ہو اور وہ یہ کہہ دے ، اپنے صدر مملکت سے کہ چونکہ وہ اس تجربے میں شریک نہیں ہے
ـــــ وہ ادیب کا تجربہ ہے ـــــ لہذا وہی اس کی وضاحت کر سکتا ہے ـــــ دوسری بات یہ کہ
جہاں تک وہ مفروضہ ہے کہ ایک نظریاتی مملکت اگر پاکستان ہے یا ہو جاتا ہے تو اس میں ادیب کا
کیا کردار ہوگا ـــــ تو میرے خیال میں جو معاشرے کی بنیادی اقدار ہیں ـــــ اور وہ اقدار ظاہر ہے
کہ دینی ہوں گی ۔ ہم فرض کر چکے ہیں کہ وہ دینی ہوں گی ۔ اقدار ہوں گی تو ادیب کے کردار کو ضرور
Judge کیا جائے گا۔

سلیم احمد : (جوہر حسین کو مخاطب کرتے ہوئے) کہنے کا مقصد یہ ہے جوہر کہ تم ہمیں لڑانے
کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے (یہ کہہ کر سلیم احمد قہقہہ لگاتے ہیں ـــــ سامعین کی طرف سے
بھی قہقہے بلند ہوتے ہیں)

عنایت علی خاں : (پوری سنجیدگی سے) اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میں اختلاف ہے
اس لیے کہ شمیم احمد مملکت کو یہ حق دے رہے ہو ۔ کہ وہ ادیب کو Judge کرے اور آپ اس
کا حق نہیں دیتے مملکت کو ـــــ یہ تو سراسر اختلاف ہی اختلاف ہے

سلیم احمد : نہیں ، نہیں ـــــ انہوں نے یہ کہا کہ ادب کا کوئی مقصد نہیں ہے مقصد
ادیب کا ہے ۔

عنایت علی خاں : اور وہ ادیب کا مقصد !
(سلیم احمد اور عنایت علی خاں دونوں بولتے ہیں اور سلیم احمد کی آواز غالب آ جاتی ہے ۔)

سلیم احمد :۔ یہاں سوال ان کا ختم ہو گیا ـــــ تو یہی بات میں نے کہی تھی ۔

قمر مشتاق : سلیم بھائی ! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا جیسا کہ آپ نے صداقت
کو ادب کی اساس قرار دیا ۔ اگر ایک ادیب بنیادی طور پہ اسلام کو بطور مذہب تسلیم نہیں کرتا اور
اس کے ادب میں وہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں جن پہ ہمارے مذہب نے پابندی عائد کر رکھی ہے
ـــــ تو ہم اس میں صداقت کہاں تلاش کریں گے ۔

سلیم احمد : اچھا ! دیکھیے ! ایک تو یہ کہ میں ـــــ معاف کریں ۔ میں ویگ Vague
باتوں کو پسند نہیں کرتا ـــــ یعنی جب مجھ سے کہا جاتا ہے کہ جناب اسلام کو بھی تسلیم کرنا ہے تو

میرے ذہن میں ایک زبردست انار کی آتی ہے۔ اسلام کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ "لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اس نے کہہ دیا ہے ـــــ اسلام کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تصدیق بالقلب اس کو حاصل ہے ـــــ ٹھیک ہے! تیسرا اسٹیج یہ ہے کہ تصدیق بالقلب اس کے سارے اعضا اور جوارح میں پھیل گئی ہے۔ اس کا عمل بن گئی ہے۔ اس کا اظہار بالعمل ہو گیا ـــــ اور تصدیق بالقلب ہو گئی اور اقرار ہو گیا ـــــ اور پھر جب وہ اس نوبت کو پہنچ گیا تو اس کے بھی بڑے درجے ہیں اس میں شہدا کا درجہ ہے، اولیا کا درجہ ہے، صدیقین کا درجہ ہے ـــــ اس کے درجات متعین کرنے جائیں ـــــ کیا ایمان اسی تسلیم کے درجے پر ہے ـــــ آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ جس طرح تسلیم کرتے ہیں، تسلیم تو آپ بھی کرتے ہیں، مگر تسلیم میں کیسا فرق ہے؟ ـــــ آپ میں اور امام حسینؓ میں کتنا فرق ہے تسلیم کے درجے میں ـــــ! تو یہ کہ جب تک آپ اس کو داخلیت میں متعین نہیں کریں گے۔ آپ کو یہ سوالات دھوکا دیتے رہیں گے ـــــ میں ایک بے عمل مسلمان ہوں میں اس بات کو نہیں چھپاتا ـــــ شمیم احمد میں جو انتہا پسندی ہے اس کا ایک بہت اچھا پہلو یہ ہے کہ ان کا ایمان اور ان کی صداقت جو ہے، بہت زیادہ اس پر شدت سے عامل ہیں ـــــ میں بالکل عامل نہیں ہوں اور میں اس عیب کو چھپاتا نہیں ہوں ـــــ جی! میں اس کی تین چار چیزوں پر ـــــ میں اس کے ایمانیات پر یقین کے درجے تک یقین رکھتا ہوں، میں اس کی اخلاقیات پر عمل کرتا ہوں اور شاید نوے فیصد عمل کرتا ہوں ـــــ لیکن اس کی میں عبادات پر عمل نہیں کرتا ـــــ اس کو بوجھ سمجھتا ہوں اپنے نفس میں ـــــ تو یہ تصدیق اور ماننے کے مختلف درجے ہیں۔ میں اپنے درجے میں اپنے باطن میں کتنی صداقت رکھتا ہوں ـــــ بس اتنا ہی میرا ایمان ہے

قمر مشتاق : سلیم بھائی! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم کسی شخص کی ذات کو سامنے رکھ کر اور اس کا Analysis کر کے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جس نظریے پر وہ زبانی طور پر بہت اصرار کرتا ہے۔ عملی طور پر وہ اس سے کتنا دور ہے ـــــ اگر میں آپ کی تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکالوں کہ ہم کسی شخص

سلیم احمد : دیکھیں پھر آپ نے غلط! دیکھیے آپ نے پھر یہ کر دیا کہ تخلیق عمل نہیں ہے۔ physical عمل ہی عمل ہے ـــــ آپ کا خیال کیا ہے؟ اقبال کو کتنی قوت مسجد قرطبہ میں صرف کرنی پڑی تھی!! آپ کا خیال یہ ہے۔ وہ عمل کی قوت جو تھی جس نے مسجد قرطبہ لکھوائی، وہ آپ کے اس محلے کے آدمی سے جو جا کے مسجد میں نماز پڑھ آتا ہے ـــــ جی! اس سے کم درجے کی تھی۔ مجھے

معاف کیجیے، مجھے ایک سوال آپ سے کرنا ہے ___ میرے خیال میں اقبال ان معنوں میں باعمل مسلمان نہیں تھے جن معنوں میں ہم میں سے بہت سے لوگ ہیں۔ لیکن اس کے اندر وہ ..... Power تھی کہ اس نے مسجد قرطبہ جیسی "مردِ مومن جیسی، جی!" "ارمغان حجاز" جیسی چیز لکھی۔ وہ کہاں سے آئی تھی اگر اس کے اندر نہیں تھی۔ تو جب تک ان سب چیزوں پر آپ کی نظر نہ ہو ان کو آپ سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ انٹرپریٹر کا مسئلہ ہے۔ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ جس کو ہم اس طرح کی سنجیدگی سے حل نہیں کر سکتے۔ ہم کو اس کو بہت زیادہ Deeply دیکھنا چاہیے الغرض یہ ہے کہ کلچر جتنا ہمارے ہاں انحطاط پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ نے یقین کیا ___ افسوس ہے کہ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یقین وہ شے ہے جو شک کے بغیر پیدا نہیں ہوتی اور جس یقین نے شکوک کو جذب نہیں کیا اپنے اندر، وہ یقین نہیں ہے۔ وہ ذہن کی ایک Deadness ہے ___ جی! وہ ذہن کی ایک مُردنی ہے۔ اس کا میں ثبوت دیتا ہوں ___ رسول کریمؐ کے پاس اصحاب آتے تھے۔ ایک نے کہا کہ میں تو منافق ہو گیا۔ کہا کیسے منافق ہو گئے؟ انہوں نے کہا کہ جب آپؐ کے سامنے ہوتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں آپ کے پاس سے چلا جاؤں گا تو زندہ نہ رہوں گا ___ جب آپؐ کے سامنے سے چلا جاتا ہوں تو کیفیت یہ نہیں رہتی ___ حضورؐ نے فرمایا ___ یہ اہل ایمان کی پہچان ہے اور شک اور یقین کے درمیان مومن جو ہے اُس کا مقام ہے ___ جی! تو یہ بہت گہرے سائیکلاجیکل مسائل ہیں، ان کو نعرے بازی نہ بنائیں۔ ان کو اس طرح کہنے سے فسادِ خلق پیدا ہوتا ہے اور لوگ جو نہ سمجھنے والے ہیں اس پر طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔

عنایت علی خاں: ایمان نام ہے شک اور یقین کے درمیان کی کیفیت کا ایمان کی یہ تشریح کہیں اور بھی آپ نے سُنی؟

سلیم احمد: جناب! میں نے یہ نہیں کہا کہ درمیان کی ___ میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے ...... اگر آپ ان سارے Spiritualists کی جنہوں نے Faith کی بات کی ہے۔ ان میں آگسٹائن سے لے کر مولانا روم تک سب کا ریکارڈ موجود ہے۔ میں کوئی بات جو ہے بے دلیل نہیں کروں گا۔ انہوں نے تمام شکوک کو جذب کیا ہے اپنے اندر ___ بھی اس کے اندر ایک Affirmative پہلوان سارے شکوک کے درمیان ___ ایک بڑی Spiritual ___ اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ ایک Conditioning آپ کی ایک

عام Level پر ہوتی ہے ___ جس آدمی کی کوئی باطنی زندگی نہیں ہوتی ___ اس میں Growth اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اس کو Critically دیکھنے کے قابل ہوتا ہے Teaching کرتے ہیں ناں ایک Conditioning کرتے ہیں ناں! ___ بچے کو تین سال کی، دو سال کی عمر سے "اللہ رسولؐ کا نام" ___ اٹھنا بیٹھنا سکھاتے ہیں ___ یہ ذہن اس کا بن جاتا ہے۔ اس Level پر عام آدمی بچے کی سطح پر رہتا ہے اس کی داخلی زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کو Traditionally جو کچھ سکھایا گیا ہے اس پر وہ شک اور اعتراض کرنا سیکھتا ہے اور یکھنے کے بعد پھر Affirmation جو ہے وہ ہوتی ہے ___ چنانچہ لا الہ الا اللہ ہمالیہ پر نہیں لکھا ہوا ___ ہر مقام پر پہلے "لا" پھر "الا" ___ پہلے "لا" اور پھر "الا" (واہ وا کی آوازیں) اس طرح تو بیان ہی نہیں کیا ___ کسی Spiritualist نے ___ کہ پہلے "لا"

عنایت علی خان : میرا خیال ہے کہ ہم دین کی بات مولانا روم کے حوالے سے نہیں کرتے ___ بلکہ نبی اکرمؐ کے حوالے سے کرتے ہیں، جن کی بات کی صداقت کو اس طرح تسلیم کرنا پڑے گا جس طرح کہ آپ نے حوالہ دیا کہ صدیق اکبرؓ نے تسلیم کیا۔

سلیم احمد : بہت سے لوگوں کا ادعا ہے کہ وہ حضور نبی اکرمؐ کی روحانیت کو یا ان کی باطنیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ بہت سے لوگ اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں حضور نبی کریمؐ کا ___ اور اس سے وہ بات کرتے ہیں ___ میں ان میں سے نہیں ہوں، لیکن میں ایک بات جانتا ہوں کہ رسول کریمؐ پر یہ کتاب نازل ہوئی جس کے بارے میں کہا گیا کہ پہاڑ پہ نازل ہوتی، تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ___ کوئی صاحب اس کا مطلب مجھے بتا سکتے ہیں؟ (اچھا ہے! سبحان اللہ کی آوازیں) ___ دیکھئے ناں! ایک کتاب، چند الفاظ آپ کو لکھ کر دے دیئے۔ اس کے اندر کیا بات ہے کہ وہ کتاب اگر پہاڑ پر نازل ہوتی تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ___ دیکھئے! جہاں قول ہے وہاں بے شمار Interpretations ہیں ___ ایک Interpretation آپ کا ہے۔ ایک میرا ہے ___ (واہ، وا، وا! کیا بات ہے صاحب!......) ___ میں نے بتایا کہ میں وہاں سے لے کر یہاں تک سارے Spiritualists کی اور سارے روحانیین کی تعبیر میں آپ کو بتاؤں گا ___ ان کے قول پیش کروں گا ___ یہ تو لمبی بحث ہے لیکن...... Spiritual life کو سمجھنے کے لیے اس کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے کہ کہاں سے یہ مقام شروع

ہوتا ہے کہ جب رسول کریمؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس کی پانچ آیات نازل ہو چکی ہیں ——— آپ اپنی بیوی کے پاس آئے ہیں ——— حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے پاس ——— کہتے ہیں مجھے چادر اوڑھا دو ——— مجھے جان کا اندیشہ ہے ——— حضرت خدیجہؓ آپ کو تسکین دیتی ہیں ——— کہتی ہیں ——— آپ ایسے ہیں ——— ایسے ہیں ——— ایسے ہیں، خدا آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس کے بعد آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں ——— یہ دیکھئے! ——— وحی تو آپ پر نازل ہوئی ہے اور اس کی تسکین دلانے کے لیے ورقہ۔۔۔۔ ہیں ——— (واہ، واہ، سبحان اللہ) ———

اس دوران سلیم احمد ایک گلاس پانی پیتے ہیں۔ ہاں صاحب! کوئی اور سوال؟ ——— دبیتہ: عنایت صاحب سے میری گفتگو بہت اچھی رہی ہے (بے شمار قہقہے ——— سلیم احمد کا قہقہہ سب سے نمایاں ہے)

عنایت علی خاں: آپ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ ادھوری صداقت کو بیان کرنے کا اس کو حق ہے۔ ایک دینی مملکت میں کہ اس کی صداقت بھی وہی ہے جو مملکت کی صداقت ہے۔ آپ نے حوالہ دیا ہے علامہ اقبال کا ——— جو بڑے ادیب ہیں بلکہ بڑے ادیبوں کے بھی بڑے ہیں ——— گویا علامہ اقبال بھی اس بیان سے اتفاق کرتے ہیں کہ اپنے ناقص تجربوں کو بیان کیا جائے؟

سلیم احمد: نہیں ایسی بات نہیں ہے ——— بلکہ میں نے یہ بات کہی تھی ——— کہ ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ ؎

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر، یقیں کا ثبات

تو اس نے یہ اعتراف کر لیا ——— میرے قول کے مطابق کہ اس کے اندر پیکار جاری ہے ——— یقین اور گمان کی پیکار ——— اور اس میں وہ دعوے کر رہا ہے کہ ایک طرف گمانوں کے لشکر ہیں ——— مگر میرے یقین میں اس قدر قوت ہے کہ اس کے باوجود ڈٹا ہوا کھڑا ہے ——— یہ اگر اس فقرے کی ——— اس مصرعے کی تشریح ہیں وہ نظم لکھتے تو میرا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ——— انہوں نے اشارہ کیا۔ اور بیان نہیں کیا ——— یہ اقبال کی شاعری میں ایک خصوصیت ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

اور بڑی صداقت سے کہا ہے ——— اور بڑے خلوص سے نبیؐ کو پکارا ہے مدد کے لیے ——— کیونکہ

دن رات وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھے۔

عنایت علی خاں: اگر آپ مجھے بھی موقع دیں تو میں عرض کروں کہ انہوں نے تو اس یقین کو اتنا معتبر جانا تھا، اسی نظم میں —— اور اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے —— انہوں نے کہا تھا ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

عشق وہ چیز ہے جو گمان سے آگے بڑھ کر یقین حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے —— ایک شخص کو.......... (عنایت علی خاں اور سلیم احمد دونوں بیک وقت بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ بالآخر سلیم احمد کی آواز غالب آجاتی ہے۔)

سلیم احمد: نہیں! مجھے اس بات سے کوئی...... میں نے عنایت صاحب......! بے انتہا محبت کی ہے اور میں محبت کے تجربے کو جانتا ہوں اور اگر آپ کہیں گے تو اس کے کچھ معاملات بھی بیان کروں گا —— تو قصہ یہ ہے کہ باوجود ساری محبت کے، دو ہزار بدگمانیاں تو مجھے ہوتی تھیں —— مجھے محبت میں کوئی کلام نہیں تھا —— میں اس کے لیے بڑی بڑی قربانی کر سکتا تھا —— لیکن دو ہزار بدگمانیاں تو مجھے ہوتی تھیں —— اور وہ میں نے اپنی شاعری میں لکھی ہیں —— تو عنایت صاحب! عشق مانع اس بات کا نہیں ہے بلکہ عشق میں تردد اور شدت اور وہ کیفیت جو اسے عشق بناتی ہے، ان چیزوں کی پیکار سے آتی ہے —— وہ اگر ایک Static جذبہ ہو تو وہ بالکل ایک Dead چیز ہے —— اس کی کوئی Value نہیں ہے!!

عنایت علی خاں: ایک شعر اور ہے۔

محمود صدیقی: عشق کی بات ہے یہ —— میں تو کیا کہوں! یہ ناراضگی کی بات کی ہے سلیم بھائی نے —— تو میں نے کہا کہ میں یہ مصرع —— تردد......

سلیم احمد: جناب یہ غزل ہے —— اس پر ایک فقرہ لکھا ہوا تھا —— میں آج اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں —— آپ ادب کے طالب علم ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے —— "الباب فصِ شیثیہ" —— فصِ شیثیہ شاید آپ کو معلوم ہو "الفصوص الحکم" کا ایک باب ہے، جس میں انہوں نے دورِ آخر کے فتنوں کا ذکر کیا ہے —— اور بتایا ہے کہ جب انسان سے ہدایت اٹھ جائے گی تو یہ ہوگا کہ لوگ کثرت سے جماع کریں گے۔ اور اولاد نہیں ہوگی —— لوگ سڑکوں پر بہائم کی طرح

جنسی جذبات میں مصروف ہوں گے اور ان کی اکثریت نفسیاتی طور پر اور Physically جیسے Impo tant ہوگی ۔ اور یہ ہوگی اور وہ ہوگی ۔ آخر اس کا قطب پیدا ہوگا اور چین میں پیدا ہوگا اور نقش قدم پر حضرت شیث کے ہوگا ۔ اور اس کی کل Qualification یہ ہوگی کہ وہ کلمہ جانتا ہوگا ۔ تو میں نے اس کا Application اپنے دور فتنی پر کیا تو ۔ یہ جو کلچر ہے ۔ یہ مطلب ہے کہ کس ٹائپ کا Type Impotent کلچر ہے ۔ یہ تو گاؤم گلوچ ہے اس کلچر کے خلاف ۔ یہ کوئی جنسی شعر نہیں ہے ؎

زور وہ اور ہے پاتا ہے بدن جس سے نمو

لاکھ کوئے کوئی "ناگوں میں دبا کر موسل

یہ کشتے کھا کر ۔ یہ فضولیات کر کے انسان میں جنسی پوٹنسی نہیں پیدا ہوگی ۔ وہ اور چیز ہے جو انسان کو Potent بناتی ہے ۔ یہ چیز اس میں کہی گئی ہے ۔ اور بڑے Symbolic Way میں کہی گئی ہے ۔

عنایت علی خاں : آپ نے دو شعر اقبال کے سنائے سلیم صاحب اور ایک شعر اور بھی Quote کیا ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے

گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

اور ؎

مرا دل مری رزم گاہِ حیات

گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات

اور ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر

مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

ان تینوں اشعار میں آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو تجربہ تھا ادھوری صداقت کا اس کا بیان ہے میرے خیال میں کلی صداقت سے واقفیت کے باوجود اس تک اپنے آپ کو نہ پہنچا سکنے کا اعتراف ہے ۔ یہاں پر نقص فہم نہیں ہے ۔ بلکہ فہم کا لازمی تقاضا عمل ہے ۔ نفاذ ہے اور یہ مجبوری ہے اور مجبوری صداقت کا اعتراف ہے ۔

سلیم احمد: حضور! میری زبان بہت تلخ زبان ہے اس کو کھلوانے کی کوشش نہ کیجیے ــــ اگر آپ چاہیں گے تو بیان کر دوں گا ــــ دیکھیے قصہ اس کا یہ ہے کہ اقبال جو تھے انہوں نے اوّل تو خیالات کی شاعری کی ہے ــــ یہ ان کا مزاج ہے ــــ بانگِ درا میں جب وہ حسیّات کے Level پر تھے۔ اس میں بہت سی باتیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک بات ہے بانگِ درا میں انہوں نے لکھا ہے۔

ع حسنِ نسوانی ہے بجلی مری فطرت کے لیے

لکھا تھا نا؟ یہ حسنِ نسوانی جو بجلی تھا ان کے لیے یہ بعد کے کلام میں کہاں چلا گیا۔ میں پوچھوں گا آپ سے ذرا بتائیے گا؟

عنایت علی خاں: ع "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

سلیم احمد: یہ خیال بازی ہے ــــ یہ خیال بازی ہے ــــ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ ــــ یہ خیال بازی ہے۔ مجھے وہ تجربہ چاہیے جہاں حسنِ نسوانی ہے بجلی میری فطرت کے لیے ــــ دوسری چیز ہے کہ جس یقین تک وہ پہنچے تھے ــــ اس کا میں کچھ بیان کروں۔ میں صرف ان کی شاعری ہی نہیں ــــ ان کے خطبات بھی پڑھتا ہوں ــــ سات Major مسائل ہیں جن میں انہوں نے اُمتِ مسلمہ سے بڑا بھیانک اختلاف کیا ہے ــــ تو اس یقین کو اس طرح نہ سمجھیے جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے انجام کار یہ کہہ دیا "Is Religion possible" "کیا مذہب ممکن ہے؟" یہ آخری خطبہ جو ہے اس میں لکھا ہے ــــ آپ لوگ ذرا دیکھیں کہ مذہب نہ عقیدہ ہے، نہ عبادات ہیں نہ رسوم ہیں ــــ مذہب جو ہے وہ صرف ایک جذباتی کیفیت ہے تو اس طرح نہ دیکھیے چیزوں کو ــــ اقبال ایک بڑی مشکل چیز ہے ــــ میں اقبال کا بچپن سے عاشق رہا ہوں ــــ پورا کلام ایک زمانے میں اقبال کا اردو اور فارسی مجھے حفظ تھا اب کچھ عمر کے تقاضے، کچھ عدم دلچسپی اور کچھ لوگوں کی اشتعال انگیزی سے بھول گیا ہوں جہاں تک اقبال کی عظمت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہماری صدیوں کی تہذیب کا اور شاعری کا امتزاج ہیں۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ان کو پاکستان سے Define کرنا ان کی توہین ہے۔ میں ان کو اتنا بڑا آدمی سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا میں ورلڈ مسلم اسٹیٹ پیدا ہو گی تو وہ اقبال کے شعلوں میں سے ایک شعلہ ہو گی۔ لیکن اس ملک میں یہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے کچھ خطوط عطیہ کے نام بھیجے ان خطوط کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی داستان مجھ کو معلوم ہے اور کچھ خطوط انہوں نے ایک جرمن لیڈی کو جہاں جاکر

اقبال تمھرے نئے لکھے تھے ۔ وہ خطوط جلا دیے گئے ــــ ممتاز حسن صاحب نے جلا دیئے ۔ وہ خطوط ــــ تو یہ تو شہادتوں کو ساری مسخ کر دینا ــــ کوئی بات نہ کرنے دینا ــــ اور یہ سمجھنا کہ کوئی آدمی اس پہ کلام نہیں کرے گا ۔ تو یہ تو ایک بڑی زیادتی کی بات ہے ۔

حبیب ارشد : شمیم صاحب ! میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ایک دینی ریاست میں ایک ادیب کو ہر تجربہ ، ہر سطح پر ہر طرح بیان کرنے کی اجازت ہونی چاہیے ؟

شمیم احمد : میرے خیال میں اگر کسی تجربے کے اظہار میں ترغیب کا عنصر شامل ہو جائے مطلب یہ کہ اگر ادیب ترغیب دینے پہ اتر آئے تو ریاست کو قدغن لگانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے ــــ کیونکہ پھر وہ لٹریچر نہیں رہتا ۔

قمر مشتاق : حضرات اب وقت خاصا ہو چکا ہے ــــ مناسب ہو گا کہ ہم گفتگو کو سمیٹیں ــــ مہمانانِ گرامی بھی تھک چکے ہوں گے اور

سلیم احمد : نہیں قمر صاحب ــــ اگر لوگ سننا چاہتے ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ نہیں ہے ــــ اگر کوئی سوال ہے تو سوال کرنے دیں لوگوں کو ۔

حبیب ارشد : میں شمیم احمد صاحب سے یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند رجحانات ، ہمارے ہاں اب کس حال میں ہیں ۔

شمیم احمد : حبیب صاحب ! یہ سوال مجھ سے متعلق نہیں ہے ۔ ترقی پسند ادب تو آج کل خود ترقی پسندوں کو بھی نظر نہیں آ رہا ہے ۔ ترقی پسند تحریک اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی تھی جس وقت تک معاشرے میں وہ کشمکش یا وہ سوالات موجود تھے ۔ جن سے اس تحریک کا تعلق تھا ۔

عنایت علی خاں : آپ نے فرمایا کہ ترقی پسندوں کو بھی اب ترقی پسند ادب نظر نہیں آتا کہ کہاں ہے کہ کس شکل میں ہے ــــ کس ہیئت میں ہے ــــ غرض یہ ہے کہ جب سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوا تو سرمایہ دارانہ ادب بھی ختم ہو گیا ۔ اگر ایک مسلمان ادیب اپنی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہے تو اس مرحلے میں جب کوئی نظریہ دنیا میں غالب و حاوی نہیں ہے تو اس کے لیے کیا مواقع ہیں ۔

شمیم احمد : میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ادیب جس کا آپ نے ذکر کیا ہے ۔ اقتدار کی طرف دیکھتا رہے گا ۔ مصلحتوں سے کام لیتا رہے گا ۔ ان حکومتوں کو اسلامی سمجھتا رہے گا ۔ اپنی خواہشات کی

بنیاد پر، جن کی بنیاد ہی سراسر غیر اسلامی ہے — تو جو لوگ اس دھوکے میں آئے وہ دراصل بنیادی طور پر اسلام کے اصل معاملات سے، نظریات سے، اس تجربے سے جو معاشرے میں اصل اسلام کو بروئے کار لا سکے اس سے یا تو محروم تھے یا انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر دیا ہے یقیناً ان کا Role وہی ہوگا جو کسی کمیونسٹ نظام میں ادیبوں کا ہوتا ہے جو کمیونسٹ حکومتوں کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی راگ۔

عنایت علی خاں: میری مراد یہ تھی کہ ایک سچا ادیب .....

شمیم احمد: سچا ادیب تو اپنی آواز کو بلند کرتا رہے گا۔ اس آئیڈیل کے لیے یا اس مشن کے لیے جس کو وہ سمجھتا ہے کہ اس ملک میں آنا چاہیے — اور اس کا اپروچ جب تک ادب نہیں ہوگا — وہی میں نے بتایا کہ اس کی وفاداری جیسے .... مملکت سے تو ہے ادب سے نہیں ہے۔ جب وہ ادیب ہے تو اس کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ اقتدار کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی وفاداری تو ادب سے ہونی چاہیے۔

عنایت علی خاں: نتیجہ کیا ہوگا اس کے عمل کا — جس طرح ترقی پسند تحریک نے ایک پروگرام کے تحت — ایک لائحہ عمل کے تحت ....

شمیم احمد: صاحب اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ انکار کر دے۔ سب سے پہلی بات کہ جو منافقت اس کے سامنے جس نام سے پیش کی جارہی ہے اس سے انکار کر دے۔ وہ تجربہ جو اس کی اپنی ذات میں شامل ہے جب تک وہ نہ دیکھ سکے۔ اس کو بروئے کار — تب تک وہ اس سے انکار کر دے۔

جوہر حسین: اردو ادب کی رفتار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

شمیم احمد: میرے خیال میں شاید یہ چند ادیبوں کا مسئلہ ہے۔ جن کی موت اور زندگی کا مسئلہ ادب ہے۔ باقی کسی کو ادب کی رفتار سے یا معیار سے یا مقدار سے یا ادب بحیثیت ایک اکائی یا صداقت کے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چند لوگ رہ گئے ہیں جب ان کی آنکھیں بند ہو جائیں گی اور بند ہونی جارہی ہیں تو پھر بہت مشکل ہوگا۔ دوبارہ اس کو ۴۶ء یا ۴۵ء والے مقام تک لے جانا جہاں ادب معاشرہ کی ایک اجتماعی سوچ بن گیا تھا اور سب سے غالب سرگرمی تھا، معاشرے کی وہاں سے ہم بہت دور آگئے ہیں۔

جوہر حسین: سلیم بھائی آپ اتفاق کرتے ہیں شمیم بھائی کی اس گفتگو سے؟

سلیم احمد : دیکھیں۔ شمیم احمد صاحب نے ابھی ۵۵ء کا ذکر کیا ہے ۵۷ء کی اگر کوئی تصویر میرے ذہن میں بنتی ہے تو ۳۶ء کی تحریک سے بنتی ہے۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک وہ جو جدید ادیبوں کی طرف گیا — راشد اور میراجی کی طرح دوسرا — ایک ترقی پسند — میں ترقی پسندوں کو تنہا نہیں کرسکتا۔ عنایت صاحب مجھے معاف کریں — ترقی پسندوں سے میں لڑ سکتا ہوں، اختلاف کرسکتا ہوں۔ جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ ادیب نہیں ہیں حکومت انہیں پکڑے تو میں اس وقت آپ سے اختلاف کروں گا۔ یہ ادب کا مسئلہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو بہت زیادہ لوگوں کو پریشان کررہی ہے — آپ نے کہا کہ اگر کوئی بات بیان کرنی ہے تو کروں — اس لیے میں یہ بات کہوں گا کہ نفس کی تین کیفیتیں ہیں — نفس اما رہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ، ادب تینوں کیفیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ مختلف سطحات پر اور اس اعتبار سے اس کی درجہ بندی ہوئی ہے۔ اب ہمارے پروفیسر عنایت صاحب کا خیال یہ ہے کہ جب ادیب نفس مطمئنہ پر پہنچ جائے تب اس کو لٹریچر تخلیق کرنا چاہیے اور جب تک وہ اس سے نچلے درجے پر ہے اسے ادب نہیں تخلیق کرنا چاہیے تو میرا اس سے اتنا اختلاف ہے کہ نفس کی تینوں کیفیتوں کا اظہار کرے گا۔ ترغیبات کے معنی یہ ہیں کہ وہاں لوامہ ہوگا نفس کی ملامت اس میں شامل ہے۔

عنایت علی خاں : معاف کیجیے چونکہ آپ نے میرا حوالہ دیا ہے۔ لہٰذا مجھے کچھ کہنا پڑے گا جسے آپ نفس لوامہ کہہ رہے ہیں۔ اس کی واضح سمت ہے نفس مطمئنہ۔

سلیم احمد : وہ — وہ اتفاق سے داغ کی شاعری تک موجود ہے۔ آپ داغ کو پڑھیے تو اس کے اندر نفس کی یہ تینوں کیفیتیں ہیں

رہ گیا عرش سے آگے جاکر   ہے یہ عالم میری تنہائی کا

سے لے کر یہاں تک بن ٹھن کے بیٹھے ہیں۔ آپ کو نفس کی تینوں کیفیتیں ملیں گی — ایک سچا ادیب اس کے سوا کچھ کر نہیں سکتا۔

(جلیسان ادب حیدرآباد کی سالگرہ کے سلسلے میں ہونے والے پروگرام "روبرو" کی ریکارڈنگ — یہ پروگرام ۱۷ فروری ۷۰ء کی شام ہلال احمر ہال میں منعقد ہوا۔)

بشکریہ رسالہ حیدرآباد

شبنم صدّیقی

برگِ سبز — سلیم احمد سے ایک گفتگو

شبنم صدیقی صاحب ، بھائی صاحب کے ان ملنے والوں میں شامل رہے ہیں جن میں میرٹھ ۱۹۴۴ء سے لے کر کراچی ۳۱ اگست ۱۹۸۳ء تک سینکڑوں نام آتے ہیں ۔ لیکن ان کا شمار بھائی صاحب کے اس حلقۂ احباب میں ہوتا تھا جو ان کی شام اور شب کی نشستوں پر مشتمل تھا ۔ شبنم صدیقی صاحب سندھ کے مختلف کالجوں میں عرصہ دراز تک اُردو کے استاد کی حیثیت سے متعین رہے لیکن کالج کی تعطیلات وہ عموماً کراچی میں گزارتے تھے اور اسی زمانے میں جب بھی موقع ملتا وہ بھائی صاحب کی نشستوں میں نظر آتے تھے ۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک جہانگیر روڈ سے انچولی سوسائٹی تک اسی طرح جاری رہا ۔ ۱۹۸۲ء میں شبنم صدیقی صاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا تو بھائی صاحب ان کو کچھ نہ کچھ لکھنے پر آمادہ کرتے رہتے تھے ۔

شبنم صدیقی صاحب کی یہ خصوصیت بہت نمایاں تھی کہ وہ بھائی صاحب کے پاس جب بھی آتے تھے تو کوئی نہ کوئی سوال یا علمی اشکال لے کر آتے ۔ چونکہ اُن کے مطالعہ کا دائرہ فلسفہ ، مذہب اور ادب تک پھیلا ہوا تھا اس لیے بھائی صاحب پوری توجہ سے اُن کے ہر قسم کے سوالات اور وضاحتیں ، دل جمعی کے ساتھ سنتے تھے اور پھر اس پر گفتگو کرتے ۔

بھائی صاحب کی رحلت کے بعد ان نشستوں میں شریک ہونے والے احباب کو جو خلا محسوس ہوا وہ دراصل ایسی آباد بیٹھک کا اچانک اجڑ جانا تھا جو تقریباً ۴۰

سال سے شام سے رات گئے تک ہر آنے جانے والے کے لیے کھلی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر ان نشستوں کا کوئی تذکرہ لکھا جا سکا تو ایک اہم ادبی اور علمی سرگرمی کاغذ پر منتقل ہو سکتی ہے۔ یقیناً ان نشستوں کا حال لکھنے والے لکھیں گے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شبنم صدیقی صاحب کے سوا کوئی فرد اپنی اور بھائی صاحب کی گفتگو کو من وعن کاغذ پر منتقل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس سے ان نشستوں میں ہونے والی گفتگو کا کوئی اندازہ کیا جا سکے۔

شبنم صدیقی صاحب نے کمال صحت اور حافظہ کی غیر معمولی صلاحیت کی مدد سے ایک موضوع پر اپنی گفتگو ریکارڈ کر کے ہمیں دی ہے۔ غالباً یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے سوالات کی پوری تیاری کر کے آئے تھے۔

ادارہ روایت توقع کرتا ہے کہ وہ دیگر موضوعات پر بھی اپنی اور سلیم احمد صاحب کے مابین والی گفتگو کو اسی صحت اور فطری انداز میں کاغذ پر منتقل کر دیں گے۔

شمیم احمد

سلیم احمد: ہاں بھئی شبنم! بہت دنوں بعد آئے۔ سناؤ کیا پڑھ رہے ہو آج کل بلکہ یہ بتاؤ کس موضوع پر سوچ رہے ہو۔

شبنم صدیقی: سوچنا کس موضوع پر ہے سلیم احمد بھائی۔ وہی جبر و اختیار کا لاینحل مسئلہ، وہی مجبوروں پر مختاری کی تہمت، وہی حدیث جبر و قدر سمجھنے کے لیے کسی پیر رومی کی ضرورت۔

س۔ ا: بھئی میں تو اتنا جانتا ہوں شبنم کہ تمہاری تقدیر میں یہ لکھا ہوا ہے کہ تم جیکب آباد سے کراچی آجاؤ گے اور چونکہ اس بات پر میرا ایمان ہے اس لیے میں تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔ کہو بھائی کیسی رہی میری منطق؟

ش۔ ص: تقدیر پر تو سلیم بھائی میں بھی ایمان رکھتا ہوں مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب سب کچھ پہلے متعین ہوا ہے اور جو متعین ہے وہ ہو کر رہے گا تو پھر انسان صاحب اختیار کیسے ہوا؟ اور اگر انسان صاحب اختیار ہے تو جو کچھ وہ اپنے اختیار اور ارادے

سے آئندہ کرے گا وہ پہلے سے کیسے متعین قرار پایا! کیا یہ تضاد نہیں ہے اور کیا یہ وہی تضاد نہیں ہے جس نے سارتر جیسے صاحب فکر کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ خدا کے وجود سے انکار کر دے اور انسان کو all in all مان لے!

س۔ ا: بڑا اچھا ہوا شبنم کہ تم نے سارتر کے حوالے سے اپنی بات مکمل کی۔ اب مجھے اس تضاد کی حقیقت کو سمجھانے میں آسانی ہو گی۔ دیکھو شبنم سارتر اگر صاحب فکر ہے تو صرف ان معنوں میں کہ وہ اس غیر روایتی، لادینی، زہر آلود فکر کا آخری صورت گر ہے جسے ہم مغربیت یا جدیدیت کہتے ہیں۔ تقدیر کے فلسفے میں سارا الجھاؤ اسی مغربیت نے پیدا کیا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس الجھاؤ اور اس تضاد کا منفی نتیجہ جس بے عملی کی صورت میں بعض مشرقی اقوام میں ان کے دور زوال میں نمودار ہوا اُسے اسی مغربیت نے فلسفۂ تقدیر سے منسوب کر دیا۔

ش۔ ص: تو اب سلیم بھائی آپ کی گفتگو سے دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ تقدیر کے فلسفے میں درحقیقت وہ تضاد نہیں ہے جو بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ سارا تضاد اور الجھاؤ مغرب کے غلط طرز تفہیم سے پیدا ہوا۔ اب اصل مقصود تو پہلی بات کا سمجھنا ہے مگر وہ اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک کہ دوسری بات کی وضاحت نہ ہو جائے تو سلیم بھائی میں یہ دریافت کرنا چاہوں گا۔ کہ اس سلسلے میں مغرب کی غلط اندیشی کا پس منظر کیا ہے۔

س۔ ا: پس منظر کی تلاش میں تو بہت دُور تک جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ مغربی فکر اپنا سلسلہ یونان کے کلاسیکی فلسفے سے جوڑتی ہے اور مغربی تہذیب و ثقافت کی پہلی کڑی یونانی تمدن ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اب جہاں تک یونان کی کلاسیکی فکر کا تعلق ہے وہ انسان کی بنیادی اور امتیازی صفت اس کے صاحب عقل ہونے کو قرار دیتی ہے نہ کہ اس کے صاحب ارادہ ہونے کو اور عقل سے بھی وہاں مراد وہ چیز ہے جسے ہماری روایتی مذہبی فکر میں عقل جزوی کہا جاتا ہے نہ کہ عقل کلی۔ ہمارے یہاں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا منصب اگر حاصل ہے تو اس کی قوت ارادہ و اختیار کی بدولت، اس کو اشرف المخلوقات اور افضل الخلائق اگر کہا جاتا ہے تو اسی جوہر کے باعث اس نے جس عظیم بار امانت کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے وہ اس کی وہی ذمہ دارانہ حیثیت ہے جو ارادہ و اختیار کا مالک ہونے کی وجہ سے اسے حاصل ہے۔ تم سوچو شبنم کہ کیا ہمارا فلسفۂ تقدیر جبر کے تصور کو وہ صورت دے سکتا ہے کہ وہ انسان کے

اس امتیازی شرف کی نفی کردے؟ کیا ہمارا تصورِ جبر اس فلسفے کے تصورِ جبر کے مترادف ہوسکتا ہے، جس میں ارادہ و اختیار کو انسان کی بنیادی اور امتیازی صفت ہی قرار نہ دیا گیا ہو جس میں انسان کا جوہر عمل عقلِ جزوی کا غلام ہو؟ اور پھر یہ سوچو کہ کیا وہ مغربی فکر جو اس یونانی فکر کی وارث ہے اسی تصورِ انسان اور اسی تصورِ جبر کی وارث نہیں ہو گی؟ مغربیت کی اس فکری آب و ہوا میں اگر جبر و اختیار میں تضاد کا رشتہ قائم ہو گیا تو یہ کوئی ناقابلِ فہم بات تو نہیں ہے

ش ۔ ص : اگر کسی فلسفے میں انسان کی قوتِ ارادہ و اختیار کو اس کی بنیادی اور امتیازی صفت قرار نہیں دیا گیا تو اس سے اس صفت کی نفی کا پہلو تو نہیں نکلتا ۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ جوہر انسان میں ہوتا تو ہے مگر یہ انسان کے وجود میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتا ۔ پھر اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ اس فلسفے کی رو سے انسان لازماً مجبور ہے اور یہ مجبوری اتنی ہولناک ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا ؟

س ۔ ا : یہ نتیجہ تو شستہ نکل چکا ۔ یہی تو وہ نقطہ ہے جہاں میں تمہیں لانا چاہتا تھا ۔ اسی نقطے سے تمہاری گفتگو کا صحیح معنوں میں آغاز ہو گا ۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ؟ کیا تم نہیں جانتے کہ یونان کی کلاسیکی فکر کے درخت نے جو پھل پیدا کیا تھا وہ اس صنفِ ادب کی شکل میں سامنے آیا تھا جسے Greek tragedy کہتے ہیں ؟ کیا تمہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یونانی المیے نے انسان کی مجبوری کی کتنی ہولناک تصویر پیش کی تھی ؟ کیا اس میں انسانی ارادوں کی تذلیل اپنے نقطۂ عروج پر نہیں ہے ؟ کیا سوفوکلیس کے ای ڈی پس نے اپنے باپ کا قاتل اور اپنی ماں کا شوہر بننے کے ہولناک انجام سے بچنے کے لیے اپنے خیال میں انتہائی کارگر تدبیر اختیار نہیں کی تھی ؟ اور کیا وہ اس ہولناک انجام سے بچ گیا ؟

یہی جبر کا وہ ہولناک تصور ہے جس نے مغرب کے فلسفیانہ افکار کی تاریخ میں تقدیر کے تصور کے ساتھ تضاد کا رشتہ استوار کیا اور یہی وہ تحفہ تھا جو یونانی علوم و افکار کی ترویج نے مسلمانوں کی فکری تاریخ کو اشاعرہ اور معتزلہ کے مناقشات کی صورت میں دیا ۔

ش ۔ ص : کیا سلیم احمد آپ پورے اعتماد اور وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مغربی فلسفے کی تاریخ میں جتنے جبریہ مسالکِ فکر وجود میں آئے ان سب کا فکری سرچشمہ یونانی المیہ تھا ؟

س ر ا: میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ خود کارل مارکس کا تاریخی لزوم یا تاریخی وجوب کا نظریہ اسی نظریۂ جبر کا ایک نیا اڈیشن ہے جو یونانی المیے کی روح تھا۔

ش ر ص: لیکن مارکس نے تو process of evolution کے ساتھ process of Revolution کا تصور پیش کر کے انسانی ارادہ و اختیار، انسانی تدابیر اور انسانی جد و جہد کو ایک حرمت عطا کی۔ اور اسی کے ساتھ جبر اور اختیار کے تصورات میں ایک صورتِ تطبیق بھی پیدا کر دی۔ اس کے فلسفے کو خالص جبر کا فلسفہ قرار دینا کہاں تک درست ہوگا؟

س ر ا: یہ مارکسی فکر کا بہت بڑا تضاد ہے۔ انسانی ارادہ و اختیار کی کوئی حرمت اور جبر و قدر میں کوئی تطبیق اس کے یہاں نہیں Process of evolution اور process of Revolution کا حاصل ایک ہی ہے اور وہ مارکسی فکر میں پہلے سے متعین ہے ارتقائی عمل بھی اسی منزل پر پہنچائے گا مگر ریہ میں انقلابی طریقِ عمل اختیار کرنے والا اسی منزل کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرے گا اور وہ منزل اُسے مینی فسٹو کی ہدایات کی روشنی میں پہلے ہی بتا دی جائے گی۔ اُسے اس بات کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی منزل خود متعین کر سکے وہ اسی طرف جانے پر مجبور ہے جس طرف مارکس کا تاریخی دھارا اسے آہستہ آہستہ لے جا رہا ہے۔ اسے انسانی ارادہ و اختیار کی حرمت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

اصل بات یہ ہے شبنم کہ مارکس فلسفی تھا ہی نہیں۔ اس نے جو کچھ فلسفے کے نام پر پیش کیا وہ اُس کے سیاسی منشور کے تابع تھا۔ فلسفی صداقت کا متلاشی ہوتا ہے اور وہ صداقت کا متلاشی نہ تھا۔ اُسے اپنے سیاسی تصورات ذہنوں میں بٹھانے کے لیے ایک فلسفیانہ گراونڈ تیار کرنا تھا اور وہ اس نے Historical Force اور Historical Necessity کے نظریے کی صورت میں تیار کر دیا۔

ش ر ص: بات سلیم بھائی موضوع سے بہت دور چلی گئی۔ گفتگو ہو رہی تھی Greek Tragedy کی اور میں اس سلسلے میں ایک بہت دلچسپ سوال کرنے والا تھا۔ زندگی کے اسٹیج پر انسان کی جو بے بسی ہے اُسے تو یونانی المیے نے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کر دیا ہے اور اُس سے مغرب کی فکری تاریخ میں جو نتائج نکالے گئے ان سے آپ اتفاق بھی کر سکتے ہیں اور اختلاف بھی۔ لیکن تھیٹر کے اسٹیج پر بار بار پردہ سین پر یا

ٹی وی اسکرین پر کسی ڈرامے کے اداکار کی جو بے بسی ہے کیا اس سے کچھ نتائج نہیں نکالے جا سکتے اور کیا ان نتائج سے زندگی کے ڈرامے کے بارے میں کوئی بصیرت حاصل نہیں کی جا سکتی؟

س ن ا : شبنم کھل کر بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو؟ تمہارا سوال واضح نہیں ہے؟

ش ہ : سلیم بھائی ایک ڈرامہ نگار ایک ڈرامہ لکھتا ہے۔ اس کی کہانی کے واقعات کو متعین کر دیتا ہے۔ کرداروں کا Role مقرر کر دیتا ہے اور پھر ڈرامے کو اسٹیج پر پیش کرتا ہے۔ اسٹیج پر آنے والے اداکار نہ ڈرامے کی کہانی کو تبدیل کر سکتے ہیں نہ اس کہانی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو نہ وہ اپنے رول کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ اس بات کے پابند ہیں کہ جس قسم کا رول جس طرح انہیں ادا کرنا ہے وہی رول اسی طرح ادا کریں۔ جس کو شریف آدمی کا رول دیا گیا ہے وہ ایک مجرم کا رول ادا نہیں کر سکتا۔ جسے چور اور قاتل کا پارٹ ادا کرنا ہے وہ وہی کرے گا جو ایک چور اور قاتل کو کرنا چاہیئے۔ وہ شریف آدمی کے روپ میں سامنے آ ہی نہیں سکتا۔

اب اگر صورت حال یہ ہو کہ اسٹیج پر ڈرامہ ختم ہوتے ہی چور اور قاتل کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے کر دیا جائے اور وہ انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیں تو کیا یہ ان کرداروں کے ساتھ منصفانہ طرز عمل ہوگا؟ کیا وہ یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ ڈرامے میں ہم مجبور تھے۔ مصنف نے ہمارا یہی رول مقرر کیا تھا۔ اسٹیج پر ہم نے جو کچھ کیا اس کی سزا ہمیں اسٹیج سے باہر دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

س ن ا : شبنم میں تمہارا سوال سمجھ گیا۔ میں خود اس بات پر آنے والا تھا کہ تمہیں یہ بتاؤں کہ Greek Tragedy کا ایک بہت بڑا Impact مغرب کی تہذیب پر یہ ہوا کہ مغرب کا انسان زندگی کو بھی ایک اسٹیج ڈرامہ سمجھنے لگا۔ یہ تہذیبی اثر مغرب کے عظیم ترین ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک شیکسپیئر کی مثال لے لو۔ زندگی کے سمندر کا اتنا بڑا غوطہ خور جو موتی لے کر باہر نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے والے انسان وہ اداکار ہیں جو اس اسٹیج پر اپنا اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔

دیکھو شبنم زندگی کے ڈرامے اور اسٹیج کے ڈرامے میں ایک بہت بڑا بنیادی فرق

ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے کا اداکار یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا رول متعین ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ رول کیا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کی تفصیلات سے واقف ہے۔ وہ اس ڈرامے کے دوسرے کرداروں کے رول کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ اس کے علم میں وہ سلسلۂ واقعات بھی ہے جس میں اسے اور اس کے ساتھی اداکاروں کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اس کی یہی واقفیت اس کے لیے جبر ہے وہ اپنے ارادے کی قوت سے اپنے رول کو یا دوسرے کرداروں کے رول کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی کارکردگی سے اس سلسلۂ واقعات کو بدل نہیں سکتا جس سے وہ پہلے واقف ہے۔

اس کے برعکس زندگی کے ڈرامے کا کردار یعنی انسان اگر یہ جانتا بھی ہے کہ مستقبل متعین ہے۔ تو یہ نہیں جانتا کہ وہ مستقبل کیا ہے۔ اور اس کی جزئیات کیا ہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ مستقبل جو بھی ہو اس کے اختیاری افعال اور ارادی اعمال ہی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوگا۔ مستقبل پر ایک پردہ ضرور پڑا ہوا ہے مگر اس پردے کو وہ اپنے اختیار اور ارادے ہی کی قوت سے ہٹا کر حقیقت آئندہ کو حقیقت موجودہ میں تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ وجدانی طور پر اپنی قوت ارادہ و اختیار کو آزادی کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ بدیہی طور پر اپنے آپ کو انتخاب اور Choice کا مالک محسوس کرتا ہے

اسٹیج کے ڈرامے کا اداکار مجبور محض ہے اس لیے وہ اپنے افعال و اعمال کا ذمہ دار نہیں۔ مگر زندگی کے ڈرامے کا اداکار اپنے مستقبل سے واقف نہ ہونے کی بنا پر جس ارادے، اختیار، حق انتخاب اور Choice کی دولت سے مالامال ہے وہ اُسے ایک ذمہ دار ہستی کا منصب عطا کرتی ہے اس لیے انسان پر اس کے افعال و اعمال کی ذمہ داری بہرصورت عائد ہوتی ہے اور اس ذمہ داری سے بری ہونا اس کے امتیازی منصب کے منافی ہے۔

شارح: سلیم بھائی مجھے انسانی ارادہ و اختیار کے منظر نامے میں بھی جبر کے تین پہلو صاف نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کو ارادے اور اختیار کی قوت دے کر اسے منصب ذمہ داری کے تقاضوں کی تکمیل پر مجبور کر دیا گیا۔ اگر یہ قوت اُسے نہ دی جاتی تو وہ ذمہ داریوں کی ان زنجیروں میں جکڑا ہوا نہ ہوتا جن کے بوجھ تلے وہ کراہ رہا ہے۔

دوسرا پہلو جبر کا یہ ہے کہ اختیار اور ارادے کی قوت اس میں اس لیے ہے کہ یہ قوت اسے دی گئی ہے۔ اگر یہ قوت اسے نہ دی گئی ہوتی تو وہ کیا کر سکتا تھا؟

تیسرا پہلو جبر کا یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار کی تمام قوت صرف کر کے جو کچھ کرتا ہے وہ ہوتا اسی کے مطابق ہے جو پہلے سے متعین ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا

اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس چیز کو ہم ارادہ و اختیار کہتے ہیں اس کی ڈور بظاہر تو انسان کے ہاتھ میں نظر آتی ہے مگر درحقیقت اس کی ڈور جبرِ قدرت کے ہاتھ میں ہے یا یوں کہئے کہ لوحِ تقدیر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا انسانی ارادہ و اختیار کی نمود کٹھ پتلیوں کے تماشے سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتی ہے؟ کیا یہ محض illusion نہیں ہے؟

س ۱: شبنم تم نے کئی سوالات ایک ساتھ کر دیئے۔ تم درحقیقت یہ کہنا چاہتی ہو کہ انسان کو ارادہ و اختیار کی قوت دی گئی تو یہ بھی جبر ہے اور اگر یہ قوت اُسے نہ دی جاتی تو وہ بھی جبر ہوتا۔ یعنی تم قانونِ قدرت کی ہر صورت کو جبر سمجھتی ہو۔ دوسری بات تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جبر reality ہے اور اختیار ایک illusion ہے یا یہ کہ اختیار بھی جبر ہی کا ایک پہلو ہے۔

دیکھو پہلی بات تو یہ سمجھ لو کہ قانونِ فطرت یا نظامِ قدرت جبر نہیں ہے۔ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے تم کہو گے یہ جبر ہے۔ اگر پانی کا بہاؤ بلندی کی طرف ہوتا تو تم اسے بھی جبر کہتے۔ آگ گرم ہوتی ہے اور برف ٹھنڈی ہوتی ہے۔ تم کہو گے یہ جبر ہے اگر ایسا ہوتا کہ آگ ٹھنڈی ہوتی اور برف گرم ہوتی تو تم اُسے بھی جبر کہتے۔

دیکھو شبنم بچے کا بچہ ہونا جبر نہیں ہے۔ جبر یہ ہے کہ بچے کو جوان نہ ہونے دیا جائے پودے کا پودا ہونا جبر نہیں ہے۔ جبر یہ ہے کہ پودے کو درخت بننے سے روک دیا جائے کسی بھی شے کا وجودِ واقعی جبر نہیں ہے۔ جبر نام ہے اس رکاوٹ کا جو اس وجودِ واقعی کو وجودِ امکانی کی صورت اختیار نہ کرنے دے اور اس کے راستے میں حائل ہو جائے۔

اب دیکھو کہ وہی نظامِ قدرت جس نے پودے کو پودا بنایا اس پودے کو درخت بنانے کے لیے کیا کیا اہتمام نہیں کرتا وہ قانونِ فطرت جس نے بچے کو بچے کی صورت دی اس بچے کو جوان بنانے کے لیے اپنے ترکش کا کون سا تیر چھوڑ دیتا ہے۔ قدرت کا نظامِ قانون ہر شے کی صورتِ واقعی کو صورتِ امکانی میں ڈھالنے کے لیے ہر قسم کے سازگار حالات پیدا کرتا چلا جاتا ہے تو جب صورتِ حال ایسی ہے تو قانونِ قدرت کو جبر سمجھنا یا اُسے جبر سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے۔

یہی وہ الجھاؤ ہے جو مغرب نے جبر کی تفہیم میں پیدا کیا اور اسی تصورِ جبر کی وجہ

سے جبر اور قدر میں تضاد کا رشتہ پیدا ہوا۔ مغرب کلیاتِ فطرت میں الجھ کر رہ گیا۔ اور اسی لیے اسے حقیقتِ مطلق کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

اب تمہارا یہ کہنا کہ انسان کو ارادہ و اختیار کی قوت کیوں دی گئی ایک اس سے بھی زیادہ بنیادی سوال کو جنم دیتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کو پیدا ہی کیوں کیا گیا۔ اگر اسے پیدا ہی نہ کیا جاتا تو اس کے مجبور یا مختار ہونے کا جھگڑا ہی کھڑا نہ ہوتا۔

اس کے بعد تمہارا یہ سوال کہ اگر انسان کو ارادہ و اختیار کی قوت نہ دی گئی ہوتی تو وہ کیا کر لیتا اس سوال کا جواب میں تمہارے ہی اوپر چھوڑتا ہوں۔ فرض کر لو کہ تم امتحان کا ایک پرچہ سیٹ کرتے ہو اور اس کے ایک سوال میں طلبہ کو ایک choice دے دیتے ہو۔ اب ایک طالب علم کہتا ہے کہ نہیں میں تو مشکل ہی سوال کا جواب دوں گا اس لیے کہ اگر ممتحن مجھے آسان سوال کرنے کا choice نہ دیتا تو میں کیا کر لیتا۔ مجھے بتاؤ کہ اس طالب علم کی اس سوچ کا نتیجہ اس کے حق میں کیا نکلے گا؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ اس طالب علم کی عقل کے بارے میں رائے عامہ کیا فیصلہ دے گی۔

دیکھو شبنم اختیار اور اختیار مطلق میں بہت فرق ہے۔ اختیار مطلق صرف ذاتِ مطلق کی صفت ہو سکتا ہے۔ Dependent وجود تو Dependent اختیار ہی پا سکتا ہے۔ ہر انسان یہ بات جانتا ہے کہ اس کی پیدائش، موت، اور اس طرح کے بے شمار کوائف اس کے اختیار میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ مختار مطلق نہیں ہے۔ وہ ایک نظامِ کونیات میں زندگی بسر کر رہا ہے اور اسے جو بھی قوتِ ارادہ و اختیار حاصل ہے اس نظامِ کونیات کا پابند رہنے کے بعد حاصل ہے۔ اگر اس نظامِ کونیات کی پابندی جبر ہے تو پھر اس کا وجود بھی ایک جبر ہے۔ پھر یا تو اس کی پیدائش ہی کا کوئی جواز نہیں ہے یا پھر یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہر انسان مختار مطلق ہوتا اور جسے ذرا بھی منطق آتی ہے وہ یہ موٹی سی بات سمجھ سکتا ہے کہ ہر انسان کا مختار مطلق ہونا یا تمام انسانوں کا بیک وقت مختار مطلق ہونا امر محال ہے اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو اصل مختار مطلق کہاں جاتا اور اس کا نظام وجود میں کیا مقام ہوتا اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

رہ گیا تمہارا یہ سوال کہ انسانی ارادہ و اختیار ایک illusion ہے اور illusion کو ہم reality کیسے سمجھیں تو اس کے بارے میں میں

صرف اس بات کی طرف اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ وجود کے کئی مراتب ہیں اور وجود کی صفات کا مرتبہ وجود کے مرتبے سے متعین ہوتا ہے۔ کوئی چیز جس مرتبۂ وجود میں ہوتی ہے اس کی صفات اسی مرتبۂ صفات میں ہوتی ہیں۔ وجودِ مطلق کی صفت اختیار بھی اختیارِ مطلق ہوگی۔ اور وجودِ اعتباری کی صفتِ اختیار بھی اختیارِ اعتباری یا اختیارِ مجازی ہوگی۔ اس اختیارِ اعتباری یا اختیارِ مجازی کو تم چاہو تو illusion کہہ لو لیکن اسے اس چیز کے ساتھ خلط ملط نہ کرو جسے مغرب والے illusion کہتے ہیں۔

ش ص: سلیم بھائی قانونِ قدرت اور جبر کے بارے میں آپ نے جو گفتگو کی اس سے ایک سوال ذہن میں اُبھرا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کلیاتِ فطرت متعین ہوں مگر جزئیات متعین نہ ہوں اور تقدیر کا تعلق صرف کلیات پر مشتمل ہو اور جزئیات اس سے خارج ہوں؟

س ا: یہ سوچ بھی مغربی ذہن کی ہے۔ مغربی فکر نے کلیاتِ فطرت کو جبر سے تعبیر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جبر اور قدر میں تضاد کا رشتہ اُبھر آیا۔ اس تضاد کا حل یہ نکالا گیا کہ کلیاتِ فطرت کو لوحِ تقدیر پر بدستور ثبت رہنے دیا جائے اور جزئیات کو اس پر سے کھرچ دیا جائے۔ یہی سوچ ہمارے مسلمان تجدد پسندوں کے لٹریچر میں نمایاں ہے اور اُسی مغربی فکر کا Impact ہے جس پر ابھی اتنی گفتگو ہو چکی ہے۔ یہی سوچ ہمارے بعض علمائے قدیم کے یہاں بھی ملتی ہے اور اُن کے یہاں یہ سوچ یونان کے اس فلسفے سے آئی جو profanity کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔ مگر علمائے اسلام کی اکثریت نے فلسفۂ جبر و قدر کی اس عجیب و غریب تعبیر کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ اسے کیسے تسلیم کرتے؟ تم سوچو شبنم کہ اگر اس مسئلے کی یہ تعبیر ذہنوں میں اُتر جائے اور اسے درجۂ استناد حاصل ہو جائے تو قرآن کریم کی وہ آیتیں کہاں جائیں گی جن میں آنے والے حالات کی واضح پیش گوئی کی گئی ہے اور خاص طور پر سورۂ روم کی کیا تفسیر کی جائے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کثیر التعداد حدیثیں جن میں زمانۂ مستقبل کے بارے میں اور خاص طور پر دورِ قربِ قیامت کے بارے میں پیشگوئیاں ہیں ان کی کیا حیثیت متعین کی جائے گی۔ یہ تعبیر تو کلام الٰہی اور رسالتِ محمدیؐ پہ ہمارے ایمان کی جڑیں ہلا کر رکھ دے گی۔

ش ص: سلیم بھائی! کہا جاتا ہے کہ چونکہ انسان صاحبِ ارادہ و اختیار ہے اور اسی لیے اس پر اپنے افعال و اعمال کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس لیے زندگی ایک آزمائش ہے

اور یہ دنیا دارالامتحان ہے ۔ اس دنیا میں انسان کو اچھے اور برے حالات سے گزارا جاتا ہے تاکہ اس کے ظرف اور اس کے کردار کی آزمائش کی جائے ۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب آزمائش کرنے والے کو پہلے سے معلوم ہے کہ کون شخص کن حالات میں کیا کرے گا اور اس کا ظرف اور اس کا کردار کس صورت میں سامنے آئے گا تو اس آزمائش کی ضرورت کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے ۔ آزمائش تو وہاں کی جاتی ہے جہاں آزمائش کرنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس کی آزمائش کی جا رہی ہے وہ اس کے نتیجے میں کس قسم کے اور کس درجے کے کردار کا ثبوت دے گا ۔

مثال کے طور پر میں اپنے ایک طالب علم کا امتحان لیتا ہوں تو اس امتحان کی ضرورت اسی لیے پیش آتی ہے کہ مجھے پہلے سے یہ نہیں معلوم کہ میرا طالب علم اس امتحان میں کتنے نمبر حاصل کرے گا ۔ اگر مجھے یہ بات کسی غیبی علم کے ذریعے پہلے ہی معلوم ہو جائے تو میں یہ کارِ عبث کیوں کروں گا ؟

ایک اور سوال سلیم بھائی مجھے آپ سے یہ کرنا ہے کہ آپ نے جبر قدرت کے تصور کو مغرب سے منسوب کرتے ہوئے اس کی تاریخ یونان سے trace کی ہے حالانکہ لوحِ تقدیر کا تصور تو عراقی دیومالا میں بھی ملتا ہے جس کا تعلق مشرق سے ہے اس دیومالا میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ تقدیر کی لوحیں ایک دیوتا کے قبضے میں تھیں وہ لوحیں کسی دوسرے دیوتا نے چرا لیں ۔ اس دیوتا سے یہ لوحیں واپس لینے کے لیے کیا کیا کچھ نہ ہوا ، تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ۔ تو کیا لوحِ تقدیر کا یہ تصور بھی مغرب کی پیداوار ہے ؟

ص ۱۰ : دیکھو شبنم عراق یا دوسرے مشرقی ممالک کی دیومالاؤں میں الواحِ تقدیر ، شجرِ ممنوعہ ، سیلابِ عظیم وغیرہ کی جو کہانیاں ملتی ہیں وہ کسی علم مقدس کی مسخ شدہ صورتیں ہیں اور اس علم مقدس کا سرچشمہ کہاں تھا یہ ایک بہت تفصیلی موضوع ہے جس پر پھر کبھی گفتگو ہوگی ۔ یہاں جو بات اہم ہے وہ یہ کہ لوحِ تقدیر کا وہ تصور جو آسمانی کتابوں میں ملتا ہے اور انتہائی مسخ شدہ صورت میں مشرق کی دیومالا میں بھی موجود ہے ۔ اس کا جبر قدرت کے اس تصور سے کوئی تعلق نہیں جو یونان سے شروع ہوا اور پورے مغرب میں صدیوں پھلتا پھولتا رہا ۔ اس تصورِ جبر کی حقیقت میں تمہیں بتا چکا ہوں اور جبر کا صحیح تصور بھی ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے سامنے لا چکا ہوں ۔

اصل میں لوحِ تقدیر یا لوحِ محفوظ وہی چیز ہے جس کا مصدر و منبع ہمارے مذہبی فلسفے کی اصطلاح میں "علم الٰہی" ہے وہی علم الٰہی جس کی طرف ابھی تم نے اپنے اس سوال میں اشارہ کیا تھا جو انسان کی آزمائش کے بارے میں تھا۔ موضوع بہت نازک اور پیچیدہ ہے مگر چند اشارے کر دیتا ہوں۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں نے مراتبِ وجود کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا تھا۔ احدیت وحدت اور واحدیت کی بحث تو بہت نازک ہے۔ تم اس وقت اتنا ہی سمجھ لو کہ وجود کا سب سے اعلیٰ مرتبہ لاہوتی ہے۔ علم الٰہی کا تعلق اسی مرتبۂ وجود سے ہے۔ اب علم الٰہی کی صورت یہ ہے کہ وہ تابع معلوم ہے۔

شبنم: سلیم بھائی قطع کلام ہوتا ہے کیا علم الٰہی بھی کسی چیز کا تابع ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہے تو کیا وہ علم الٰہی کہلانے کا مستحق ہے؟

سلیم احمد: شبنم ٹھہرو جلد بازی سے کام نہ لو۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ موضوع بہت نازک ہے دیکھو علم مجرد کوئی چیز نہیں ہوتی۔ علم کی Definition میں یہ بات شامل ہے کہ وہ کسی معلوم کے بارے میں ہوتا ہے۔ اگر معلوم کا وجود نہیں تو علم کا وجود بھی نہیں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ علم الٰہی تابع معلوم ہوتا ہے اور اس کا اعلیٰ ترین مرتبۂ وجود سے ہے انسان کا جسم اور اس کی مادی زندگی کی جزئیات جس مرتبۂ وجود میں ہیں وہ عالم ناسوت ہے۔ عالم ناسوت کو عالم اجسام اور عالم حس و شہود بھی کہا جاتا ہے۔

اب عالم ناسوت یا عالم اجسام یا عالم حس و شہود میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اس میں فصل زمانی ہوتا ہے اس میں بُعدِ مکانی ہوتا ہے اس میں تعدد ہوتا ہے اس میں تفرید و تکثیر ہوتی ہے اس میں تحرک ہے تغیر ہے سیمابیت ہے۔ کیف و کم ہے وغیرہ وغیرہ

لیکن مرتبۂ لاہوت ان تمام کرائف سے پاک بلکہ ماورا بلکہ وراء الورا ہے۔ وہاں پہلے اور بعد اور بعد اور ماضی اور حال اور مستقبل بے معنی چیزیں ہیں۔

اب اس دنیا میں جسمانی زندگی بسر کرنے والے انسان کا علم بھی ان تمام ناسوتی کرائف کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس لیے علم انسانی اس دنیا کے تمام واقعات کو پہلے اور بعد اور ماضی اور حال اور مستقبل کے چوکھٹوں میں فریم کی ہوئی تصویروں کی شکل میں دیکھتا ہے اور چونکہ مستقبل کا چوکھٹا ابھی بن کر تیار نہیں ہوا اس لیے مستقبل میں پیش آنے والے

واقعات اس کے لیے عدم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر علم الٰہی جو مرتبۂ لاہوت میں ہے اس کے لیے اس عالم ماری کا مستقبل عدم نہیں بلکہ وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم الٰہی میں تمام معلومات دنیاوی کی تمام ناسوتی کثافتوں سے پاک اور تمام شہودی کوائف سے منزہ صورت ایک بسیط حقیقت کی شکل میں موجود ہے۔ یہی منبع لوح محفوظ ہے۔ یہی مصدر لوح تقدیر ہے۔

انسان کا ارادہ عالم ناسوت کی چیز ہے اس لیے انسانی ارادے کی آزمائش بھی عالم ناسوت ہی سے علاقہ رکھتی ہے۔ اس آزمائش کے نتیجے میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ ایک متعین مستقبل کی شکل میں اس علم الٰہی کا ایک حصّہ ہے جو ماورائے تقسیم ہے۔

ان اشارات کی روشنی میں جبر اور اختیار کی تطبیق کے معنی یہی ہیں کہ جو کچھ مرتبۂ لاہوت میں ناسوتی کثافتوں اور شہودی کوائف سے منزہ ایک بسیط حقیقت کے طور پر موجود ہے اور جو کچھ عالم ناسوت میں انسانی ارادہ و اختیار سے زمان و مکاں کے چوکھٹوں میں نمودار ہوتا ہے ان دونوں میں ایک کامل ازلی اور ابدی مطابقت موجود ہے۔

ش۔ ص: اچھا سلیم بھائی، رات بہت ہو گئی۔ سیل زماں کی لہر بہت دور تک جا پہنچی ہے۔ اب اجازت دیجیے۔ ہماری آئندہ گفتگو کا موضوع ہوگا۔

"کونیاتی نظام میں عدل و انصاف کا تصور"

س۔ ما: سمجھ گیا۔ اب تم نے اجازت مانگ ہی لی ہے اور میرے سگریٹ بھی ختم ہو چکے ہیں۔ اب جاتے جاتے تقدیر کے مسئلے کو تم یوں سمجھ لو کہ ابھی تم یہاں بیٹھے ہو۔ تمہاری تقدیر پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ ابھی اٹھو گے اور اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے گھر پہنچ جاؤ گے تمہاری تقدیر شہود میں آجائے گی۔ یہی تمہاری وہ تقدیر ہو گی جو اس وقت بھی متعین ہے۔

اچھا خدا حافظ۔

ش۔ ص: شب بخیر۔

سلیم احمد / گفتگو: اطہر نفیس

اَدب کے چند بنیادی مسائل

سلیم احمد ہمارے شعر و ادب کا ایک منفرد، معتبر اور قابلِ احترام نام ہے۔ وہ صفِ اوّل کے نقاد اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی برصغیر پاک و ہند کے تمام ادبی حلقوں میں مشہور و معروف ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے۔ اور ان کے مداحوں اور عقیدت مندوں کے علاوہ ان کی آراء سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی ادبی دیانت اور شعر و ادب سے ان کی سچی لگن کے معترف ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ سلیم احمد کی زندگی کا ہر لمحہ شعر و ادب کے لیے وقف ہے۔

ہم نے اس انٹرویو میں جناب سلیم احمد سے ادب کے چند بنیادی مسائل پر گفتگو کے علاوہ کچھ ذاتی نوعیت کے سوالات بھی کیے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ (اطہر نفیس)

س:۔ آپ سے میرا پہلا سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب اور ادیب سے ایک لاتعلقی اور بے نیازی کا سا رویہ کیوں ہے اور اس زمانے میں اس کے اسباب کیا ہیں؟

ج:۔ ہاں: ہمارے زمانے میں ادب سے لاتعلقی اور بیگانگی اتنی عام ہے کہ ادب صرف ادیبوں کا گھریلو مسئلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ادب کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کچھ ادب لکھنے والے ہوں اور کچھ ادب پڑھنے والے ہوں۔ پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے لیکن ہماری موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ پورے ملک میں اگر تین چار ہزار چھوٹے بڑے لکھنے والے ہیں۔ تو وہی ادب پڑھنے والے بھی ہیں ایسے ادب پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے جو خود نہ لکھتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادیب خود ہی لکھتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں لیکن سب سے بڑا سبب شعور کی تبدیلی

ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو ہر چیز کو افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے اور اگر کسی چیز میں ٹھوس مادی افادیت نظر نہ آئے تو اسے مسترد کر دیتی ہے۔ یہ افادی نقطۂ نظر پہلے بھی موجود ہوگا مگر اس نے زور حالی کے زمانے میں پکڑا۔ اس زمانے میں لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ ادب بے کار ہے۔ خالی طوطا مینا اڑاتا ہے۔ گل و بلبل کی فرضی داستانیں سناتا ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود حالی کو احساس ہوا کہ ادب از کار رفتہ اور بیکار Activity ہے۔ یہی احساس تھا جو حالی کو افادی ادب کی طرف لے گیا۔ اور انہوں نے قومی سیاسی اور اخلاقی ادب کی تحریک شروع کی۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ ادب بیکار چیز نہیں کیونکہ اس سے قومی خدمت کی جا سکتی ہے۔ یہ رجحان ترقی پسند تحریک تک ترقی کرتا رہا اور اس تحریک کے تحت جو ادب پیدا ہوا وہ پڑھا بھی خوب گیا۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افادی ادب سے بھی لوگوں کو چنداں دلچسپی نہیں رہی یعنی ہم حالی کے زمانے سے زیادہ مادی افادیت پسند ہو گئے ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے ایک دلچسپ بات کہی۔ "ادب اس وقت پڑھا جاتا ہے جب لوگوں کو ہر وقت کسی اور بات کی فکر نہ ہو۔"

ہمارے زمانے میں ادب اس لیے نہیں پڑھا جاتا کہ ہمیں ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی فکر لگی رہتی ہے۔ بہر حال تاریخی طور پر حالی کے وقت سے ہمارے شعور میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ خالص ادب کے نام پر کسی آدمی کو بڑائی کے ساتھ قبول نہیں کیا گیا خود حالی کو یہ احساس تھا کہ نئے ادب کی تحریک کے باوجود قوم کے شعور کو تبدیل نہیں کیا جا سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ خود لکھا تھا "شاعری نئی ہو یا پرانی چلتی نظر نہیں آتی۔"

اچھا اب ایک ایسی قوم میں جس کی روایت اتنی بڑی ہو، خاص طور پر شاعری کی روایت اتنی بڑی ہو اور جس نے شعر و شاعری کے Taste کو اتنا پھیلایا ہو کہ شاعروں کی عظیم تر ین روایت عوام سے لے کر خواص تک ایک ہموار ڈھب سے کہ بادشاہ تک شعر کہتے ہوں یا شعر کہنے کے Process میں Involve ہو۔ اس میں یہ تبدیلی کیوں ہوئی۔ یہ مزید ایک سوال ہے، مگر ہمارے یہاں ایسے سوال پر غور نہیں ہوتا۔ بہر حال تنقید نگاروں کا کام یہی ہے کہ وہ ان سوالوں پر سوچیں۔ کوئی فرد واحد اس کا جواب نہیں دے سکتا ہے۔ یہ سوال کہ اقبال اور حالی جیسے بڑے شاعر اپنی عمر کے ایک دور میں پہنچ کر شاعری چھوڑو، شاعری چھوڑو کرتے رہے۔ چاہے چھوڑ نہ سکے۔ اقبال نے اپنے خط میں لکھا کہ "ہماری قوم کو فلسفے اور شاعری کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔" یا حالی کا کہنا ہے کہ

؎ راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

با اقبال کا یہ کہنا

ع جو کام کچھ کر رہی قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

تو ایسی قوم میں جس میں اتنے بڑے شعراء اور ادیب پیدا ہوئے ہوں۔ اس میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی: یہ بڑا غور طلب سوال ہے۔ ملک کے سوچنے والوں کو اس سوال پر غور کرنا چاہیے۔

س: آپ نے اپنی مشہور نظم "مشرق" میں بھی اور ویسے بھی کئی جگہ لکھا ہے کہ مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے۔ میں آپ کی ہی تحریروں سے اور گفتگو کے حوالے سے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ مغرب کھوکھلا ہو چکا ہے۔ وہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے تو یہاں سے میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ مشرق کس سے ہار گیا ہے۔ اس لیے کہ میرے پیش نظر تو بظاہر مشرق و مغرب ہی کی آویزش ہے؟

ج: میں نے جب یہ کہا کہ مشرق ہار گیا ہے تو میں نے مشرق کی ایک تعریف بھی بیان کی تھی وہ غلط ہو یا صحیح ہو۔

میں نے کہا تھا۔ "مشرق کیا تھا؟"

جسم سے اوپر اٹھنے کی ایک خواہش تھی۔ شہوت اور جبلت کی تاریکی میں دیا جلانے کی کوشش تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ میرے نزدیک "مشرق" ایک عمل تھا انسان کے روحانی ارتقاء کا۔ جسم سے اوپر اٹھنے کے معنی مادے سے اوپر اٹھنے کے ہیں۔ جبلت، شہوت اور دوسری مادی ضروریات اوپر اٹھنے کے معنی روح کی بلندیوں کا سفر ہے۔ "مشرق" ایک روحانیت کا نام ہے۔ مغرب اس کے مقابلے میں مادیت ہے تو جب میں نے یہ کہا کہ "مشرق" ہار گیا تو میں نے یہ کہا کہ انسان کے اندر وہ قوت جو اس کو روح کی طرف لے جاتی ہے اور اس سفر میں اس کو بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مشرق ہے اور وہ ہار گئی ہے۔ یہ بات کہ انسان روحانیت کی بلندی سے مادیت کی طرف نزول کر رہا ہے یہ تو قصہ آدم کے وقت کی بات ہے لیکن اس کا اجتماعی رُخ ہمیشہ روحانی بلندی کی طرف یعنی نیچے سے اوپر کی طرف رہا ہے یہ صرف تین سو سالہ دور میں ہوا کہ اجتماعی رُخ مادیت کی طرف ہو گیا۔ مغرب اسی بات کا نام ہے کہ اجتماعی طور پر مادیت حاوی ہو گئی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ جتنے اثرات مغرب کے مشرق میں در آئے ہیں اتنی ہی مادیت پھیلی ہے یہاں تک کہ عام زندگی کو چھوڑ دیجیے شعر و ادب کے تصورات کو دیکھیے جن پر ہم ابھی گفتگو کر رہے تھے کہ یہ ادب یہ شاعری ہماری عظیم ترین روایت ہے مگر لوگوں نے کہا کہ یہ خیالی طوطا مینا ہے۔ کاریکاری ہے یعنی بطور ایک روحانی Activity کے ادب کی اہمیت کا احساس

زائل ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ قومی ادب۔ سیاسی ادب۔ مادی یا افادی ادب نے لے لی تھی یعنی جو آپ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچاتا ہو۔ آپ کو ترقی کرنے کی راہیں دکھاتا ہو۔ اس میں روحانی Element جو تھا وہ اس میں سے خارج ہوگیا تو گویا شعر و ادب تک یہ تصور آتا رہا۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ عہد جدید کے مذہبی تصورات تک میں یہ مادیت سرایت کرگئی ہے اور جو روحانی یا مذہبی اعمال تھے۔ ان کی تشریح میں بھی مادی نقطہ نظر در آیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے میں کہتا ہوں کہ مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے۔ اب کیا ایسی صورت ہے کہ مغرب جو اپنی شکست سے اس لیے دوچار ہے کہ مادی انسان سے اگر روحانیت کو خارج کردیا جائے تو کیا باقی رہ جائے گا۔ سڑا ہوا مادہ باقی رہ جائے گا۔ انسان کے اندر ایک چیز روح ہے اور ایک چیز جسم ہے۔ جب روح نکل جاتی ہے تو جسم مردہ ہوجاتا ہے۔ جتنی جتنی مغربیت سے روحانیت خارج ہوتی جائے گی یہ Dead میٹر میں تبدیل ہوتا جائے گا تو مغرب کی تباہی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا مشرق میں اس بات کا امکان ہے کہ وہ دوبارہ اپنی روحانیت کو زندہ کرسکے؟ یہ سوال مشرق و مغرب کا اتنا بڑا سوال ہے کہ جس کا جواب ابھی تک فراہم نہیں ہوسکا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں مذہب کے احیاء کی کتنی بڑی تحریک موجود ہے لیکن اس تحریک سے مغرب کی طرف آپ کے سفر میں کیا کوئی کمی آگئی ہے؟ یہ میرا ایک سوال ہے۔ یہ سوال میں بڑوں بڑوں سے پوچھتا ہوں۔

ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس دور میں ہم ہیں یہ دور بھی تاریخ کا اتنا ہی اہم دور ہے جتنا کوئی اور دور تھا۔ اس کو روکا نہیں جاسکتا۔ نہ اس دور کو لوٹایا جاسکتا ہے نہ اس کو کسی مقام پر ٹھہرایا جاسکتا ہے یہ تو اپنا Process پورا کرے گا یہاں تک کہ دوسرا نیا دور شروع ہوجائے گا جس میں انسان اپنی روحانیت کی بازیافت کرے۔ جب وہ دوبارہ بازیافت کرے گا تو اس کا سفر اس سمت میں شروع ہوگا۔ تب مشرق کی ترقی دوبارہ شروع ہوگی۔ مشرق میں جو کچھ ہو اسے گا میل بنے گا۔ مشعل راہ بنے گا۔ یہ ایک نئی روحانیت کا آغاز ہوگا۔

س: آپ نے ہر موقع پر اعتراف کیا ہے اور ساری ادبی دنیا اس بات کو جانتی ہے کہ آپ محمد حسن عسکری صاحب سے بہت متاثر ہیں تو آپ کے اور عسکری صاحب کے درمیان مشترک پوائنٹ تو بہت ہوں گے مگر میں یہ پوچھنے کی جرأت کروں گا کہ آپ کے اور ان کے درمیان کوئی پوائنٹ آف ڈفرنس بھی ہے۔ میرا خیال ہے ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی اپنی انفرادیت ہے، اپنی شخصیت ہے جسے میں آپ کے ادب میں بھی اور زندگی میں بھی محسوس کرتا ہوں۔

ج : میرے اور عسکری صاحب کے درمیان اس قسم کے اختلافات نہیں تھے جیسے ان کے اور بہت سے مداحوں اور شاگردوں کے درمیان تھے۔ کچھ لوگوں کی انا کا مسئلہ تھا تو کچھ لوگوں کو اپنے آپ کو Assert کرنے کا شوق تھا کچھ اس طرح کہ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو اپنی انفرادیت قائم کرنے کا شوق ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے اختلافات ان کے اور ان کے شاگردوں اور مداحوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ مجھے عسکری صاحب سے ایسا کوئی اختلاف نہیں تھا میرا ان سے ایک بنیادی مسئلے پر اختلاف تھا جسکو میں نے لکھا ہے کہ عسکری صاحب نے آخری عمر میں اس مشرق و مغرب کی بحث میں یہ Preach کیا کہ اگر آپ روایتی ادب پر قائم رہنا چاہیں، تو آپ کو اپنی سوسائٹی کو بھی روایتی بنانا پڑے گا۔ اور اگر آپ کی سوسائٹی غیر روایتی ہو گئی ہے تو آپ روایتی ادب پیدا کرنا چاہیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یا تو یہ ہو گا کہ آپ پرانی شکل برقرار رکھیں گے مگر اس میں نئے معنی داخل ہو جائیں گے یا نئے معنی کے ساتھ ہی صورت در آئے گی۔ تو ہر حال میں آپ کا ادب غیر روایتی ہو جائے گا۔ اگر آپ غیر روایتی ہیں تو غیر روایتی معاشرے میں آپ روایتی ادب پیدا نہیں کر سکتے۔ اچھا تو اب ہم غیر روایتی معاشرہ میں آ گئے یعنی اس معاشرے میں ہیں جو مغرب کے زیر اثر ہے۔ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی درجہ میں ایسا ادب پیدا کریں گے جو مغربی ادب کی پیروی میں ہو گا۔ ان کی تقلید میں ہو گا۔ وہ کہہ رہے تھے مغرب کا ادب چونکہ خود روحانی Reality سے بغاوت کر کے پیدا ہوا ہے اور ادب ایک روحانی Activity ہے تو مغرب میں ادب کیوں مر رہا ہے جس کے آثار نمایاں ہیں تو نتیجے کے طور پر کچھ دنوں میں آپ کا ادب بھی مر جائے گا۔ جب انہوں نے یہ لکھا تو میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ مجھے جواب دیں کہ روایتی معاشرہ پیدا کرنا تو شاعر کے بس کی بات نہیں ہے اور آپ یہ کہتے ہیں کہ روایتی شاعر اس میں شاعری کر نہیں سکتے ہیں۔ غیر روایتی معاشرے میں روایتی شاعری پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو ناکام ہوں گے۔ غیر روایتی شاعری کرینگے تو آپ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے تو مطلب یہ ہے کہ اس کا حل کیا ہے؟ آپ سمجھ رہے ہیں نا تو میرا اختلاف ان سے یہ ہوا کہ وہ تجزیہ کر چکے تھے مگر وہ کہتے تھے کہ روایت کو قائم رکھو۔ تو میرا ان سے زندگی میں اختلاف ہو گیا کہ آپ یہ Preach کر رہے ہیں کہ روایت کو قائم رکھو جبکہ آپ خود کہہ چکے ہیں کہ غیر روایتی معاشرہ میں روایتی شاعری قائم نہیں رہ سکتی۔ ان کی زندگی میں بھی یہ سوال مجھ کو پریشان کرتا رہتا تھا اور ان کے انتقال کو سال بھر سے زیادہ ہو گیا ہے میں اس سوال پہ اور بھی Deep ہو گیا یوں عسکری صاحب سے میرے اختلافات کچھ ایسے تھے جو میں نے اس کتاب میں ظاہر کر دیے ہیں جو میں عسکری صاحب پہ لکھ رہا ہوں۔ وہ اختلافات بھی ان کی شخصیت سے یا اس طرح کے اختلافات

نہیں ہیں جیسے ان کے شاگردوں اور مداحوں کو رہے ہیں۔ بلکہ وہ بعض بنیادی اختلافات ہیں اور عسکری کی نظر عسکری کی بصیرت اور عسکری کا علم اور اس سے جو کچھ میں نے سیکھا۔ اپنی استعداد کے مطابق۔ اور جو میرے اندر تھا اس کے باوجود میری اور ان کی شخصیت میں فرق تھا۔ مسلسل میں نے کوشش کی کہ میں اپنے آپ کو عسکری کے سانچے میں ڈھال لوں تو میری شخصیت کے وہ عناصر جو ان کی ہم آہنگی میں نہیں تھے اور جب میری Reality کا ایک حصہ تھے وہ مجھے کدھر لے گئے۔ وہ مجھ کو لے گئے کہ میں نے "مشرق" جیسی نظم لکھی جو عسکری صاحب کو بالکل پسند نہیں تھی۔ میں نے دوسری نظمیں لکھیں جن کو وہ بالکل پسند نہیں کرتے تھے وہ تو میری ان غزلوں کو پسند کرتے تھے جو "بیاض" میں ہیں۔

میرے اندر ایک Element ایسا بھی تھا جسے وہ بالکل ناپسند کرتے تھے اور ناپسندیدگی کی وجہ سے میں ان کو نہیں سناتا تھا۔ اور اگر کبھی ایسی چیزیں انہیں سناتا تو وہ ناک بھوں چڑھاتے۔ تو یہ پیکار جاری تھی۔ اب آپ ان اختلافات کو جو چاہیں کہہ لیں۔

س: آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ اقبال کو کیوں پسند کرتے ہیں یعنی وہ پسند کون سی ہے جو صرف آپ ہی سے منسوب کی جا سکے؟

ج: اقبال کو لوگ مختلف حیثیتوں میں پسند کرتے ہیں۔ کوئی ان کو ریفارمر سمجھتا ہے کوئی ان کو مصلح سمجھتا ہے۔ ان کی شاعری کی حیثیت کو کچھ لوگ ضمنی سمجھتے ہیں مگر میں نے یہ اتفاق کیا کہ اقبال کی اصل عظمت ان کی شاعری کی وجہ سے ہے۔ "ضرب کلیم" پر مضمون لکھتے ہوئے میں نے بتایا تھا کہ اس میں شاعری کے کتنے Element موجود ہیں۔ اقبال سے میرا تعلق عمر کے اس وقت کے حصے سے ہے جب میں نے آنکھ کھول کر کتاب دیکھنی شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے ہمعصر اور ہم عمر لوگ اختر شیرانی سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اس وقت میں اقبال کا اتنا بڑا Devotee تھا کہ مجھے اقبال کا پورا کلام حفظ تھا۔ اردو اور فارسی دونوں۔ اور میں اپنے ہم عمروں میں اس بات کے لیے مشہور تھا کہ اگر کوئی مجھ سے بحث کرتا تھا میں اقبال کے حوالے سے اُسے چت کر دیا کرتا تھا۔ اقبال میرے لیے بطور ایک حربے کے تھا۔ اس کے بعد جتنا جتنا میں نے مطالعہ کیا مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اقبال کے خیالات سے ۰۰ فیصدی اتفاق کرنا تو میرے لیے مشکل ہے بلکہ ان کی شاعری سے ۰۰ فیصدی اتفاق کرنا میرے لیے آسان ہے۔ تو میں نے یہ کہا کہ آپ اقبال کو اس کے خیالات کی وجہ سے عظیم مانتے ہیں تو مجھ کو بھی یہ حق دیجیے کہ میں اقبال کو شاعر کی حیثیت سے عظیم مانوں خواہ مجھے ان کے خیالات سے اختلاف ہو۔ اسی طرح میں نے اپنے لیے اقبال کی مقبولیت کا Justification پیدا کیا۔

س: گزشتہ دنوں پروز پوئم پر بہت بحثیں چلتی رہیں۔ پروز پوئم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: پروز پوئم کا جو شور اٹھا تھا وہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب جو بات میں لکھوں گا وہ کسی Controversy کی بنیاد نہیں بنے گی۔ پروز پوئم کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ کوئی آزادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذمہ داری ہے۔ آپ قافیے سے حسن پیدا کرتے ہیں۔ آپ ردیف سے حسن پیدا کرتے ہیں۔ آپ وزن سے حسن پیدا کرتے ہیں تو گویا شعر کا امتیاز آپ ان چیزوں سے پیدا کرتے ہیں لیکن پروز پوئم اس چیز کی کوشش ہے کہ ان سہاروں کے بغیر حسن پیدا کر کے دکھایا جائے یعنی آپ سے کہا جائے کہ آپ دلہن کے زیور اتار دیں۔ اسے خوبصورت کپڑے نہ پہنائیں۔ اسے بناؤ سنگھار اور غازے وغیرہ سے دور رکھیں اس کے باوجود وہ دلہن نظر آئے تو جوہر ذاتی ہو گا تو نظر آئے گا کیونکہ سجاوٹ کو تو آپ نے نکال ہی دیا ہے تو پروز پوئٹری کے ان حلقوں کی ذمہ داری تھی کہ خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے جتنے طریقے ہیں ان سے ہاتھ اٹھا لیں مگر ہیوی کریڈٹ کر کے دکھائیں اور اس کی اہلیت ہمارے یہاں کس میں ہے یہ تو اصل مسئلہ ہے۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ جس قوم میں ابھی تک آزاد نظم اپنی جگہ نہ بنا سکی ہو اس قوم میں پروز پوئم کیسے چلے گی۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے۔ اگر کوئی Talented آدمی پروز پوئم لکھتا ہے تو کسی کو کیا اعتراض ہے۔

س: آپ کو تصوّف سے بڑا شغف رہا ہے۔ آپ نے تصوف کے بارے میں بہت کچھ پڑھا بھی ہے اور لکھا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ تصوف سے آپ نے شعر و ادب میں کیا کام لیا ہے؟

ج: آپ کو معلوم ہے کہ محی الدین ابن عربی کے پڑھنے کے بعد مجھ میں جو سوالات پیدا ہوئے ان کی تصدیق کے لیے میں کسی معتبر آدمی کے پاس جانا چاہتا تھا تو میں بابا ذہین شاہ تاجی کی خدمت میں حاضر ہوا اور سبقاً سبقاً دو سال "فصوص الحکم" اور دیگر مسائل کو سمجھا۔ میری روح میں ایک مسئلہ تھا کہ انسان تکوین پر کیسے راضی ہو جاتا ہے یعنی صبر و رضا اور مشیت الٰہی کے آگے ایک تنکے کی طرح سر جھکانا کیسے ممکن ہے کہ اس سے انحراف نہ ہو۔ اس سے ٹکرانے کا سوال پیدا نہ ہو۔ اس سے انقباض پیدا نہ ہو۔ میں یہ قوت چاہتا تھا جو مجھے ملی۔ محی الدین ابن عربی نے فرمایا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے اب آپ دیکھئے دنیا میں کیسے کیسے واقعات ہو رہے ہیں۔ اگر تکوین میں سب ٹھیک ہو رہا ہے تو اس میں پریشانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے میری روح کو ایک تقویت حاصل ہوئی کہ میں جب کبھی اپنے

آپ کو اور اپنے حالات کو دیکھتا ہوں تو جو میرا حقیقی Reaction ہے اس کو میں منجانب اللہ سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر جو چیز پیدا ہو رہی ہے۔ وہ میرے رب کی طرف سے ہے۔ اس سے صادق رہنا میرا کام ہے۔ اس کے مطابق میں نے زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔ میں نے لکھا اور کہا بھی کہ انسان کو اپنی باطنی صداقت کے ساتھ رہنا چاہیے اور اگر اس کے قدم ڈگمگاتے ہیں تو باطنی صداقت یہ ہے کہ قدم ڈگمگا گئے۔ اس بات کا اثر میری غزلوں میں پاؤ گے کہیں میں نے لکھا ہے کہ ؎

ہیں وہ سفاک آنکھیں ڈھونڈتا ہوں
جو خود کو دیکھنے کی تاب لائیں

کہیں کہا ہے ؎

شر کا احساس ہو کہ خیر ملے
خود کو دیکھوں تو چشم غیر ملے

تو یہ تمام چیزیں اس ضمن میں آتی ہیں۔ میں نے براہِ راست تصوف کے مسائل پر نہیں لکھا لیکن ضمنی طور پر یہ باتیں میرے یہاں موجود ہیں۔

س: اب آپ اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ بتائیے۔

ج: میری زندگی طرح طرح کے واقعات و حادثات سے بھری ہوئی ہے اور میں نے جو اثرات ان سے لیے ہیں تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ان اثرات کو "مشرق" میں بہت تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ وہ جب چھپے گی تو اس میں میری سوانح عمری کے اجزا اور حصے ہوں گے لیکن میری زندگی میں سب سے بڑا اثر جو مجھ پر تھا وہ میری ماں کا تھا۔ میں یوں محسوس کرتا تھا کہ میں اپنے گوشت پوست میں تو اپنی ماں کا ہوں ہی، اپنی روح میں بھی اپنی ماں کا ہوں اور اگر میرے کردار میں کوئی استقامت کوئی خوبی، کوئی چیز کسی کو نظر آتی ہے اور اگر وہ مجھ میں کہیں ہے تو وہ میری ماں کے اثر سے ہے۔ پچھلے برس ان کا انتقال ہو گیا تو والد کے انتقال سے لے کر یہاں تک۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی دو موتوں کے درمیان ہے۔ بچپن میں میرے والد کا انتقال اور اب اپنی ماں کا انتقال ہے۔ میں اللہ کی ناشکری نہیں کرتا۔ مجھے میرے دوستوں نے، میرے عزیزوں نے، میرے خردوں نے، میرے بزرگوں نے ایسی محبت دی، اتنی حوصلہ افزائی کی، میری اتنی قدر کی کہ میرے باپ سے بھی بڑے بزرگ نہ صرف بچوں کی طرح میری قدر کرتے تھے بلکہ میری عزت بھی کرتے تھے۔ اگر میں ان کے سامنے چلا جاتا تو وہ میرے

یہ لکھڑے سو جانے یہی مجھے اپنے خاندان سے ملا اور یہی مجھے فرانی زندگی سے بھی ملا ہے۔

س : آپ اپنے بچپن کا کوئی واقعہ سنا دیجیے؟

ج : ایک مرتبہ ایک خاتون میرا انٹرویو کرنے آئیں۔ میں اس وقت سو رہا تھا۔ جب میں اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے بجائے آپا کا انٹرویو کر رہی ہیں بعد میں انہوں نے میرا انٹرویو بھی لیا لیکن جو باتیں میں نے کیں وہ میرے بارے میں آپا نے پہلے ہی لکھوا دی تھیں۔ ان واقعات میں آپا نے ایک واقعہ یہ بھی بتایا کہ ہمارے ایک بزرگ کے پاس بہت سی کتابیں تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے ان کتابوں کو ایک بہت بڑے صندوق میں رکھ دیا تھا۔ تو میں کتاب پڑھنے کے شوق میں اس بڑے صندوق میں اتر جاتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پڑھتے پڑھتے وہیں نیند آ گئی تو سو گئے۔ اب سارا گھر تلاش میں ہے۔ تمام محلے میں ڈھونڈا جا رہا ہے۔ پھر جب کتابوں کا صندوق دیکھا جاتا تو میں برآمد ہوتا۔ ایک مزیدار واقعہ اور یاد آیا کہ میرے چچا نے ایک دفعہ بہت بڑا غبارہ مجھے لا کر دیا اور میں کھیل کھیل میں غبارے پر بیٹھ گیا۔ اور غبارہ پھٹ گیا۔ جب غبارہ غائب ہو گیا تو میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا غبارہ کمرے سے باہر کہاں غائب ہو گیا۔ میں اس غبارے کی تلاش میں کمرے میں بہت دیر تک گھومتا رہا۔

س : ایک سوال اور ہے۔ آپ کی تنقیدی کتاب "نئی نظم اور پورا آدمی" بڑی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اس کی موجودگی میں یہ سوال تو نہیں ہے۔ لیکن میں کہہ رہا ہوں کہ پورے آدمی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج : اس کتاب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے بعد جتنی کتابیں آئیں ان سب میں "نئی نظم اور پورا آدمی" کے بارے میں کچھ نہ کچھ اظہار ضرور ہوا اور مضامین بھی لکھے گئے۔ میری اس کتاب سے بہت شدید اختلاف ہوا۔ لوگوں نے ان کے جنسی پہلو پر بہت زیادہ گفتگو کی۔ مگر اطہر۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ پورے آدمی کا مطلب ہے پورا تجربہ تو جب میں یہ کہتا تھا کہ یہ ادھورا آدمی ہے تو میرا مطلب یہ تھا کہ یہ آدمی اپنے پورے تجربے کو یا تو بیان نہیں کرنا چاہتا یا اسے شعور میں نہیں آنے دینا۔ آدمی تو اپنے ماں کے پیٹ سے پورا پیدا ہوتا ہے مگر اس کے اوپر کچھ پابندیاں کچھ اس کی مصلحتیں، کچھ اس کی مفاہمتیں، کچھ اس کے مفادات، کچھ اس کے تعصبات اثر کرتے ہیں اور یہ سب مل کر اس کے شعور سے اس کے پورے تجربے کے بعض اجزا کو خارج کر دیتے ہیں تو اس کو اپنے پورے تجربے کی طرف لوٹنا چاہیے۔ میں نے یہی کہا ہے۔ چونکہ میں نے اس بات کو ایک خاص دور کی شاعری پر اطلاق کیا تھا جس میں شاعری کا موضوع رومان تھا۔ مرد اور عورت کے تعلقات پر بہت زور دیا جاتا

تھا۔ اس لیے مرد اور عورت کے صحیح تعلقات پر زور دیا ہے ورنہ اس سے پہلے تو لیلیٰ مجنوں کے فرضی قصے اور گل زہلل کے فرضی افسانے بیان ہوتے تھے۔ پہلی بار Real مرد اور عورت اس میں آئے جب عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر ہوا تو میں نے یہ سوال کیا کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے پورے تجربے میں جنس ہی ایک چیز ہے تو یہ کہاں غائب ہو گئی۔ اب کوئی بھی آدمی یعنی ہم اس پیمانے کو لے کر بڑے سے بڑے ادب کو Judge کر سکتے ہیں اور ہر دور کے جہاں آدمی اپنے پورے تجربے کو یا تو بیان نہیں کرتا یا شعور میں آنے نہیں دیتا تو ہمارا پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ہم انسان کو اس کے تجربے سمیت جانتے ہیں اس میں سے اس کا کون سا جزو حذف ہو گیا ہے۔ 'ادھوری جدیدیت' میں نے کتاب لکھی۔ اس میں آپ یہ دیکھئے کہ میں نے کہا کہ جدیدیت نے اپنا اسٹنگ بنیاد تجربے کو بنایا ہے کہ جو ہمارا تجربہ ہو گا اس پر ہم حقیقت کو قبول کریں گے یا رد کریں گے۔ بجائے اس بات کے کہ وہ اپنے پورے تجربے کے ساتھ ہوتی یعنی جن حقائق کو Authority پر بنیاد کی وجہ سے رد کیا تھا وہ اگر تجربات میں بیچے ہوئے تو ان کو قبول کر لیتی۔ وہ اپنے انکار کی اسیر ہو کر رہ گئی اور وہاں ادھوری ہو گئی۔ تو یہ سارے تصورات پورے تجربات سے وابستہ ہیں۔ اس کو ہماری تنقید میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ انسان کا پورا تجربہ کیا ہے۔ انسان ایک ایسی حقیقت ہے جس کے پاس جذبات بھی ہیں جسم بھی ہے۔ حسیات بھی ہیں عقل بھی ہے جس کے پاس وجدان بھی ہے روح ہے اور جبلت بھی ہے تو یہ انسان کی Totality ہے تو جو انسان اس کے زیادہ سے زیادہ اجزا کو Cover کر لیتا ہے وہ اتنا ہی بڑا ہو جاتا ہے اور جتنا اس سے روگردانی کرتا ہے اتنا ہی انسان چھوٹا رہ جاتا ہے۔ اس کو کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ سلیم احمد ایک کلیہ بنا لیتے ہیں اور ایک نظریہ گھڑ لیتے ہیں۔ پورا آدمی بھی ایک نظریہ ہے۔ حالانکہ نظریات کے سبب سے تو ادھورا آدمی بنتا ہے یعنی پورا آدمی تو خود ہر نظریہ کی نفی ہے۔ کیونکہ نظریہ اس وقت بنتا ہے جب آپ کلیت کو ٹکڑوں میں بانٹ کر کسی ایک حصے کو صداقت سمجھ لیتے ہیں تو یہ پورا آدمی ہر نظریے کا بطلان ہے۔

(بشکریہ: روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۸، ۲ مئی ۱۹۷۵ء)

انٹرویو: آصف فرخی

چشمِ طوفان — سلیم احمد

سلیم احمد کی اس گفتگو کا آغاز ۱ جولائی ۱۹۸۲ء کو ہوا، لیکن چونکہ اس کا دائرہ کار اتنا پھیل گیا تھا اور یہ انٹرویو ایک عام دلچسپی کے رسالے میں اشاعت کے لیے حاصل کیا جا رہا تھا، اور اس وجہ سے ادبی گفتگو کے ساتھ ساتھ اور بہت سے مسائل بھی زیر بحث آ گئے تو سلیم بھائی نے کہا کہ ریکارڈنگ کی ایک نشست اور رکھی جائے جس میں ادبی رویوں پر بات چیت کی جائے۔ تو اس طرح گفتگو کا اختتام ۱۰ جولائی کی رات میں ہوا۔ یہ گفتگو انگریزی میں ماہنامہ Herald کے ستمبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اشاعت سے قبل اس کا مسودہ سلیم بھائی نے دیکھ لیا تھا اور چھپتے وقت اس میں جو کانٹ چھانٹ ہوئی تھی۔ اس میں ان کی اجازت بھی شامل تھی، لیکن ان کی ہدایت تھی کہ یہ گفتگو اردو میں اپنی اصل صورت میں اس وقت شائع ہو جب وہ اس پر نظر ثانی کر لیں، خصوصاً بعض جملے جو ادھورے رہ گئے یا ٹیپ میں صاف سنائی نہ دے سکے اور انگریزی کے وہ الفاظ تبدیل کر دیے جائیں جو انگریزی اشاعت کے خیال سے عمداً بکثرت استعمال کیے گئے تھے۔ لیکن ناگہانی موت نے سلیم بھائی کی اپنی کتابِ زندگی کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اب یہ گفتگو بغیر کسی تبدیلی یا ترمیم کے حاضر ہے۔

یہ انٹرویو طوفانی موسم میں لیا گیا۔ صبح ہوئی تو موسم گرما کا روشن، چمکیلا دن ہر طرف پھیل گیا۔ لیکن جس وقت میں ٹیپ ریکارڈ بغل میں داب، سلیم کے گھر کے لیے روانہ ہوا تو آسمان پر طوفان کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی تھیں اور لگتا تھا کہ اب برسا تھے

اندیشہ تھا کہ میں منزل مقصود پر پہنچ بھی پاؤں گا یا راستے میں بھیگ کر شرابور ہو جاؤں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ موسم سلیم احمد کے ساتھ مکالمہ کرنے کے لیے عین مناسب ہے۔ طوفان تو سلیم احمد کے مزاج کا حصہ ہیں۔ شعلہ فشاں اور بے لاگ شخصیت، فن گفتگو کے ماہر، شاعر، ناقد، کالم نگار، ڈرامہ نگار، مفکر اور ادیب سلیم احمد ادب کو اپنی زندگی کا بنیادی خط سمجھتے ہیں۔ خیالات کے قلم رو میں اپنے سفر اور اپنے ذہنی ارتقاء کے معاملے میں وہ جس قدر تیز قدم ہیں، اپنے پڑھنے والوں کو اس سفر میں شریک کرنے کے اسی قدر قائل بھی ہیں۔ ان کے خیالات میں روشنی اور گرمی کی کارفرمائی اس قدر ہوتی ہے کہ بعض دفعہ وہ چنگاری سے شعلہ بن جاتے ہیں اور سلیم احمد کے گرد ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ہنگامہ سلیم احمد کو اپنی بات کہہ کر لوگوں کی خود اطمینانی پر ضرب لگانے سے نہیں روکتا۔ انگریزی محاورے کے مطابق، سلیم احمد ہمیشہ طوفان میں پائے جاتے ہیں

آصف فرخی: سلیم احمد صاحب، آپ کی شہرت کا آغاز ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ پھر آپ نقاد کے طور پر جانے گئے اور اب آپ روزانہ کالم لکھ رہے ہیں، اور آپ نے ریڈیو ٹیلی وژن وغیرہ کے لیے بھی لکھا، صحافت بھی کی، تو یہ جو آپ کی اتنی ساری اور مختلف حیثیتیں ہیں، تو ان میں سے خود آپ کے نزدیک کون سی چیز بنیادی اہمیت کی حامل ہے

سلیم احمد: اس سوال کا آصف ایک تو مقصد یہ ہے کہ میں معروضی طور پر یہ دیکھوں کہ معاشرے میں یا میرے پڑھنے والوں میں یا ان لوگوں میں جو مجھ سے دلچسپی رکھتے ہیں، کس چیز کو اہمیت دی جاتی ہے، اور دوسری بات یہ کہ میں خود بتاؤں کہ میرے نزدیک کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ اب قصہ یہ ہے کہ میری دو چیزیں Controversy سے بالا رہی ہیں، یعنی ان کی قبولیت اگر مکمل نہیں رہی تب بھی ان کا گراف اونچا رہا۔ میری دو حیثیتوں کو کبھی چیلنج نہیں کیا گیا، نمبر ایک تو ڈرامہ نگار کی میری حیثیت کو، اور دوسرے تنقید نگار کی حیثیت کو۔ ان دو چیزوں کو قبول کیا گیا۔ ڈرامہ نگاری سے میں بقول غالب، روشناس خلق ہوا، اور وہ لوگ جو ادب سے چنداں دلچسپی نہیں رکھتے یا لکھنے پڑھنے سے ان کا براہ راست تعلق نہیں ہے، وہ بھی میرے ڈراموں سے متاثر ہوئے اور تمہارے لیے شاید یہ بات دلچسپی کا باعث ہو کہ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند پر حکومت پنجاب نے دس جلدوں میں تاریخ مرتب کی جو ہزار سالہ مسلم تہذیب کی تاریخ تھی تو اس کے اندر جس واحد حیثیت سے میرا ذکر ہوا ہے وہ ڈرامہ نگاری ہے۔ یعنی کسی حیثیت سے

نہیں، شاعر نہیں، نقاد نہیں، صحافی کی حیثیت سے نہیں موجود ہے۔ لیکن اس میں میرا ذکر ڈرامہ نگار کے طور پر موجود ہے۔ میں نے تقریباً پونے دو سو ڈرامے لکھے۔ ریڈیو کے لیے اور ایک زمانہ ایسا تھا کہ میرے ڈرامے بہت شوق سے سُنے جاتے تھے۔ اور یوں کہنا چاہیئے کہ ریڈیو سُننے والوں کی کئی نسلیں ان ڈراموں کو سن کر جوان ہوئیں۔ اور وہ اب تک ان ڈراموں کو یاد رکھے ہوئے ہیں لیکن ٹی وی پر میرے ڈراموں سے "تعبیر" وغیرہ سے، زیادہ شہرت ہوئی جس وقت کراچی میں ٹی وی کا آغاز ہوا تو اس پر پہلا ڈرامہ میرا پیش کیا گیا یعنی کراچی میں نشریات شروع ہونے کے تیسرے دن وہ دکھایا گیا۔ تو یہ ڈرامے کی حیثیت ہے ۔ نقاد کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ سراہا گیا اور یہ کہا گیا کہ سلیم احمد شاعر اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے اچھے نقاد ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ شاعری سلیم میں کم ہے۔ میں خود یہ کہتا ہوں کہ شاعری میرا سب سے کمزور بچہ ہے اور چونکہ کمزور بچہ ہے اس لیے مجھے بہت عزیز ہے۔ تو یہ گویا کہ ایک عمومی صورتِ احوال ہے۔ اور صحافت، صحافت میں نے آج سے آٹھ دس سال پہلے شروع کی تھی، اور کچھ کالم لکھے میں نے "حریت" کے لیے "جسارت" کے لیے مسلسل کئی سال لکھتا رہا، اب یہ روزانہ کالم نویسی کا تجربہ کیا ہے میں نے۔ "حریت" میں، اس کو بھی عام طبقوں میں پڑھا گیا۔ اور مجھ سے کئی لوگوں نے یہ بات کہی اور سراہیں پسند کیا۔ تو یہ ہے بات۔

آصف فرخی : اچھا تو آپ نے اپنی ادبی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے اپنی ڈرامہ نگاری کو بہت اہمیت دی ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ بذاتِ خود بہت ڈرامائی شخصیت ہیں، یا پھر یہ کہ شاعری اور تنقید بھی اس ڈرامے کا ایک حصّہ ہیں جس ڈرامے کا نام سلیم احمد ہے۔

سلیم احمد : صاحب ڈرامے کا اثر تو میری تنقید پر بھی پڑا ہے۔ اور تم نے "نئی نظم پورا آدمی" پڑھتے ہوئے دیکھا ہو گا کہ میں نے اس میں ڈرامائی تاثرات یا Dramatic effects دیئے ہیں اور میری شاعری کے بارے میں بھی یہ بات مسلسل کہی جاتی رہی ہے کہ میں شعر سے ڈرامے میں بہت کام لیتا ہوں۔ بالخصوص میں نے جو طویل نظم لکھی ہے "مشرق ہار گیا" اس میں میں نے اس فن سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، جب وہ چھپے گی تو لوگوں کو اندازہ ہو گا کہ میں نے اس فن کو کس طرح برتا ہے۔ اب رہ گیا ڈرامائی شخصیت ہونے کا، تو یہ بات آپ نے بڑی دلچسپ کہی ہے اور اگر ڈرامے کے معنی کشمکش اور پیکار اور ٹکراؤ کے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ میری شخصیت جو ہے وہ ڈراماٹسٹ کی ہے، داخلی طور پر بھی اور خارجی طور پر بھی خارجی

طور پر میں بڑے تنازع کا اور Controversy کا موضوع رہا ہوں اپنی تحریر کی ابتدا سے اور ہر قسم کے تنازع میرے ارد گرد پروان چڑھتے رہے ہیں، میرے خیالات کے سلسلے میں میری باتوں کے سلسلے میں، میرے رویوں کے سلسلے میں، میری ہر چیز کے بارے میں۔ اور داخلی طور پر بھی میں بڑے شدید حالات اور شدید کشمکش سے گزرتا رہا ہوں، اور اب تک گویا ان چیزوں کا Synthesis میرے اندر نہیں ہوا ہے جس سے میں زندگی بھر دوچار رہا ہوں۔

آصف فرخی: اس سوال سے میرا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ اتنی متنازعہ فیہ شخصیت کیوں ہیں؟ آپ کی تحریر میں اور آپ کے مزاج میں وہ کون سی چیز ہے جو لوگوں کو اتنا Provoke کرتی ہے۔

سلیم احمد: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ لوگ جو ہیں ...... معاشرے میں .... اصل میں ہے یہ قصہ کہ خیالات لوگوں کو اپنے پیش روؤں سے منتقل ہوتے ہیں اور عموماً معاشرہ اور اس کے افراد جو ہیں وہ ان کو یوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان میں گویا ایک Confirmity پیدا ہوتی ہے اور وہ Accepted thought یا طے شدہ خیالات کے اوپر زندہ رہتے ہیں۔ لوگ ان میں محصور ہو جاتے ہیں، ان کے غلام ہو جاتے ہیں۔ تو میں ہمیشہ ..... کوئی خیال میرے لیے پہلے سے طے شدہ نہیں ہے۔ میں اس کی ابتدا، اس کی خیال کی تنقید، اس پر تشکیک اور اس پر سوال کرنے سے ابتدا کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ میری تحریروں کو پڑھیں تو ان میں تھیسس، اینٹی تھیسس کا اتنا عمل ہوتا ہے کہ ابھی ایک بات کہہ رہا ہوں، اس پر سوال کر رہا ہوں، پھر ایک اور بات کر رہا ہوں، اس پر سوال کر رہا ہوں۔ "اقبال ایک شاعر" پڑھیں آپ، تو اس میں آپ کو معلوم ہوگا کہ سوال در سوال در سوال تحریر ابھرتی چلی جاتی ہے، ایک رویہ بیان کرتا ہوں، ایک خیال بیان کرتا ہوں، پھر کہتا ہوں اس پر یہ سوال ہے، اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو پھر اس پر یہ سوال جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ یہ ہے اس میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ حقیقی عمل ہے میری سوچ کا، اور یہی میری قوت ہے، اور یہی تنازعات میرے چاروں طرف پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی بات جو ہے وہ میرے ذہن میں اس طرح نہیں آتی کہ میں اس کو ایک جمے جمائے نقشے کے اندر رکھ دوں اور کیونکہ یہ باتیں اس ترتیب سے ہیں اور اس طرح ہیں۔

آصف فرخی: یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کسی ایک مضبوط نظریے کی پناہ اور حفاظت حاصل کرنے کے بجائے سوالات کی تلاش میں رہتے ہیں، اور آپ کا ذہنی عمل جوابات کی نہیں بلکہ

بنیادی سوالوں کی جستجو ہے۔

سلیم احمد: ہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ میں جو ابات کو توڑتا چھوڑتا چلا جاتا ہوں، ایک ایک کرکے مسترد کرتا جاتا ہوں، اور، اور۔۔۔۔۔۔ میں اس کو ایک مثال سے واضح کر دوں۔ مثلاً غالب کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اور اقبال کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں چند خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، چند خیالات کی تکرار ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے میں بات وہاں سے شروع کروں گا جہاں پہ یہ سب طے شدہ خیالات بن جاتے ہیں، اس کے بعد جو مرحلہ ہے میں اس کے بعد کی بات کہوں گا۔ دہرائی ہوئی باتوں کو میں چھوڑ دیتا ہوں۔ اس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی کی مخالفت کر رہا ہوں حالانکہ وہ جو ہے نا، وہ طے شدہ باتیں، وہ تو اپنا کام کر گئیں وہ تو ہماری سوچ کا حصہ بن گئیں۔ اب اس سے آگے بڑھنا ہے کہ اس سے آگے کی منزل کیا ہے۔ یعنی میں وہ۔۔۔۔۔۔ ان خیالات کے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ خیالات ایسے ہو گئے ہیں کہ میں ان کو سوتے سے اٹھ کر بول سکتا ہوں کسی آدمی کو، اور ایک ہزار صفحے کی کتاب اقبال پہ میں بول دوں گا ایک مہینے میں، اور وہ اس کو لکھ لے گا۔ یہ طے شدہ باتیں ہیں، میں اپنی بات اس سے آگے شروع کروں گا۔ یہ میرا طریقہ کار ہے۔

آصف فرخی: طے شدہ خیالات سے گریز کا جو عمل ہے جس کو آپ نے اپنا طریقہ کار بتایا ہے، اس میں لوگوں کو چونکانے کی خواہش بھی شامل ہے؟

سلیم احمد: نہیں، میں نے کبھی کوئی بات چونکانے کے لیے صرف نہیں کہی۔ وہ چیز جو میرے خون میں نہیں ہے، وہ چیز جو میرے ذہن میں نہیں ہے، وہ اس لیے کہ لوگ چونکیں یا لوگوں کا کچھ ری ایکشن ہو، وہ کبھی میرا طریقہ کار نہیں رہا جی۔ لوگوں کو چونکانا میرے مسئلے کا حل نہیں ہے، جو سوال میں نے اٹھایا ہے، وہ میرا مسئلہ ہے، میں تو اس کا جواب ڈھونڈ رہا ہوں۔

آصف فرخی: آپ کی بہت سی تحریروں کا انداز ایسا ہے کہ جیسے آپ پڑھنے والے کو چیلنج کر رہے ہیں، اُسے اُکسا رہے ہیں جان بوجھ کر، کوئی provocative چیز آپ کی تحریر میں موجود ہے جو۔۔۔۔۔۔

سلیم احمد: وہ تو ہے۔ اس کا۔۔۔۔۔۔ وہ میرے فن کا حصہ ہے۔ اگر میں گفتگو کر رہا ہوں اور میرے ناظرین سو رہے ہوں، تو مجھے ایسے ناظرین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، جی۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بات اس طرح کروں کہ۔۔۔۔۔۔ ہمارے ایک بہت کرم فرما تھے، بے چارے مرحوم ہو گئے

ابن صفی صاحب، انہوں نے ایک دفعہ میرے بارے میں کمنٹ کیا تھا کہ سلیم احمد اپنے مضمون کا پہلا فقرہ اس طرح لکھتا ہے جیسے ڈگڈگی بجا رہا ہو۔ تو قصہ یہ ہے کہ وہ ڈگڈگی تو میں بجاتا ہوں، لیکن وہ فن کا حصہ ہے، اس کے مواد کا حصہ نہیں ہے، طریق کار اور ہیئت کا حصہ ہے، مضمون کے Content میں وہی بات کہتا ہوں جو مجھے کہنی ہوتی ہے۔

آصف فرخی: اگر آپ تنقید میں ڈگڈگی بجا رہے ہیں تو پڑھنے والا تو پھر بندر ہوا۔

سلیم احمد: (قہقہہ) یہ بھی ہے شاید۔ یہ بھی ہے۔ میں چاہتا یہ ہوں کہ اس کی توجہ میری طرف مبذول ہو۔ وہ ردعمل ظاہر کرے، ری ایکٹ کرے اور جتنی شدت کے ساتھ وہ ری ایکٹ کرے، اتنا ہی بہتر ہے یعنی کھسیائے۔ (قہقہہ) اتنا ہی میرا اثر اس پر زیادہ ہوگا اور میری بات گہرے طور پر اس کے اندر اُترے گی۔

آصف فرخی: خیالات میں جو سفر آپ نے کیا ہے اور آپ کا جو ذہنی و فکری سفر رہا ہے اس میں بعض دفعہ یہ احساس ہوتا ہے کہ Instability کا بھی ایک عنصر رہا ہے۔ بعض دفعہ آپ ایک چیز کی شدت پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی یہ لگتا ہے کہ آپ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں، اس پر Commit نہیں کرنا چاہ رہے ہیں۔

سلیم احمد: نہیں، ایسا نہیں ہے، میں نے .... میں اصل میں ...... مسئلہ اصل یہ ہے کہ بعض اوقات میں خود اپنے آپ کو آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈالتا ہوں۔ یعنی میں اپنے موقف کے بالکل برخلاف موقف اختیار کر لیتا ہوں اور اس پہ دلائل دینا شروع کر دیتا ہوں۔ یا اس کو پیش کرنے لگتا ہوں، یا میں چاہتا ہوں کہ اس کی طرف لوگ توجہ کریں۔ تو آپ یہ دیکھیں گے کہ میری تحریروں میں .... چنانچہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں، وہ جو اس معنی میں خیال کا استحکام چاہتے ہیں کہ ایک ہی خیال کا آدمی ہو جائے۔ ان کو جب میری تحریروں میں وہ چیز نظر آتی ہے۔ آپ نے میرے کالموں میں دیکھا ہوگا کہ میں ترقی پسندوں سے ساری زندگی لڑتا رہا اور میں نے کچھ کالم ایسے لکھے جو ان کی حمایت میں تھے۔ میں نے کہا صاحب ذرا دیکھیں تو یہ کیا کہتے ہیں۔ یعنی ان کے نقطہ نظر سے۔ اور اس وقت جب میں پیش کرتا ہوں تو وہ ان کا نقطہ نظر نہیں رہتا۔ اس کو اس طرح پیش کرتا ہوں جیسے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ پھر وہ میرا نقطہ نظر ہو جاتا ہے۔

آصف فرخی: آپ کے طریقہ کار کی تفصیل کے لیے آپ کی ادبی زندگی کے مختلف ادوار کو بھی ذہن میں رکھیں۔ آپ نے جب لکھنا شروع کیا تو آپ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے اُبھرے۔

سلیم احمد: جی ہاں، جی ہاں۔

آصف فرخی: اور آپ کا نام نئے شاعروں میں لیا جاتا تھا، مثلاً ناصر کاظمی، اور جمیل الدین عالی وغیرہ، یعنی جن سے اس وقت مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جاتی ہوں گی، یعنی وہ شاعر جو غزل کو فراق کے بعد ایک نئی منزل کی طرف لے جاتے نظر آتے تھے، لیکن آپ پھر تنقید نگاری پر آ گئے، آپ نے بہت سے جمے جمائے مسلمہ رویوں کو ٹٹولا، لوگوں کو انداز فکر تبدیل کرنے پر مجبور کیا، اور اب آپ روزانہ کالم میں مسئلے مسائل چھیڑتے ہیں گویا اب آپ چھوٹے درجے کے حکیم الامت ہیں اور پبلک کے سامنے روز وعظ کرتے ہیں۔ تو آپ فن سے پند و نصیحت کی طرف کیسے آئے، کیا آپ اپنے فن میں ان باتوں کا اظہار نہیں کر سکتے تھے جن کی خاطر اب آپ Preaching کرتے ہیں؟ آپ کو اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی

سلیم احمد: فن کی شکل میں .... اصل میں قصہ اس کا یہ ہے کہ واعظ تو میرے اندر نہیں تھا لیکن ایک ایسا آدمی ضرور تھا جو انسانوں کی اور قوموں کی تقدیر سے اور افراد کی تقدیر سے اور ان کے بننے بگڑنے سے بہت گہری دل چسپی رکھتا تھا، چنانچہ بچپن سے میرے اندر یہ عنصر رہا کہ میں انسانوں کو دیکھوں، یہ سمجھوں کہ انفرادی طور پر کس طرح عمل و حرکت کرتے ہیں، Behave کرتے ہیں اور اجتماعی طور پر کس طرح کرتے ہیں، اور اس کے اندر کوئی تبدیلی کس طرح لائی جا سکتی ہے۔ یہ میری زندگی کے مشن میں شامل ہے۔ میں نے چونکہ پچیس سال غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لہٰذا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کو اپنے میڈیم میں، اپنی شاعری میں استعمال کرتا تو کامیابی مجھے ہوتی یا نہ ہوتی۔ لیکن وہ ایک بڑا عجیب سا موضوع ہے اور اس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ اردو کے نقاد جو ہیں تین چار آدمیوں کے استثناء کے ساتھ یہ کسی مسئلے کو نہیں جانتے، ان کو معلوم نہیں ہے کہ تخلیقی مسائل کیا ہیں اور انسان اپنی روح میں کن مسائل سے دوچار ہوتا ہے اور وہ فن میں کس طرح آتے ہیں۔ مثلاً میں ایک موٹی سی بات آپ سے کہوں گا۔ میرا ذہن بچپن سے بہت Developed تھا۔ میرے حسیات بھی اسی قدر پختہ تھے لیکن میرے جذبات میں زیادہ پختگی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب میں کوئی بات کرتا تھا تو جس میں ذہن کا عنصر زیادہ ہو اس میں پاور Power آ جاتا تھا اور جس میں جذبات ہوں اس میں میری پاور کم ہو جاتی تھی۔ لیکن نازک محسوسات کو میں پکڑ لیتا تھا تو اب میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں اپنی شخصیت کے ان سارے پہلوؤں کو کس طرح تقویت اتنی دوں کہ ان میں ایک .... ٹی ایس ایلیٹ نے ایک بات کہی ہے کہ جس کو کہتے ہیں شخصیت کے مختلف اجزاء کا

ہم آہنگ ہو کر عمل کرنا تو اب یہ پارہ پارہ حسیت جو ہے اس کا اظہار اور چیز ہے، جن لوگوں کا وہ مسئلہ ہے وہ کوئی صاحب احساس کے بن جاتے ہیں، کوئی عقل محض بن جاتے ہیں، کوئی جذبات کے بن جاتے ہیں، کوئی صرف زبان کے۔ تو ان کے مسائل کو تو شاید یہ نقاد سمجھتے ہوں، لیکن ایک ایسے آدمی کا جو اپنی شخصیت میں Unified Sensibility کو Develop کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے مسائل کو یہ لوگ بالکل نہیں سمجھتے۔ تو میرے اندر جو ہے، مجھے معلوم ہے اور میں بچپن سے اپنی ان باتوں پر غور کرتا رہا ہوں، یعنی اپنے آپ کو اور اپنی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میری ایک دعا ہے اور وہ میں بچپن سے آج تک مانگتا آیا ہوں۔ میرے ایک دوست ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ میاں اس دعا کو سنتے ہی مسترد کر دیں گے۔ اتنی منطقی دعا سننے کے لیے خدا تیار نہیں ہوگا۔ اور وہ دعا یہ ہے کہ اے خدا جتنی تو نے مجھے استعداد اور صلاحیتیں دی ہیں ان سب کو بتدریج ترقی دے کر درجۂ کمال تک پہنچا۔ تو یہ دعا ہے جو اتنی منطقی ہے کہ لوگ کہتے ہیں اس کا قبول ہونا مشکل ہے (ہنسی) لیکن بہر حال میں یہ دعا مانگتا رہا ہوں کہ میرے اندر جتنی بھی صلاحیتیں ہیں۔ احساس کی صلاحیت ہے یا جذبات کی صلاحیت ہے یا ذہانت کی صلاحیت ہے اور جتنی کو یا استعدادیں خدا نے مجھے دی ہیں، ان سب کا بتدریج اظہار کروں اور انہیں پنپتے ہوئے دیکھوں۔ تو اب تم یہ دیکھو کہ میں اس راہ پہ اس طرح چلا نہیں، کبھی میں نے غزل لکھی اور کبھی تنقید۔ اگر آپ "بیاض" ہی اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا میں اپنی شاعری کے بارے میں کوئی دعوی نہیں کرتا کہ وہ بہت اعلیٰ پیمانے کی شاعری ہے اسے آپ جو بھی درجہ دیں، لیکن اتنا رنگوں کا تنوع شاید آپ کو کسی آدمی کے ایک مجموعے میں نہ مل سکے گا جتنا کہ "بیاض" میں ملتا ہے اسی وجہ سے یہ ہے۔ تو میں کوشش کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ ساری Activities ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں تو کبھی میں نے کسی عنصر کو ترقی دی، کبھی کسی عنصر کو Develop کیا، اور میں اس بات سے گھبرایا نہیں کہ مجھے نہ جانے کتنی مدت لگ جائے کہ میں اس چیز کو گرفت میں لا سکوں۔

آصف فرخی: جب آپ کی شاعری میں اتنے رنگ ہیں اور آپ کو مختلف اسالیب پر گرفت ہے اور آپ ان میں اپنا اظہار کر سکتے ہیں، تو پھر آپ کو مثال کے طور پر، تحریکِ نسواں کے بارے میں بیان جاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آج کل جو خواتین کے مختلف رویّے ہیں، جو جنسی صورتِ حال ہے بلکہ جو جنسی کشمکش یا War of the sexes کی صورت ہمارے معاشرے میں ہے جب آپ اسے غزل میں سمو سکتے ہیں، غزل جیسی

صنف میں اس کا اظہار کر سکتے ہیں تو پھر یہ باقاعدہ قسم کا بیان کیوں ڈرافٹ کرتے ہیں؟
سلیم احمد: نہیں یہ تو معاشرے کے اندر مختلف صورتیں ہیں، یعنی شاعر کی حیثیت سے میرا جو کام ہے اس کے علاوہ........ دیکھو ممکن ہے کہ میرے یہ سارے مسائل میری شاعری میں بھی کسی وقت آ جائیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر میں تاریخ پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں یا مسائل نسواں پر لکھنا چاہتا ہوں، یا بچوں کی تربیت پر لکھنا چاہتا ہوں یا مجھے قرآن حکیم کی کسی سورت میں کوئی نئے معنی نظر آتے ہیں ان کو بیان کرنا چاہتا ہوں یا مذہبی مسائل کے اندر مجھے کوئی بات کہنی ہے جو میں لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہوں تو میں یہ میڈیم کیوں نہ استعمال کروں؟ بلکہ میں تو اسے ادیبوں کی محدودیت سمجھتا ہوں کہ وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں، ہم فلاں ہیں، ہم کو ان مباحث سے کیا غرض ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میں مذہب پر بات کرنے والے کی ایک حیثیت سے، فلسفے پر بات کرنے والے کی حیثیت سے ایک میں سماجی مسائل پر غور کرنے والے کی حیثیت سے جو میں باتیں کر سکتا ہوں وہ کروں اور ضروری نہیں ہے کہ وہ گویا کہ تخلیقی میڈیم ہی میں ہوں۔ اگر مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ میں صرف اپنی غزل میں اس دلچسپی کو ظاہر کروں، وہ میرے علم کا حصہ ہے، میں اس کو کسی بھی طرح ظاہر کر سکتا ہوں۔ ایک زمانے میں میں نے کچھ اس طرح کے مضامین لکھے اسلامی تاریخ کے بارے میں میں نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا، تو ہمارے کچھ دوست ہمارے پاس آئے اور انہوں نے کہا صاحب آج ہم آپ سے ایک بات پوچھنے آئے ہیں، فیصلہ کرنے آئے ہیں اور آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ آپ ایک تخلیقی فنکار رہیں یا آپ مورخ ہیں۔ میں نے کہا کہ بھائی یہ تو تاریخ ہے، اگر مجھے گُتلی بنانے کے بارے میں لکھنا پڑے تو وہ بھی لکھوں گا۔ یہ آخر کیا ہے؟ جو میرے علم کے حصے ہیں جو میرے تجربے کے حصے ہیں، میں جس طرح چاہوں گا ان کو بیان کروں گا، اور جس صنف میں چاہوں گا کروں گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو افسانہ نگار رہیں، یا ہم شاعر ہیں۔ اور اس کے اندر بھی خانے بنا رکھے ہیں، یہ غزل کا شاعر ہے، یہ نظم کا شاعر ہے، یہ رباعی کا شاعر ہے، یعنی شاعر ہونے کی بھی قسمیں بنا دی ہیں، شاعروں میں بھی خانے ہیں، اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ادیب ہوں اور میں تاریخ بھی لکھ سکتا ہوں، مذہب پر لکھ سکتا ہوں، میں نفسیات بھی لکھ سکتا ہوں، میں فلسفہ بھی لکھ سکتا ہوں، میں سماجی مسائل پر بھی لکھ سکتا ہوں اور میں ان سب کو اپنی شاعری کے اندر بھی اس کا عنصر بنا سکتا ہوں۔
آصف فرخی: ٹھیک ہے، آپ چونکہ تخلیقی آدمی ہیں اس لیے آپ یوں لکھ سکتے ہیں اور آپ

نے لکھا بھی ہے۔ اب مسئلہ اس کا ہے جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ مثلاً خواتین کے مسئلے کا حوالہ بیچ میں آیا ہے تو پچھلے دنوں اس پر بھی کافی Controversy چلی۔ آپ نے کچھ کالم لکھے اور اس پر خواتین نے احتجاج کیا، تو وہ کیا سلسلہ تھا اور اس بارے میں آپ کے کیا نظریات ہیں؟

سلیم احمد: بھئی مسئلہ یہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ کہا کہ صاحب کچھ احکام قرآن مجید میں اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے ہیں عورتوں کے بارے میں اور ہماری عورتوں کی جو موجودہ روش ہے وہ ان احکام کے مطابق نہیں ہے۔ اس پر عورتوں نے احتجاج کیا اور مطلب یہ کہ اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ وہ کوئی خلاف اسلام بات کہہ رہی ہیں بلکہ اس بات سے انکار کیا اور انھوں نے اسلام کا ایک Interpretation دینے کی کوشش کی اور یہ کہا کہ ہمارے جو رویے اور ہمارے جو طریقے ہیں، اسلام ان کی مخالفت نہیں کرتا۔ ملّا مولوی ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ تو یہ بات بالکل غلط بات تھی۔ میں نے کہا کہ آپ کا کوئی رویہ ہو، نہ اس سے اسلام واقف ہے اور چودہ سو سال کی اسلامی ثقافت اس سے واقف ہے۔ یہ بالکل ایک نئی چیز ہے، اور یہ بالکل منافقت اور جھوٹ ہے کہ آپ اسلام سے اس کی پیوندکاری کریں۔ نہ صرف یہ کہ یہ اسلام بلکہ مسلمانوں کا اجتماعی Behaviour اور مسلمانوں کا مجموعی کلچر خواہ وہ عرب کلچر ہو یا ترک کلچر ہو یا ایرانی کلچر ہو یا ہندوستانی کلچر ہو۔ اس سے بالکل ناواقف ہے، اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور یہ چیز ہمارے یہاں پیدا ہوئی ہے مغرب کے آنے کے بعد سے۔ اس کی سو سال کی تاریخ میرے سامنے رکھی ہے، اور جس طرح وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھی ہے اس کو میں، جی، انگلیوں پر حساب لگا کر بتا سکتا ہوں کہ وہ یوں درجہ بدرجہ آگے بڑھی ہے۔ اس طرح یہاں سے یہاں پہنچی ہے۔ تو یہ بات میں نے لکھی، اس کے اوپر جناب عورتوں نے کہا کہ صاحب ہم دعد لے کر آئیں گے۔ میں نے کہا موقف آپ طے کر لیجیے۔ آپ کو مذہبی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی ہے، آپ کو معاشرتی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی ہے، آپ کو جنسی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی ہے، یا اخلاقی نقطۂ نظر، کوئی نقطۂ نظر آپ طے کر لیجیے اس کے بعد گفتگو کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ لیکن وہ لوگ نہیں آئیں۔ پھر مجھے کہلایا گیا کہ وہ ایک خط میرے نام لکھ رہی ہیں جس کا میں جواب دوں۔ تو میں نے کہا کہ میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں، آپ مجھے خط لکھیے، میں آپ کے ہر سوال کا شافی جواب دوں گا۔ لیکن وہ خط

بھی نہیں آیا۔ اس اثنا میں دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اسرار احمد صاحب نے کہہ دیا کچھ اور جب ضیاءالحق صاحب نے کہا کہ اتھارٹی تو میں ہوں، تو انہوں نے بھی کہہ دیا کہ یہ تو میری ذاتی رائے تھی تو میں نے ان کے خلاف بھی لکھا۔ میں نے کہا کہ نہ آپ اتھارٹی ہیں نہ ضیاءالحق صاحب اتھارٹی ہیں، اتھارٹی اللہ اور اس کا رسولؐ ہے، اور نہ آپ کی ذاتی رائے سننے کے لیے ہم نہیں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اگر یہ آپ نے ذاتی باتیں کی تھیں تو اس سے ہم اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر یہ اسلام اور اللہ رسول کی بات تھی تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کی ذاتی رائے جو تھی اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ خدا اور اس کے رسول کے واضح احکام ہیں وہ مجھے معلوم ہیں۔

آصف فرخی: تو یہ نظریات جو ہیں وہ ہمیں عملی طور پر کہاں لے جاتے ہیں۔ کیا آپ بھی ڈاکٹر اسرار کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ عورتوں کو پردے کے پیچھے بٹھا دیا جائے اور انہیں زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔

سلیم احمد: عملی طور پر جس وقت معاشرے میں فساد کی صورت رونما ہو، اس وقت سب سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اصولوں پر اتفاق ہو جائے، اور جب اصولوں پر اتفاق ہو جائے تو پھر معاشرے میں اس کے اطلاق کی صورت نکالی جاتی ہے، اور رکاوٹیں حائل ہیں ان کو دور کیا جائے، اور جو دور نہیں ہوسکتیں ان کو اکراہ کے ساتھ گوارا کیا جائے کہ وہاں مجبوری ہوگئی۔ یہ ہے اسلامی نقطۂ نظر۔ اور اب ہمارے یہاں موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اصولوں پر ہی اتفاق نہیں ہے اور چونکہ یہ نہیں لہٰذا کبھی یہ غور نہیں کیا گیا کہ کن رکاوٹوں کو دور کر کے ان اصولوں پر عمل ہوسکتا ہے اور حالات زمانہ کے اعتبار سے کون سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں جگہ دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہر مسئلہ الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام میں پردہ اور عورتوں سے متعلق جتنے احکام ہیں ان کا اصل اصول صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عورت اور مرد اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ تو ہے اصل اصول۔ اس کے بعد وہ ذیلی اصول ہیں جن کی مدد سے اس پر عمل ہوسکتا ہے ان میں کیا چیزیں ہیں کہ عورتیں اپنے ستر کو چھپائیں۔ اپنی زینت کی چیزوں کو ظاہر نہ کریں۔ غیر محرم مردوں کے ساتھ مخلوط نہ ہوں۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان ایسی گفتگو نہ ہو جو ان میں بے راہروی کے دروازے کھولے اور عورتیں اپنا وقت گھروں میں گزاریں.........

آصف فرخی: مگر سلیم بھائی جو عورتیں کام کرتی ہیں.........

سلیم احمد: اس پر بھی میں بات کرتا ہوں۔ آپ ان باتوں پہ غور کریں تو آپ کو اصل اصول اور ان ذیلی اصولوں کا علم ہو جائے گا۔ گھر سے نکلنا ضرورت کے وقت جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ ان باتوں کو پورا کرتا ہو۔ اس پابندی کے ساتھ وہ کام کر سکتی ہیں۔ اب چونکہ یہ مسلم ریاست ہے اس لیے آپ اس سے مطالبہ کیجیے کہ عورتوں کے لیے ان سب چیزوں کا بندوبست کریں جب تک یہ صورتحال پیدا نہ ہو آپ خود اپنے ضمیر کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ آپ اصل اصول پر عمل کرنے کے لیے صدق دل سے تیار ہیں، اور اگر تیار ہیں تو پھر آپ جو جی چاہے کیجیے۔

آصف فرخی: اچھا تحریک نسواں پہ آپ کے خیالات کی طرح، آپ کے جو خیالات عریانی اور فحاشی کے بارے میں ہیں وہ بھی بحث و ہنگامے کا سبب بنے رہے ہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں نے تو ان دونوں مسائل پہ آپ کے رویّوں کو باہم منسلک قرار دیا۔ تو اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔

سلیم احمد: دیکھیے، میں نے یہ کہیں نہیں کہا اور جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا یا دانستہ بہتان طرازی سے کام لیا کہ میں فحش کو جائز سمجھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اپنے الفاظ کا مطلب واضح کرو۔ اپنی Terms کو Define کرو۔ فحش کہتے کس کو ہیں یہ تم مجھے بتاؤ۔ جنس کا بیان ہر حالت میں فحش نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا نا!

آصف فرخی: ٹھیک ہے۔

سلیم احمد: ورنہ طب اور فقہ اور مختلف علوم میں جو جنس کا بیان ہے وہ سب فحش ہو جاتا۔ اب فحش کیا چیز ہے، اس کی تعریف مجھے بتائیے۔ اور جن چیزوں کو فحش آپ کہتے ہیں ان میں بتائیے کہ اس میں یہ چیز فحش ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ آرٹ اپنی فطرت کے اعتبار سے فحش نہیں ہو سکتا کیونکہ آرٹ کا کام جذبات کو بھڑکانا نہیں، جذبات کی تہذیب کرنا ہے۔ فن فحش ہو ہی نہیں سکتا جس وقت تک وہ فن ہے جس وقت وہ آرٹ کے منصب سے گر جائے گا، وہ فحش بھی ہو سکتا ہے، وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میرا مسلک تھا اس کے بارے میں، اور اس کے سوا کوئی مسلک نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں عریانی میں اور فحاشی میں فرق کرتا ہوں۔ مثلاً میں ایسے معاشرے کے بارے میں جانتا ہوں جہاں عورتیں اپنے جسم کے بالائی حصے کو برہنہ رکھتی ہیں لیکن ان کے اندر کوئی احساس شرم و برہنگی نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایسے ہوتی ہیں جیسے معصوم بچے آپ کے سامنے ننگے ہوں۔ جی! اور یہ ہو سکتا ہے کہ

آپ سر سے پاؤں تک جسم ڈھک کے فحش کام کریں۔

آصف فرخی: نہیں، میرا سوال بالکل ادبی پس منظر میں تھا۔ جیسے منٹو ہیں جنہیں بعض لوگ فحش نویس گنتے ہیں یا پھر عصمت چغتائی ہیں یا وہ لوگ ہیں جن کے یہاں جنس کا بیان نہ سہی تو خیالات کی بے باکی ضرور ہے، تو کیا آپ کے خیال میں ان موضوعات پر لکھنے والے افسانہ نگار۔ اور ادیب کسی بھی صحت مند معاشرے کے لیے ضروری نہیں ہیں؟

سلیم احمد: بالکل نہیں۔

آصف فرخی: اور اگر ڈی ایچ لارنس جیسا فنکار پیدا نہ ہوا ہوتا اور اس نے ان موضوعات کو نہ چھیڑا ہوتا تو ایک کمی اور ایک فقدان کا احساس ہوتا تو پھر......

سلیم احمد: بالکل، بالکل۔ لارنس کو میں کتنا پسند کرتا ہوں یہ تو تمہیں معلوم ہے۔ اور تم نے دیکھا ہو گا کہ میں نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ اور اسی مسئلے پر "جسارت" والوں سے میرا اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اور اسی پر یہ سارا جھگڑا اکھڑا ہوا تھا۔ اور میں ایک زمانے میں اس پر لکھ بھی کافی چکا ہوں۔ "نئی نظم اور پورا آدمی" میں میں نے میراجی کو اور راشد کو اور منٹو کو اور عصمت کو کافی Support کیا اور سب سے کہا کہ یوں نہیں ہے جس طرح آپ سوچتے ہیں بلکہ یہ لوگ صحیح ہیں۔ یہ الگ چیز ہے کہ آپ کے اعصاب اتنے اشتعال زدہ ہو جائیں کہ کوئی چیز بھی آپ کے لیے فحش بن جائے۔

آصف فرخی: کچھ عرصہ قبل حکومت نے جوش صاحب پر چند پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ کیا آپ کی نظر میں یہ اقدام درست تھا؟ یہ سوال اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جس وقت یہ احکامات صادر ہوئے ہیں اس وقت آپ حکومت کے پبلسٹی ایڈوائزر تھے۔ تو کیا اس میں آپ کا بھی عمل دخل تھا؟

سلیم احمد: دیکھو بھئی آصف، اگر میں اس کے بارے میں حقائق بیان کروں گا تو لوگ یقین نہیں کریں گے، اور جو میری بات کو جھوٹ گردانیں گے میں ان کے سامنے خود کو کیوں Justify کروں؟ ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ جوش صاحب سے میرے کیا تعلقات تھے اور جوش صاحب مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے۔ کاش یہ بات ان لوگوں نے جوش صاحب سے پوچھی ہوتی۔ اور کئی لوگ جانتے ہیں کہ خود جوش صاحب نے ان لوگوں کو کیا جواب دیا تھا جو ان کے پاس یہی بات کہنے گئے تھے۔ اب میں نہیں بتاؤں پوری بات، اور یہ میں نے اب تک کسی سے نہیں

کہی ہے اور نہ ضرورت سمجھی ہے ۔ میں ان دنوں ایڈوائزر تھا ، مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی کوئی بات ہو رہی ہے یا پابندی لگنے والی ہے ۔ صبح میں اپنے دفتر گیا تو وہاں بیگم شاہدہ نفیس نے فون کیا اور کہا کہ یہ کیا ہوا ہے ۔ میں نے اخبار نہیں پڑھا تھا تو میں نے کہا مجھے نہیں معلوم ۔ پھر میں نے اسی وقت فون محمود اعظم فاروقی صاحب کو [اس وقت کے وزیر اطلاعات ونشریات] انہوں نے کہا کہ میں تو خود ابھی وزیر بنا ہوں اور بالکل لاعلم ہوں اور میں آپ کو پوچھ کر بتاؤں گا ۔ چنانچہ میں نے پھر انہیں دوبارہ کیا ۔ اب انہوں نے یہ کہا کہ جو ہوا ہے ٹھیک ہوا ہے ۔ میں نے کہا کہ چونکہ اس ضمن میں آپ کی منسٹری نے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں لیا ہے ۔ لہٰذا میں آپ کے اس فعل سے اپنی بریت ظاہر کرنا چاہتا ہوں ۔ انہوں نے کہا آپ کو اختیار ہے ، آپ پریس کانفرنس کر کے یہ بات کہہ سکتے ہیں ۔ جب انہوں نے کہا تو پھر میں نے کوئی پریس کانفرنس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ جن افراد سے معاملہ تھا ان کے سامنے میرا نقطہ نظر آ گیا ۔ پھر میں نے مشیر کی حیثیت سے ایک خط انہیں بھیجا جس میں اس اقدام کی حماقت پر تنقید کی کہ یہ ہر اعتبار سے غلط ہے ۔ یہ خط منسٹری کے ریکارڈ میں محفوظ ہوگا جن کو میرے رول پر شک ہے وہ نکلوالیں اور پڑھ لیں ۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم میرے بچے ہو ، میں یہ کسی کے آگے بیان صفائی نہیں دے رہا ہوں ۔ نہ میں اس کا قائل ہوں نہ اس کی ضرورت سمجھتا ہوں ۔

آصف فرخی : اچھا ، اب واپس ادب کی طرف رُخ کریں جب ہم اپنے موجودہ معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں غالب رجحان مادہ پرستی کا ہے ، فکری سطح پر بھی ایک سطحیت ہے ، تو اس زر پرست معاشرے کی تیز رفتار زندگی میں ادب کا فنکشن کیا ہے ، بلکہ اس صورت حال میں ادب کی تخلیق کا کچھ جواز بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نہیں ؟

سلیم احمد : میرے خیال میں پہلے اگر ادب ایک شوق تھا اور اس کے جواز کی تلاش ہوتی تھی ؟ یا آپ کہیں کہ وہ ایک مشغلہ اگر تھا ، تو اب وہ لازمہ ہو گیا ہے ۔ اگر ادب باقی نہیں رہے گا تو یہ معاشرہ ایسے فسادات کا شکار ہو جائے گا ۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ، ایسا تشدد ہوگا کہ پھر کوئی چیز اسے بچا نہیں پائے گی ۔ یہاں تک کہ مذہب بھی نہیں بچا سکے گا ۔ تو پہلے کے معاشروں میں ادب ایک ناگزیر چیز نہیں ہوگا ، میں سمجھتا ہوں کہ ایسے معاشرے ہو سکتے ہیں اور وہ صحت مند معاشرے بھی ممکن ہے کہ ہوں ۔ جن میں کہ ادب کی ضرورت نہ ہو ، لیکن ہمارا معاشرہ ایسا نہیں ہے اور ہمارے معاشرے میں ان ہی دو چیزوں کی وجہ سے جو تم نے بیان کیں ، یعنی مادہ پرستی اور فکری

گہرائی کا فقدان، تو ان کی وجہ سے لازم ہو گیا ہے کہ ادب ایک Parallel Distinction کے طور پر زندہ رہے۔ یہ Money Minded ہونے کے معنی کیا ہیں، صاحب؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ میرا صوفہ مجھ سے اہم ہو، یا ٹی وی زیادہ اہم ہو، میرا مکان مجھ سے اہم ہے، میری کرسی مجھ سے زیادہ اہم ہے، ایک میں صرف الو کا پٹھا ہوں باقی سب چیزیں بنیادی اہمیت کی ہیں، جی! لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ادب میں خود آگہی کی ایک روایت ہے جب تک ادب کا مرکز انسان نہ ہو، زندگی نہ ہو وہ ادب نہیں ہوتا جی! اور جب تک ایک مضبوط انسان نہ ہو، اس وقت تک ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو یہ مطلب ہے کہ ایک ایسی صورت حال میں جہاں انسان اشیاء سے کمتر درجے کا ہو گیا ہو، بلکہ لاشئہ محض بن گیا ہو، اس کے اندر ادب کو باقی رکھنا زندگی کی قوتوں کی پرورش کے مترادف ہے، ایک حیاتیاتی ضرورت ہے۔

آصف فرخی: تو ایسی صورت حال میں ادیب کو بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے اور ادیب کی ذمہ داری اور فرائض بھی پہلے کے مقابلے میں بڑھ جاتے ہیں، تو......

سلیم احمد: ارے بھئی، میں ایک لطیفہ آپ کو بتاؤں۔ ابھی ایک صاحب میرے پاس آئے، انہوں نے ایک رسالے کے لیے میرا انٹرویو لیا۔ "محور" نام تھا رسالے کا۔ اپنی دانست میں بہت بڑی بات انہوں نے مجھ سے پوچھی کہ صاحب یہاں پارٹیاں ہیں، گروپ بازی ہے، میں نے کہا کہ ہر قسم کی گروپ بازی، سیاسی، مذہبی اور ادبی موجود ہے، اور اس کے اندر ادیب مکالمہ نہیں کرتے، بلکہ یہ کرتے ہیں کہ اگر میرے گروپ کا ایک آدمی ہے تو مجھے اس کی تعریف کرنی ہی ہے، مخالف گروپ کا ہے تو اس کی مخالفت کرنی ہی ہے۔ یہ ادب سے لے کر سیاست تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر یہ بین الاقوامی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک روسی ادیب یا روسی دھڑے کا آدمی ہے، وہ امریکہ پر ہر وقت تنقید کرتا رہے گا، کوریا ہے اور ویت نام ہے اور فلاں دھما کا، لیکن روس اگر افغانستان میں کچھ کرے گا تو وہ خاموش بیٹھا رہے گا، پولینڈ میں کچھ کر دے گا وہ خاموش بیٹھا رہے گا، یا پھر امریکہ کا ادیب ہے، جی، تو وہ روس کو برا بھلا کہتا رہے گا امریکہ کے مسائل پر خاموش رہے گا۔ جو ادیب جس لابی کا ہو گا وہ دوسرے کو برا بھلا کہتا رہے گا۔ تو یہ دیکھیے کہ انفرادی رویے سے لے کر اجتماعی رویے تک یہ چیز موجود ہے تو میں نے یہ کہا کہ صاحب، آدمی جو ہے ادیب، وہ کسی دھڑے اور کسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اس کو بغیر اس بات کا لحاظ کیے کہ کون کس دھڑے سے، کس گروپ سے تعلق رکھتا ہے، اس کو سچائی کی تلاش ہے اور سچائی کی

گواہی دینی ہے تو ان صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک ایسا سچا آدمی کوئی ہے۔ میں نے کہا ایک تو یہ خاکسار یہیں موجود ہے اور کچھ اور لوگ ہیں۔ انہوں نے جا کر اس کی سرخی لگا دی کہ سلیم احمد کہتے ہیں کہ پاکستان میں سچے ادیب صرف دو ہیں، میں اور میرا بھائی۔ یہ دیکھئے یعنی پورا وہ انٹرویو پڑھیے اور اس کی سرخی دیکھیے جو اس کے اوپر انہوں نے جمائی ہے۔ حالاں کہ سچے ادیب تو...... فیض صاحب یقیناً ایک سچے ادیب ہیں۔ فراز صاحب یقیناً ایک سچے ادیب ہیں۔ منیر نیازی یقیناً ایک سچا ادیب ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ سچا ادیب اور سچا آدمی کہیں ملتا ہے ایک دوسرے سے، کوئی نقطۂ ملاقات ہے ان دونوں کا؟ سچے ادیب کے پہلے معنی یہ ہیں جو سچا ادب تخلیق کر رہا ہو۔ سچے آدمی کے معنی یہ ہیں کہ سچی گواہی دے رہا ہو۔ اگر یہ دونوں مجتمع نہیں ہوں گے اس وقت تک ادب کی بات پوری نہیں ہو گی۔ تو اب یہ آدمی جس کو اپنی بھی حمایت نہیں کرنی ہے بلکہ وہ بات کہنی ہے جو صحیح ہے خواہ وہ اس کے دشمن کی بات۔ ہو وہ آدمی کہاں سے آپ لائیں گے، وہ آدمی کہاں ہے؟

آصف فرخی: آپ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں جو دائیں بازو کی عصبیت یا Chauvinism ہے آپ اس کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ اس پر تبصرہ کیجیے۔

سلیم احمد: صاحب میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ دائیں بازو والے کہتے ہیں کہ یہ لیفٹ ونگ کا آدمی تھا جو خفیہ طور پر ہمارے اندر داخل ہو گیا، اور لیفٹ ونگ والے جو ہیں وہ میرے جانی دشمن ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر محاذ پر گویا، کوئی آدمی مجھ کو Own کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی کسی کو Totally own نہیں کرتا۔ میں بھی ان سب کو جزوی طور پر قبول کرتا ہوں۔ اور رائٹ ونگ شاونزم کا میرے عالم یہ ہے کہ میں نے لکھا کہ میں حبیب جالب کو اور فیض کو اور فراز کو سلام کرتا ہوں کیونکہ اگر معاشرے میں روح نکل مر جائے گی تو معاشرے کی نمو مر جائے گی، معاشرے کی ترقی نہیں ہو گی، تو ایسا میں رائٹ کا شاونسٹ ہوں۔ دوسری طرف ان کو بتاتا ہوں کہ بھئی آپ چیزوں کو اس طرح نہ دیکھئے۔ اس وقت معاشرہ ہزار قسم کے تضادات کا اور Contradiction کا شکار ہے۔ اس میں کوئی قوت جب تک Synthesis نہیں پیدا کرے گی آپ معاشرے کو سالم نہیں رکھ سکیں گے اور یہ معاشرہ چونکہ منعکس ہوتا ہے میرے اندر اس لیے وہ سارے تضادات جو معاشرے کے اندر ہوتے

ہیں وہ جو میرے اندر ہوتے ہیں، خواہ مجھے اس کا شعور ہو خواہ نہ ہو، خواہ اس کے کسی ایک ٹکڑے سے میں اپنا Identification پیدا کرلوں اور باقی ٹکڑوں کو چھوڑ دوں۔ لیکن وہ معاشرہ میرے اندر ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرے میں اور خود اپنی ذات میں Integration اور تعلق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں خود آگہی ہو، اور اس خود آگہی سے آپ میں معاشرہ آگہی اور جہان آگہی اور انسان آگہی پیدا ہو گی۔ لیکن یہ کھکھیڑ کون پالے؟ میں اپنے ایک ٹکڑے کو لے لیتا ہوں اور اس سے کلام کرتا ہوں۔ یہ ہوتا ہے ہمارے یہاں۔ شعرا میرے سامنے بیٹھتے ہیں، ادیب میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ کوئی اپنے احساس کو پکڑے بیٹھا ہے، کوئی اپنے تعقل کو پکڑے بیٹھا ہے، کوئی اپنے نظریے کو پکڑے بیٹھا ہے، کوئی ایک حصّہ اپنی ذات کا اس نے لے لیا ہے، کوئی اپنے پورے وجود سے نہیں بولتا، نہ اپنے پورے تجربے کو بیان کرتا ہے۔ یہ صورت میں معاشرے میں دیکھتا ہوں۔ اس کی وجہ سے یہ ایک معاشرہ جو ہے آپ کا، یہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹا ہے۔ اور اس کے اندر سے مکالمہ بند ہو گیا ہے۔ کیونکہ مکالمہ اس چیز کی دریافت کا نام ہے کہ میرے اندر اور آپ کے اندر کتنی چیز مشترک ہے اور کتنی چیز مختلف ہے اور مختلف کیوں ہے اور مشترک کیوں ہے۔ مکالمہ اس تحقیق و تفتیش کا نام ہے۔ مکالمے کے بند ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ خود آگہی حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

آصف فرخی: ایک ذاتی سوال پوچھتا ہوں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مکالمہ بند ہو چکا ہے اور جس میں نئے خیالات تازہ آب و ہوا داخل نہیں ہو رہے، اسی معاشرے میں آپ تیس پینتیس سال سے عمل خود آگہی میں مشغول ہیں۔ اب اس مقام پر آ کر اپنی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں کیسا محسوس کرتے ہیں، یعنی آپ اپنے تئیں کامیاب رہے یا نہیں، یا کیا کھویا کیا حاصل کیا۔

سلیم احمد: اصل میں حاصل کرنا جو ہے، اس کے کوئی معنی میری نظر میں نہیں ہیں۔ اب میں تم سے پوچھوں کہ آپ سانس لیتے ہیں، آپ نے اس سے کیا حاصل کیا، صاحب؟ آپ نے محبت کی تو کیا حاصل کیا ہے؟ آپ نے کوئی نیکی کی تو کیا حاصل کیا؟ میں نے کہا کہ کچھ حاصل نہیں کیا۔ محبت کا حاصل کیا ہے سچے پیدا کرنا؟ محبت آپ نے کی، محبت کا تجربہ ہوا۔ مجھے سچائی کا تجربہ یا نیکی کا تجربہ ہوا۔ یا میں نے سانس لی یا ٹھنڈا پانی پیا تو اپنی پیاس بجھانے کے علاوہ میں نے کیا حاصل کیا، یہ کہ میں نے اسے برت لیا۔ اس کے سوا حاصل ہونے کے کوئی معنی نہیں؟ کیونکہ تم نے وہ میرا

مضمون پڑھا ہوگا "حکایتِ یوسف" والا۔ اس میں شبیہ سازی یا امیج میکنگ کی جو بات میں نے کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی امیج کا حصہ ہو گیا ہے۔ یہ حاصل ہونے کا مطلب ہے شہرت کی صورت میں، نام کی صورت میں، قبولیت کی صورت میں، اعزاز کی صورت میں، ایوارڈ کی صورت میں، وہ آپ کے معاشرتی امیج کا حصہ ہے جس وقت وہ آپ کے معاشرتی امیج کا حصہ بن گیا۔ اسی وقت سے وہ آپ کی سچائی کے لیے ایک رکاوٹ اور مشکل بن گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ماضی کی چیز ہو گئے۔ اگلے لمحے آپ کچھ اور نہیں بن سکتے۔ وہی رہیں گے آپ اسی کو دہرائیں گے۔ یعنی میں دیکھتا ہوں کہ فیض صاحب جیسا آدمی بھی جو ہے اپنے کلیشے سے دامن نہیں چھڑا سکتا چونکہ ان کا ماضی ان کو نہیں چھوڑتا۔ زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ اٹھارہ انیس سال کے رہے ہوں گے جب ترقی پسند بنے ہوں گے، اس وقت سے روس میں کچھ ہو گیا، چین میں کچھ ہو گیا، دنیا کہیں سے کہیں بدل گئی مگر ان کے اندر سے جو وہ ایک تھا...... وہ جو ایک طوطا پال رکھا تھا، وہ نہیں بدلا۔ اس قسم کے طوطے لوگ پال لیتے ہیں تو ان کا کیا علاج کیا جائے ایک دفعہ یہ نہیں کہتے کہ اچھا میں نے یہ تجربہ کیا تھا، اور اب وہ تمام ہوا۔ وہ گیا۔ اب میں اس وقت ایک نئی آنکھ سے چیزوں کو دیکھ رہا ہوں تو اپنے کلیشے میں بکتے ہیں۔ اپنے آپ کو دہراتے ہیں اس کی توانائی ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے اور میں نے بعض دفعہ یہ کہا بھی کہ آپ نے شاعری میں ذرا تاثر پیدا کیا، اس کی لوگوں نے داد دی۔ تو انہوں نے کہا اوہو، یہ تو ایسے ہی ہو گیا جیسے آپ کی محبوبہ نے کہا کہ آپ جو ہے یہ جو نیلا سوٹ پہن کر آئے ہیں اس میں بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ وہ تو سالی کہہ کے بھول گئی۔ آپ نے جب تک وہ سالا چندی چندی نہیں ہو گیا، اتار کے نہیں دیا وہ نیلا سوٹ۔ صبح اٹھ کر ڈانٹا آپ نے وہ نیلا سوٹ اور گھر سے باہر نکل آئے۔ اس کو ایک طرف رکھ دیجیے۔ ارے، وہ کہہ کر بھول گئی، آپ بھی بھول جائیے۔ ممکن ہے اسے کوئی نیا رنگ زیادہ اچھا لگ جائے۔ ایسی کیا بات ہے۔ (قہقہہ) لیکن یہ صاحب اسے کس طرح سمجھ لیں۔ ڈرتے ہیں کہ وہ بات کہیں ہٹ نہ جائے، کہیں جو میں نے قاری جمع کر لیے ہیں جو اپنے پرستار جمع کر لیے ہیں۔ کہیں میں نے پیدا کر لیے ہیں، وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ ارے یہ فیض صاحب کو یہ کیا ہو گیا، یا منیر نیازی کو یہ کیا ہو گیا۔ یہ انہوں نے کیا لکھ دیا ہے، یہ تو انہوں نے لفظ ہی ایسا لکھ دیا ہے جو جو کشش کی نعمت کا تھا۔ فیض صاحب کے ڈکشن کا تھا ہی نہیں۔ اب اس کو کہاں وہ برداشت کر سکیں گے۔ لہٰذا وہ وہی لکھے جاتے ہیں۔ حبیب عنبر دست اور

کیا کیا۔ جب سے شعر کہنا شروع کیا ہے، وہی نیلا سُوٹ ڈاٹے ہوتے ہیں۔

آصف فرخی: یہ اس قسم کے لوگ ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کی توقعات کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تو اس میں قارئین سے زیادہ ان ادیبوں کا قصور ہے۔

سلیم احمد: کیوں نہیں، ادیب کے سوا کس کا قصور ہے۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ معاشرے میں علم کی، ادب کی، جمالیات کی، خیر کی، سچائی کی پیاس اٹھ گئی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل نامناسب بات ہے۔ معاشرہ بالکل Potent حالت میں رہتا ہے ہر وقت خیر کو قبول کرنے کے لیے حسن کو قبول کرنے کے لیے، صداقت کو قبول کرنے کے لیے، اگر وہ قبول نہیں کر رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی یا تو ان چیزوں میں کمی ہے یا اس کی پیشکش میں کمی ہے، یا معاشرے کو آپ پر اعتبار نہیں آرہا۔ یعنی آپ ایک غیر معتبر آدمی ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ اور یہ عقیدہ میرا آخری عقیدہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں ایک کلمہ سچ کہوں گا تو اس کی گواہی دینے والے موجود ہوں گے۔ یہ بات ہے کہ گواہ جھوٹے بھی ہوتے ہیں، سچے بھی ہوتے ہیں۔ مخالفت کرنے والے بھی ہوتے ہیں، ایسے بھی ہوتے ہیں جو گواہی نہیں دیتے، ایسے بھی ہوتے ہیں جو زبانی طرازی کرتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان ایک قوت موجود ہوتی ہے اور یہ قوت انسانوں کے درمیان سے فنا ہو جائے، تو انسان روئے زمین پر باقی نہیں رہیں گے۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔

آصف فرخی: اس وقت کی ادبی سماجی صورتِ حال دوہرے تضاد کا شکار ہے۔ ایک طرف معاشرہ ادب کو بالکل نمائشی چیز سمجھتا ہے کہ آپ نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر واہ واہ کر لی اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور دوسری طرف ادیب بھی جو اسی معاشرے کا فرد ہے ان میں اپنی .... انہوں نے ایک Free Mason کلب سا بنا رکھا ہے، تو ....

سلیم احمد: بھئی ایک بات میں تم سے پوچھتا ہوں، میں یہ پوچھتا ہوں کہ ارے بھائی ادب پیدا ہوتا ہے لفظ اور زندگی کے ملاپ سے۔ ادب لفظ اور لفظ کے ملاپ سے نہیں پیدا ہوتا، جی لفظ اور لفظ کے ملاپ سے ادب کا ایک مردہ ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ اس کے اندر زندگی سے رشتہ استوار نہیں ہوتا جس وقت اس میں Life Spark آجاتا ہے اور جب وہ لفظ کے اندر اترتا ہے تو ادب بنتا ہے۔ ہمارا، یعنی میں اپنی بات کر رہا ہوں کہ میری پوری زندگی لفظ سے لفظ پیدا کرنے میں گزری۔ شاعری کی میں آپ سے بات کر رہا ہوں لفظ سے لفظ پیدا

کرنے میں...... کیونکہ اس زندگی کو دیکھنا، اس کے دُلھ کر بھگتنا، اس کے معنی اور مفہوم کو جاننا، اس کے اظہار پر قدرت پانا، اس کے لیے ایک بڑا لمبا Process درکار ہے سمجھے ناں، تو اس جوکھم میں کون جان ڈالے۔ آدمی اس جوکھم میں جان نہیں ڈالتا۔ وہ عسکری صاحب پراؤسٹ کا ایک فقرہ نقل کیا کرتے تھے۔ کہ زندگی ہر انسان کے قلب میں ایک کتاب لکھ دیتی ہے اور اس کا پڑھنا اس کا پہلا فریضہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے، لیکن اس کو پڑھنا اتنا مشکل ہے کہ لوگ قومی جنگوں میں شریک ہو کر جان تک دے دیتے ہیں کہ یہ کتاب نہ پڑھنی پڑے، تو ہماری ساری ادبی سرگرمیاں اس لیے جھوٹی سرگرمیاں بن گئی ہیں کہ ہم اس کتاب کو پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو زندگی نے ہمارے اندر رکھی ہے۔ ہمارے دکھوں کی صورت میں، ہماری کیفیتوں کی صورت میں، ہماری حسرتوں کی صورت میں، ہماری مایوسیوں کی صورت میں اور ہمارے خیر و شر کے تمام پہلوؤں کی صورت میں۔ ہم ایک اپنا بہت خوبصورت امیج معاشرے کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ معاشرہ تو مختلف سطحوں کا بنا ہوا ہے، اس کے اندر ضیاء الحق سے لے کر ایک پٹواری تک سب موجود ہیں۔ نہیں، اس کے کسی سیکشن کو لے کر چلیے۔ کچھ اسکول کی لڑکیوں کے لیے، کچھ نوجوانوں کے لیے، کچھ سیاسی پارٹی کے لوگوں کے لیے دیکھیے۔ آپ پورے ادب کا جائزہ لیجیے کہ اس کا مخاطب ہے کون۔ وہ خود بتا رہا ہے کہ میں کس سے کیا کہہ رہا ہوں۔

آصف فرخی: ادب کا جو موجودہ دور ہے، آج کل جو لکھا جا رہا ہے اسے آپ اردو کی پوری روایت میں کیا درجہ دیتے ہیں؟

سلیم احمد: بھئی میں تو بہت مایوس کن سمجھتا ہوں۔ یعنی ہم نے ادب کے جتنے بڑے بڑے ادوار پیدا کیے ہیں، پہلے وہ ایک انٹرویو میں میں نے کہا بھی تھا کہ ہم نے دیو زاد پیدا کرنے بند کر دیے ہیں اور ہم بالشتیے پیدا کر رہے ہیں، تو وہ فقرہ منیر نیازی کو اتنا لگا کہ اس نے شور مچایا کہ اوئے دیکھو، سلیم احمد کے بچے نے کیا کہہ دیا۔ اس نے مجھ سے کہلوایا بھی کہ یہ کیسا چکر ہے، ایہہ گل کیہ ہے، اوہ جی مینوں اور فیض صاحب نوں بالشتیا کہہ رہے ہیں (قہقہہ) تو وہ کبھی ناراض ہوتا تھا کبھی ڈانٹ پیٹتا تھا کہ مجھے اور فیض صاحب کو جی..... (قہقہہ)۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اس عہد کے اندر امکانات اتنے ہیں۔ یہ اردو کے سابقہ ہر دور سے بڑا ادب کا دور ہو جائے۔ افسوس ایسا نہیں ہوتا۔

آصف فرخی: امکانات کس چیز میں؟ کن معنوں میں مختلف ہے؟

سلیم احمد: تجربات میں دیکھو ایک بند معاشرہ آپ کا تھا، روایتی اعتبار سے مذہبی اعتبار سے آپ اس کو جتنا اچھا سمجھیں، لیکن ادب کے نقطہ نظر سے وہ معاشرہ محدود امکانات کا معاشرہ تھا۔ اب یہ بڑی بات ہے کہ آپ کھلے ہوئے دھارے کے سامنے ہیں جہاں چاروں طرف سے ہوائیں اور طوفان اور زلزلے اور جو طرفہ ہوائیں آپ کے سامنے ہیں۔ ادبی اعتبار سے یہ بڑی بات ہے۔ اس معاشرے کا تناظر اتنا وسیع ہو گیا، اتنا پیچیدہ ہو گیا۔ اس کے اندر اتنی جہات پیدا ہو گئیں۔ یہ دور، چیلنج اتنا بڑا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ اگر میر بھی اس دور میں ہوتا تو کیا میر اس دور کے چیلنج کو برداشت کر سکتا، یا اس کا جواب دے سکتا۔

آصف فرخی: تو تجربات بھی ہیں، تنوع بھی ہے، بین الاقوامی فکری اور ادبی تناظر بھی ہے اور دوسری طرف ہمارے ادیب ہیں تو وہ چیز آخر کیا ہے جو انہیں لکھنے سے روکتی ہے؟

سلیم احمد: بس ایک چیز ہے۔ Creativity کے معنی ہیں نفس کشی۔ ایک دفعہ میں اپنے اندر سے اپنی خودی کی موت جو ہے اس کے تجربے سے دوچار ہو جاؤں، اس کو کہہ نہیں پاؤں گا میں ہزار دفعہ کوشش کروں گا۔ مطلب یہ کہ آپ کے اندر ایک چیز ہے، جو آپ کو آپ کے خوف میں، آپ کی امیدوں میں، آپ کی خواہشات میں زندہ رکھتی ہے اور اس سے آپ کا Ego Assertion پیدا ہوتا ہے اور وہی آپ کی تخلیقی قوت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی موت ضروری ہے، اس کو مارنا پڑتا ہے۔ اور جب آپ اپنے اندر اس کی موت مر جائیں تو سارا وژن، ساری کائنات سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے اس پر "اقبال ایک شاعر" میں لکھا ہے کہ خدا تک کا دیدار اس خودی کی موت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک دم سے یوں معلوم ہوتا ہے ..... تم نے کبھی جھولا، جھولا ہے، جب وہ ایک دم سے نیچے آتا ہے اور آپ کو یوں لگتا ہے کہ رسی اس کی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے تو اس ایک لمحے میں جو آپ کی کیفیت ہوتی ہے، پھر آپ ہاتھ مار کر رسی کو پکڑ لیتے ہیں، وہ چیز ہے اس کا تجربہ آدمی کو ہونا چاہیے۔ مگر ہاں اس میں تحفظات نہیں ہیں۔ میں نے یہ مثال بھی دی تھی دریا کی۔ آپ دریا کنارے کھڑے ہیں اور کوئی اچانک آپ کو دھکا دے دیتا ہے۔ اچانک دھکا دے دے تو کیا کیفیت ہوگی۔ اور تیرنا آپ جانتے نہ ہوں تو یہ تحفظ ٹوٹ جانے، ٹوٹ جانا چاہیے اور ہمارے اعصاب بھی ٹوٹ جائیں پھر شاید۔۔ تو وہ Crisis پیدا ہوگا، وہ neurosis پیدا ہوگا جو سگا بھائی ہے تخلیق کا۔

آصف فرخی: تو گویا آخری تجزیے میں، دیوانگی میں کمی ہے۔

سلیم احمد (قہقہہ)

آصف فرخی: ان حالات میں بھی جو لوگ لکھ رہے ہیں، ان میں سے وہ کون کون ہیں جنہیں آپ شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

سلیم احمد: بھئی میں جن لوگوں کو خوشی سے پڑھتا ہوں تنقید میں، وہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ چار آدمی ہیں عسکری صاحب، فراق صاحب، کلیم الدین احمد اور ایک اور صاحب تھے ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ ان چار آدمیوں کی کسی تحریر کو میں چھوڑنا نہیں چاہتا اور ان چاروں کی کیفیت یہ ہے کہ میں ہر چھٹے مہینے یہ چاہتا ہوں یا ہر چوتھے مہینے کہ ان کو پھر سے پڑھوں فکشن میں مجھ کو منٹو بے انتہا پسند تھے۔ ان کے مرنے کے بعد میں نے فکشن پڑھنا بہت کم کر دیا۔ قرۃ العین حیدر مجھے بہت پسند ہیں۔ انتظار حسین مجھے پسند ہیں۔ نئے لوگوں میں میں جستہ جستہ پڑھتا ہوں، کوئی چیز کسی کی پسند آتی ہے، کوئی نہیں آتی۔ شاعروں میں یہ ہے کہ فیض صاحب کا مجھے بڑا مخالف سمجھا جاتا ہے۔ ان سے میرا نظریاتی اختلاف تھا اور میں نے ان پر تنقید کی بھی سخت ہے لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ میں فیض صاحب کو پاکستان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں، سب سے اچھا شاعر بھی۔ اور ان کو پڑھتے ہوئے میرے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس میں احتجاج بھی شامل ہے۔ پرانا کلام پڑھتے ہوئے لیکن۔ نیا کلام جو ہے ان کا وہ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ بے کار اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں اور میرا وقت بھی ضائع کرتے ہیں۔ مجھے منیر نیازی اچھا لگتا ہے، مجھے ناصر کاظمی اچھا لگتا ہے، مجھے ظفر اقبال اچھا لگتا ہے، مجھے احمد مشتاق اچھا لگتا ہے مجھے کشور ناہید اچھی لگتی ہے اور پروین شاکر بھی۔ نوجوانوں میں یہ سارے لوگ جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں یعنی ان میں ایک تنوع ہے، ان میں کوئی چیز ایسی ہے جو ان نوجوانوں میں ہے اور جو مجھے اچھا لگتا ہے کہ میرے لیے ہے۔

آصف فرخی: آپ نے جو نام بتائے ہیں، مجھے ان میں دو ناموں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ ادبی بالشتیوں کا جو ذکر ہو رہا تھا تو یہ دو نام ایسے ہیں، جو اپنے اپنے انداز میں دیوزاد ہیں ن م راشد اور مجید امجد۔

سلیم احمد: راشد کے اوپر تو میں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اور راشد کا نام تو گویا ایسا ہے کہ جب میں نے منیر نیازی کا فقرہ پڑھا کہ صاحب اچھا آپ بتا دیجیے اس عہد کے دیوزاد کون ہیں تو انہوں نے کہا کہ صاحب ایک توفیق کا نام لکھ لیجیے اور اس سے چھوٹی سطح پر فراق اور

راشد۔ تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ راشد بے حد اہم آدمی ہے یعنی ان کے اندر مجھے حسن کا عنصر تو اتنا زیادہ معلوم نہیں ہوتا جتنا فیض صاحب میں ہے، لیکن ان کے اندر بعض چیزیں ایسی ہیں، بعض خصوصیات ایسی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ ان کا ذہن بڑا ترقی یافتہ تھا اور ان کی گرفت بہت مضبوط تھی اپنے مواد پر۔ لیکن معاف کیجیے گا۔ مجید امجد مجھ سے زیادہ نہیں چلے۔ میں نے بہت خلوص نیت کے ساتھ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن یہ نہیں ہو سکا کہ میں ان کو پوری طرح قبول کر سکوں۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے شعری وجدان میں اتنی وسعت ہے کہ میں مختلف قسم کی چیزوں کو پسند کر سکتا ہوں۔

آصف فرخی: اصل میں ہمارے شعور کی تربیت روایتی غزل کے انداز میں ہوتی ہے جب کہ آج کی صورت حال اتنی بدل چکی ہے کہ روایتی غزل گو، بہت سی چیزوں کو گرفت میں نہیں لا پاتا اور رپٹ جاتا ہے، اب مغرب کی نقالی کا مسئلہ نہیں رہا، وہ بھی ہمارے ذہنی ماحول کا حصہ بن چکا ہے، تو کامیاب شاعر تو وہی ہوگا جو ان مختلف النوع عناصر کو ہم آہنگ کر سکے

سلیم احمد: میں تو یہ کہتا ہوں کہ ادب بغیر Synthesis کے پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ سارے تضاد...... دیکھو نا، تم میرا مطلب ہے کہ اس کو خارج میں کیوں دیکھتے ہو یہ سارا تضاد مشرق اور مغرب کا، یا مواد اور ہیئت کا جو موجود ہے معاشرے میں، یہ آپ کی ذات میں بھی موجود ہے نا، ہم اس مسئلے کو اپنے اندر حل نہیں کر پا رہے ہیں۔ جس روز کوئی اس مسئلے کو اپنے اندر اپنی ذات کے اندر حل کرے گا، وہ اس عہد کی آواز بن جائے گا۔

آصف فرخی: کیا اس کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نظر آتا ہے؟

سلیم احمد: بھئی یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ پیش گوئی کرنا میرا کام نہیں ہے، ادب پر جو میں بات کہہ سکتا تھا۔ وہ میں نے تمہیں بتا دی، آگے کی بات میں نہیں بتا سکتا۔

میری زبانِ آتشیں لَو تھی مِرے چراغ کی
میرا چراغ چُپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

تقاریر

سلیم احمد

شہادت کے موضوع پر چند تقاریر

میرا موضوع شہادت ہے جو ایک عظیم الشان موضوع ہے کیونکہ شہادت کو سمجھنا موت کو سمجھنا ہے اور زندگی کو سمجھنا ہے اور اس زندگی کو سمجھنا ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے بلکہ جسے موت آتی ہی نہیں۔ وہ زندگی جو خدا کے بڑے رازوں میں سے ایک راز ہے ایک ایسا راز جسے انسان سمجھ نہیں سکتا جو اس کے شعور سے ماورا ہے جس کے آگے وہ صرف ایک حیرت زدہ انسان کی حیثیت سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس حیرت کی ابتدا بھی حیرت ہے۔ اور انتہا بھی حیرت ہے۔ جان دینے والے نے جان دی اور حق کے لیے جان دی۔ وہ ہمارے سامنے مر گیا۔ خاک اور خون میں مل گیا مگر وہ زندہ ہے اور رزق پاتا ہے اور اس کو مردہ کہنا منع ہے وہ زندوں سے زیادہ زندہ ہے کیونکہ موت کی بھی دو قسمیں ہیں اور زندگی کی بھی دو قسمیں ایک زندگی ان کی ہوتی ہے جو زندگی میں بھی مردہ ہوتے ہیں۔ ان کی موت بھی مردوں کی موت ہوتی ہے اور دوسری موت ہے جو زندگی ہوتی ہے اور زندہ اس کے راستے سے گذر کر مرتے نہیں اور زیادہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ تب شہادت کے معنی حیات ابدی ہوتے ہیں اور یہ خدا کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انبیا اور صدیقین کے ساتھ شہدا کا بھی ذکر کیا ہے۔ شہادت پر گفتگو کرتے ہوئے میرا مرکزی حوالہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت ہے۔ میرا حوالہ کربلا ہے۔ کربلا ایک واقعہ ہے جو چودہ سو سال پہلے پیش آیا اور واقعات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ واقعہ جو ہوا اور گذر گیا اور دوسرا وہ واقعہ جو ہوا اور قائم رہا۔ ایک واقعہ ماضی میں ہو کر ماضی میں رہ جاتا ہے دوسرا واقعہ زمانے میں سفر کرتا رہتا ہے۔ وہ ماضی سے گذر کر حال بنتا ہے اور حال سے مستقبل بن جاتا ہے۔ تاریخ گذرے ہوئے واقعات کا مجموعہ ہے۔ مگر واقعے کی تاریخ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک مردہ تاریخ اور ایک

زندہ تاریخ ایک وہ تاریخ ہوتی ہے جو گذر جاتی ہے اور بھلا دی جاتی ہے یا صرف مورّخوں کے کام آتی ہے۔ وہ اس کی چیر پھاڑ کرتے ہیں اور پھر دوسرے مورّخ کے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں۔ لیکن زندہ تاریخ کبھی ماضی نہیں بنتی۔ وہ ہر دور میں ہمارے تجربے کا حصہ ہوتی ہے اور ہم اور ہماری زندگی دونوں اس کے حوالے سے بامعنی ہو جاتے ہیں۔ ہم اس کی روشنی میں خود کو دیکھتے اور سمجھتے اور پرکھتے ہیں۔ وہ ہمارے گوشت پوست کا جزو ہوتی ہے اور اگر ہم اسے بھولنا بھی چاہیں تو نہیں بھول سکتے۔ واقعاتی تاریخ وہ ہے جو ماضی کے ساتھ گذر گئی۔ زندہ اور باقی رہنے والی تاریخ علامتی تاریخ ہوتی ہے۔ کربلا علامتی تاریخ ہے۔ ہجرت علامتی تاریخ ہے۔ فتح مکّہ علامتی تاریخ ہے۔ صلح حدیبیہ علامتی تاریخ ہے۔ جس طرح فرد زندگی کے مختلف تجربوں سے گذرتا ہے اسی طرح قومیں بھی مختلف تجربات سے گذرتی ہیں اور اپنے حوالوں سے اپنے تجربات کو سمجھتی ہیں اور نئے تجربات کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ ہجرت ایک عظیم الشان تجربہ ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ حق کی فتح کی طرف پہلا قدم کیا ہے اور فتح مکہ حق کی فتح کا آخری قدم۔ صلح حدیبیہ سے ہم فتح مبین کے معنی سمجھتے ہیں اور کربلا ہمیں بتاتی ہے کہ جب حالات ویسے ہو جائیں جیسے کربلا کے وقت تھے تو اہلِ حق کا فریضہ کیا ہے اس وقت حضور نبیؐ ہوتے تو کیا کرتے۔ اب نبوت کی شان سبطِ نبی کے عمل میں ظاہر ہوتی ہے اور تاریخ کا ایک دور پورا ہو جاتا ہے۔ ہجرت جس کام کی ابتدا تھی اس کی قوسِ صعودی فتح مکہ ہے اور قوسِ نزولی کربلا ان دونوں قوسوں کے ملنے سے وہ دائرہ بنتا ہے جس کا دوسرا نام دینِ حق ہے۔ یہی دائرہ اسلام ہے اور شہادت کو سمجھنا اسی دائرے کی معنویت کو سمجھنا۔

کربلا زندہ تاریخ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کربلا کل بھی کربلا تھی آج بھی کربلا ہے اور کل بھی کربلا ہو گی اور ہم جو اس لمحہ موجود میں سانس لے رہے ہیں تو ہم کربلا کے روبرو ہیں کربلا ہمارے سامنے وجود میں آ رہی ہے۔ امام حسین علیہ السلام ہمارے سامنے مدینے سے سفر کر رہے ہیں۔ ابن زیاد ہمارے سامنے کوفے میں داخل ہو رہا ہے۔ عمرو بن سعد کو ہمارے سامنے رے کی گورنری دی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ صرف ہمارے سامنے نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے اندر بھی ہو رہا ہے۔ کربلا ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ اور باہر بھی ہمیں کربلا کی زندہ تاریخ کو سمجھنے کے لیے اپنے اندر اور اپنے باہر کربلا کی حقیقت کو سمجھنا ہو گا۔ صرف اسی طرح ہم کربلا کو اس کے حقیقی معنی کو سمجھ سکتے ہیں۔ تب ہم کربلا کو ماضی کا کوئی واقعہ نہیں سمجھیں گے

تب ہمیں معلوم ہو گا کہ حسینیت کبھی ماضی نہیں بن سکتی حسینیت ہر وقت لمحہ موجود میں زندہ ہوتی ہے اور ہمارا امتحان لیتی ہے ۔ اور ہمیں آواز دیتی ہے ۔

عزیزان گرامی کربلا سے ہمارا رشتہ صرف اس وقت زندہ رشتہ بن سکتا ہے جب ہم اسے لمحہ موجود میں اپنے اندر اور باہر دیکھیں ۔ اور حسین کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہیں ۔ حسین کو کسی دور میں کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ حق اس بات سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کا ساتھ دیتا ہے یا نہیں ۔ حق جاننے والوں کے لیے چراغ گل کر دیتا ہے ۔ حق کو ہماری ضرورت نہیں ہمیں حق کی ضرورت ہے لہٰذا اس حق کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم باطل کو پہچانیں ۔ نبی کے دور میں باطل کی پہچان آسان ہوتی ہے جس طرح سورج روشنی اور تاریکی کو جدا جدا کر دیتا ہے اس طرح نبی کی ذات حق اور باطل کو الگ الگ کر دیتی ہے ۔ حق نبی کے ساتھ ہوتا ہے اور باطل نبی کی مخالفت کے ساتھ تب ہم نبی کی طرف اپنا چہرہ کر لیتے ہیں جس طرح سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف اپنا رخ کر لیتا ہے اور ہم نبی کے ذریعے پہچان لیتے ہیں کہ باطل کے کتنے روپ ہیں اور وہ کس کس شکل میں ظاہر ہو رہا ہے ۔ شرک ، کفر ، نفاق سب کے چہرے ہمارے لیے جانے پہچانے چہرے بن جاتے ہیں لیکن نبی کے بعد یہ پہچان مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ تب باطل حق کا لباس پہن لیتا ہے وہ کلمہ پڑھتا ہے ۔ اذانیں دیتا ہے ۔ نماز ، روزہ ، حج زکوٰۃ سب پر عمل کرتا ہے مگر اس کے محرکات کچھ اور ہوتے ہیں ۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے قلب مومن نہیں ہوتا اور اہل ایمان کے لیے یہ ایک بڑی کٹھن منزل ہوتی ہے ۔ کربلا اسی کٹھن منزل میں ہماری رہنمائی کرتی ہے ۔ کربلا ہمیں بتاتی ہے کہ رسول کے بعد آل رسول کی کیا حیثیت ہے اور حدیث ثقلین کا کیا مفہوم ہے ۔ نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ لوگو میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ، جب تک ان کا ساتھ دو گے گمراہ نہیں ہو گے ۔ ایک قرآن دوسرا میری عترت یا میری سنت اور روایتوں کے اختلاف کے باوجود دونوں کا مفہوم واحد ہے ۔ کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک صاحب کتاب نہ ہو ۔ ہم کتاب کو صاحب کتاب سے سمجھتے ہیں اور صاحب کتاب کو کتاب سے ۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ۔ ایک طرف کلام ہے دوسری طرف کلیم ایک طرف مجرد تصورات اور اصول ہیں دوسری طرف ان اصولوں کی مجسم تعبیر ہے ۔ ہم کلام سے جو کچھ سمجھتے ہیں صاحب کلام کے ذریعے اس کی تصدیق کرتے ہیں ۔ ضروری ہے کہ یہ تصدیق کا ذریعہ نبی کے بعد باقی رہے ۔ اہل بیت اطہار کا یہی منصب تھا وہ حق کی تصدیق کا ذریعہ ہیں ۔ ان کا حوالہ مصحف ناطق

کا حوالہ ہے۔ نبی کی عترت اور نبی کی سنت میں کوئی فرق نہیں پھر جب ہم نے کربلا کی حقیقت سمجھ لی تو نبی کے بعد کی صورت حال میں حق اور باطل کو الگ الگ پہچان لیا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ حسینیت کس چیز کا نام ہے اور یزیدیت کس چیز کا۔ جاہ و اقتدار، مال و منال، دولت و ثروت حرص و ہوس، بغض و حسد اور فطرت انسانی کے تمام رزائل ہمارے سامنے بے نقاب ہو گئے۔

ہم نے ابن زیاد، عمرو بن سعد اور شمر جیسے لوگوں کو پہچان لیا اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ سب دنیا اور دنیا پرستی کی علامات ہیں اور حق کی علامت حسین علیہ السلام ہیں جو صرف اللہ تعالےٰ کے لیے ہیں اور اللہ تعالےٰ ان کے لیے۔

حق اور باطل کی جنگ کبھی معطل نہیں ہوتی۔ بلکہ موجود ہے ہمارے ارد گرد معرکۂ کربلا آج بھی جاری ہے آج بھی نیک بخت روحیں ایک طرف ہیں اور بد بخت روحیں دوسری طرف۔ رحم خدا ترسی اور عدل پروری ایک طرف ہے اور ظلم، شقاوت اور بے انصافی دوسری طرف۔ کتنے ہیں کہ آیات الٰہی کی تلاوت کر کے حقیر سکوں کے عوض ان آیات کو فروخت کر رہے ہیں کتنے ہیں کہ روشن چہروں کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں مگر ان کے دل تاریک ہیں اور حق و باطل کا یہ تضاد ہمارے اپنے گھروں، ہمارے اپنے محلوں، ہمارے اپنے شہروں سے لے کر دنیا کے بعید ترین خطوں تک پھیلا ہوا ہے۔ دیکھو تمہارے ملک میں کیا ہو رہا ہے اور ملت اسلامیہ جس کو خدا نے امت وسط بنا کر لوگوں پر گواہ کیا تھا۔ وہ ادبار اور نکبت کی کس پستی میں ہے۔ خلق خدا دن رات ظلم کی چکی میں پسی جا رہی ہے اور کوئی نہیں ہے جو مظلوم انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھے۔ ہر طرف حرص و ہوس خوف اور لالچ کے بت پوجے جا رہے ہیں۔ تاریکی موج در موج روشنی پر یلغار کر رہی ہے اور صبح کے آثار کہیں نہیں۔ دنیا کو قیصر و کسریٰ کی طرح سپر پاورز نے آپس میں بانٹ لیا ہے اور خلق اللہ کو بھیڑ بکریوں کی طرح خریدا اور فروخت کیا جا رہا ہے۔ امت مسلمہ جس کو اس عالم میں حق کی شہادت کے لیے کھڑا ہونا تھا وہ خود کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی روس کے ساتھ ہے، کوئی امریکہ کے ساتھ، کوئی فرانس اور برطانیہ سے گٹھ جوڑ کر رہا ہے۔ کوئی اسرائیل کے ساتھ۔

اس عالم میں کربلا کی زندہ تاریخ کے سوا کون سی چیز ہے جو اہل حق کی رہنمائی کر سکے جو انہیں بتا سکے کہ اس ماحول میں انہیں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ حسین علیہ السلام کے سوا اور کون ہے جس کا دامن پکڑ کر ہم اس ماحول میں حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ ہمیں معلوم ہے یہ بدر کی صورت حال نہیں ہے۔ خندق اور خیبر کی صورت حال بھی نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے فتح مکہ کی صورتحال

بھی ہم سے دور ہے۔ عزیزان گرامی ہم اس وقت کربلا اور صرف کربلا کی صورت حال میں ہیں اور اسی لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم شہادت حسین کو سمجھیں۔ ہم سمجھیں کہ ہمارا پہلا مقابلہ ان سے ہے جو ظاہر میں ہمارے جیسے ہیں کیا میں ان کے نام آپ کو بتاؤں کیا میں ان کی علامتیں آپ پر ظاہر کروں۔ یہ وہی ہیں جن کے دل دنیا کی متاعِ قلیل کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے حیاتِ دنیا کے لیے حیاتِ آخرہ سودا کیا اور اللہ کی آیات کو سستے داموں بیچ رہے ہیں بلکہ انہیں اپنے اعمالِ بد کا زینہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہم شہادت حسین کو سمجھیں گے تو خدا ہمیں اس صورت حال کے معنی سمجھائے گا۔ اور ہمیں صبر کی قوتوں سے مسلح کرے گا اور ہمیں بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار کرے گا۔ شہادت حسین کو سمجھ کر ہم اپنے فرض کو سمجھیں گے۔ فرض کو نہیں اپنے حق کو سمجھیں گے اور مومن کا اس سے بڑا حق اور کوئی نہیں ہے کہ وہ خود کو مومن ثابت کرے اور اپنے ایمان پر اپنی جان کی گواہی پیش کرے یہی مقام شہادت ہے۔

عزیزان گرامی ہر چیز کا ایک جوہر ہوتا ہے اور یادِ حسین کا بھی ایک جوہر ہے اور جس چیز کا جوہر ضائع ہو جاتا ہے وہ صرف ایک صورت رہ جاتی ہے، رسم بن جاتی ہے اور رسم ہو کر کلچر کا جزو ہو جاتی ہے اس طرح رسم میں بھی ایک معنی پیدا ہو جاتے ہیں وہ تہذیبی یا ثقافتی شناخت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لیکن مذہب شناخت سے کچھ زیادہ ہے اور اسی لیے ہر ثقافت کا جوہر اس کا مذہب ہوا کرتا ہے۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ یادِ حسین ایک مذہبی عمل کی حیثیت سے کیا ہے اور ثقافتی عمل کی حیثیت سے کیا ہے۔ ثقافتی عمل سے اگر مذہبی روح کو نکال دیا جائے تو ثقافتی عمل بھی باقی نہیں رہتا جس طرح روح کے نکل جانے کے بعد جسم گل سڑ جاتا ہے اسی طرح مذہب کے بغیر ثقافت بھی ایک جسدِ بے روح بن جاتی ہے یادِ حسین کا جوہر عمل ہے اور عمل کی مختلف منزلیں ہیں اور مختلف درجے ہیں۔ اگر آپ سچ بولتے ہیں تو یہ بھی اسوۂ شبیری کا ایک درجہ ہے، اگر آپ لوگوں کو ان کے حقوق دیتے ہیں تو ایک درجہ اسوۂ شبیری کا یہ بھی ہے اور اگر آپ سلطانِ جابر کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہیں تو یہ بھی اسوۂ شبیری کی پیروی کا ایک مقام ہے اور ان مقامات پر پہنچنے اور ان پر قائم رہنے میں جو تکلیفیں ہوتی ہیں اور جو مصائب آتے ہیں ان پر صبر کرنا بھی اسوۂ شبیری کا ایک زینہ ہے۔ اس طرح عمل، صبر اور شہادت ایک ہی سفر کی تین منزلیں ہیں۔ ہم جب حسین علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یادِ حسین کو صرف رسمی طور پر منا کر ہم اسوۂ شبیری کا حق ادا نہیں کرتے ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے عمل کے بہترین

نمونے موجود ہیں مگر ہم نے ان کی یاد کو صرف ثقافت کی حیثیت سے برقرار رکھا ہے اور مذہب کے تقاضوں کو ہم بھول گئے ہیں۔

○

عزیزانِ گرامی!

جب ہم کسی چیز کو مجرد طور پر دیکھتے ہیں تو اس کی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے لیکن جب اُسے ہم اپنی ذات کے حوالے سے سمجھتے ہیں تو وہ ہمارے لیے کچھ اور بن جاتی ہے۔ ہماری ذات، ہمارا ماحول، ہمارا زمانہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ہم سے قریب ترین تعلق رکھتی ہیں۔ ہم انہی حوالوں سے صرف پہچانے جاتے ہیں بلکہ وجود میں آئے ہیں اس لیے اپنی پہلی تقریر میں میں نے شہادت پر جو گفتگو کی اس میں یہ بیان کرنے کی کوشش نہیں کی کہ شہادت کے معنی کیا ہیں، شہادت کی تاریخ کیا ہے اور امام حسین علیہ السلام شہید ہوئے تو کن حالات میں ہوئے اور ان کی شہادت کے کیا نتائج برآمد ہوئے اور ہم اس شہادت سے کیا سبق سیکھتے ہیں۔ میں نے یہ فرض کر لیا کہ یہ باتیں آپ کو معلوم ہوں گی اور نہ ان کے اعادے کی ضرورت ہوگی نہ یاد دہانی کی۔ اس تقریر میں میں نے صرف یہ کہنے کی کوشش کی کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت بالخصوص اور شہادت کی روایت بالعموم موجودہ حالت میں ہمارے لیے کیا معنی رکھتی ہے اور کس طرح ہم اپنی صورتِ حال میں اس روایت کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے دین کے ان تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں جن میں ہمارے لیے اخروی سعادت بھی ہے اور دنیاوی نجات بھی۔ لیکن اس تقریر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مجھ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان چیزوں پر بھی گفتگو کروں جنہیں میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آج بات یہیں سے شروع کی جائے۔

شہادت کے معنی ہیں گواہی۔ یقینی خبر کو بھی شہادت کہتے ہیں۔ شہادت کے ایک معنی قسم کے بھی ہیں اور عالمِ غیب کے مقابل پر عالمِ ظاہر کو بھی شہادت کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شہادت کے معنی اللہ کی راہ میں جان دینے کے بھی ہیں۔ شہید کے معنی ہیں حاضر، سچا گواہ، وہ جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو اور اللہ کی راہ میں جان دینے والا۔ شہادت کے تمام معنی باہم مربوط ہیں۔ شہادت عالمِ ظاہر میں، عالمِ غیب کی سب سے بڑی علامت ہے اور اس بات کی سب سے سچی گواہی ہے کہ مومن کے لیے سب سے بڑی چیز سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی ہے اور یہ گواہی اندھی گواہی نہیں ہے

یہ ایک بہت بڑے علم کا حصہ ہے۔ یہ گواہی جان بوجھ کر دی جاتی ہے علم کے ساتھ دی جاتی ہے اور وہ علم ہمارے حواسی اور عقلی علم کی طرح غیر یقینی نہیں ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کی بنیاد ایک یقینی خبر پر ہے۔ یعنی وحی الٰہی پر۔ شہید بیک وقت ان سب چیزوں کا امین ہوتا ہے اور اپنی ذات سے ان پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اب شہادت کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی جہاد پر گیا اور اسے شہادت نصیب ہوئی یعنی شہادت اس کے علم اور ارادے کا حصہ نہیں تھی۔ جہاد پر جانے والا ہر آدمی شہید نہیں ہوتا اور اس بات کا کھلا ہوا امکان موجود ہوتا ہے کہ وہ زندہ واپس آجائے۔ وہ یقینی علم کے ساتھ شہادت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ شہادت اس کے لیے ایک امکان ہوتی ہے ایک ایسا امکان جو پورا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی تو ایسی شہادت کو بھی ہم شہادت کہتے ہیں لیکن شہادت کی دوسری قسم شہادت کے یقینی علم کے ساتھ ہے۔ اب شہادت ایک امکان نہیں ہوتی ایک یقینی امر ہوتی ہے۔ اور شہید پہلے سے اس کے لیے تیار ہوتا ہے اس کا ارادہ کرتا ہے۔ شہادت کی یہ دوسری قسم ہے اور پھر اس کے بھی مدارج ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ پوری شہادت اس کا نام ہے کہ آدمی مسافری اور مشقت میں مارا جائے اس کے گھوڑے کی کوچیں کاٹی جائیں اور اس کی لاش میدان میں پڑی رہے اور اس کے گرد اگرد بہت لوگ دوستوں اور قرابتوں سے مارے جائیں اور اس کا مال لوٹا جائے اور اس کی بیویاں اور یتیم لڑکے قید میں گرفتار ہوں اور یہ سب مصیبتیں صرف اللہ کے واسطے ہوں۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت یقینی علم کی بنا پر تھی اور وہ شہادت تھی جسے شاہ عبدالعزیز نے پوری شہادت کہا ہے اور شہادت کی یہ تمام فضیلتیں امام حسین علیہ السلام کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئیں۔ یہ پوری شہادت ہے اور اس کے مقابلے پر تمام شہادتیں جزوی شہادتیں ہیں۔

عزیزان گرامی اس گفتگو کے بعد میں شہادت کی حقیقت کے بارے میں ایک اور زاویے سے گفتگو کروں گا۔ یہ بات ہمارے سامنے موجود ہے کہ ہر زندہ چیز اپنی زندگی کی حفاظت کرتی ہے جس طرح کائنات کی ہر شے کا ایک وظیفہ فطری ہے اس طرح زندگی کا وظیفۂ فطری اپنی حفاظت اور حیات ہے۔ زندگی پیدا ہونے ہی خود تحفظی کے عمل میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی سانس لیتا ہے۔ اور غذا کا طالب ہوتا ہے اس کے تمام اعضا اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ زندگی کی حفاظت کریں اور اس عمل میں زندگی کے معاون ثابت ہوں، خون کی گردش، سانسوں کی آمد و شد، دل کی حرکت سب کا مقصد زندگی کا قیام ہے۔ اب زندگی دو طرح اپنی حفاظت کرتی ہے ایک طرف وہ اپنا تحفظ فرد میں کرتی

ہے اور دوسری طرف نوریا میں ہم دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں جو کچھ جانتے ہیں ہماری تمام ضروریات و اختیارات، وہ سب زندگی کے اسی تقاضے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسان زندگی کے اسی تقاضے کے تحت غذا، لباس، مکان اور دیگر ضروریات کی طلب کرتا ہے۔ اور یہ طلب اس کے مقاصد میں اوّلین درجہ رکھتی ہے۔ اب زندگی کی حفاظت ایک تو مادی ماحول اور مادی ذرائع سے ہوتی ہے اور دوسرے اس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اسے روحانی تحفظ حاصل ہو وہ کائنات میں صرف مادی تحفظ نہیں چاہتا مابعد الطبیعیاتی تحفظ بھی چاہتا ہے۔ انسان کے تمام عقائد، نظام ہائے فکر اور آفاقی اور کائناتی تصورات اسی ضرورت کے تابع ہوتے ہیں۔ ہم بچے کو جب یہ سکھاتے ہیں کہ وہ سچ بولے یا اخلاق پر عمل کرے یا اعلیٰ کردار کا ثبوت دے تو اسے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس سب کا نتیجہ اس کے حق میں خیر ہوگا ہم کہتے ہیں خدا حق کے ساتھ ہے، ہم کہتے ہیں ہم حق پر رہیں گے تو خدا ہماری مدد کرے گا، ہم کہتے ہیں کہ حق کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ یہ سب اسی کائناتی تحفظ کے اشارے ہیں اور ایک مسلمان بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو ہم غذا سے بھی پہلے اس کے کان میں اذان دیتے ہیں اور اللہ کی بڑائی کا اعلان کرتے ہیں یہ بچہ بڑا ہو کر اس کائناتی تحفظ کے ساتھ زندہ رہتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ تحفظ اس کے مادی تحفظ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہر مذہب اور ہر عقیدہ اسی کائناتی اور مابعد الطبیعیاتی تحفظ کی بنیادی انسانی ضرورت کو پورا کرتا ہے اس تحفظ کے بغیر انسان بامعنی طور پر زندہ نہیں رہ سکتا لیکن مذہب اس معنی سے ایک بڑے معنی کی تخلیق کرتا ہے اور وہ معنی یہ ہیں کہ زندگی تحفظ کی ضرورت سے آزاد ہو جائے یعنی زندگی کے فطری وظیفے میں ایک ایسی تبدیلی پیدا ہو اور اس کی اس طرح قلب ماہیت ہو جائے کہ خود تحفظی کے بجائے رضائے الٰہی اس کا مقصود بن جائے۔ یہ اعلیٰ ترین مقصد اسلام میں شہادت کے تصور کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ شہید جانتا ہے کہ اسے کوئی مادی تحفظ حاصل نہیں، حالات اس کے خلاف ہیں، ماحول اس کا دشمن ہے کوئی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے پاس نہ لشکر ہے نہ سپاہ، نہ جنگی ساز و سامان اور نہ کوئی اور قوت، اس کے بعد اس کے پاس صرف ایک سہارا ہے۔ کہ خدا اس کے ساتھ ہے، خدا اس کی مدد کرے گا، خدا حق کا ساتھ دے گا۔ یہ وہ کائناتی تحفظ ہے جو اس کی آخری امید ہے۔ مگر شہید رضائے الٰہی کے لیے اس آخری سہارے سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے اور اس خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سربسجود ہوتا ہے جس کی مشیت جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ شہادت کے معنی اس مشیت کے آگے سر جھکانا ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ ذات باری تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے اور بندے کا کام صرف اس کی اطاعت ہے۔ امام حسین علیہ السلام

نے سفر کربلا میں ایک خواب دیکھا کہ کہنے والا کہتا ہے کہ جانے والے جارہے ہیں اور موت ان کے تعاقب میں ہے۔ یہ امام کا خواب تھا اور امام کا خواب، خواب نہیں ہوتا واقعہ ہوتا ہے۔ ہمارے آپ کے واقعات لئے حقیقی نہیں ہوتے جتنا حقیقی امام کا خواب ہوتا ہے۔ امام حسینؑ نے جب یہ خواب بیان کیا تو حضرت علی اکبر نے وہ سوال کیا جو صرف ایک امام زادہ ہی کر سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ بیشک ہم حق پر ہیں۔

عزیزان گرامی امام عالی مقام صرف حق پر نہیں تھے بلکہ خود حق تھے۔ حق ان کی ذات میں مجسم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود مشیت الٰہی یہ تھی کہ موت ان کے تعاقب میں ہو اور کربلا کی زمین ان کے خون سے سیراب ہو اور وہ اپنے رب کی اس مشیت پر راضی تھے یہی شہادت اعلیٰ کا وہ مقام ہے جو امام عالی کو حاصل ہوا۔ تب زندگی اپنے عارضی اور آنی و فانی تحفظ سے دست بردار ہو کر زندگی جاوید کے لیے تیار ہو گئی اور امام عالی مقام نے ہم پر یہ راز کھول دیا کہ جب تک زندگی اپنے تحفظ کے اس دائرے سے باہر نہیں نکلتی اس وقت تک وہ حقیقی معنوں میں زندگی نہیں بنتی۔ شہادت انسانیت کبریٰ کا وہ مقام ہے جہاں انسانیت معرفت حق کی اعلیٰ ترین منزل کو طے کرتی ہے۔ اور حق کو صرف حق کے واسطے سے پہچانتی ہے۔ نماز عصر کا ہنگام ہے۔ سارے رفقاء شہید ہو چکے ہیں۔ بھانجے بھتیجے بھائی اور بیٹے کام آچکے ہیں۔ جسم مبارک زخموں سے چور ہے۔ دشمن ہجوم کیے ہوتے ہیں امام کی حجت پوری ہو چکی ہے اور دنیاوی معنوں میں کوئی امید باقی نہیں۔ اب حق کے مشیت کے ظاہر ہونے کا لمحہ ہے، یہ مشیت شہادت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ مشیت یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام شہید ہوں، زمین ان کے خون سے سرخ ہو ان کے جسد مبارک کو گھوڑوں سے روندا جائے۔ ان کی بیبیوں کو قید کیا جائے ان کے خیموں میں آگ لگائی جائے ان کے تنہا وارث کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ امام حسین علیہ السلام یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ بے شک اللہ بہت بڑا ہے۔ بے شک اللہ بہت بڑا ہے اور امام سجدہ آخر میں اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ سر کا یہی جھکانا، یہی سجدۂ آخر وہ مقام ہے جہاں خود شہادت بھی اپنی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ شہادت تسلیم و رضا کا آخری معیار ہے۔ امام نے یہ سجدۂ آخر ادا کیا، وعدہ کی تکمیل ہو گئی، اور بقول شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اس شہادت سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے اس وصف کی تکمیل ہو گئی جس کے لیے مشیت الٰہی یہ تھی کہ وہ ان کی ذات کے بجائے ان کے نواسے کے ذریعے انہیں حاصل ہو۔ امام نے سجدہ کیا اور حق و باطل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ الگ ہو گئے۔ وہ لوگ جو مادی تحفظ کے سہاروں میں گرفتار تھے وہ

ایک طرف تھے اور امام دوسری طرف۔ دنیا نے دیکھا کہ دولت جاہ و حشم، لشکر و سپاہ، طبل و علم ہر وہ چیز جس کی طرف زندگی دوڑتی ہے۔ حسین کے سجدۂ آخر سے شکست کھا گئی۔

عزیزان گرامی!

انسان زندگی کی محبت میں گرفتار ہے کیونکہ زندگی خود سے محبت کرتی ہے۔ ہم زندگی پرست ہیں اور زندگی زندگی پرست ہے۔ اس لیے ہم زندگی کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہمارا پورا وجود، ہمارے جسم کا ذرّہ ذرّہ زندگی زندگی پکار رہا ہے اور یہ پکار خود زندگی کی پکار ہوتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس پکار سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ موت ہے۔ موت زندگی کی آواز بازگشت ہے اور ہر چیز سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ شہید زندگی سے نہیں رضائے الٰہی سے محبت کرتا ہے۔ اور رضائے الٰہی کے لیے اپنی جان قربان کرتا ہے اور اس کے لیے موت کو گلے لگاتا ہے۔ ہماری زندگی سے موت پیدا ہوئی تھی۔ شہید کی موت سے زندگی پیدا ہوئی ہے۔ ہزاروں سلام ہیں ان شہداء پر جنہیں یہ زندگی مل گئی جو حیات کی محبت سے نکلے اور حیّ کے ساتھ ہو گئے اور حی نے انہیں ایسی حیات سے سرفراز کیا جس کی کوئی ضد نہیں، جو موت سے بے نیاز ہے جس کا سجدۂ آخر حیات کے لیے نہیں، حی کے لیے ہے۔

○

آج میرا موضوع نفس مطمئنہ ہے اور چونکہ میرا مرکزی حوالہ شہادت ہے اس لیے آج ہم نفس مطمئنہ اور شہادت کے تعلق پر گفتگو کریں گے یعنی یہ دیکھیں گے کہ نفس کی وہ کیا کیفیات ہیں جو اپنا اظہار شہادت میں کرتی ہیں اور شہید اپنے عمل شہادت سے اپنے نفس کے بارے میں ہمیں کیا بتاتا ہے پچھلی دفعہ ہم نے شہادت کو تحفظ حیات کے نقطہ نظر سے بیان کیا تھا ہم نے دکھایا تھا کہ حیات فطری طور پر اپنا تحفظ چاہتی ہے اور تمام انسانی اعمال کا مقصد حیات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن شہید حیات کے بجائے "حیّ" کو اپنا مقصود بناتا ہے۔ شہید حیات کی بقا کے بجائے رضائے الٰہی کے لیے عمل کرتا ہے۔ اور اس طرح خود حیات سے بلند ہو جاتا ہے اس کی زندگی اور موت دونوں رضائے الٰہی کے لیے وقف ہوتی ہیں اور یوں وہ حیات کے مقاصد سے ایک بلند تر مقصد کی تکمیل کرتا ہے آج ہم یہ دکھائیں گے کہ بنیادی نفسی کیفیت میں انسان کیا ہوتا ہے اور شہادت کے لیے اُسے کس کیفیت سے کتنا اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ ایک بچے کو دیکھیے وہ فطری انسان کا سب سے سادہ

اور سب سے نمائندہ مظہر ہے۔ وہ جبلی محرکات اور خواہشات کا ایک سیماب صفت برق پارہ ہوتا ہے۔ ہر لمحہ اس کے وجود کی گہرائیوں سے خواہشوں اور آرزوؤں کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور وہ ان لہروں پر ایک تنکے کی طرح تیرتا رہتا ہے۔ یہ خواہشات اور آرزوئیں نظم و ضبط سے خالی ہوتی ہیں ان میں کوئی تنظیم نہیں۔ آپ انہیں ترتیب نہیں دے سکتے اور نہ کسی نظام کے تحت لا سکتے ہیں۔ وہ باہم متضاد اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں وہ ایک وقت ایک چیز چاہتا ہے۔ دوسرے وقت دوسری چیز۔ لمحہ لمحہ وہ بدلتا رہتا ہے اور اس کے وجود میں کوئی ایسا مرکز نہیں ہوتا جو اس کی خواہشات کو کنٹرول کر سکے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب آپ اسے معاشرتی تنظیم کے دائرے میں داخل کرتے ہیں۔ آپ اسے اخلاق و آداب سکھاتے ہیں۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ وہ اُن میں سے کچھ باتوں کو قبول کرتا ہے اور کچھ کو رد کرتا ہے۔ اب اس میں ایک سماجی وجود پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سماجی وجود، خوف اور ترغیب سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک خول کی طرح اس کے فطری وجود کے اوپر مسلط ہو جاتا ہے۔ لیکن تنظیم کو قبول کرنے کے باوجود اس کے نفس کا تضاد اور انتشار کم نہیں ہوتا وہ ایک سماجی وجود اختیار تو کرتا ہے مگر اس کی حیثیت صرف ایک مصنوعی چہرے کی ہوتی ہے۔ سماجی وجود کے ذریعے وہ دوسروں کی مرضی کے مطابق رہنا بسنا سیکھتا ہے۔ ریاکاری منافقت، جھوٹ اور اخفا اس کے وجود کے لازمی حصے ہوتے ہیں وہ اپنے اندر سے کچھ اور ہوتا ہے اور اپنے باہر سے کچھ اور —— اور لطف یہ ہے کہ اسے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا —— وہ اپنے تضاد سے ناواقف ہوتا ہے اور خود اپنے اعمال کے محرکات کو سمجھنے کے ناقابل ہوتا ہے۔ یہ ہمارے سماجی وجود کی عام حالت ہے دنیا کے کروڑوں انسان اسی حالت میں رہتے ہیں۔

کہیں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس حالت سے آگے ترقی کرتے ہیں ان میں کسی طرح اپنے تضاد کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی دورخی اور دورنگی کو جان لیتے ہیں ان میں یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کے دکھانے کے دانت کچھ اور ہیں اور کھانے کے کچھ اور ہیں۔ یہ سماجی وجود کے اندر ایک نئے وجود کی پیدائش کا لمحہ ہے۔ اب ان میں ایک اخلاقی وجود پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن میں اپنے تضاد کے احساس سے شرمساری اور ملامت کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اپنے ظاہر اور باطن کے فرق کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ شعور ان کے لیے ایک بڑی گہری اذیت کا سبب بن جاتا ہے رسماتی طور پر نفس کی اس کیفیت کو "نفس لوّامہ" کی اصطلاح میں بیان کیا جاتا ہے۔ فطری انسان کا نفس نفس امارہ کہلاتا ہے —— اسی نفس امارہ سے نفس لوامہ کی پیدائش ہوتی ہے اور انسان اپنے

اخلاقی وجود کو حاصل کرتا ہے۔ لیکن اخلاقی وجود تضاد کا احساس تو پیدا کر دیتا ہے مگر تضاد کو رفع نہیں کرتا اسے رفع کرنے کے لیے ایک قدم اور آگے اٹھانا پڑتا ہے۔

عزیزان گرامی! جب ہم خود آگاہی کے اس لمحے میں داخل ہونے میں رجب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے وجود کی عمیق ترین تہوں میں وہ کون سی چیز ہے جو ہمارے اعمال کی محرک ہے دوسرے لفظوں میں جب ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ہم حقیقی معنوں میں کیا ہیں تو اخلاقی وجود سے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اسلامی اصطلاحوں میں "نفس مطمئنہ" اس خود آگاہی سے پیدا ہوتا ہے جو انسان پر اس کی حقیقت کو کھول دے محی الدین ابن العربی کے الفاظ میں آدمی اپنے عین ثابتہ کو پہچان لیتا ہے۔ اب عین ثابتہ کیا ہے وہ صورت ہے جو علم الٰہی میں محفوظ ہے ـــــ میں اس کی تشریح میں کچھ بہت زیادہ مشکل مسائل میں نہیں الجھوں گا میں صرف اتنی بات کہوں گا کہ ہر انسان کا ایک جوہر ذات ہوتا ہے جو اس کے منشائے تخلیق میں شامل ہوتا ہے کہ ایک ایسی منفرد، یکتا، ناقابل تقسیم، ناقابل تجزیہ اکائی ہے جسے ہم صرف ایک ایسے تعین سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو کبھی دہرایا نہیں جا سکتا۔ جس کی تکرار ناممکن ہے۔ صوفیہ اسے "تجلی" کہتے ہیں اور تجلیات الٰہیہ کا کوئی شمار نہیں ہے۔ ہر انسان ایک "تجلی" کا مظہر ہے اور وہی تجلی اس کا رب ہوتی ہے وہ اسے پیدا کرتی ہے، عدم سے وجود میں لاتی ہے اسے پروان چڑھاتی ہے اور وقت معینہ تک اس کی حفاظت کرتی ہے۔ خود آگاہی کا عمیق ترین تجربہ یہ ہے کہ انسان اس تعین کو اپنے جوہر ذات کو تجلی الٰہی کو اپنے رب کو جانے، مولائے کائنات حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "جس نے اپنے نفس کو جانا اس نے اپنے رب کو جانا"[1] اور یہی جاننا وہ فریضہ ہے جس کو ادا کرنے کے بعد ہی انسان نفس مطمئنہ کو حاصل کر سکتا ہے، انسان جب اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اس کا رب اس سے کہتا ہے کہ "تو میرے بندوں میں داخل ہو جا میری جنت میں داخل ہو جا اب تیرا رب تجھ سے راضی ہو گیا اور تو اپنے رب سے راضی ہو گیا۔"

عزیزان گرامی! جس انسان کو یہ معرفت حاصل ہو گئی وہ نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہو گیا اب اس کا وجود مشیت حق کا آئینہ بن گیا اب وہ صرف اپنے رب کا بندہ بن گیا اور اس کا رب اس سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گیا۔ ایسے انسان کا ہر عمل مستند عمل ہوتا ہے اب وہ حق پر عمل نہیں کرتا خود حق بن جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اس کی زبان اللہ کی زبان بن جاتی ہے اس کا کلام اللہ کا کلام بن جاتا ہے ـــــ نفس مطمئنہ معرفت کا اعلیٰ ترین مقام ہے اور شہید کو یہ معرفت اپنے عمل شہادت میں حاصل ہوتی ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ جاننا

[1] بعض اہل علم اس قول کو ذوالنون مصریؒ سے منسوب کرتے ہیں (ادارہ)

ہے کہ وہ کیا ہے کون ہے اس کی تقدیر کیا ہے اس کا رب کون ہے اور اس رب کی مشیت کیا ہے۔ اور پھر وہ اس معرفت کے ساتھ اپنی تقدیر کو اور مشیت الٰہی کو قبول کرتا ہے۔ امامؑ نفس مطمئنہ کے اس مقام پر فائز تھے جہاں تقدیر الٰہی ان کی کیفیات نفس کا نام بن جاتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ وہی تھا جو حق نے ان کی زبان پر جاری کیا تھا وہ وہی کرتے تھے جو حق نے ان سے چاہا اور جس کا ان کے رب نے حکم دیا —— اور کہنے اور کرنے کے اس عمل میں انہیں نہ کوئی خوف تھا نہ کوئی حزن تھا نہ کوئی ملال تھا نہ کوئی اضطراب نہ کوئی تشویش، جس طرح سورج سے روشنی پھوٹتی ہے اسی طرح ان کا عمل ان کے وجود سے ظاہر ہوا اور یہی وہ عمل تھا جو اہل حق کے لیے خود حق کے عمل کی مثال بن گیا۔ امام حسینؑ نے ایک مرتبہ مدینے کے گورنر سے کہا "مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں کوئی کام چھپا کر کروں"۔ امام حسینؑ نے جو کچھ کیا وہ ان کا ظہور تھا۔ حق ان پر ظاہر ہوا اور وہ خلق پر ظاہر ہوئے اور ان کے ظہور میں حق کے سوا اور کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ گھوڑے سے سجدۂ آخر تک امام کا سفر اسی جوہر کا سفر تھا جو ظاہر ہوتا ہے تو اللہ کی آیات میں سے ایک آیت بن جاتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں ایک معجزہ ہو جاتے ہیں۔ تب ہم اللہ کی نشانیوں کو جان لیتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کی آخری منزل کیا ہے اور وہ کون سا مقام ہے جہاں عبد اور رب ایک دوسرے سے راضی ہو کر ایک دوسرے کے شریک کار ہو جاتے ہیں۔

شہادت ایک عمل ہے اور ہر عمل کے کچھ محرکات ہوتے ہیں اور عمل کو جاننے کے لیے اس کے محرکات کو جاننا پڑتا ہے کیونکہ محرکات ہی ہیں جو اس کے جوہر کو متعین کرتے ہیں۔ محرکات اچھے ہوں تو عمل اچھا ہوتا ہے۔ محرکات برے ہوں تو عمل برا۔ کچھ لوگ محرکات کے بجائے نتائج پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عمل اپنے نتیجہ سے پہچانا جاتا ہے جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ بات ایک معنی میں درست ہے اور ایک معنی میں غلط۔ ہر عمل کے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک دنیا میں دوسرا آخرت میں۔ آخرت میں جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ محرکاتِ عمل یا نیاتِ عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دنیاوی نتائج ہمیشہ نیاتِ عمل کے مطابق نہیں ہوتے۔ بعض اوقات اچھی نیت سے خراب نتیجہ پیدا ہوتا ہے بعض اوقات خراب نیت سے اچھا نتیجہ۔ اس لیے اگر نتائج سے مراد اخروی نتائج ہیں تو یہ بات درست ہے کہ وہ کام اچھا ہے جس کے نتائج اچھے ہوں لیکن اگر نتائج

سے دنیاوی نتائج مراد ہوں تو یہ کلیہ درست نہیں ہے۔ کلیہ یہ ہے کہ عمل کا جوہر ہمیشہ نیت سے متعین ہوگا۔ یہی وہ جوہر ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا ـــــ شہادت صرف جان دینے کا عمل نہیں ہے، جان لوگ بہت سی چیزوں کے لیے دیتے ہیں ۔ دولت کے لیے، شہرت کے لیے، ملک و قوم کے لیے۔ خود کے لیے، یہاں تک کہ خودکشی کرنے والا بھی جان دیتا ہے۔ اسی لیے جان دینے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ کس کے لیے جان دی گئی ہے اور جان دینے والے کی نیت کیا ہے شہادت کے معنی ہیں حق کے لیے جان دینا۔ رضائے الٰہی کے لیے جان دینا۔ یہ نیت ہی شہادت کا جوہر ہے۔ بس جو عمل اس نیت کے مطابق ہے وہ خیر ہے، کربلا بھی خیر ہے اور کربلا سے پہلے خاموشی بھی خیر ہے اور کربلا میں امام کا یہ قول بھی خیر ہے کہ مجھے واپس جانے دو یا مجھے یزید کے پاس بھیج دو یا جہاد کے لیے سرحدوں پر نکل جانے دو۔ اس راہ میں امام نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا سب کا سب خیر ہے کیونکہ سب کی نیت ایک ہے۔ رضائے حق۔ امام کو معلوم ہے کہ دشمن کی نیت کیا ہے۔ امام کو معلوم ہے کہ دشمن ان کے کسی عمل کی وجہ سے ان کا دشمن نہیں ہے۔ دشمن کے لیے ان کا وجود ہی دشمنی کی بنیاد ہے کیونکہ شر کے لیے خیر کی موجودگی سب سے بڑا خطرہ ہے۔ خیر موجود رہے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے۔ امام شر کی اسی حقیقت کو کھولنا چاہتے ہیں۔ وہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دیکھو شر ان کی کسی شرط پر راضی نہیں شر صرف یہ چاہتا ہے کہ یا تو خیر کو اپنے تحت لے آئے، اُسے ایسا بنا دے کہ شر سے صلح کر لے، اس کا شریک کار بن جائے یا پھر یہ چاہتا ہے کہ خیر کو مٹا دے۔ امام شر کی اس نیت کو چاہتے ہیں کہ رہتی دنیا تک کے لیے اُسے برہنہ کر دیں کربلا میں شر اور شر کی نیت کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے اس نیت کو کلمہ پڑھ کر مسلمانوں میں شامل ہو کر مسلمانوں کی وضع قطع بنا کر چھپایا گیا۔ اُسے چھپانے کے لیے اذانیں دی جاتی تھیں، نمازیں پڑھی جاتی تھیں، حج کیے جاتے تھے۔ زکوٰۃ دی جاتی تھی مگر یہ سب عمل دکھاوا ہی دکھاوا تھے۔ ان کی بنیاد میں شر تھا اور یہ شر کا حجاب تھے شر نے اپنے چہرے پر ایمان کا، اسلام کا، خیر کا نقاب ڈال دیا تھا۔ امام نے اپنے عمل سے شر کے چہرے کو بے نقاب کر دیا اور دکھا دیا کہ شر کا حقیقی چہرہ کیسا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کربلا اقتدار کی جنگ تھی اس جنگ میں ایک فریق ہار گیا دوسرا جیت گیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے نیت کی حقیقت کو نہیں جانا۔ کربلا اقتدار کی جنگ تھی تو کیا مدینہ میں اقتدار کی جنگ نہیں ہوئی، کیا خیبر و خندق اقتدار کی جنگیں نہیں تھیں، کیا مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا ہر عمل اقتدار کے لیے نہیں تھا۔ بے شک کربلا اقتدار کی جنگ تھی، جس طرح رسول کریم کی جنگیں

اقتدار کی جنگیں تھیں، مگر اقتدار کس کے لیے۔ اللہ کے لیے، دینِ حق کو غالب کرنے کے لیے حدود اللہ کے نفاذ کے لیے۔ عدل و احسان کے قیام کے لیے معروف کے حکم اور منکر کے استیصال کے لیے وہ جنگ جو حق کو غالب کرنے کے لیے ہوتی ہے اسے اقتدار کی جنگ نہیں کہتے اسے حق کی جنگ کہتے ہیں اور اس جنگ کا نتیجہ کبھی فتح مبین ہوتی ہے اور کبھی شہادتِ عظمیٰ اور دیکھو اقتدار کی یہ جنگ کیسی ہے جو بہتر نفوس کے ساتھ لڑی جا رہی ہے۔ اور کیسی جنگ ہے کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ اور ان کے درمیان ہے اور اسی جنگ کے مجاہدوں کو دیکھو کہ اس میں شیرخوار بچوں کو میدان میں لایا جا رہا ہے۔ کیا تم انسانیت کی تاریخ میں اقتدار کی ایک ایسی جنگ کی مثال پیش کر سکتے ہو۔

بے شک امام حسین علیہ السلام نے حق کے غلبہ کے لیے جنگ کی اور جنگ کی تمام مصلحتوں کو پورا کیا۔ انہوں نے سکوت کے وقت سکوت کیا اور کلام کے وقت کلام۔ انہوں نے اہلِ کوفہ کی طاقت کو جانچنے کے لیے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو بھیجا۔ انہوں نے اتمام حجت کے لیے خطبات دیئے اور لوگوں کو ان کے خطوط دکھائے۔ انہوں نے جب باطل کو بدترین شر پر آمادہ دیکھا تو صلح حدیبیہ کرنے والے رسولِ برحق کے نواسے کی حیثیت سے صلح کی شرائط متعین کیں اور اپنے اس پورے عمل میں صرف ایک بات ظاہر کی، صرف ایک بات غائب کی وہ یہ کہ شر اپنے باطن میں مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہوتا ہے اور اقتدار کی بڑی سے بڑی مسند پر بیٹھ کر بھی حق کی ہیبت سے لرزتا رہتا ہے۔ کربلا ہر دور میں باطل کی اس کمزوری کا اعلان کرتی ہے۔ بات یوں نہیں ہے کہ بدر میں حق کو فتح حاصل ہوئی اور کربلا میں باطل کو...... بات یوں ہے کہ بدر ہو یا کربلا دونوں میں شکست باطل ہی کی ہوئی ہے۔

میں نے شہادت کو عمل کہا ہے۔ عمل کے پیچھے ارادہ ہوتا ہے۔ ارادہ کے پیچھے نیت ہوتی ہے اور یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، نیت کے پیچھے جنگ کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ "میں" ہوتا ہے۔ جو نیت کرتا ہے یہ ایک اہم بات ہے اسے سمجھنا ضروری ہے۔ ہمارے تمام اعمال باہم متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ہم ایک وقت میں سچ بولتے ہیں اور دوسرے وقت میں جھوٹ، ایک وقت محبت کرتے ہیں اور دوسرے وقت نفرت۔ ایک وقت ہمارا عمل خیر کے محرک سے پیدا ہوتا ہے دوسرے وقت شر کے محرک سے اور ہمارے اعمال اور ان کا تضاد۔ ان کے پیچھے کوئی ایک "میں" نہیں ہوتا۔ ہمارے اندر بے شمار "میں" ہیں اور بے شمار انائیں۔ اور ہر لمحہ ہمارے اندر ایک "میں" عمل کرتا ہے۔ یہ میں کبھی کوئی جذبہ ہوتا ہے، کبھی کوئی خیال، کبھی کوئی جبلت اور ان میں باہم کوئی ربط

نہیں ہوتا اور چونکہ ہمارے اندر کوئی ایک "میں" نہیں ہوتا اس لیے کوئی ایک ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ارادے سے کچھ نہیں کرتے ہم جو کچھ کرتے ہیں اس پر کرنے کی صرف تہمت ہوتی ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ ہم سے سرزد ہوتا ہے ہم کچھ کرتے نہیں، ہم سے کچھ ہو جاتا ہے۔ جیسے بارش ہوتی ہے، جیسے ہوا چلتی ہے، جیسے دھوپ نکلتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اعمال کسی ارادے کا نتیجہ نہیں ہوتے صرف ایک میکانکی وقوعہ ہوتے ہیں ایسے اعمال کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ غیر مستند اعمال ہیں ایسے اعمال ہیں جو ہمارے وجود کی سطح پر بلبلوں کی طرح ابھرتے ہیں اور بلبلوں ہی کی طرح پھوٹ جاتے ہیں۔ عمل، ارادہ کے بغیر اور نیت کے بغیر یہ ہے ہمارے اعمال کا خلاصہ۔ ان کے پیچھے ہمارے وجود کی قوت نہیں ہوتی، یہ ہمارے پورے وجود سے ظاہر نہیں ہوتے۔ ان کا سرچشمہ ہمارے باطن میں نہیں ہوتا یہ وہ اعمال ہیں جو خواہ کوئی بھی نتیجہ پیدا کریں اپنے جوہر میں بے قدر و قیمت ہوتے ہیں۔ لیکن ایک وہ عمل ہے جو ہمارے جوہر ذات سے پھوٹتا ہے۔ ہمارے وجود کی تہوں سے رستا ہے جس میں ہم پورے کے پورے شریک ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے ہم اپنی پوری سالمیت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ ایسے اعمال کے لیے ضروری ہے کہ ہم موجود ہوں اور موجود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک ہوں۔ ہمارے اندر ایک "میں" ہو۔ ہم ایک ایسی اکائی کی طرح ہوں جسے تقسیم نہ کیا جا سکے صرف ایسا عمل ہی وہ عمل ہوتا ہے جس کے پیچھے ارادہ اور نیت ہوتی ہے اور یہی وہ نیت ہے جو کسی عمل کو حقیقی معنوں میں عمل بناتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے عمل کو دیکھیے۔ انکا ابتدا سے انتہا تک وہ ایک ہی عمل ہے وہ اعمال کا مجموعہ نہیں ہے ایک ہی عمل ہے جو آگے اور بڑھنے کے مختلف مراحل سے گزر کر بھی ایک ہی ہے اس کے پیچھے جو ارادہ ہے وہ ایک ہے جو نیت ہے وہ ایک ہے۔ یہ ایک "میں" کا عمل ہے۔ ایک سالم وجود کا عمل ہے اور وجود میں یہ سالمیت آتی ہے ایمان سے۔ ایک ایسے ایمان سے جو پوری شخصیت کو ایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے جو اسے اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ پھر اس میں کوئی دراڑ، کوئی رخنہ باقی نہیں رہتا۔ ایمان جوڑتا ہے اور شرک اور کفر توڑتے ہیں۔ اور نفاق کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ شخصیت کا تضاد رفع نہیں ہوا۔ زبان کچھ کہتی ہے، دل کچھ کہتا ہے۔ قول کچھ ہوتا ہے۔ عمل کچھ ہوتا ہے۔ امام کا عمل ایمان کی معراج ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جس کی صداقت پر شہادت کو گواہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جس کو آزمائش کی بھٹیوں میں تپایا گیا ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جس کو کوئی مصیبت متزلزل کر سکتی ہے نہ کوئی ابتلا، اور اسی ایمان سے وہ نیت پیدا ہوتی ہے جو چشمہ کوثر کی طرح صاف ہے۔ وہ ارادہ پیدا ہوا ہے جو قطب تارے کی طرح اٹل ہے، وہ عمل پیدا ہوا ہے جو حی علی

خیر العمل کا جواب ہے۔ اس عمل میں ایمان، نیت، ارادہ اور نتیجہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔

شہادت عمل ہے اور عمل کی بنیاد طلب خیر پر ہے۔ عمل سے کوئی خاص عمل مراد نہیں ہے بلکہ کوئی بھی عمل ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں حصول خیر کے لیے کرتے ہیں بھلائی اور فائدہ کے لیے کرتے ہیں اس لیے کرتے ہیں کہ اسے اپنے لیے اچھا سمجھتے ہیں، مفید سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا عمل ہمارے تصور خیر کا پابند ہوتا ہے کوئی دولت کو خیر سمجھتا ہے اور دولت کے لیے عمل کرتا ہے، کوئی شہرت کو خیر سمجھتا ہے اور شہرت کے لیے عمل کرتا ہے۔ کوئی عزت کو خیر سمجھتا ہے اور عزت کے لیے عمل کرتا ہے کوئی اقتدار اور قوت کو خیر سمجھتا ہے اور اقتدار اور قوت کے لیے عمل کرتا ہے۔ دولت، شہرت عزت، قوت، صحت یہی وہ چیزیں ہیں جو انسانی اعمال کے محرکات ہیں۔ انسان ان کو خیر سمجھتا ہے اور خیر کا طالب ہوتا ہے اور حصول خیر کے لیے عمل کرتا ہے اس لیے عمل کے معنی ہیں حصول خیر کے لیے کام کرنا اب یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان جس چیز کو خیر سمجھتا ہے اُسے عارضی طور پر حاصل نہیں کرنا چاہتا کوئی یہ نہیں چاہتا کہ آج دولت مند ہو جائے اور کل مفلس بن جائے۔ آج مشہور ہو جائے اور کل گمنام بن جائے۔ آج طاقت ور ہو جائے اور کل کمزور بن جائے آج صحت مند ہو جائے اور کل بیمار ہو جائے۔ ہم خیر کو عارضی طور پر نہیں دائمی طور پر چاہتے ہیں۔ اس لیے انسان صرف خیر کا طالب نہیں۔ دوام خیر کا طالب ہے یہ انسان کی فطرت ہے انسان کے عمل میں اللہ کی یہی فطرت اپنا اظہار کرتی ہے۔ لیکن خدا نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی کسی چیز کو دوام نہیں ہے۔ ہر چیز متغیر ہے۔ بدل رہی ہے۔ آج کچھ ہے کل کچھ ہے۔ بچہ جوان بنتا ہے جوان سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ بوڑھا ہو کر مرتا ہے۔ زمانہ ہر چیز کو اسی طرح کچھ سے کچھ بناتا رہتا ہے یہ زمانے کی فطرت ہے اور انسان کی فطرت زمانے کی فطرت سے متصادم ہے اور یہی انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ زمانہ کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ انسان نقصان میں ہے خسارے میں ہے کیونکہ زمانہ ہر چیز کو بدلتا رہتا ہے۔ وہ کسی چیز کو دوام حاصل کرنے نہیں دیتا۔ جو چیز زمانے کی ضد میں ہے وہ عارضی ہے، غیر مستقل ہے۔ اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ زمانہ انسان کے خسارے پر گواہ ہے انسان اس خسارے سے بچ نہیں سکتا لیکن صرف ایک چیز ہے جو زمانے کے اس عمل کے مقابل ہے اور وہ ایمان ہے اور ایمان کا اظہار عمل صالح ہے اور عمل صالح کی تکمیل تو صوا بالحق اور تو اصوا بالخیر ہے۔ اور ان سب کا حاصل سعادت اخروی ہے اور سعادت اخروی کا کمال رضائے الٰہی ہے۔ پس جو کام رضائے الٰہی کے لیے ہے اس کے سوا جو عمل ہے خسارہ کا عمل ہے۔ گھاٹے کا عمل ہے

اور شہادت وہ عمل ہے جو خسارے سے بلند اور گھاٹے سے ماوراء ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہے اس عمل کے سامنے زمانے کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ وہ عمل ہے جو زمانے کا مفتوح نہیں زمانے کا فاتح ہے۔ سورۃ عصر میں یہی وہ حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتائی ہے اور امام، صاحبِ عصر کو کہتے ہیں۔ امام وہ ہے جو زمانے پر حاکم ہے اور زمانہ سے بلند ہے اور زمانے کا راکب ہے۔ دیکھو کربلا میں ایک طرف صاحبِ عصر کا عمل ہے اور دوسری طرف غلامانِ عصر کا عمل ہے۔ وہ جو عصر کے غلام ہیں وہ بھی خیر کے طالب ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ خیر کیا ہے۔ انہوں نے دنیا اور دنیا کی متاعِ قلیل کو خیر سمجھ لیا ہے اور اس خیر کے بدلے اس خیر کا سودا کیا ہے جس کی طرف امام انہیں بلا رہے ہیں۔ ایمان کی طرف اور عملِ صالح کی طرف اور تواصوا بالحق کی طرف اور تواصوا بالخیر کی طرف۔ امام انہیں بلا رہے ہیں مگر وہ نہیں سنتے کیونکہ نہ وہ زمانہ کی حقیقت سے واقف ہیں نہ صاحبِ زمانہ کی اور بے شک کہ زمانہ ہی اس بات کا گواہ ہے کہ وہ خسارہ میں ہیں۔ اور بے شک خیرِ دائم ان کے لیے ہے جو عصر کو جانتے ہیں اور صاحبِ عصر کی آواز کو سنتے ہیں۔

(غیر مطبوعہ)

سلیم احمد

ادیب اور مملکت

یہ تقریر جناب سلیم احمد نے دوسری کل پاکستان اہل قلم کانفرنس کی پہلی نشست میں کی تھی جو اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام ۲۵۔۲۶ نومبر ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوئی تھی۔

○

قبل اس کے کہ میں موضوع زیر بحث پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں۔ ایک واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک نقاد نے ایک سرکاری پرچے کے لیے میر پر مضمون لکھا اور اُن کے حالات زندگی بتاتے ہوئے نواب آصف الدولہ سے ان کا ایک مکالمہ نقل کیا۔ سچویشن یہ تھی کہ میر صاحب نواب آصف الدولہ سے خفا تھے اور دربار میں حاضری بند کر دی تھی۔ ایک روز وہ اپنے مکان کے سامنے کھڑے ہوئے کبوتروں کو دانہ کھلا رہے تھے کہ اتفاق سے نواب آصف الدولہ کی سواری اُدھر سے گزری نواب نے میر صاحب کو دیکھا تو اپنا ہاتھی روک لیا اور میر صاحب سے ان کا مزاج پوچھا۔ میر صاحب ناراض تو تھے ہی، انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق بے دماغی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا کہ شارع عام پر گفتگو کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہے۔ خیر یہ واقعہ تو بچے بچے کو معلوم ہے لیکن جب یہ مضمون اس پرچے کے نگران اعلیٰ نے پڑھا تو اسے شائع ہونے سے روک دیا وجہ یہ بتائی کہ اس قسم کے واقعات نہیں بیان ہونے چاہئیں کیونکہ ان سے حکمرانوں کے بارے میں غلط رویے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ میں نے یہ واقعہ آپ کو اس لیے سنایا ہے تاکہ آپ سے پوچھ سکوں کہ کہیں آپ بھی میر کے واقعہ کو اس سرکاری پرچے کے نگران اعلیٰ کی طرح ادیب اور مملکت کے غلط تعلقات کی مثال تو نہیں سمجھتے کیونکہ اگر ایسا ہے تو پھر کسی طرح کی بھی کوئی بات کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی صورت میں بس اپنے کبوتروں کو دانہ کھلانے میں مصروف رہوں گا اور نواب آصف الدولہ کے معاملات کو ان کے انفارمیشن آفیسروں پر چھوڑ دوں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس سیمنار میں اپنا مضمون پڑھنے کے لیے مجھے بلایا ہے تو آپ ایسے کسی رویے کا شکار نہیں ہوں گے اور

اور مجھے اجازت دیں گے کہ آپ کی مزاج پرسی کے جواب میں میں اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق جو جی چاہے کہوں۔"

ہاں تو آج کا موضوع ہے "ادیب اور مملکت" آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں اس مسئلے پر بڑی بڑی بحثیں ہوئی ہیں۔ کچھ لوگ جن میں مملکت کے نظریہ سازوں کے ساتھ ادیب بھی شامل ہیں اس نظریہ کے حامل ہیں کہ ادیب اور مملکت کا رشتہ آقا و محکوم کا رشتہ ہے۔ ادیب مملکت کا آلۂ کار ہے اور اس کا اولین فریضہ مملکت کے فرائض کو پورا کرنا ہے یعنی ادیب کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ لکھے مملکت کے مقاصد اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھے۔ مملکت حالتِ جنگ میں ہو تو ادیب وطن کے سجیلے جوانوں کو یہ بتائے کہ میرے نغمے تمہارے لیے ہیں۔ ایسے افسانے، ناول اور ڈرامے تخلیق کرے جن میں دشمن کو شیطان ثابت کرنے کے لیے پورا زورِ قلم لگایا گیا ہو۔ حکومت پیداوار بڑھانا یا بچت کی ترغیب دینا چاہے تو ادیب اپنے ہم وطنوں کو یہ بتائے کہ وہ دن رات کتنا ایندھن ضائع کر رہے ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اس نظریہ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ادیب مملکت کے پراپیگنڈے کے لیے لکھے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے پیچھے ایک پورا نظریۂ حیات موجود ہے جو مملکت کو اپنے نظامِ اقتدار میں وہی جگہ دیتا ہے جو مذہبی نظامِ اقدار میں خدا کو حاصل ہے۔ یعنی اس نظریہ کے تحت ہر چیز مملکت کے لیے ہوتی ہے۔

میں اپنا شمار مملکت کے ادنیٰ خدمت گزاروں میں کرتا ہوں اور اس کے شہری کی حیثیت سے اس کے قانون کی اطاعت و احترام اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ضرورت پڑے تو اس کے لیے میں اپنے جان و مال کی قربانی بھی دے سکتا ہوں۔ میری مملکت میرے لیے ایک ایسی کشتی کی طرح ہے جس پر سمندر اور اس کے طوفانوں کے درمیان میری سلامتی کا انحصار ہے۔ نہ صرف میری بلکہ میری آئندہ نسلوں کی سلامتی بھی مملکت ہی کے حصارِ عافیت میں ممکن ہے۔ اور پاکستان تو مجھے یوں بھی عزیز ہے کہ یہ میرے ایمان کا جزو ہے اور میرے دین کے حوالے سے میرے لیے مقدس ترین متاعِ حیات ہے لیکن یہ سب باتیں شہری کے حوالے سے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی کہ ادیب بحیثیت ادیب کے کچھ اور ہوتا ہے مجھے بصد ادب پورے وثوق سے کہنے دیجئے کہ ادیب بحیثیت ادیب مملکت کا آلۂ کار نہیں ہے یعنی اس کا ادبی فریضہ مملکت کے مطالبہ پر لکھنا نہیں ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور یہ بات ادیب کے نہیں ادب کے بارے میں ہے۔ وہ یہ ہے کہ ادب کا فریضہ مملکت کی خدمت نہیں ہے بلکہ مملکت کا فریضہ ادب کی خدمت ہے۔ میرے الفاظ اگر آپ کو پرجوش

معلوم ہوں تو ہیں ان کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن اگر آپ کو ان سے کچھ الجھن بھی ہو رہی ہے تو اسے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ آیئے میری بات کو سمجھنے کے لیے ایک سوال پر غور کیجیے کیا مملکت کا قیام مقصود بالذات ہے؟ یا مملکت اس کے لیے قائم کی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے کچھ مقاصد حاصل کیے جاسکیں؟ اگر مملکت مقصود بالذات ہے تو پھر ہر چیز یقیناً مملکت کے مفاد کے تابع ہے لیکن اگر مملکت مقصود بالذات نہیں ہے اور چند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے تو پھر وہ مقاصد مملکت پر فوقیت رکھتے ہیں میں پاکستان کی مثال پیش کرتا ہوں۔ پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جو واضح طور پر چند مقاصد کے تحت وجود میں آئی ہے۔ آسانی کے لیے کہہ لیجیے کہ اسلام کے لیے وجود میں آئی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام پاکستان پر فوقیت رکھتا ہے اور پاکستان کا مقصود اسلام کی خدمت ہے اس مثال سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ مملکتیں کچھ ایسے اعلیٰ تر مقاصد کے لیے وجود میں آتی ہیں، جو مملکتوں پر مقدم ہوتے ہیں۔ اور مملکتوں کا قیام ان مقاصد کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بات اگر واضح ہوگئی تو مجھے دعویٰ کرنے دیجیے کہ ادب ان اعلیٰ ترین مقاصد میں سے ایک مقصد ہے جن کے لیے مملکتیں وجود میں لائی جاتی ہیں۔

میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ادب کی اس مدح سرائی پر، کہہ لیجیے کہ مبالغہ آمیز مدح سرائی پر، اظہار ناراضگی کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ادب اتنی چھوٹی چیز ہے کہ اس کا مقابلہ مملکت سے کرنا ممولے کو شہباز سے لڑانا ہے۔ ادب بے چارہ ہے ہی کیا؟ ادب کمزور اور چھوٹے موٹے لفظوں کا مجموعہ ہی تو ہوتا ہے۔ پھر ادب کو مملکت کے مقابلے پر کیسے رکھا جاسکتا ہے؟ میں ادب کے دفاع میں شاید ابھی کچھ نہ کہوں لیکن اگر آپ لفظوں کی بے حرمتی کریں گے تو آپ کی طرح میں بھی برا ماننے کا حق رکھتا ہوں۔ الفاظ چھوٹی موٹی چیز نہیں ہیں۔ یہ الفاظ ہی ہیں جنہیں کبھی ہم خیال کہتے ہیں، کبھی جذبہ کبھی احساس۔ یہاں تک کہ ہمارے عقائد بھی الفاظ کے بغیر نہیں ہوتے۔ تو ادب اگر الفاظ کا مجموعہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ادب اور ہمارے عقائد، ہمارے خیالات، ہمارے جذبات، ہمارے احساسات کی تشکیل کا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تخلیق کا ذریعہ ہے۔ اب اگر آپ چاہیں تو مجھ سے یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ ادب کا مقصد اگر مملکت کی خدمت نہیں ہے اور ادب ان اعلیٰ ترین چیزوں میں سے ایک ہے جن کے لیے مملکت وجود میں آتی ہے، تو ادب کا مقصد کیا ہے؟ یقیناً یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس سوال کے بے شمار جوابات دیئے گئے ہیں میں نے شروع میں مملکت کے نظریہ سازوں اور ان کے ہمنوا ادیبوں کا ذکر کیا تھا ان کا یہ نظریہ کہ ادب کا مقصد مملکت کی خدمت ہے اسی سوال کا ایک جواب تھا۔ اس جواب کی متعدد شکلیں ہیں۔ مملکت چونکہ ایک معاشرتی

تنظیم ہے اس لیے کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ادب معاشرے کا خادم ہے۔ اسی منطق کو آگے بڑھاکر کچھ نظریہ سازوں نے ادب کو سیاسی تنظیموں کا آلۂ کار ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس کے جواب میں کہنے والوں نے نفی کے جوش میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ادب صرف ادیب کے لیے ہوتا ہے جھگڑے کی صورت میں انتہا پسندانہ نظریات اسی طرح پھیلتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سارے جوابات ادب کی ماہیت اور حقیقت کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ ادب کا مقصد چاہے مملکت کی خدمت کو ٹھہرا لیا جائے، چاہے معاشرے اور سیاسی پارٹیوں کے مقاصد کے حصول کو ادب کی غرض و غایت بنایا جائے یا ادب کے مقصد کو ایک فرد واحد یعنی ادیب کی خدمت قرار دیا جائے۔ ان سب باتوں میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ادب کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہے جبکہ حقیقت شاید یہ ہے کہ ادب کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ادب ایک بے مقصد چیز ہے جی ہاں بالکل بے مقصد آپ شاید یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں کہ میں نے ادب کے مقصد کی نفی کر کے خود ادب کی اہمیت کو ختم کر دیا ہے اور اس کی بے اہمیتی کو تسلیم کر لیا ہے لیکن کیا سچ مچ کسی چیز کے بے مقصد ہونے کے معنی غیر اہم ہونے کے ہیں؟

میں چاہتا ہوں کہ اسی سوال کو آپ توجہ سے سنیں میرے سامنے ایک مثال ہوا کی ہے ہوا کتنی اہم چیز ہے اور ہماری زندگی کے لیے کتنی ضروری ہے لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہوا کا مقصد یہ ہے کہ ہم سانس لیں اور گرمی ہو تو پنکھا چلا لیں دوسرے لفظوں میں کیا ہوا کا مقصد انسانی زندگی کو فائدہ پہنچانا ہے میرے نزدیک جواب صاف نفی میں ہے۔ ہوا کا ہرگز کوئی ایسا مقصد نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہوا ایک ایسا فطری عنصر ہے جس کے بغیر انسانی زندگی ممکن نہیں لیکن انسانی زندگی ہوا کا مقصد نہیں۔ ہوا تو بس فطرت کے مظاہر میں سے ایک فطری مظہر ہے۔ یہ مثال میں نے اس لیے پیش کی ہے تاکہ یہ کہہ سکوں کہ ادب بھی ہوا کی طرح تہذیبی زندگی کا ایک فطری عنصر ہے۔ جس طرح فطرت ہوا کو پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح تہذیبی زندگی ادب کو پیدا کرتی ہے اس بات کو ایک بار تسلیم کر لیا جائے تو ہم ادب کے فائدوں کی بات بھی کر سکتے ہیں۔ ادب سے انسانوں کو سینکڑوں روحانی، اخلاقی، جمالیاتی فائدے پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ فائدے ادب کا مقصد نہیں ہیں۔ ادب کی تعریف تو بس یہی ہے کہ وہ تہذیب کے عناصر ترکیبی میں ایک اہم عنصر ہے۔ دراصل ادب کے مقصد کا اضطراب انگیز سوال ہمیشہ ایک تہذیبی زوال کی صورت حال میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ پوچھنا کہ ادب کا مقصد کیا ہے؟ درحقیقت یہ پوچھنے کے مترادف ہے کہ تہذیب کا مقصد کیا ہے؟ اور یہ سوال ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تہذیب خود اپنے وجود سے غیر مطمئن ہو جاتی ہے۔ ادب کے بارے میں ہمارے شعور میں جو اضطراب اور الجھن پائی جاتی ہے وہ تہذیبی زوال

کی اس صورت سے پیدا ہوتی ہے جس میں آج ہم مبتلا ہیں اور آہستہ آہستہ ایک ایسی حالت کی طرف بڑھ رہے ہیں جو قدیم بربریت سے زیادہ ہولناک ثابت ہوگی۔

ادب تہذیب کا ایک فطری عنصر ہے یہ بات کہہ کر شاید میں یہ بیان کر سکوں کہ ادب کی ماہیت کیا ہے جس طرح فطرت کے عناصر میں خود فطرت کی روح کارفرما ہوتی ہے اس طرح ادب بھی اس تہذیب کی روح کا مظہر ہوتا ہے جو اسے پیدا کرتی ہے یہ تہذیب کی روح کیا ہے؟ اسے شاید میں واضح طور پر بیان نہ کر سکوں، کیونکہ بہت سی چیزیں اتنی پُر اسرار ہوتی ہیں کہ ان کی نقاب کشائی ممکن نہیں ہوتی ان کے اردگرد مقدس تاریکی کا ایک ایسا ہالہ ہوتا ہے جسے شعور کی روشنی میں نہیں لایا جا سکتا۔ شاید میں صرف یہ کہہ سکوں کہ تہذیب کی روح خود زندگی کی طرح ایک سرِ نہاں ہے، زندگی کی قوت سے ہم زندہ رہتے ہیں وہ ہمارے جسم کے روئیں روئیں میں سرایت کیے ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہم مٹھی بھر خاک کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتے لیکن کیا ہم اسے بیان کر سکتے ہیں؟ تہذیب کی روح ایک ہیئت اجتماعیہ کی زندگی کا دوسرا نام ہے اسی ہیئت اجتماعیہ کے ہر چھوٹے بڑے مظہر میں زندگی کی وہ رو دوڑی ہوئی ہوتی ہے جس کے بغیر وہ ہیئت اجتماعیہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک زندہ اور توانا درخت کی زندگی کی طرح وہ اس کی جڑوں سے شاخوں تک پھیلتی ہے اور پھولوں اور پھلوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ادب شجر تہذیب کے اندر کام کرنے والی توانائی کا وہ پھول ہے جو اس کی بلند ترین شاخ پر کھلتا ہے اور اس بہار آفرین توانائی کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ بات اگر آپ کو کچھ شاعرانہ معلوم ہو تو آئیے اسے تصورات کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب جو میں بحث کرنے والا ہوں وہ کہیں مجرّد تصورات کے گورکھ دھندے میں پھنس کر نہ رہ جائے۔ بات یوں ہے کہ مجھے مجرّد تصورات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ انسان کیا ہے؟ یا انسانیت کسے کہتے ہیں؟ تو شاید میں اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہ کروں لیکن یہ سوال کہ میں کیا ہوں اور میرا اپنے ماحول اپنی قوم اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے کیا تعلق ہے؟ مجھے گھنٹوں سوچنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ چاہیں تو اُسے میری ذہنی کمزوری کہہ لیں۔ میں تخصیص کے بغیر تعمیمات پر غور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لیے درخواست ہے کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں تہذیب کی روح کے مسئلے اور ادب سے اس کے تعلق کو ایک ٹھوس سوال میں تبدیل کر لوں۔ یعنی اس پر اس طرح غور کروں کہ پاکستان کی اگر کوئی تہذیب ہے تو اس کی روح کیا ہے؟ اور پاکستانی ادب اور ادیبوں سے اس کا کیا تعلق ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسا سوال ہو گا جس کے جواب میں میں صرف اپنے دماغ سے نہیں

اپنے پورے وجود سے شریک ہوں گا اور شاید اس تلاش کے دوران کوئی ایسی بات کہہ سکوں جو آپ کی سماعت کے شایان شان ہو کوئی ایسی بات جس پر سوچنے والے سوچیں اور عمل کرنے والے اگر چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

پاکستان کے بارے میں ایک بنیادی پیش پا افتادہ بات یہ ہے کہ یہ اسلامی مملکت ہے جس کی ایک اپنی تہذیب ہے اور پاکستان اس لیے وجود میں آیا ہے کہ اس تہذیب کی بقا اور استحکام کے ذریعے کو زندگی کی ساری توانائیوں کے ساتھ پورا کرے۔ اب یہ تہذیب ایک مذہبی تہذیب ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک مذہب کے انسانوں پر عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوئی ہے اور تمام بنیادی انسانی رشتوں کو متعین کرتی ہے۔ انسانی رشتوں کی چار مرکزی اور بنیادی شکلیں ہیں۔ خدا اور انسان کا رشتہ، انسان اور کائنات کا رشتہ، انسان اور انسان کا رشتہ اور انسان کا خود اپنے نفس سے رشتہ۔ یہ رشتے مثبت اور منفی دونوں ہوتے ہیں یعنی جب ہم خدا اور انسان کے رشتے کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ یہ رشتہ لازمی طور پر مثبت ہوتا ہے۔ مثبت رشتہ خدا کا اقرار کرتا ہے، منفی رشتہ انکار۔ لیکن رشتے دونوں ہوتے ہیں ان معنوں میں کوئی بھی تہذیب خدا اور انسان کے رشتے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہی حال دوسرے انسانی رشتوں کا ہے۔ آپ فطرت، انسان اور اپنے نفس کے بارے میں مثبت یا منفی کوئی بھی رویہ اختیار کر سکتے ہیں اب یہ تہذیب، تہذیب پر مبنی ہے کہ وہ کس رشتے کو کس طرح محسوس کرتی ہے۔ تہذیبوں کے اختلافات اسی احساس کے اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا، فطرت، انسان اور نفس کے بارے میں ایک خاص طرح محسوس کرتی ہے اور اپنی ہیئت کے تمام مظاہر میں ایک بنیادی طرزِ احساس کا اظہار کرتی ہے۔ اس طرزِ احساس کے بغیر یہ تہذیب نہ اپنے تمام اجزا کو مجتمع کر سکتی ہے اور نہ ماضی حال اور مستقبل کے تسلسل میں انہیں زندہ اور فعال طور پر قائم رکھ سکتی ہے۔ اس بحث کا ادب سے یہ تعلق ہے کہ ادب تہذیبی طرزِ احساس کا لفظی اظہار ہے جو ہمیشہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ تہذیب اپنے طرزِ احساس میں کتنی زندہ اور فعال ہے۔ دوسرے لفظوں میں ادب تہذیبی طرزِ احساس کا اظہار بھی ہے اور اس کی زندگی توانائی کا پیمانہ بھی۔ یہی حال دوسرے فنونِ لطیفہ کا ہے۔ یہ جہاں تہذیب کی داخلی قوت سے پیدا ہوتے ہیں وہاں ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ قوت کس حد تک زندہ ہے میں نے جب یہ کہا تھا کہ ادب تہذیب کا ایک فطری عنصر ہے تو اس سے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں،

میری مراد یہ تھی کہ خود تہذیب کی روح نے اپنے اظہار کے لیے اس آئینے کی تخلیق کی ہے۔ پاکستانی ادب اگر وہ ادب ہے تو پاکستانی تہذیب کے آئینے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اب ہم ایک نازک بحث کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں ممکنہ وضاحت کے ساتھ اسے آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اس بحث کو آج کے موضوع سے جوڑ کر ایک بات مکمل کر لوں۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ ادب کا ہماری تہذیب سے کیا تعلق ہے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس بحث میں مملکت کا کیا مقام ہے۔ مجھے عرض کرنے دیجئے کہ مملکت کا قیام اگر ایک تہذیب کو قائم کرنا اور اس کی بقا اور استحکام کا فریضہ انجام دینا ہے۔ تو پاکستانی مملکت کا مقصد اسلامی تہذیب کی اس شکل کو محفوظ رکھنا جو پاکستان کو معرض وجود میں لائی ہے۔ یقیناً مملکت کے فریضے کی یہ بحث ہم اعلیٰ ترین مقصد کی روشنی میں کر رہے ہیں اور اس میں قیام امن، فراہمیٔ روزگار، ملکی پیداوار میں اضافہ اور نظم و نسق وغیرہ کے مسائل چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مملکت تہذیب سے متعلق اپنا فریضہ ہمیشہ تہذیب کے ظاہری عوامل کی حفاظت کی صورت میں ادا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مملکت تہذیب کے ظاہر کی حفاظت کرتی ہے۔ جبکہ ادیب اس کے باطن کی نگہبانی کرتے ہیں اس طرح ادیب اور مملکت تہذیب کے داخل و خارج یا اس کے جسم اور روح کی حفاظت کے مشترک مقصد میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور یوں اپنی اپنی حدود میں وہ اعلیٰ ترین فریضہ انجام دیتے ہیں جس کے بغیر کوئی ہیئت اجتماعیہ مہذب کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

مملکت اور ادیب کے باہمی تعاون ہی سے تہذیبی زندگی زمان و مکان کی بدلتی ہوئی رو میں اپنے تسلسل کو قائم رکھتی ہے لیکن تعاون کی یہ بات ہمیشہ اعلیٰ معنوں میں کی جا سکتی ہے کیونکہ تعاون کی وہ شکلیں جن کو مملکت کے نظریہ سازوں نے عہد حاضر میں اس طرح بیان کیا ہے جس طرح بد دیانت دکاندار سارا وزن ایک ہی پلڑے میں ڈال دیتا ہے یعنی مملکت کو مرکز بنا کر ادیب کو اس کے گرد طواف کرنے کی خدمت سونپی گئی ہے اور یہ تسلیم کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ادیب کو وہی کرنا ہے جو مملکت اس سے کرانا چاہتی ہے۔ تعاون کے اس غیر متعلق نظریہ کو رد کرنے کے لیے میں وہ بحث چھیڑنا چاہتا ہوں جس کے بارے میں میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ابھی اسے آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ میرا اشارہ اس صورت حال کی طرف ہے جب ادیب اور مملکت کے تعاون کی بجائے اختلاف ہو۔

جناب صدر میں اپنے ضمیر کی پوری سچائی کے ساتھ یہ اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ادیب اور

مملکت میں اختلاف ہو اور یہ اختلاف سچے ادیب اور مملکت کے درمیان ہو کیونکہ سیاسی گروہ بندیوں اور ان جھوٹے ادیبوں کو جو ادب کو سکہ رائج الوقت کے طور پر استعمال کرتے ہیں میں ادیبوں کی صف میں شامل ہی نہیں سمجھتا، تو اس اختلاف میں میں ادیب کا طرفدار ہوں گا اور سچے ادیب سے مملکت کا اختلاف صرف ایک دوست اور ہمدرد کا اختلاف ہوتا ہے۔ ایک ایسے دوست اور ہمدرد کا اختلاف جو اپنے مخصوص فریضہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اختلاف کرتا ہے۔ یہ بات تھوڑی سی مبہم ہے اس لیے آیئے اسے ذرا وضاحت سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

تہذیب جس کی حفاظت مملکت اور ادیب دونوں کے فرائض میں شامل ہے کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ یہ ہر لمحہ تغیر پذیر ہے اور زندگی کی طرح ہر لمحہ نت نئی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ اس کے اندر دو اصول ہمیشہ کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک ثبات کا اصول اور دوسرا تغیر کا۔ ثبات کا اصول تہذیب اور معاشرت کی ان شکلوں کو برقرار رکھتا ہے جو اپنے وجود کو اس لیے قائم رکھنا چاہتی ہیں تاکہ ماضی حال اور مستقبل کے سفر میں وہ اپنے تسلسل کو برقرار رکھ سکیں۔ اس کے برعکس تغیر کا اصول تہذیب کو جمود اور اس لیے موت سے بچاتا ہے اور ہر دم اپنی تازہ کاری سے تہذیب کو زندہ اور توانا رکھتا ہے۔ ادیب اور مملکت دونوں ثبات اور تغیر کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے کام کرتے ہیں لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مملکت تغیر کے مطالبے کو اتنے واشگاف انداز میں دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہے جتنے واضح طور پر ایک سچے ادیب کی بصیرت اسے دیکھ لیتی ہے کیونکہ مملکت ثبات کی نمائندہ ہے جب کہ ادیب نسبتاً تغیر کی زیادہ نمائندگی کرتا ہے اور یوں ادیب کے وجدان پر ہونے والا کشف بظاہر مملکت سے متصادم ہو جاتا ہے۔ جبکہ درحقیقت ادیب تغیر کی جس ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کو جان لینا مملکت کے قیام و بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک سچے ادیب کے وجدان کی صداقت انجام کار مملکت کو بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس تغیر کو قبول کرنا خود مملکت کے لیے لازمی تھا، حالانکہ مملکت ایک لمحۂ موجود میں اسے دیکھنے سے قاصر تھی ان معنوں میں ادیب کا مملکت سے اختلاف تہذیب کے لیے ایک نیک فال ہوتا ہے اور تہذیب کی زندگی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا بنجر ہو جانے والی زمین کے لیے وہ سیلاب جو اسے ایک نئی زرخیزی سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس بات کو میں اقبال کے الفاظ میں بیان کرنا چاہوں تو یہ کہوں گا کہ ادیب مملکت یا معاشرے یا ہیئت

اجتماعیہ کے لیے ایک دیدۂ بینا کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مدد سے مملکت اپنے ماضی، حال، اور مستقبل کو دیکھتی ہے اور اپنے سفر حیات میں دیکھ بھال کر زمانے کے کٹھن اور دشوار گزار راستے کو طے کرتی ہے۔ اگر یہ دیدۂ بینا موجود نہ ہو تو مملکت اندھیروں میں بھٹک کر رہ جاتی ہے اور نہ اپنے گرد و پیش کو دیکھ سکتی ہے اور نہ خود اپنے وجود کا کوئی جواز پیش کر سکتی ہے۔

بشکریہ انہار۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۸۳ء

گُلِ نَم

عصرِ نو میں ترے کرب کو جھیلتا صبحِ فردا کے غم میں سُلگتا رہا
جیسے کوئی دیا جل رہا ہو کہیں ایک ویران مسجد کی محراب میں

آج کا مسئلہ

یہ اس زمانے کے بہت مشہور خیالات میں سے ایک ہے کہ موجودہ تہذیب زوال پذیر ہے۔ لیکن مشہور خیالات کی سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ ان کے معنی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ موجودہ تہذیب کن معنوں میں زوال پذیر ہے؟ بعض حقائق پر نظر ڈالی جائے تو یہ خیال سراسر باطل معلوم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ اتنی ترقی کا ہے کہ انسان چاند پر پہنچنے والا ہے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی سہولت اور آسائش کا جیسا اہتمام اس دور میں ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا مشینوں کی ترقی نے انسان کے لیے ممکن بنا دیا ہے وہ ہاتھ پاؤں چلائے بغیر پوری زندگی آرام اور چین سے بسر کر سکے۔ ساری دنیا میں امراض کا قلع قمع کیا جا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب موجودہ تہذیب مُردوں تک کو زندہ کرنے لگے۔ ان حالات میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ تہذیب زوال کی طرف جا رہی ہے۔ ہمارے پاس یہ باور کرنے کے لیے کئی اسباب موجود ہیں کہ یہ نظریہ چند قنوطی دماغوں کی پیداوار ہے۔ ورنہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ موجودہ تہذیب ترقی کی طرف جا رہی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ گھپلا کہیں ترقی کے لفظ میں ہے۔ شاید جب ہم یہ کہتے ہیں کہ موجودہ تہذیب ترقی کر رہی ہے تو اس کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ موجودہ تہذیب تنزل کی طرف جا رہی ہے تو ہمارے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔ ترقی سے ہماری کیا مراد ہے؟

ایمرسن نے کہا ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہمارے سامنے کا آسمان زیادہ نیلا ہو گیا ہے یا ہمارے باغوں میں گلاب زیادہ سرخ رنگ کے ہونے لگے

ہیں۔ ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہمارا ماحول بہتر ہو رہا ہے۔ ترقی کی یہ تعریف جزوی اعتبار سے صحیح ہے مگر ہمارے کلی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتی۔ ماحول کس چیز میں بہتر ہو رہا ہے؟ مادی سہولتوں اور آسائشوں میں؟ اسکول اور اسپتال زیادہ کھل رہے ہیں۔ لوگوں کو کام زیادہ مل رہا ہے۔ کام کی اُجرت زیادہ مل رہی ہے ماحول کی بہتری اور کسے کہتے ہیں؟ لیکن ترقی کے اور معنوں میں بھی موجودہ تہذیب ترقی کر رہی ہے تو کیا واقعی موجودہ تہذیب چند قنوطیت زدہ لوگوں کے بیمار ذہنوں کی پیداوار ہے

لیکن اقبال تو شاید قنوطیت زدہ لوگوں میں نہیں تھے۔ پھر ہمیں ان کے یہاں ایسے خیالات کیوں ملتے ہیں۔ اقبال کا نام میں نے مثالاً لیا ہے ورنہ یہ رونا تو بیسویں صدی کے کم و بیش تمام شاعروں اور ادیبوں کے یہاں عام ہے ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ادب اور شاعری کے زوال کو یہ لوگ تہذیب کا زوال کہتے ہوں۔ ہمارے یہاں کئی ارباب دانش اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ موجودہ زمانہ میں تہذیب کی عنان ترقی فلسفہ، شاعری اور ادب کے بجائے سائنس کے ہاتھ میں آگئی ہے اس لیے فلسفی شاعر اور ادیب حضرات اسے تہذیب کا زوال کہتے ہیں۔ ایک اسی سے ملتا جلتا خیال یہ ہے کہ تہذیب کے زوال کا رونا بالعموم شکست خوردہ متوسط طبقے کی طرف سے رو یا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ اب اپنا تاریخی رول ادا کر چکا ہے اور ختم ہو رہا ہے اس لیے اسے اپنا خاتمہ تہذیب کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ بادی النظر میں یہ خیالات ایسے نہیں ہیں کہ انہیں آسانی سے رد کیا جا سکے۔ ہمیں ان پر بار بار غور کرنا چاہیے۔ میں آپ کی فکر کے لیے چند سوالات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اور ہماری تہذیب ترقی سے ہمارا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ ترقی کا حقیقی معیار کیا ہے؟ اس سلسلہ میں، میں ایک طالب علم کی مثال پیش کرتا ہوں ہمیں جب اسکول سے اپنے بھائی بہن یا اپنے بچے کے بارے میں ترقی کی رپورٹ ملتی ہے تو اس کا مطلب ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ پڑھنے میں ترقی کر رہا ہے۔ اسی طرح بڑھئی کا کام سیکھنے والے کی ترقی یہ ہے کہ وہ بہتر بڑھئی بنتا جائے۔ بڑھئی کی ترقی کے معنی یہ کبھی نہیں ہوں گے وہ کرکٹ کھیلنے میں ہوشیار ہو گیا ہے۔ اسی طرح کرکٹ کھیلنے والے کی ترقی یہ نہ ہوگی کہ وہ کتابیں زیادہ پڑھنے لگا ہے۔ ترقی کا تعین دراصل اس چیز کے تعین سے ہوتا ہے جس کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے۔

چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ موجودہ تہذیب ترقی کر رہی ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ متعین کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ہماری تہذیب کس چیز کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح

تہذیب کے تنزل کا ذکر کرتے وقت ہمیں یہ متعین کرنا چاہیے کہ ہمارے نزدیک تہذیب کو کیا چیز حاصل کرنا چاہیے جو موجودہ تہذیب یا کوئی تہذیب حاصل نہیں کر رہی ہے۔ اس طرح یہ ساری بحث مقصد کے تعین کی بحث بن جاتی ہے جو لوگ تہذیب کی ترقی کا اثبات کرتے ہیں ان کے نزدیک تہذیب کا مقصد کچھ اور ہے اور جو اس کے تنزل کا تذکرہ کرتے ہیں ان کے نزدیک کچھ اور۔ یہاں پہنچ کر بحث حیات وکائنات کے بعض ایسے مسائل سے الجھ جاتی ہے جہاں بڑے بڑوں کے پر جلنے لگتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ تہذیب کی ترقی مادی ترقی ہے حالانکہ اس کی ترقی کو روحانی ہونا چاہیے۔ اس طرح ان کا نقطۂ نظر دو لفظوں میں یہ ہوتا ہے کہ موجودہ تہذیب حقیقی انسانی معیار یعنی روحانی ترقی کو حاصل نہیں کر رہی ہے اس کا مطلب کسی طرح مادی ترقی کو جھٹلانا نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے انکار کرنا ہوتا ہے کہ کوئی تہذیب صرف مادی ترقی کر کے ترقی یافتہ کہلا سکتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ تہذیب ترقی کر رہی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر مختصر الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ مادی ترقی ہی اصل ترقی ہے۔ آپ نے دیکھا اب بات قنوطیت زدہ دماغوں کی نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی نہ یہ شعراء و ادبا کا مسئلہ ہے نہ متوسط طبقہ کا۔ بلکہ اختلاف دراصل دونوں بنیادی نقطہ ہائے نظر کا ہے۔ اب یہاں سے ایک تیسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں درست کون سا ہے۔

کیا تہذیب کی حقیقی ترقی روحانی ترقی ہوتی ہے؟ یہ تو ہوا ایک سوال، پھر اس سوال سے بے شمار ضمنی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ روحانی ترقی کسے کہتے ہیں اور روحانی ترقی کیسے کی جاتی ہے؟ کیا روحانی ترقی کا مطلب ”ذکر و فکر خانقاہی“ ہے

کیا جن تہذیبوں نے روحانی ترقی کی وہ بہترین تہذیبیں تھیں؟ دوسری طرف مادی ترقی والوں سے بھی کئی سوال پوچھے جا سکتے ہیں۔ آپ چاند پر پہنچ رہے ہیں تو بہت اچھا کر رہے ہیں، مگر چاند پر پہنچنے کی انسانی معنویت کیا ہے؟ کیا وہاں پہنچ کر بھی آپ سٹے کا کاروبار شروع کریں گے؟ یہ تو صحیح ہے کہ آپ نے انسانی آسائش اور سہولت کا خاطر خواہ انتظام کر دیا ہے۔ مگر پھر انسان پہلے سے زیادہ دکھی، مجبور اور بے بس کیوں ہے؟ ہوائی جہاں نے دنیا کو ایک کر دیا، مگر انسان کے درمیان خود غرضی اور نفس پرستی کی دیواریں پہلے سے زیادہ اونچی کیوں ہو گئی ہیں؟ جب تک ہم ان دونوں فریقوں سے ان سوالات کا جواب حاصل نہ کر لیں اس وقت تک ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ترقی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور جب تک ہر ترقی کا حقیقی مفہوم متعین نہ کر لیں۔ اس وقت تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ موجودہ تہذیب ترقی کر رہی ہے یا تنزل کے راستہ پر گامزن ہے۔

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے جسے بہرحال ترقی کے راستے پر گامزن ہونا ہے۔ اس لیے ترقی کے مفہوم کا تعین اس کے لیے کوئی ذہنی مسئلہ نہیں بلکہ حقیقی ضرورت ہے۔ آج ہم جو بنیادیں اٹھائیں گے کل انہی پر ہماری اجتماعیت کی عمارت قائم ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقصد کے تعین سے پہلے حصول مقصد کی راہوں پر چل پڑیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہو کہ ہم کعبہ کے بجائے ترکستان پہنچ گئے ہیں۔

ہمیں بڑھئی بننا ہے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے اور کرکٹ کا کھلاڑی بننا ہے تو اس کا بھی علم ہونا چاہیے۔ میں جب پاکستان کے عوام اور رہنماؤں میں ترقی کا جوش دیکھتا ہوں تو مجھے حقیقی خوشی ہوتی ہے۔ ایک نئے ملک اور نئی قوم کی حیثیت سے ہمارا یہ جوش ہر طرح قابل تحسین ہے۔ مگر ہمیں بار بار ترقی، ترقی کہتے ہوئے اپنے آپ سے یہ پوچھنا نہیں بھولنا چاہیے کہ کس چیز میں ترقی ——

روحانی اور مادی ترقی کے بارے میں میں نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا سامنا دنیا کی اور قوموں کو جس طرح بھی کرنا پڑا ہو پاکستان میں یہ سوالات اتنے پریشان کن نہیں ہیں۔ دراصل ان سوالات کا جواب اسی وقت دے دیا گیا تھا جب حصول پاکستان کی تحریک چلائی گئی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ قیام پاکستان کی تحریک ان سوالات کا ایک جواب ہی تھی۔ حصول پاکستان کی تحریک میں ہمارا یہ دعویٰ تھا کہ دنیا کو جس نئے نظام حیات کی ضرورت ہے اور قوموں کا عالمگیر اضطراب جو سوالات پوچھ رہا ہے۔ اس کا جواب ہمارے پاس ہے۔ ہم دنیا کے سامنے اسلام کے نظام حیات کا تجربہ کر کے دکھا دیں گے کہ اسلام کس طرح دنیا بھر کے مسائل کا واحد جواب ہے۔ اس لیے ہمیں پاکستان میں "ترقی" کے مفہوم پر از سر نو بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مفہوم نہیں ہے۔ اگر پاکستان اس نصب العین کی طرف بڑھ رہا ہے جو اس کے قیام کی غایت ہے تو پاکستان ترقی کر رہا ہے اور اگر بڑھ رہا ہے تو ترقی نہیں کر رہا ہے۔ ہمارے لیے اس مسئلے میں دو دلے پن کی گنجائش نہیں ہے۔ پاکستان کی تقدیر پاکستان کے قیام کے وقت ہی متعین ہو چکی ہے۔

پاکستانی عوام اور پاکستانی رہنماؤں کو ترقی کا نام لیتے ہوئے پاکستان کی غایت تخلیق کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور ترقی کا ہر منصوبہ بناتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا یہ منصوبہ قیام پاکستان کے مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہے۔ ہم اس بات پر بہت پہلے متفق ہو چکے ہیں کہ اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بننا ہے۔ اب تو ہمیں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ سوچنا ہے کہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لیے کن کن مسائل سے گزرنا ہوگا یہی ہماری ترقی کی ابتدا ہوگی۔

کالم کی ابتدا میں میں نے اقبال کا نام خاص طور پر لیا تھا۔ اقبال کی مدد سے ہم ان منازل کا تعین

نسبتاً زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ ہمیں اقبال کے کلام کو صرف قوالی کی صورت میں سننے یا جلسہ جلوس میں گانے سے زیادہ پاکستان کی اجتماعی زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے میں لازمی طور پر اقبال کو اسلام کے سلسلے میں آخر نہیں سمجھتا۔ لیکن ان پر تنقید کے تمام دروازے کھلے رکھنے کے باوجود آغاز کار کے لیے اقبال کی اساسی اہمیت کا قائل ہوں۔

اقبال نے ہمیں اسلام کا یہ ابدی پیغام دل نشین انداز میں سنایا ہے کہ مادی ترقی کی نفی کیے بغیر اسے ہمارا مقصود و منتہا نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ تہذیب اگر صرف مادی ترقی کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیتی ہے تو اس تہذیب سے جنگ کرنا ہمارے اولین فرائض میں سے ہے ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

بشکریہ حریت، کراچی، ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

آج کا مسئلہ

پچھلے دنوں حلقۂ اربابِ ذوق میں شمیم احمد نے "تخلیق اور تنقید کے جائز رشتے" پر مضمون پڑھا تو مجھے یاد آیا کہ یادش بخیر ترقی پسند نقاد ایک زمانہ میں کہا کرتے تھے کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ لوگ جو ان کے مقاصد سے اتفاق نہیں کرتے تھے یا طریقِ کار سے اختلاف رکھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا، نیت کا حال خدا ہی کو معلوم ہے لیکن دونوں فریق اپنے دعوے اور جواب دعوے میں کچھ گھپلا بھی کرتے ہوں، ڈنڈی کہاں نہیں ماری جاتی اور پھر جنگ اور محبت میں تو سب کچھ جائز ہے لیکن ڈنڈی مارنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ ادب کے کھکھیڑ میں ایسا کون سا فائدہ ہے کہ آدمی ساری زندگی اکھاڑے میں گزار دے اور وہ بھی بے ایمانی کے داؤ پیچ میں بھی سب کرتب کر لیے ہیں تو ادب ہی کیوں، دنیا میں بہت سے دھندے پڑے ہیں۔ جو لوگ ترقی پسندوں کے مخالف تھے ان کا الزام یہی تھا، ترقی پسند ادب میں سیاست کا دھندا کرنے آئے ہیں اور سیاست بھی ایک خاص قسم کی۔ اس کے جواب میں ترقی پسند کہتے تھے کہ اگر ہمارے نظریہ کا اثبات ایک خاص قسم کی سیاست ہے تو اس نظریہ کی نفی بھی ایک خاص قسم کی سیاست ہے۔ اس زمانے میں ہمارے ایک دوست ایک دلچسپ بات کہا کرتے تھے کہ زمانہ کمیونسٹوں کا ہے اور آپ ان سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھے بغیر نہیں رہ سکتے یا آپ کمیونسٹ ہوں گے یا اینٹی کمیونسٹ۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ میں غالباً یہی رشتہ ہوتا ہے، تضاد کا رشتہ، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترقی پسند ٹھیک کہتے تھے؟

دوسروں کا حال تو مجھے نہیں معلوم، لیکن زوال پسندوں کے ترجمان محمد حسن عسکری اور ترقی

پسندوں کا اختلاف کچھ اور تھا، عسکری صاحب کہتے تھے کہ سیاست کے مردے سیاست میں گڑ جائیں اور ادب کے مردے ادب میں، یعنی ترقی پسند اپنے نظریہ سیاست کی حمایت میں جو چاہیں لکھیں، بس اسے ادب نہ کہیں ان کا کہنا تھا کہ سارے سچے ادیبوں نے وقت پڑنے پر ایسا ہی کیا ہے، مثلاً ٹینی سن نے جنگ کے خلاف نظمیں لکھیں، بعد میں انہیں یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ شاعری نہیں ہے، کیونکہ صرف تکلیف سے پیدا ہوئی ہے، دوسری مثال وہ فرانسیسی ادیبوں کی دیتے تھے، جواب مجھے یاد نہیں رہی، بظاہر یہ ایک سیدھی سی بات تھی، اور ترقی پسندوں کے "جوشش ایمانی" کو دیکھتے ہوئے ان سے بعید بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی ادبی حیثیت کی قربانی دے دیں پھر ادب یہ دعویٰ کرنے سے تو بنتا نہیں کہ یہ ادب ہے جس تحریر کو ادب بننا ہوتا ہے وہ اپنے آپ ادب بن جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو اپنے ادب ہونے سے انکار کے باوجود ادب کا شاہکار ٹھہرتی ہے مثلاً علامہ اقبال کو ہمیشہ یہ اصرار رہا کہ وہ شاعر نہیں ہیں، اور انہوں نے جو کچھ کہا ہے اسے شاعری کہنا ان کے ساتھ زیادتی ہے لیکن یہ زیادتی ان کے اور ان کے کلام کے ساتھ ہو کر رہی اور کون جانے کہ ان کی آخری قدر و قیمت اسی زیادتی کے ذریعہ متعین ہو، میر صاحب کا شعر ہے ؎

هم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

پتا چلا کہ ادیب یا شاعر ہونے اور ادب یا شاعری پیدا کرنے سے انکار کی ہمت بھی ادیبوں اور شاعروں ہی کو ہوتی ہے، ترقی پسندوں میں یہ ہمت نہیں تھی وہ اپنے جوشش ایمانی میں عسکری صاحب کے خلاف قرار دادیں تو منظور کرتے رہے، مگر کسی جیالے دیوانے نے یہ نہیں کہا کہ اے یار میرے، اپنے ادب اور شاعروں کو اپنے پاس رکھ، ہم تو جو کچھ لکھ رہے ہیں اپنے نظریہ یا سیاست کے لیے لکھ رہے ہیں، ادب اور شاعری نہیں ہے تو نہ سہی، خیر میں یہ کلیہ تو نہیں بناتا کہ کوئی ترقی پسند ایسا کہہ دیتا تو اس کی تحریریں سچ مچ ادب بن جاتیں......لیکن......شاید — کون جانے! کم از کم عسکری صاحب کا منہ تو بند ہو جاتا۔

اب ترقی پسندوں کا مقابلہ دو قسم کے لوگوں سے تھا، ایک تو وہ لوگ جو سچ مچ ایک خاص قسم کی سیاست کے باعث نظریہ کی نفی کرتے تھے...... (ان کا نام میں نہیں لوں گا، آپ سب انہیں جانتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان میں سے بعض اب ہوا کا رخ دیکھ کر ترقی پسند بھی

بن بیٹھے ہیں) اور دوسرے وہ لوگ تھے جن کو نظریہ کے اثبات یا نفی سے غرض نہیں تھی، ــــــــــــ

ــــــــــــ بلکہ جن کا کہنا یہ تھا کہ ترقی پسند جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کی ادبی حیثیت کچھ نہیں ہے، "یا کچھ نہیں" سے صرف "کچھ" ہی زیادہ ہے۔ پہلے قسم کے لوگوں کو ان کی سیاست بڑے بڑے سرکاری عہدوں یا امریکی وظیفوں تک لے گئی جو اس رتبہ تک نہیں پہنچے، انہیں یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ وہ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رہے، ان کے یہاں نظریہ سے انکار ادب کی سنجیدہ اہمیت سے انکار ہو گیا انہوں نے ادب کو صرف تفریحی چیز بنا کر پیش کیا اور تفریح بھی ذرا ہلکی پھلکی، ان کی تخلیقات اس امر کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے ادب کو نہ تو انسانی روح کی تفتیش کا اعلیٰ ذریعہ بنایا نہ انسانی تقدیر کے انکشاف کا، ان میں نہ زندگی کی کوئی گہری بصیرت ملتی ہے، نہ انسان اور انسانیت کے مسائل پر کسی تشویش یا تردد کا اظہار ہوتا ہے، یہ ان باتوں کو اتنی بھی اہمیت نہیں دیتے جتنی اپنی تنخواہ کو دیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، ان کا ادب یا تو بے معنی تجربہ پرستی کا شکار ہے، یا لب ولہجہ کی ایک ایسی موہوم سوگواری میں پھنس کر رہ گیا ہے، جس سے بقول عسکری صاحب صرف اداس بھیڑوں کا ادب پیدا ہوتا ہے۔

یہاں بعض لوگ مجھے یاد دلائیں گے کہ حسب معمول میں نے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی ہے اور عسکری صاحب اور ان کے نام نہاد مقلدوں کو صاف بچا لے جانے کی کوشش کی ہے، بات یوں نہیں ہے کہ یہ لوگ نظریہ کے اثبات یا نفی سے غرض نہ رکھتے ہوں اور صرف شعری یا نثری تحریروں پر عمل جراحی کر کے ادبی یا غیر ادبی آلائشیں نکال لینے ہی سے سروکار رکھتے ہوں۔ عسکری صاحب کی تحریروں میں جا بجا یہ اعلان ملتا ہے کہ ادب نظریہ سے پیدا نہیں ہوتا، میں اس یاد دہانی کا شکر گزار ہوں اور مجھے اس امر واقعہ سے انکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بے شک عسکری صاحب نے ایسا لکھا ہے اور ان کے نام نہاد مقلدوں نے بھی

میرا جواب صرف اتنا ہے کہ نظریہ کی نفی اور نفی کا نظریہ ایک چیز نہیں ہیں، اور اس بھیڑوں کا ادب پیدا کرنے والا گروہ نظریہ کی نفی نہیں کرتا بلکہ نفی کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے میں دعوی اور جواب دعوی دونوں کو ایک بار پھر آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔

ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا۔

سرسری طور پر دیکھا جائے تو پہلا گروہ نظریہ کا اثبات کرتا ہے اور دوسرا گروہ نظریہ کی نفی۔

مگر درحقیقت دونوں گروہ نظریہ کا اثبات کرتے ہیں ان میں جو فرق ہے وہ نظریہ کے اثبات یا نفی کا نہیں ہے فرق صرف یہ ہے کہ دونوں متضاد نظریات کے حامل ہیں، یاد رکھیے متضاد نظریات یعنی نظریہ دونوں طرف موجود ہے۔ نظریہ کی نفی اس طرح نہیں ہوتی۔ نظریہ کی نفی کے لیے ضروری ہے کہ بیک وقت دونوں باتوں کی تردید کریں یہ غلط ہے کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا، یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ بیک وقت دونوں باتوں کی تائید کی جائے، یہ صحیح ہے کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا۔ ...... واہ! کیا تھالی کا بینگن ہے کہ دونوں طرف لڑھک رہا ہے!

آپ کا بھینگا سر آنکھوں پر، مگر نظریہ کی نفی کے لیے تھالی کا بینگن بنے بغیر چارہ بھی نہیں۔

دونوں طرف لڑھکنے یا متضاد حقیقتوں کی بیک وقت تائید یا تردید کرنے کا صرف ایک ہی مطلب ہے۔ یہ کہ دونوں حقیقتیں اضافی ہیں اور ان میں ہر ایک جزوی طور پر اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اپنی ہی جیسی دوسری حقیقت سے تعلق رکھتی ہے اس لیے ہمیں انہیں ایک دوسرے کے رشتوں میں دیکھنا چاہیے۔ اس کے برعکس نظریہ اپنی دریافت کردہ حقیقت کو مطلق قرار دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح نظریہ سازی کا عمل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جو باتیں اپنی تائید میں نظر آئیں انہیں قبول کر لیا جائے اور جو باتیں اس کے برعکس ہوں ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ نظریہ کی یہ تعریف اگر صحیح ہے تو نظریہ کی نفی کا مطلب ہے۔ اضافی حقیقتوں کو اضافی سمجھنا اور انہیں ان کے مجموعی نظام میں اپنے اپنے مقام پر رکھ کر ان کے باہمی رشتوں میں دیکھنا۔ تھالی کے بینگن کی خوبی ہی یہ ہے کہ تھالی کی ہر حرکت کے ساتھ اپنا مقام بدل لیتا ہے۔

لیکن ...... ذرا توقف فرمائیے۔ یہاں میں اپنے بینگن کو جدید اردو ادب کی تھالی میں لڑھکاتا ہوں اور پھر دیکھیں گے کہ کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ پہلے تائید کی صورت کو لیجیے۔

یہ صحیح ہے کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کیسے؟ اقبال کی شاعری نظریہ سے پیدا ہوئی ہے ٹھیک! اور حالی کی قومی نظمیں؟ ہاں کیوں نہیں اور پریم چند کا افسانہ؟ ٹھیک اور جوش کی انقلابی شاعری؟ درست۔ اور فیض چلیے یہ بھی سہی۔ باقی اپنی پسند کے نام آپ خود بڑھا لیں اور اپنے نظریہ کی تائید کے طور پر شامل کر لیں۔ یہ بینگن کی ایک پوزیشن ہے۔

بینگن کی دوسری پوزیشن یہ ہے کہ ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی مثالیں مناسب ہے کہ آپ خود ڈھونڈ لیں کیونکہ سردار جعفری سے نیاز حیدر اور جگن ناتھ آزاد سے گوپال متل تک میری فہرست بہت لمبی ہے ...... اچھا اس وقت تک ہم اپنے بینگن کو دیکھتے ہیں۔

۱۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ ہمارے ادب کا ایک وسیع حصہ ہے جو نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادب نظریہ سے پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ کیا یہ بات درست ہے کہ نظریہ کے نام پر ہمارے سامنے بہت سی ایسی چیزیں رکھی گئی ہیں جو ادب نہیں ہیں اگر یہ درست ہے تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔

نتیجہ: بینگن کی دونوں پوزیشنیں درست ہیں اور بینگن کو حق حاصل ہے کہ جب کسی طرف سے یہ دعویٰ کیا جائے کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخالف سمت میں لڑھک جائے اور کہے کہ ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا۔ اور جب کسی طرف سے اس کے برعکس دعویٰ ہو تو بینگن کے لیے دوسری پوزیشن موجود ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ ادب نظریہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اب غالباً آپ کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ محمد حسن عسکری ترقی پسندوں کے مقابلے پر کیوں کہتے تھے کہ ادب نظریہ سے نہیں پیدا ہوتا......... صاحب بینگن اگر بینگن ہے تو لڑھکے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علاج؟ بینگن کا بھرتہ بنا لیجیے... بعض لوگ بینگن کا بھرتہ اس طرح بناتے ہیں کہ ہر قسم کی صداقت سے انکار کر دیتے ہیں۔ جدید دور کا سارا ذہنی مزاج اسی بھرتے سے پیدا ہوا ہے۔

اچھا اب تک ہم نے جو گفتگو کی ہے اس کے موٹے موٹے نتائج کیا ہیں؟

دو متضاد نظریوں کی جنگ درحقیقت دو جزوی حقیقتوں کی جنگ ہوتی ہے اور اس جنگ کا محرک جزوی صداقتوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کلی صداقت بن جائیں۔ ورنہ اپنے اپنے مقام پر دونوں میں کوئی جنگ نہیں۔ چنانچہ ہم ادب میں نظریہ کی نفی کرتے ہیں تو اس سے ہمارا اور مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم متضاد حقیقتوں کو ان کی اضافی حیثیت میں دیکھتے ہیں اور اپنے اپنے مقام پر ان کی جو حیثیت ہے اسے تسلیم کرتے ہیں۔ جب ہم کسی ادب کو نظریاتی کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد ہوتی ہے کہ اس میں کسی جزوی حقیقت کو کلی صداقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ پر غیر نظریاتی ادب وہ ہوگا جس میں جزوی حقیقت کو جزوی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہو اور اسے اس کی متضاد حقیقت کے رشتے کے ساتھ دیکھا گیا ہو۔

لیکن اردو میں غیر نظریاتی ادب کے ایک اور معنی ہیں — ایسا ادب جس میں کسی حقیقت کو دیکھا ہی نہ گیا ہو۔ یعنی اداس بھیڑوں کا ادب عرف بینگن کا بھرتہ۔

خیر بھرتے میں کیا مضائقہ ہے، لیکن اس کے بعد کیا کھائیے گا؟

بشکریہ حریت، کراچی ۱۶ نومبر ۱۹۶۸ء

اِصلاحِ معاشرہ

معاشرے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمارا سب سے اہم مسئلہ اصلاحِ معاشرہ ہے ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جو طرح طرح کی بدعنوانیوں کی زد میں ہے۔ لوگوں کی اخلاقی زندگی تباہ ہو چکی ہے اور انسانی رشتوں کی ساری شکلیں زہر آلود ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف حساس لوگوں کے لیے اذیت اور کرب کا باعث نہیں ہے بلکہ معاشرے کے عام افراد کے لیے بھی ناقابلِ برداشت بن گئی ہے۔ خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی موثر کوششیں بہت جلد نہ شروع کی گئیں تو معاشرہ اخلاق اور قانون کی ہر پابندی سے آزاد ہو کر ایک ایسے فساد اور انتشار کا شکار ہو جائے گا جس کا تدارک ممکن نہ ہو گا۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال صرف ہمارے معاشرے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام دنیا ایک اخلاقی بحران سے گزر رہی ہے اور اس کا تجزیہ صرف اس وقت ممکن ہے جب اسے عالم گیر مسائل کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک یہ مسئلہ اخلاقی نہیں بلکہ معاشی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصّہ وہ جو معاش کے تمام ذرائع پر قابض ہے اور زندگی کی ساری آسائشیں اور سہولتیں اس کے لیے وقف ہیں جبکہ دوسرا حصّہ اس سے محروم ہے اور افلاس اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ دونوں گروہ تنازع للبقا کے عمل میں مبتلا ہیں اور نتیجے کے طور پر اخلاق ایک غیر متعلق سوال بن کر رہ گیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم کی جائے اور دونوں گروہوں کے تضاد، تخالف اور مسابقت کی لا مختتم دوڑ کو ختم کیا جائے۔ اس گروہ کے نزدیک انفرادی اخلاق کے کوئی معنی نہیں اور معاشرتی فساد کا حل انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔

اس کے مقابلے پر ایک دوسرا گروہ انفرادی اخلاق کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ بڑی اجتماعی تبدیلیاں بھی افراد کے ذریعے ہی ظہور میں آتی ہیں۔ دولت کی منصفانہ تقسیم، عدلِ عمرانی کا تصور اور اجتماعی انقلاب کا عمل بھی ایسے افراد کی موجودگی کا محتاج ہے جو ان اصولوں پر یقین رکھتے

ہوں اور معاشرے کو اُن کی بنیاد پر تبدیل کرنا چاہتے ہوں۔ اب اگر یہ لوگ خود بدعنوان ہوں اور اخلاقی اعتبار سے درست نہ ہوں تو وہ معاشرے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انقلاب ایک انقلابی جماعت کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور اس انقلابی جماعت کے افراد کا اخلاقی ہونا انقلاب کی لازمی شرط ہے۔

بدقسمتی سے ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو مجادلوں اور مناظروں کا موضوع بنا لیا گیا ہے اور فکری طور پر دونوں گروہ دو نظاموں کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندہ ہیں جب کہ معاشی نقطۂ نظر رکھنے والے اشتراکی نظام کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کی نیتوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ معاشی نقطۂ نظر والے اخلاقی نقطۂ نظر والوں پر الزام لگاتے ہیں کہ ان کا مقصد صرف استحصال کو تقویت پہنچانا ہے۔ ان کے نزدیک مفلوک الحال عوام کو اخلاق کا سبق پڑھانے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھیں اپنی معاشی حالت کی تبدیلی سے روکا جائے اور اس کے مقابلے پر سرمایہ داروں کو ہر قسم کی لوٹ مار کی اجازت دے دی جائے جب کہ انقلاب کا تقاضہ یہ ہے کہ عوام کو اپنی محرومیوں کا زیادہ سے زیادہ احساس ہو اور وہ اسے تبدیل کرنے کے لیے کوشاں ہوں، چناں چہ انقلاب طبقاتی کشمکش کو شدید سے شدید تر کرنے کا متقاضی ہے نہ کہ اخلاقی درس و تدریس کا۔ دوسرا گروہ طبقاتی کشمکش کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر رکھنے والوں پر معاشرتی انتشار پیدا کرنے اور معاشرے کے امن و سکون کو غارت کرنے کا الزام لگاتا ہے۔

اب اس صورتِ حال میں ہمارے لیے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہم مسئلے کا تجزیہ کن اصطلاحوں میں کرتے ہیں اور اس کے حل کے لیے کیا تجویز پیش کرتے ہیں۔ سچائی سے بات کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ ہمارے یہاں مسئلے کے تجزیے اور وضاحت کے لیے اتنا غور نہیں کیا گیا ہے جتنا ضروری ہے۔ عام طور پر ہم اخلاقی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہیں اور معاشی نقطۂ نظر کو غیر اسلامی سمجھ کر اسے چنداں اہمیت نہیں دیتے یا مناسب غور و فکر کے بغیر رد کر دیتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر جو رویہ پیدا ہوتا ہے اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں اخلاقی اصولوں پر زور دیتے رہنا چاہیے اور ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ ہم لوگوں کو بتا دیں کہ اخلاقی اعتبار سے کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بری۔ چناں چہ دن رات تبلیغ و اشاعت کے تمام مرکز لوگوں کو اخلاق کا درس دینے میں لگے رہتے ہیں اور بے بسی سے یہ مشاہدہ کرنے کے باوجود

کہ اس سے لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہ خواب دیکھتے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی دن کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑے گا۔ اس سلسلے میں ہمارا استدلال جن منزلوں سے گزرتا ہے وہ یہ ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اسلام نے ہمیں اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو ہمیں اس تعلیم پر عمل کرنا چاہیے۔ اب رہا یہ سوال کہ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہم اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر عمل نہ کریں تو معاشرے کی اصلاح کس طرح کی جائے اس پر ہم کوئی غور نہیں کرتے حالانکہ اصل مسئلہ یہی ہے۔ اخلاقی تعلیم پر اگر عمل کیا جائے تو اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے، لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، اس لیے حقیقی سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں کیا کیا جائے؟

معاشی اور اجتماعی نقطۂ نظر یہیں ہمارے کام آتا ہے۔ اشتراکیت پر ہمیں جو بھی اعتراض ہو، لیکن معاشی اور اجتماعی تجزیے صرف اشتراکیت کی میراث نہیں ہیں۔ ہمیں اشتراکیت کی فلسفیانہ اساس یعنی جدلیاتی مادیت پر اعتراض ہے، ہم اس کی تاریخی جبریت کے نظریے سے بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ اشتراکی ریاستوں میں جبر و تشدد کا جو نظام رائج ہے وہ ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، لیکن اس کے معنی یہ کسی طرح بھی نہیں ہیں کہ اشتراکیت میں صداقت کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں میں جُزوی صداقت موجود ہے۔ جُزوی صداقت کو اگر جُزوی صداقت رہنے دیا جائے تو اسے اس کے حدود میں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جھگڑا اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب جزوی صداقت کو بھی صداقت منوانے کی ضد کی جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہمیں اشتراکیت کی معاشی ہمہ اوست تو قبول نہیں ہے، لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کے جو تجزیے اشتراکیت نے کیے ہیں اُن میں بہت کچھ صداقت موجود ہے۔ ان تجزیوں سے واقفیت اور اُن پر مناسب غور و فکر ہمارے لیے اس سبب سے ضروری بلکہ لازمی ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہ خالص اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ اس میں بہت سے عناصر ایسے موجود ہیں جو غیر اسلامی معیشت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عناصر ہماری معاشرت میں غیر ملکی حکومت کے دو سو سالہ اقتدار میں پیدا ہوئے اور اب ہماری اجتماعی زندگی کا حصہ ہیں۔ ہماری زندگی اُن کے اثرات کے تحت آ چکی ہے۔ ہم ان اثرات کو پوری طرح سمجھے بغیر اپنی اجتماعی زندگی کے کسی بھی منظر کی تشریح نہیں کر سکتے۔ غیر ملکی حکومت سے پہلے ہم جس معاشرے میں رہتے تھے وہ ایک اخلاقی معاشرہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشرے میں فرد خاندان اور اجتماع کے لیے ایسے زندہ رشتے موجود تھے جن میں اخلاقی تربیت کا نظام موثر ثابت ہوتا تھا تب لوگوں کے رشتے شخصی نوعیت کے تھے لوگ چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں رہتے تھے جن میں افراد کا ایک دوسرے سے قریبی

اور حقیقی تعلق ہوتا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر پوری معاشرت میں اخلاقی روک تھام کا ایک ایسا نظام موجود تھا جو افراد کو بہت سے ایسے کاموں سے مؤثر طور روک سکتا تھا جو معاشرے میں ناپسندیدہ سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس معاشرت میں خود کفیل آبادیوں کی موجودگی ان میں معاشی مسابقت کی وہ بھاگ دوڑ بھی پیدا نہیں ہونے دیتی تھی جو ہماری موجودہ معاشرت میں ایک فتنہ بن گئی ہے۔ میرے لیے فی الحال یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں قدیم اور جدید معاشرت کے تمام امتیازی اختلافات کو تفصیل سے بیان کر سکوں، لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری جدید معاشرت اور اس کے مسائل قدیم معاشرت کے مسائل سے مختلف ہیں اور ہمیں انھیں گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اشتراکیت مذہب کو نہیں مانتی اور بحیثیتِ مجموعی ایک باطل نظام ہے جو انسانی فطرت اور اس کے مطالبات کے ایک سطحی اور یک رُخے تصور پر قائم ہے، لیکن اشتراکی تجزیوں نے ہمیں یہ بات ضرور بتائی ہے کہ ایک سرمایہ دارانہ معاشرت میں مذہب کی کیا درگت بنتی ہے۔ ان تجزیوں کی روشنی میں ہم طرزِ احساس، طرزِ خیال اور طرزِ عمل کی ان تبدیلیوں کو سمجھ سکتے ہیں جو سرمایہ دارانہ معیشت میں مذہب کو صرف زبانی جمع خرچ کی چیز بنا دیتے ہیں۔ وہ ہمیں سائنسی صداقت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں پورے معاشرے کا **واحد محرکِ عمل** زر اندوزی بن جاتا ہے۔ اور مذہب کی اصلی تعلیمات سرمایہ داروں کی **باہوں میں صرف** اپنے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ روزمرّہ کے حقائق ہیں جنھیں ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں، لیکن معاشی تجزیہ اس صورتِ حال کی نشان دہی کے بعد اس کا حل صرف یہ تجویز کرتا ہے کہ ذرائع معاش کو افراد کے قبضے سے نکال لیا جائے اور انھیں اجتماعی قبضے میں دے دیا جائے۔ وہ ہمیں یہ تو بتاتا ہے کہ معیشت میں ساری خرابی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ سرمایہ دار پیسہ جمع کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ سرمایہ دار پیسہ کیوں جمع کرنا چاہتا ہے؟ اس کے نتیجے کے طور پر وہ انسانوں کی داخلی زندگی میں کسی تبدیلی کے بغیر صرف خارجی تبدیلی کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ماحول کو بدل دینے سے آدمی خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں انفرادی اور اخلاقی نقطۂ نظر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے نزدیک انسان صرف ماحول کو درست کرنے سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ افراد کی داخلی تبدیلیاں پورے ماحول کو بدلنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔

اس لیے اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کو اندر اور باہر دونوں طرف سے بدلا جائے۔ اس میں داخلی تبدیلیاں بھی کی جائیں اور اس کے ماحول کو بھی درست کیا جائے۔ داخلی تبدیلی کے

معنی افراد میں تبدیلی کے ہیں اور ماحول میں تبدیلی اجتماع میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مختصر لفظوں میں ہمیں انفرادی اخلاق کی ضرورت بھی ہے اور اجتماعی قانون کی بھی۔ اس لیے اسلام صرف انفرادی یا صرف اجتماعی تصورات پیش کرنے کے بجائے ایسے تصورات پیش کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہوں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد کی زندگیوں کو بھی تبدیل کیا اور اس کے بعد ایک ریاست کی بنیاد بھی رکھی جس کی اساس اسلامی قوانین پر تھی۔ یہ قوانین اور اخلاقی زندگی مل کر ہی انسانی فوز و فلاح کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے آج کل اسلامی نظام کے نفاذ کا بہت چرچا ہے۔ اس کے لیے کوششیں بھی ہو رہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی لوگوں کے دلوں میں یہ خوف بھی موجود ہے کہ معاشرے کی موجودہ حالت میں یہ نظام موثر ثابت ہوگا یا نہیں۔ ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ نظام ہمیشہ قوانین سے تعلق رکھتا ہے اور خارج سے عائد کیا جاتا ہے، اس لیے اسلامی نظام کے معنی صرف یہ ہیں کہ قوانین کو اسلام کے تابع کر دیا جائے، لیکن قانون کا دائرۂ اثر ہمیشہ محدود ہوتا ہے وہ کبھی پوری زندگی کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر یہ قانون تو بنایا جا سکتا ہے کہ رشوت نہ لی جائے یا سُودی کاروبار نہ کیا جائے، لیکن یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ ہر شخص اپنے پڑوسی سے محبت کرے اور اُس کے حقوق ادا کرے۔ اسلام کی بنیاد ایمان، تقویٰ اور اللہ کے خوف اور محبت پر ہے۔ اور یہ داخلی متعلقات ہیں جو افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں اجتماعی قوانین کے تحت نہیں لایا جا سکتا، اس لیے صرف اسلامی نظام کے تصور میں وہی خرابی موجود ہے جسے ہم اشتراکیت کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔ نظام ہمارے ماحول کو بدل سکتا ہے مگر خود ہمیں اندر سے نہیں بدل سکتا، اس لیے ہمیں ماننا چاہیے کہ ہمارے نظام میں کوئی بھی تبدیلی صرف اس وقت کارگر ثابت ہوگی جب ہم خود بھی اندر سے تبدیل ہوں۔ رشوت لینے کا قانون صرف اُس وقت موثر ہوگا جب ہمارے ماحول سے رشوت کے محرکات ختم کر دیے جائیں گے اور ساتھ ہی ہم باطنی طور پر اخلاقی معنوں میں رشوت کو بُرا سمجھیں گے۔

اس مختصر سی بحث کے بعد ہم اپنے سوال کی طرف لوٹتے ہیں۔ اصلاحِ معاشرہ کس طرح ممکن ہے؟ معاشی تجزیے کی مدد سے ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاشرے میں معاشی ناہمواری موجود ہے ایک طرف وہ لوگ ہیں جو معاش کے تمام وسائل پر قابض ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس خالی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کی وجہ سے دونوں طبقات میں تضاد اور تخالف پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی افراد میں معاشی مسابقت کی دوڑ شروع ہوتی ہے جو مذہب اور اخلاق

سب کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ معاشرے سے معاشی عدم توازن کو ختم کیا جائے اور ایسے قوانین بنائے جائیں جو امیروں کو امیر اور غریبوں کو غریب تر نہ بننے دیں اور دوسری طرف اخلاقی تعلیم کے ذریعے لوگوں کو بتایا جائے کہ صرف معاشی مسابقت ہی زندگی کا واحد مقصد نہیں ہے۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے اگر سُودی کاروبار کو قانوناً ختم کر دیا جائے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے اور اسلام کے قانونِ وراثت پر عمل کیا جائے تو معاشرے میں ناہموار معاشی تفاوت کا سدِّباب کیا جا سکتا ہے۔ سُودی کاروبار سرمایہ دارانہ نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے خاتمے سے وہ بنیاد منہدم ہو جائے گی جس پر سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد نظامِ زکوٰۃ اور قانونِ وراثت کا نفاذ معاشرے میں انقلابی تبدیلیوں کا دروازہ کھولے گا۔ یہ اجتماعی بُرائیاں دُور ہوں گی تو اخلاقی طور پر افراد کی اصلاح کا کام آسان ہو جائے گا۔ یوں ہمارے معاشرے میں اسلام قوانین و اخلاقیات کا مجموعہ ہوگا۔ اور یہ کہ اسلام انسانی زندگی کو بطور ایک کُل کے دیکھتا ہے اور اُس کے ایک ایک جزو کی اصلاح کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اسلام کا یہی مکمل تصور اسے عہدِ جدید کے جُزوی نظریات سے مختلف بناتا ہے چاہے وہ جُزوی نظریات سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کے حامل ہوں چاہے اشتراکی نقطۂ نظر کے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں انسانوں کا واحد محرک عمل زر اندوزی کا جذبہ بن جاتا ہے وہ معاشی بالادستی کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اُن کے نفسِ باطن میں یہ بات گہرائی تک اُتر جاتی ہے کہ اگر اُن کے پاس پیسہ ہے تو سب کچھ ہے۔ اور پیسہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دولت انسان کی بہت پُرانی کمزوری ہے اور دولت کے ذریعے انسان کو جو عزت، آسائش اور سہولت حاصل ہوتی ہے وہ ہر زمانے میں انسانوں کے لیے ایک پسندیدہ چیز رہی ہے، اس لیے ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ زر اندوزی کی خواہش ایک اہم محرک عمل ہے جو ہر دور میں موجود رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اس سے پہلے جو انسانی معاشرے تھے اُن میں فرق یہ نہیں ہے کہ ایک میں زر اندوزی کی خواہش معدوم ہے اور دوسرے میں موجود۔ بلکہ فرق تناسب اور توازن کا ہے پُرانے معاشرے میں زر اندوزی کی خواہش موجود رہی ہے، لیکن اس کے مقابلے پر ایسی قوتیں بھی موجود رہی ہیں جو اس خواہش کو اس کی جائز حدود میں رکھنے کی کوشش کرتی رہی ہیں ان قوتوں میں مذہب سب سے اہم ہے۔

ہمارے یہاں سرمایہ دارانہ نظام کی آمد سے پہلے جو معاشرہ قائم تھا اس میں حیاتِ اخروی کو حیاتِ دنیوی پر ترجیح حاصل تھی۔ آخرت کے مذہبی عقیدے سے جو اخلاقیات پیدا ہوئی تھی اس میں

اکلِ حلال، قناعت اور توکل، حرص و ہوس سے اجتناب بنیادی قدریں تھیں۔ اس کے علاوہ معاشرے میں عزت اور ذلت کے پیمانے بھی مختلف تھے۔ شرافت، دیانت، علم، حسنِ اخلاق اور مروت کو اہمیت دی جاتی تھی اور دنیا پرستی کو رذائلِ اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں سے مل کر لوگوں کا ایک طرزِ عمل بنتا تھا جو معاشرے میں زر پرستی کے رجحان کی روک تھام کرتا تھا۔ لوگوں کے پیشے موروثی ہوتے تھے اور ان کے پیچھے صدیوں کی روایات قائم تھیں کہ کس پیشے کے آدمی کو کیسا ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ عوام کی اکثریت چھوٹی چھوٹی دیہی آبادیوں میں رہتی تھی جہاں لوگوں کا ایک دوسرے سے تعلق قریبی اور شخصی ہوتا تھا۔ یہ تعلق ہر فرد کے رویے اور طرزِ عمل پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کرتا تھا جن کو توڑنا کسی حالت میں بھی پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے معاشرے کے اس پورے نظام کو توڑ دیا۔ مذہب، اخلاق اور سماجی ترجیحات کے اثرات کمزور ہونے شروع ہوئے اور اُن کے بارے میں لوگوں کے وہ رویے نہیں رہے جو پورے معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرتے تھے۔ سب سے بڑی تبدیلی موروثی پیشوں کے نظام کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی۔ یہ روایات کے ایک پورے سانچے کے ٹوٹنے کا عمل تھا جس نے لوگوں کے طرزِ ادا، طرزِ خیال اور طرزِ عمل کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ پھر چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا اولین تقاضہ یہ تھا کہ شہری آبادیوں میں اضافہ ہو اور وہ مرکز قائم ہوں جن میں سرمایہ دارانہ نظام پوری طرح بروئے کار آسکے، اس لیے دیہی آبادی رفتہ رفتہ شہروں میں منتقل ہونے لگی۔ شہروں میں جدید تعلیم، پیشے کی نئی سہولتوں اور روایات کی عدم موجودگی نے ایک ایسی زندگی کی شکل اختیار کرلی جس میں ہر فرد وہ کرنے کے لیے آزاد تھا جو اُس کی خواہش کے مطابق ہو۔ پرانے بندھنوں کا ٹوٹنا اور ایک نسبتاً زیادہ آزاد اور دلیر معاشرت کا پیدا ہونا سرمایہ داری کے اہم ترین نتائج میں سے ایک ہے۔ مذہبی اخلاقی، معاشرتی موروثی اور خاندانی روایات سے آزاد شہری آبادیاں اپنے نئے مسائل پیدا کرنے لگیں۔ یہ عمل سست رفتار مگر تقدیر کی طرح اٹل اور متعین تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم اور جدید رویے ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہے، لیکن ان کا مجموعی نتیجہ جدید رویوں کی تقویت کی صورت میں برآمد ہوا۔

اب سرمایہ داری کے تحت جو معاشرہ پیدا ہوا ہے اُس میں دنیاوی کامیابی قدرِ غالب کی حیثیت رکھتی ہے اور ان انفرادی اور اجتماعی رویوں کی تشکیل کرتی ہے جن میں زر اندوزی سب سے زیادہ اہم ہے۔ ابھی ہمارے شہروں میں ایسے لوگ کثیر تعداد میں رہتے ہیں جن کی جڑیں دیہی زندگی میں موجود ہیں۔ وہ شہروں میں روزی کمانے کے لیے آتے ہیں اور پیسہ بنا کر پھر اپنے علاقوں میں چلے جاتے ہیں یا آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ ان کے رویوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ شہروں میں جو طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں وہ

اُس طرزِ عمل سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو وہ اپنے علاقوں میں اختیار کرتے ہیں۔ وہاں وہ ان آزادیوں کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو انھیں شہروں میں حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیہی آبادیاں بھی رفتہ رفتہ شہری آبادیوں کے زیرِ اثر آ رہی ہیں جس کی وجہ سے وہاں بھی پرانے رشتوں کی شکست و ریخت کا عمل اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ گاؤں کا ایک آدمی جب شہر سے واپس جا کر وہاں کے لوگوں کے سامنے اپنی "فتوحات" کا نمونہ پیش کرتا ہے تو اُس کا اثر گاؤں والوں کی نفسیات پر اتنا ہی گہرا ہوتا ہے جتنا شہری آبادی کے لوگوں پر۔ اس کے ذریعے وہ پرانے طرزِ احساس اور طرزِ عمل کو چھوڑنے اور نیا طرزِ احساس اور نیا طرزِ عمل اختیار کرنے پر راغب ہوتے ہیں۔ اخلاق اور کردار کے بجائے اب یہ خارجی فتوحات زیادہ اہم ہو جاتی ہیں اور لوگ اُن کے ذریعے زندگی کا ایک نیا تصوّر حاصل کرنے لگتے ہیں۔

یہ داستان اتنی لمبی ہے کہ اس کی تفصیلات کو آسانی سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر طور پر ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ داری کا فرد پرانے معاشرے کے فرد سے ایک مختلف دنیا میں رہتا ہے اور ایک بالکل نئی نفسیات کا حامل ہے۔ اس کی زندگی کی قدریں وہ نہیں ہیں جو پرانے معاشرے کی قدریں تھیں اور وہ ایک ایسی ذہنیت کا مالک ہے جو اُس کے آبا و اجداد میں موجود نہیں تھی۔

دراصل سرمایہ داری نظام کلا ہی وہ فرد ہے جس کے بارے میں ہم نے یہ کہا ہے کہ اس کا واحد محرکِ عمل زر اندوزی کا جذبہ ہے۔ اس میں وہ دونوں طبقات شامل ہیں جنھیں سرمایہ دار اور عوام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں معاشی اعتبار سے یہ فرق ضرور ہے کہ ایک کے پاس سب کچھ ہے اور دوسرے کے پاس کچھ نہیں، لیکن ان کی مجموعی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی زر اندوزی کے جنون میں مبتلا ہیں چاہے کام یابی کے اعتبار سے کسی درجے پر ہوں۔ وہ طبقاتی کشمکش جس کا ذکر اشتراکی اپنے معاشی تجزیوں میں کرتے ہیں انھی افراد پر مشتمل مختلف طبقات کی کشمکش ہے اس لیے اشتراکی ہمیشہ سماجی شعور پر زور دیتے ہیں جس کا مطلب ایک ایسا شعور ہوتا ہے جو اُن کے افراد کے اندر پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ احساس کہ پیسہ ہی سب کچھ ہے اور زندگی کا واحد مقصد معاشی خوش حالی یا بالادستی حاصل کرنا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں اسی شعور کی پیداوار ہیں اور اپنی باہمی زور آزمائی کے باوجود ایک دوسرے کے ضمیمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہم نے اب تک جو بحث کی ہے اُس کا ہماری پوری بات سے یہ تعلق ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی اخلاقیات کو جو چیلنج درپیش ہے اُس کے دو رُخ ہیں۔ ایک طرف تو ہمیں ایسے قوانین بنانے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے اس فرد کی ہوسِ زر اندوزی کو خارجی طور پر روک سکیں، دوسری طرف ہمیں ایسی اخلاقی اقدار کی تبلیغ و اشاعت کرنی ہے جو اس کی مجموعی ذہنیت کو اندر سے بدل سکیں۔

قوانین خارجی پابندیاں عائد کریں گے اخلاقیات داخلی تنظیم کرے گی، لیکن یہ عمل ایک خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وضاحت کے ساتھ اس کی نشان دہی کردوں۔ ہمارے پرانے معاشرے میں بڑی خوبیاں تھیں لیکن اس میں ایک بہت بڑی خامی بھی تھی۔ اس کی قوتِ عمل مسلسل ضائع ہو رہی تھی اور اس کا نتیجہ اس مسلسل انحطاط کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا جو عہدِ جدید کے آغاز سے پہلے ہمارے معاشرے کو موت کی طرف لے جا رہا تھا۔ بادشاہت اور جاگیرداری کا فرسودہ نظام اپنی افادیت کھو چکا تھا اور اس کے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور تعلیمی اداروں میں اتنی جان باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ایک صحت مند اور توانا زندگی کا بوجھ اُٹھا سکیں۔ اس میں کچھ دخل اس دنیاوی احساس کا بھی تھا جو زوال پذیر اخلاقی اقدار میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اقبال نے بجا طور پر تقدیر پرستی، توکل اور قناعت اور عزلت گزینی اور خانقاہ نشینی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت جو رویّے ان اقدار میں ظاہر ہو رہے تھے، وہ انحطاط کے پیدا کردہ تھے جب کہ ایک بہتر زمانے میں یہی قدریں قوتِ حیات سے معمور تھیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں اسلامی نظام اور اسلامی اخلاقیات کی آڑ میں ایسے رویّے فروغ نہ پا جائیں جن میں زندگی کے چیلنج کا سامنا کرنے کی سکت نہ ہو۔ ہمیں ایک مذہبی مگر فعال اور توانا دنیاوی احساس کی ضرورت ہے۔ اقبال نے انحطاط کی بہت کچھ ذمّہ داری تصوّف پر ڈالی ہے، مگر یہ صوفی بزرگ ہی تھے جو زوالِ بغداد کی خاکستر سے ایک جہانِ نَو پیدا کرنے کی دُھن میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ کے ان نیک بندوں نے دور اُفتادہ علاقوں میں پھیل کر اپنی قوت اور توانائی سے اسلام کی نئی شمعیں روشن کیں۔ اخلاقی اقدار زندگی کے توانا ہاتھوں میں قوت کا اظہار بن جاتی ہیں، لیکن زوال اور انحطاط کی حالت میں ان کی ظاہری اور باطنی معنویت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ ہمیں ایک ایسی اخلاقیات کی ضرورت ہے جو شرافت، دیانت، استغنا، خود آگاہی اور خود گزراں کی قدروں سے مالا مال ہو مگر قوم کی قوتِ عمل کو گھٹانے کے بجائے ترقی دے، صرف اسی صورت میں ہم زندگی کے نئے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں گے۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہوسِ زر انسان کو باطنی طور پر کمزور کرتی ہے اور حرص و آز کی قوتیں انسانوں کو مضبوط بنانے کے بجائے اندر سے توڑ کر رکھ دیتی ہیں، اس لیے اسلامی اخلاقیات کا تقاضہ ہے کہ زندگی کی قوت کو مضمحل کئے بغیر انسان ان کمزوریوں پر قابو پائے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیں اپنے معاشرے کو موجودہ فساد سے نکالنے کے لیے دو سطح پر جہاد کرنا پڑے گا۔ ایک داخلی جہاد جو اس کمزوری کے خلاف ہو گا جو حرص و ہوس کی شکل میں ہمیں اندر سے توڑ رہی ہے اور ایک خارجی جہاد جو ان قوتوں کے خلاف ہو گا جو ہمارے معاشرے میں اسلام کی روح سے براہِ راست متصادم ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کردہ ہیں۔ ہمیں معاشرے

میں انسانی رشتوں کو اُن کی صحیح شکل میں بحال کرنا ہوگا۔ عزت اور ذلت کے لیے معیار مقرر کرنے ہوں گے۔ سماجی امتیاز اور معاشرتی افتخار کے لیے پیمانے تخلیق کرنے ہوں گے اور سب سے زیادہ ایسے ادارے پیدا کرنے ہوں گے جن میں قوم کی تخلیقی رُوح بے ساختگی اور توانائی سے اپنا مثبت اظہار کر سکے۔ اشتراکیت نے سرمایہ داروں کے خلاف جو بغاوت کی وہ اس وجہ سے ناکام رہی کہ اس کے پیچھے انسانوں کی داخلی زندگی کو منظم اور مرتب کرنے کا کوئی اصول موجود نہیں تھا۔ اُس نے خارجی حالات کو دُرست کرنے کے بعد یہ توقع قائم کی کہ انسان خود بخود اندر سے بدل جائے گا، لیکن یہ توقع صرف اس وجہ سے پُوری نہ ہو سکی کہ انسان اندر سے بدلے بغیر صرف خارجی تبدیلی سے دُرست نہیں ہو سکتا ہے۔ اشتراکیت چاہتی تو مذاہب کی تاریخ سے یہ سبق سیکھ سکتی تھی، مگر اُس کی مذہب دُشمنی نے اُسے اس سے محروم رکھا۔ اب ہمیں سرمایہ داروں کے خارجی نظام کو اسلامی قوانین کے ذریعے شکست دینا ہے اور اس کی حریصانہ ذہنیت کو اسلامی اخلاقیات کے ذریعے تبدیل کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصلاحِ معاشرہ کا کام ہمیں دو سطحوں پر کرنا ہوگا۔ ایک کی ذمّہ داری حکومت، عدلیہ، انتظامیہ اور دیگر قانونی ایجنسیوں پر ہوگی اور دوسرے کی ذمّہ داری علما، صوفیا، اربابِ علم و ادب اور دانشوروں پر ہوگی۔ اوّل الذکر قوتیں اسلامی نظام کا جسم تیار کریں گی، جب کہ موخر الذکر قوتیں اس کی رُوح کو قائم اور برقرار رکھیں گی۔

بشکریہ جسارت کراچی

ہمارے یہاں جدید تعلیم کے ساتھ ایسے لوگوں کا ایک مؤثر طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنی نجات کا راستہ مغرب کی پیروی میں ڈھونڈتا ہے۔ اس طبقے کی بنیادی ذہنیت اُن تین گروہوں سے تعلق رکھتی ہے جو یا تو مذہب دشمن ہیں یا مذہب سے مایوس یا مذہب کے بجائے مذہبیت کو فروغ دینا چاہتے ہیں یہ ذہنیت جب زندگی کے معاملات میں اپنا اظہار کرتی ہے تہذیب، ثقافت، سیاست و معاشرت اخلاق و معیشت اور ادب اور فن کے وہ نظریات پیدا ہوتے ہیں جو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے سرمایہ فکر کی بنیاد ہیں۔ ہمیں پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ و قیام کو اس تمام پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہئیے۔

اس بحث میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ پاکستان کی آبادی دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک طرف ملک کے سیدھے سادے عوام کی اکثریت ہے جو اسلام میں غیر متزلزل یقین رکھتی ہے۔ یہ لوگ تعلیمی معاشی اور تہذیبی اعتبار سے غیر ترقی یافتہ ہیں لیکن اسلام کے لئے ان کی حیثیت ایک ناقابل تسخیر قلعے کی ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقے کے دو حصے ہیں ایک وہ جس کی تعلیم و تربیت مذہب کے مطابق ہوئی ہے۔ یعنی طبقۂ علماء اور دوسرا وہ جو مغربی علوم کا پروردہ ہے

مذہب کے بارے میں جن تین رویوں کا ذکر ہوا ہے وہ اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغربی رویوں کو قبول کرنے والا طبقہ ایک قلیل اقلیت ہے جسے اپنی قلیل تعداد کے باوجود یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ ملک کے مؤثر اور کلیدی مراکز پر قابض ہے۔ اب نظام اسلام کے نفاذ کے اولین مرحلے میں ہمارے سامنے دو بنیادی سوال ہیں۔ (۱) ذہنی طور پر اس اقلیت سے ہمارا معاملہ کیا ہو جو جدید شعور کے نام پر مذہب کے بارے میں ہم سے مختلف رویہ رکھتی ہے۔ یا تو مذہب دشمن ہے یا مذہب سے مایوس ہے یا مذہب کے بجائے مذہبیت کی قائل ہے۔ (۲) خارجی طور پر ہم اُس دنیا سے کس قسم کا تعلق پیدا کریں۔ مغرب کے نام نہاد جدید شعور کے زیر اثر ہیں۔

ان دونوں سوالوں کو ملا لیا جائے تو ان کی صورت یہ بنتی ہے۔ نظام اسلام کے حامیوں کے پاس عہد جدید کے شعور کا جواب موجود ہے یا نہیں اور وہ علم و بصیرت کی بنیاد پر ان رجحانات کا سدباب کر سکتے ہیں یا نہیں جو مغرب و مشرق میں نشاۃ ثانیہ کے بعد پھیلے۔ ہم ان سوالات کی روشنی میں ذرا بھی سنجیدگی سے غور کریں تو رینے گینوں اور محمد حسن عسکری کی فکر ہمیں ایک روشن مینارہ کی طرح نظر آتی ہے۔ وہ عہد جدید کے اسی چیلنج کا مذہب کی طرف سے آخری جواب ہے۔ اور اگر اسے پوری طرح سمجھ لیا جائے تو یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ہم مغرب کے گمراہ کن رویوں کو کس طرح سمجھیں اور سمجھ کر کس طرح ان کا دفاع کریں۔ محمد حسن عسکری کی کتاب جدیدیت اسی نقطۂ نظر سے اس صدی کی سب سے اہم اور وقیع ترین کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہئیے جو مغربی فکری یلغار میں اپنے مذہب کا دفاع کرنا چاہتا ہے۔

زندگی کا ہر عمل اپنے جواز کے لئے ایک فکری بنیاد کا طالب ہوتا ہے۔ ہم نظام اسلام کے تجربے کو اگر صرف ایک مقامی واقعے سے زیادہ عہد حاضر کا ایک ایسا چیلنج بنانا چاہتے ہیں جو پوری

دنیا کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بن جائے تو ہمیں اس فکری بنیاد کو مضبوط سے مضبوط تر بنا کر عام کرنا پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں علم و فکر کے ہر میدان میں مغرب کے جدید شعور کو چیلنج کرنا پڑے گا اور اس کی گمراہیوں کو اس طرح واضح کرنا پڑے گا کہ روشنی اور تاریکی کے درمیان فیصلہ ہو سکے اور اللہ کا دین عہد حاضر کے تمام دنیا پر غالب آ جائے۔

۱۴۔ مارچ ۔ ۸۳ء

جمود اور حرکت کا مسئلہ ہمارے دانشوروں کو جس بُری طرح پریشان کئے ہوئے ہے اس کا اندازہ آئے دن چھپنے والے مضامین سے کیا جا سکتا ہے۔ علمی اور تحقیقی تحریروں سے لے کر اخباری کالموں تک یہ مسئلہ بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ اور طرح طرح کے سوالوں اور جوابوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں مسئلہ میں کیا ایسا الجھاؤ ہے کہ بات صاف ہونے میں نہیں آتی۔ اور جتنا اسے سلجھایا جاتا ہے وہ اتنی ہی الجھتی جاتی ہے۔

میں اس مسئلہ پر انہیں کالموں میں متعدد بار اظہار خیال کر چکا ہوں۔ آیئے آج ایک اخباری مضمون کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ مسئلہ کے الجھاؤ نے الجھتے الجھتے کیا شکل اختیار کر لی ہے۔ مضمون نویس صاحب جمود اور حرکت کی بحث کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اسلام ایک ایسا مکمل نظام فکر ہے جس کے ستون بنیادی احساسات و اقدار اپنی شکلیں نہیں بدلتے۔ لیکن نئے رنگ بدلے جانے کا تقاضا کرتے ہیں اور رنگ بدلنے کا نام اسلام نے اپنے نام لیواؤں کے سپرد کیا ہے۔ اس کا نام تجدید و اجتہاد ہے۔" مکمل نظام فکر کی تشریح کرتے ہوئے مضمون نویس صاحب کہتے ہیں کہ ہم "تکمیل کو عموماً جمود کے معنوں میں لیتے ہیں حالانکہ تکمیل تحرک کی آخری تعریف ہے۔ اسلام وہ دین ہے جو تکمیل تحرک کا داعی ہے۔ یعنی اپنے اندر حرکت کی آخری شکل لئے ہوئے ہے۔"

ان خیالات کی حقیقی اہمیت یہ ہے کہ بظاہر یہ جتنے پُر معنی نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی بے معنی ہیں۔ اور صرف ہمارے لکھنے والوں کے انتشار خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ذرا یہ سوچئے کہ "رنگ" بدلنے کے کیا معنے ہیں۔ اسلام چار چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایمانیات، عقائد، عبادات اور اخلاقیات و احکام۔ اب ذرا یہ بتایئے کہ ان میں کون سی چیز رنگ بدلنے کا تقاضا کرتی ہے۔ کیا ایمان کو بدلا جا سکتا ہے کیا عقائد میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ کیا عبادات میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ کیا اخلاقی اقدار تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ زیادہ صاف لفظوں میں کیا ہم توحید، رسالت اور عقیدہ آخرت کو بدل سکتے ہیں یا پھر نمازوں میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ یا سچ بولنا، دیانت سے کام لینا، انصاف سے کام لینا۔ انصاف کرنا ان اخلاقی باتوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ اگر یہ سب چیزیں ناقابل تغیر ہیں تو رنگ بدلنے کا کیا مطلب ہے؟

حرکت کا اصول ہے کہ یا تو کمتر سے بہتر کی طرف ہوگی یا بہتر سے کمتر کی طرف۔ یعنی کوئی چیز یا تو اس سے اچھی بنتی ہے جیسی وہ ہوتی ہے یا اس سے خراب بنتی ہے جیسی وہ ہوتی ہے۔ بہتر بننے کو ترقی کہتے ہیں اور خراب بننے کو تنزل۔ اب اگر "تکمیل" کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک چیز کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہے۔ مکمل ہونے کے بعد کوئی چیز نہ اس سے بہتر بن سکتی ہے نہ اس سے کمتر۔ وہ مکمل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک چیز کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ وہ جیسی بن گئی ہے اور اس میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ان معنوں میں تکمیل کے بعد تبدیلی کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ اسلام اپنے نزول سے آخری وحی تک مکمل ہوتا رہا ہے۔ جب آخری وحی آ گئی تو خدا نے اس کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کمی بیشی اگر ہوئی تو اس کے صرف یہ معنی ہوں گے کہ وہ اب تک مکمل نہیں ہے۔ جمود، سکون، ٹھہراؤ، ثبات

خواہ یہ الفاظ عہد جدید کی ذہنیت کو کتنے ہی برے کیوں نہ لگیں۔ اور خواہ وہ اس کی کتنی ہی تردید کیوں نہ کرے یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ دین اگر قائم و دائم دین نہیں ہے تو اسے دین نہیں کہا جا سکتا۔ ختم نبوت کے یہی معنی ہیں کہ وہ دین جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوا تھا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو گیا۔ اور اب قیامت تک یہی دین ہے۔ یہ نہ بہتر بن سکتا ہے اور نہ نعوذ باللہ بدتر ہو سکتا ہے۔

مضمون نویس صاحب کو علمائے کرام سے شکایت ہے کہ وہ تبدیلی کو جمود سمجھتے ہیں۔ اور ہر قسم کی تبدیلیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہمیں مضمون نویس صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ انتشار اور تخریب کو حرکت سمجھتے ہیں اور غیر اسلامی چیزوں کو بھی اسلام میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ایک ذکاء الرحمٰن صاحب کی بات نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو ہماری تہذیب میں مغرب کی پیوند کاری کرنا چاہتا ہے انتشار اور تجدید کے نام پر حرکت اور تبدیلی کی دہائی دیتے لگتا ہے۔ قارئین کرام میں سے جن لوگوں کو اس مسئلہ سے سنجیدہ دلچسپی ہے وہ رسالہ "روایت" میں اس مسئلہ پر شائع شدہ مضامین کا مطالعہ کریں۔

۲۳ مئی ۸۴ء

رسالہ ادب لطیف میں صفدر میر صاحب کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ چھپا ہے جس میں انہوں نے ادیبوں کے ایک ایسے گروہ کا ذکر کیا ہے جو کسی زمانے میں ایک خاص قسم کی پاکستانیت پر زور دیتا تھا، لیکن جو اب اپنے موقف سے ہٹ گیا ہے۔ اور ایسے رجحانات ظاہر کر رہا ہے جن کی وہ پہلے شدید مخالفت کرتا تھا۔ اس گروہ میں پتہ نہیں کون کون لوگ ہوں گے۔ لیکن ایک انتظار حسین صاحب کا نام صفدر میر صاحب نے کھل کر لیا ہے ان کا کہنا ہے کہ انتظار حسین صاحب پہلے پاکستان

کی جغرافیائی تعبیر کے مخالف تھے۔ اور پاکستان کے اسلامی تشخص پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ موہنجو ڈارو اور ہڑپہ جو دڑو کا پاکستانی شناخت میں کوئی حصہ ہے لیکن صفدر میر صاحب کا خیال ہے کہ انتظار حسین اب اپنے اسلامی موقف سے ہٹ گئے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ میرا بائی، بدھ اور مہا بھارت کی طرف گرم سفر ہیں اور ایسی کہانیاں لکھ رہے ہیں جن میں غیر اسلامی روایات سے استفادہ کا رجحان غالب ہے۔ صفدر میر صاحب کا کہنا ہے کہ انتظار حسین صاحب نے جب بھارتی علاقوں کے ماضی کو قبول کر لیا ہے تو شاید ایک دن وہ پاکستانی علاقوں کے ماضی کو بھی قبول کر لیں گے۔ اور اس طرح گویا اس کو تسلیم کر لیں گے۔ جو اب تک صفدر میر صاحب اور ان کے ہمنواؤں کی مشترکہ ملکیت رہا ہے۔ صفدر میر صاحب نے طنزاً یہ بھی لکھا ہے کہ شاید اس طرح ایک نہ ایک دن انتظار حسین لاہور کو بھی تسلیم کر لیں اور اسے اپنی خیالی بستی "روپ نگر" کو ایک بستے کے بجائے ایک جیتے جاگتے شہر کی حیثیت سے مان لیں۔

ہمیں معلوم نہیں کہ صفدر میر صاحب کے ان اعتراضات کے جواب میں انتظار حسین کا موقف کیا ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بدھ حکایات پر کہانیاں لکھنے یا مہا بھارت سے اثر قبول کرنے کے معنی اسلامی تشخص یا پاکستانیت سے انحراف کے کیسے آ گئے۔ کیا انتظار حسین نے کہیں یہ کہا ہے کہ بدھ روایت مسلمانوں کی شناخت ہے یا مہا بھارت اسلامی تہذیب کا حصہ ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے مجھے کہنے دیجئے کہ فرض کیجئے میں یونانی دیو مالا پڑھتا ہوں۔ اور اس سے شدت سے متاثر ہوتا ہوں اور اس کے کسی کردار کو علامت بنا کر کوئی نظم لکھتا ہوں تو کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے یونانی دیو مالا کو اسلام یا پاکستانیت کا حصہ مان لیا ہے۔

میرے نزدیک صفدر میر صاحب اگر موہنجو ڈارو اور ہڑپہ سے بہت متاثر ہیں اور ان کے

متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو یہ ہرگز کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ قابل اعتراض بات صرف یہ ہے کہ بدھ ازم اور مغربی جوڈازم کو پاکستان کی شناخت بنایا جائے۔ ہمیں ایک شخص کے "شخصی کلچر" اور قومی کلچر کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ میں وید پڑھ سکتا ہوں، گیتا حفظ کر سکتا ہوں۔ اپنشد پر تجزیہ کر سکتا ہوں، کنفیوشس کی تعریف کر سکتا ہوں۔ یہ سب وسیع تر انسانیت کا حصہ ہیں اور مجھے ان سے اثر لینے کا پورا حق ہے۔ لیکن ان میں سے اثر لینا ایک بات ہے۔ اور انہیں قومی تشخص قرار دینا دوسری بات ہے۔ گیتا میرے شخصی کلچر کا حصہ بن سکتی ہے، قومی کلچر کا حصہ نہیں بن سکتی۔ خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ انتظار اگر ہندی روایات پر کہانیاں لکھ رہے ہیں تو یہ کسی طرح ان کے اسلام اور پاکستانیت کی نفی نہیں کرتی۔ نہ اس سے ان کے سابقہ موقف کی تردید ہوتی ہے۔ یہ صرف اس وقت ہوگا جب انتظار حسین یہ اعلان کر دیں کہ اب وہ ان ہندی روایات کو مسلمانوں کی شناخت کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ پاکستانیت کیا چیز ہے اس کی تشریح کا نہ انتظار حسین کو اتنا حق ہے نہ صفدر میر کو جتنا اقبال کو ہے۔ اقبال اسلامی شناخت کو کلمہ توحید اور رسالت محمدیہ پر منحصر سمجھتے تھے اور پاکستان ان کے لئے ہندی مسلمانوں کے اسلامی تشخص کی حفاظت کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک ایسے مہذب فرد بھی تھے جس نے دنیا کے تمام بہترین تہذیبی روایات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اپنے افلاک کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اسلامی تشخص کی نفی کئے بغیر بعض ایسی شخصیتوں کا ذکر کیا جو ان کے شخصی کلچر کا حصہ تھے اور جن سے انہوں نے اکتساب فیض کیا تھا۔ چنانچہ جاوید نامہ میں گوتم موجود ہے اور زرتشت موجود ہے اور جہاں دوست کے کردار بھی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ اقبال نے بدھ اور جہاں دوست کا ذکر کیا ہے اس لئے وہ نہیں اسلامی تشخص کا حصہ سمجھتے ہیں۔ انتظار حسین کی پاکستانیت اگر بدھ اساطیر پر کہانیاں لکھنے سے مجروح ہو سکتی ہے تو جاوید نامہ سے بھی بدھ کا ذکر نکال دینا چاہیے۔

۲۸-۳- مئی ۴۳

طاہر مسعود

اُردو کالم نویسی اور سلیم احمد

سلیم احمد کی کالم نویسی ان کی فکر کی ایسی جہت سے تعلق رکھتی ہے جس پر اچھی طرح سے غور کیے بغیر شاید پورے سلیم احمد کو سمجھنا آسان نہ ہو۔ اس لیے کہ سلیم احمد کی پہلو دار شخصیت اور ہمہ آن متحرک فکر کا اظہار جس تواتر اور غیر رسمی طریقے سے ان کے کالموں میں ہوا ہے غالباً ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین بھی ان مسائل و موضوعات کا احاطہ نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی توقع کی جانی چاہیے۔ تاہم ان کی مرکزی فکر ان کے ادبی مضامین اور کالموں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کالم ان خیالات کی توسیع کا درجہ رکھتے ہیں جسے انھوں نے اپنے ادبی اور تنقیدی مضامین میں پیش کیا۔ سلیم احمد کی فکر کی تفہیم میں ان کے کالم بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کالموں میں وہ کم و بیش انھی سوالات کو اٹھاتے اور انھی مسائل سے نبرد آزما نظر آتے ہیں جو عمر بھر ان کی فکری زندگی میں تلاطم و اضطراب کا موجب بنے رہے۔ اس اعتبار سے ان کے کالم ان کی فکر کا ایسا مرکزی حوالہ ہیں جس کی مدد سے ان کے کل خیالات و تصورات کی اساس کو بآسانی بیان کیا جا سکتا ہے۔

اردو کالم نویسی میں سلیم احمد کا کیا مقام ہے؟ انھوں نے اس صنف میں کسی نئی جہت کا اضافہ کیا؟ ان کے کالم اپنے مواد و اسلوب کے لحاظ سے کس قدر و قیمت کے حامل ہیں؟ ان سوالات کے براہ راست جوابات شاید محض دعوے پر مبنی ہوں اس لیے ضروری ہے کہ ہم سرسری طور پر اردو کالم نویسی کی روایت کا جائزہ لیں اور پھر اس تناظر میں سلیم احمد کی کالم نویسی کو رکھ کر دیکھیں تاکہ ہمیں اپنے سوالات کا مطلوبہ مگر معروضی اور دیانت دارانہ جواب مل سکے۔

اُردو صحافت میں کالم نویسی کا تصور عام طور پر طنز و مزاح سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے

کہ کالم واقعات عامہ پر کالم نگار کے ہلکے پھلکے تاثرات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ محققوں نے اردو کالم نویسی کے ابتدائی خدوخال اردو صحافت کے اولین دور میں رائج خبر نویسی کے اسلوبِ بیان میں تلاش کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق ابتدائی دور میں خبر نویس یا نامہ نگار کسی واقعہ کو رپورٹ کرتے ہوئے واقعہ پر اپنا ردِعمل بطور تبصرے کے شامل کر دیا کرتے تھے۔ کالم نویسی اسی صنف کی ترقی یافتہ شکل ہے لیکن اگر ہم اس تحقیق و کرید میں پڑے بغیر زیر بحث مسئلے کو طے کرنا چاہیں تو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ خبر نویسی کا جدید انداز جس طرح مغربی صحافت کی دین ہے اسی طرح جدید کالم نویسی کا تصور بھی مغرب ہی سے لیا گیا ہے۔ مغرب میں کالم نویسی کا آغاز اگر اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہوا تو اردو کالم نویسی بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں پروان چڑھی اور اس کی ساخت و پرداخت ان جید صحافیوں کے ہاتھوں ہوئی جنھوں نے اسے خالص طنز و مزاح کی صنف کے طور پر متعارف کرایا اور اس کی مقبولیت نے اسے طنز و مزاح کے تصور سے اس طرح مربوط کر دیا کہ آج بھی 'کالم نویسی' کی صنف کے تذکرے سے ذہن میں ہلکی پھلکی شگفتہ سی تحریر کا خیال اُبھرتا ہے۔

یوں تو انیسویں صدی کے اہم اخبار "اودھ پنچ" نے کالم نما تحریروں کی اشاعت سے اُردو کالم نویسی کے لیے رستہ ہموار کر ہی دیا تھا لیکن پہلی بار ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال' میں "افکار و حوادث" کے عنوان سے مزاحیہ کالم تحریر کر کے جدید کالم نویسی کی موجودہ عمارت کی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد کی ثقہ دینی شخصیت کو سامنے رکھیے اور ان کے کالموں کا مطالعہ کیجیے کہ کس طرح وہ برصغیر کے سیاسی امور و معاملات کو اپنے شگفتہ اندازِ بیان کا موضوع بناتے ہیں تو مولانا کی شخصیت کا ایک بالکل نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ مولانا آزاد کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۱۷ء میں 'ستارۂ صبح' کے صفحۂ اول پر اسی نوع کے کالم لکھے۔ پھر مولانا محمد علی جوہر اور خواجہ حسن نظامی نے بھی اسی طرز کے فکاہیہ کالم تحریر کیے۔ غرضیکہ اردو کالم نویسی کے ابتدائی نقوش کو واضح کرنے میں جن بزرگوں نے حصہ لیا چونکہ وہ سیاسی، علمی، دینی اور ادبی شخصیتیں بھی تھیں اسی لیے ان کی ان حیثیتوں نے ان کے کالم نویس ہونے کی حیثیت کو پس پشت ڈال دیا، سوائے مولانا چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کے جنھوں نے علم و فضل میں نمایاں امتیاز رکھنے کے باوجود کالم نویس کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی اور سچ پوچھیے تو انہی کے ہاتھوں اردو کالم نویسی کا پودا پھل پھول کر ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ ان بزرگوں نے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی ناہمواریوں کو اجاگر کرنے کے لیے فکاہیہ کالموں کا سہارا لیا۔ گو اس دور میں تحریر کیے جانے والے کالموں میں مواد کا تنوع بھی ملتا ہے اور

طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ اقتصادی، تمدنی موضوعات کے علاوہ شخصی مناقشوں اور چپقلشوں کا انداز بھی ان کالموں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ فکاہیہ کالموں ہی کا دور کہلائے گا۔

حصولِ آزادی کے بعد کالموں میں موضوعات کا دامن وسعت اختیار کرتا ہے۔ کراچی اور لاہور سے نکلنے والے اخبارات میں پہلے پہل فکاہیہ نوعیت کے کالم شروع ہوئے جو تقسیم سے قبل کی کالم نویسی کی روایت کے تسلسل میں تھے۔ اسی عرصہ میں جو کالم نویس سامنے آئے، ان میں مجید لاہوری، طفیل احمد جمالی، ابن انشا، نصر اللہ خاں، انعام درانی، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن یہاں سے کالم نویسی کی ایک اور سطح بھی متعین ہوئی اور سنجیدہ مزاج کے حامل کالم بھی اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ یہ روایتی معنوں میں فکاہیہ کالم نہیں تھے۔ ان کالموں میں شگفتگی کا عنصر موجود تھا جو کالم کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے لیکن انہیں محض طنزیہ اور مزاحیہ کالم قرار دینا درست نہ ہوگا۔ میاں محمد شفیع، ظہیر کاشمیری، انتظار حسین، عبدالکریم عابد، عبدالقادر حسن، رئیس امروہوی، جمیل الدین عالی، اور اس نوع کے دیگر کالم نگاروں نے فکاہی کالم کی جگہ سیاسی، تجزیاتی، ثقافتی اور سماجی نوعیت کے کالموں کو متعارف و مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ۶۰ء کی دہائی شروع ہوتے ہی مزید سنجیدہ اور تخصیصی نوعیت کے کالم نویس میدان میں اترے۔ زیڈ اے سلہری، پیر علی محمد راشدی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید وغیرہ نے سیاسی اور بین الاقوامی امور پر سنجیدہ اور تجزیاتی کالم نویسی کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ ۷۰ء کے بعد سنجیدہ تجزیاتی کالم نگار کے طور پر محمد صلاح الدین اور فکاہیہ کالم نگار کی حیثیت سے عزیز اثری اور خامہ بگوش (مشفق خواجہ) رفیق ڈوگر، عطاء الحق قاسمی، ظفر اقبال، نذیر ناجی، مجیب الرحمن شامی اور دیگر بہت سے لکھنے والے سامنے آئے۔ ۸۰ء کے بعد سنجیدہ تجزیاتی کالم نگاری میں تین نام نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ارشاد احمد حقانی، ابن الحسن اور بریگیڈیئر عبدالرحمن صدیقی تاہم ان حضرات کا مرکزی موضوع سیاست ہی رہا۔ بریگیڈیئر عبدالرحمن صدیقی سے قبل بریگیڈیئر غفار مہدی دفاعی امور کے بارے میں کالم سپردِ قلم کرتے رہے تھے۔

اردو کالم نویسی کی پوری روایت کا جائزہ لیجیے اور پھر سلیم احمد کے کالموں کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ جتنے کالم نویس ہیں وہ اپنے بعض منفرد خصائص کے باوجود کسی نہ کسی لحاظ سے ایک دوسرے سے متاثر و مماثل نظر آئیں گے سوائے سلیم احمد کے جن کے کالموں کی انفرادیت اس درجہ مسلّم ہے کہ ان کے کالم کے موضوعات، ان کا اسلوب، ان کے تجزیے کا طریقۂ کار ان میں نہ تو

وہ کسی سے متاثر ہیں، نہ کسی کے مماثل۔ انہوں نے کالم نویسی میں اپنے لیے ایک بالکل جداگانہ ڈھنگ، ایک بالکل مختلف راستے کا انتخاب کیا ہے۔ ان کا نمایاں ترین وصف اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ان کے کالموں کی مثال کسی اور کالم نگار سے نہیں دی جا سکتی۔ وہ اس نوع کے کالموں کے خالق بھی ہیں اور شاید خاتم بھی۔

سلیم احمد نے ۱۹۶۶ء میں پہلی بار کالم نویسی کا آغاز کیا۔ انہوں نے روزنامہ "حریت" کے ادبی گزٹ میں ہر ہفتے "مجھے کچھ کہنا ہے" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ ابتدائی کالموں میں ہی انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب اور موضوعات کی بنیاد رکھ دی تھی جس نے آگے چل کر بتدریج وسعت اختیار کی۔ ان کالموں میں انہوں نے بیشتر ادبی اور سماجی موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ اور یہ کالم اپنے ادبی، علمی اور تجزیاتی انداز اور طریقۂ کار کی بنا پر فوراً ہی پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ان کالموں میں عام اخباری کالم اور مضامین کے برعکس ذہانت، طباعی اور نقطۂ نظر کی انفرادیت کا اظہار ہوتا تھا۔ "حریت" میں ان کی کالم نویسی بہت طویل عرصہ تک جاری نہ رہ سکی اور جس "خصوصی ادبی گزٹ" میں ان کے کالم چھپتے تھے اس کے بند ہوتے ہی یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ بعد ازاں وہ ہفت روزہ "زندگی" اور دیگر ہفت روزہ جرائد میں کبھی قلمی اور کبھی اصلی نام سے لکھتے رہے۔ قلمی نام سے لکھنے کا سبب غالباً ریڈیو پاکستان میں سرکاری ملازمت کی مجبوری تھی۔ ۱۹۷۰ء میں جب "جسارت" جاری ہوا تو الطاف حسن قریشی کی فرمائش پر انہوں نے اس اخبار کے لیے کالم نگاری شروع کی۔ "جسارت" چونکہ ابتداء ہی سے ایک نظریاتی اخبار تھا اسی لیے اس میں ان کے سلسلہ ہائے کالم بیشتر اسلامی، ملی، اخلاقی اور قومی مسائل پر تھے۔

سلیم احمد کی کالم نگاری کا طویل ترین عرصہ "جسارت" ہی میں گزرا ہے (اس اخبار میں ان کے مطبوعہ کالموں کا ایک انتخاب "اسلامی نظام، مسائل اور تجزیئے" کے عنوان سے مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔) "جسارت" میں سلیم احمد نے اس زمانے میں بھی تواتر سے لکھا جب یہ اخبار حکومت کے زیرِ عتاب تھا اور سرکاری ملازمین اسے اپنی میز پر رکھنا تو رہا کنار اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے اور جب بھٹو حکومت نے "جسارت" کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے اس پر پابندی عاید کی تو سلیم احمد کی باقاعدہ کالم نگاری ایک بار پھر تعطل کا شکار ہوگئی۔ "جسارت" کے ڈیکلریشن کی بحالی اور اس کے دوبارہ اجراء کے ساتھ ہی سلیم احمد کے کالم "روبرو" کے عنوان سے ہفتہ میں ایک سے زائد بار چھپنے لگے۔ چند برسوں تک یہ سلسلہ

باقاعدگی کے ساتھ جاری رہا لیکن ۱۹۸۰ء میں ان کے ایک انٹرویو اور بعض کالموں کے مندرجات پر ان کا 'جسارت' کی انتظامیہ سے اختلاف رائے ہوا اور جب نقطہ نظر کے اس اختلاف میں شدت پیدا ہوئی تو سلیم احمد نے اس اخبار سے یہ کہتے ہوئے علیحدگی اختیار کر لی کہ اگر اخبار کی پالیسی اور سچائی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں ہمیشہ 'سچائی' کا انتخاب کروں گا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ 'جسارت' کو جب بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی ان کا قلم حاضر ہے۔ "جسارت" سے علیحدگی کا فیصلہ ان کے لیے بیحد دکھ بھرا تھا۔ کیونکہ اس اخبار میں لکھنے کی وجہ سے انہوں نے اپنے عزیز ترین دوستوں کے علاوہ اپنے استاد محمد حسن عسکری تک کی ناراضگی گوارہ کی لیکن اس میں لکھنا نہ چھوڑا۔ بعدازاں انہیں حریت میں لکھنے کی پیشکش ہوئی اور اس طرح ایک طویل مدت کے بعد انہوں نے 'حریت' سے دوبارہ وابستگی اختیار کی۔ بظاہر یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس اخبار سے انہوں نے کالم نگاری کی ابتداء کی تھی، انتقال سے قبل تک وہ اسی اخبار میں کالم لکھ رہے تھے اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ 'جسارت' جس سے ان کی گہری جذباتی وابستگی تھی اور جہاں انہوں نے اپنے بہترین علمی اور فکری کالم لکھے، وفات کے بعد ان کے وہ دو غیر مطبوعہ کالم جو انہوں نے 'حریت' کے لیے تحریر کیے تھے، 'جسارت' میں شائع ہوئے۔

'جسارت' اور 'حریت'، میں ان کے مطبوعہ کالموں کا باہمی موازنہ کئی اعتبار سے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان دونوں اخباروں میں ان کے کالم اسلوب، مزاج اور موضوعات میں ایک دوسرے سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ "جسارت" کے کالموں میں سلیم احمد کا اسلوب سنجیدہ، منطقی اور تجزیاتی ہے ___ ان کے موضوعات ملی، قومی، اخلاقی اور دینی نوعیت کے ہیں اور انہی مسائل کی سنجیدگی سے ان کا اسلوب متعین ہوا ہے جبھی وہ ان کالموں میں فقرے بازی سے گریز کرتے ہیں اور اپنے نپے تلے جامع اندازِ بیان سے ذرا سا بھی ہٹنا پسند نہیں کرتے ___ انفرادی احساسات و تاثرات کا ان کالموں میں کہیں گزر نہیں۔ حتیٰ کہ ادبی مسائل اور معاملات جو ان کی زندگی بھر کا اوڑھنا بچھونا رہے بلکہ جسے وہ اپنی موت و زیست کے مسئلے سے کم اہمیت نہ دیتے تھے ___ وہ ادبی مسائل 'جسارت' کے کالموں سے بالعموم غائب رہے۔ برعکس اس کے "حریت" میں انہوں نے اسی مخصوص رنگ کو اختیار کیا جو اکثر ان کے تند و تیز اور کھلے ادبی مضامین کا خاصا ہوا کرتا تھا۔

'جسارت' میں ان کے بلند پایہ علمی یا اصطلاح میں اداریہ نما کالم سنجیدگی، متانت اور فکر کی گہرائی لیے ہوتے تھے جبکہ "حریت" میں ان خصوصیات کے علاوہ طنز، بذلہ سنجی اور انفرادی تاثراتی

انداز بھی ملتا ہے ـــــ ان کالموں میں ہماری ملاقات اس سلیم احمد سے ہوتی ہے جو اینچولی سوسائٹی میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے گفتگو کرتے، قہقہے لگاتے یا پھر کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ 'حریت' کے کالموں میں تو وہ قارئین کو اپنے محسوسات میں اس درجہ شریک کرتے ہیں کہ اتنی ذہنی و جذباتی قربت تو ان کے اکثر قریبی دوستوں کو بھی کبھی حاصل نہ ہو سکی۔

'جسارت' اور 'حریت' کے کالموں کے مزاج و مواد میں تفاوت و تضاد کی متعدد وجوہ ممکن ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ 'جسارت' میں لکھتے ہوئے وہ زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد سے وابستہ ایک انتہائی کمیٹیڈ کالم نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو اپنی تحریریں کے ذریعے مصلح Reformer کا کردار انجام دینا چاہتا ہو۔ (اسی لیے انتظار حسین نے اپنے کالم میں کئی بار لکھا کہ سلیم احمد سر سید بننا چاہتے ہیں) چونکہ سلیم احمد ساری عمر اسلامی اور دینی فکر کے حامل رہے اس لیے 'جسارت' جیسے اسلامی اور نظریاتی اخبار میں رہتے ہوئے انہوں نے اسی فکر کو آگے بڑھانے اور ان کی معاونت کرنے والے کالم تحریر کیے۔ وہ علی الاعلان اسلامی انقلاب کے جویا تھے اور یہ مقصد اور مشن انہیں اتنا عزیز تھا کہ اس کے لیے انہوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات تک کو قربان کر دیا۔ اسی لیے 'جسارت' کے کالم ادبی موضوعات سے تہی نظر آتے ہیں۔ اور اگر انتظار حسین کی بات کو درست مان لیا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ سر سید کی طرح سلیم احمد کا مسئلہ بھی مسلمانوں کا سیاسی اور اخلاقی زوال تھا۔ سر سید نے 'تہذیب الاخلاق' میں اپنے علمی مضامین کے ذریعے مسلمانوں کے شعور کی بیداری کے ضمن میں جو کام انجام دیا۔ سلیم احمد بھی (سر سید کے نقطۂ نظر سے انتہائی اختلاف کے باوصف) اپنے کالموں کے ذریعے کم و بیش وہی کام کر رہے تھے۔

جسارت میں لکھنا سلیم احمد کے لیے محض شوقی کالم نویسی کی تسکین نہ تھا بلکہ اس سے سوا بھی کچھ تھا۔ اس سے قطع تعلق کے بعد 'حریت' میں جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو بہت جلد ان کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا اور وہ ادبی مسائل، علمی اور ادبی کتابوں اور اپنے معاصر ادیبوں کے علاوہ روزمرہ کے مسائل پر بھی قلم اٹھانے لگے۔ یہ کالم وہ گپ شپ کے انداز میں لکھا کرتے تھے جس میں اکثر اوقات سنجیدگی اور شگفتگی کا امتزاج ہوتا تھا۔

بلاشبہ اخبار کا مزاج کالم نگار کے اسلوب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا 'جسارت' اور 'حریت' میں ان کے اسلوب کے فرق کو ان اخباروں کے مزاج کا فرق بھی کہا جا سکتا ہے۔ اول الذکر اخبار میں ان کا کالم اداریے کے ساتھ نصف صفحے پر چھپتا تھا جبکہ مؤخر الذکر اخبار میں ان کا کالم، کالم ہی کی جگہ

پر شائع ہوتا تھا۔ بہرکیف، قابل غور بات یہ ہے کہ سلیم احمد نے جہاں بھی لکھا، اپنی تحریروں اور اپنے خیالات کے ذریعے انہوں نے لوگوں کو سوچنے کی دعوت دی اور رائے سازی کا اہم فریضہ انجام دیا۔

اس سے پہلے کہ سلیم احمد کے کالموں اور ان کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس سوال پر غور کر لیا جائے کہ انہوں نے کالم نگاری کیوں شروع کی؟ اکثر ادیب کالم نگاری کو غیر علمی مشغلہ تصور کرتے ہیں۔ اخبار کا عارضی پن انہیں کھٹکتا ہے۔ اور وہ کسی ادیب یا تخلیقی آدمی کو اخبار نویسی کے لیے سخت ناموزوں ٹھہراتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ برصغیر کی ممتاز ترین دینی، علمی اور ادبی شخصیتوں کی ایک بڑی اکثریت اخبار و جرائد سے وابستہ رہی۔ ان کے افکار و نظریات نے رائے عامہ کی تعمیر و تربیت میں جو نمایاں کردار ادا کیا اس میں میڈیم "اخبار" ہی بنا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شخصی صحافت کا دور تھا اور صحافت اور ادب کے دھارے ابھی پوری طرح سے جدا نہیں ہوئے تھے ــــ لیکن اخبارات کے سلسلے میں ہمارے ادیبوں کا استعجابی رویہ تقسیم کے بعد کی پیداوار ہے۔ عمومی اعتراض یہ ہے کہ چونکہ کالم نگار کا دائرہ کار روزمرہ کے واقعات پر رواں تبصرے و تجزیے تک محدود ہے لہذا اس کی تحریر کے مندرجات و مشتملات کی اہمیت اور قدر و قیمت وقتی اور چند روزہ ہوتی ہے اور ہمارے جن ادیبوں نے کالم نگاری کو بطور پیشے کے اختیار کیا ہے اس کے پیچھے محض حصول معاش کی مجبوری کارفرما ہے نہ کہ کوئی سنجیدہ مقصد۔ ہمارے نزدیک اگر اس اعتراض میں کوئی وزن ہے تو بھی اس کا اطلاق سلیم احمد کی کالم نگاری پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ سلیم احمد نے جس نوع کی کالم نگاری کی بنا ڈالی ہے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے۔ پھر یہ کہ سلیم احمد غالباً واحد ادیب ہیں جنہوں نے کالم نگاری کو ذریعہ معاش کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا۔ "حریت" کے آخری زمانے کو چھوڑ کر انہیں اپنے کالموں کا ہمیشہ برائے نام معاوضہ ملتا رہا۔ ایک ایسے زمانے میں جب شہرت، کسب زر اور اثر و رسوخ میں اضافے کی خاطر اخبار میں لکھنے کا چلن عام ہو، سلیم احمد نے ان تمام ترغیبات و تحریصات سے بے نیاز رہ کر اخبار نویسی کی۔ ظاہر ہے وہ اتنے چھوٹے آدمی نہیں تھے، دوست دشمن سبھی گواہ ہیں کہ ان کی پوری زندگی حرص و آز سے ہمیشہ بلند تر رہی۔ اور جب کبھی انہوں نے معاشی ضروریات کی تکمیل کی خاطر لکھا تو ببانگ دہل اس کا اقرار کیا اور اپنی ان تحریروں کو "سیٹھ کا مال" قرار دیا۔ اتنی اخلاقی جرأت بھی ہمارے کتنے ادیبوں میں پائی جاتی ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ سلیم احمد نے کالم نگاری کو اظہار کے ایک راستے کے طور پر اپنایا تھا۔

یک ایسے راستے کے طور پر جس سے ابلاغ کے عمل میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک کیا جائے "حریت" سے دوبارہ وابستگی کے بعد انہوں نے اپنے پہلے ہی کالم میں اپنی کالم نگاری کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے...... ہم گفتگو کرنے سے خوفزدہ ہیں اور یہ خوف اس احساس سے پیدا ہوا ہے ۔ کہ ہم گفتگو کریں گے تو پہچان لیے جائیں گے کہ ہم درحقیقت اندر سے کتنے کھوکھلے اور سہمے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہم برہنگی اور بے نقابی سے ڈرتے ہیں اسی لیے اپنے چہروں پر نقابیں ڈالے رہتے ہیں۔"

(۹ اگست ۱۹۸۱ء)

سلیم احمد گفتگو کے ذریعے معاشرے میں مکالمے کی روایت کو زندہ کرنے کے خواہاں تھے۔ اور اسی لیے انہوں نے کالم نویسی کو ذریعہ بنایا تھا ۔ انہوں نے آگے چل کر یہ بھی وضاحت کی تھی کہ گفتگو کے معنی محض بولنے کے نہیں ہوتے کیونکہ بہت سا بولنا صرف ایک شور ہوتا ہے ۔ اس شور میں کوئی معنی نہیں ہوتے گفتگو شور کا نام نہیں، شور میں بامعنی آواز کے اضافے کا نام ہے۔

سلیم احمد اپنے خیال کو دوسروں تک پہنچانا اور دوسروں کے خیال میں خود کو شریک رکھنا چاہتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ چیزوں کو مسائل کو جس طرح دیکھتے تھے دوسروں کو اسی طرح دکھانا چاہتے تھے اور ساتھ ہی دوسروں کے نقطۂ نظر سے بھی انہیں اتنی ہی ہمدردی اور دلچسپی تھی ـــــ وہ اس مقصد کے لیے ادبی رسائل کو بھی استعمال کر سکتے تھے لیکن ادبی رسائل پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ادبی رسائل اپنی بے قاعدہ اور محدود زر اشاعت کی بنا پر غیر موثر ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں قوم کو جن پیچیدہ اور سلگتے ہوئے مسائل کا سامنا ہے ادبی رسائل نہ تو ان کا احاطہ کرنے میں اور نہ ہی انہیں موثر طریق سے پیش کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے "جسارت" کے ایک کالم میں لکھا:

"مجھے نہیں معلوم کہ اخبار کے کالم کس حد تک ایسی بحثوں کے متحمل ہو سکتے ہیں ـــــ مگر ایک ایسے زمانے میں جب لوگوں تک پہنچنے کا کوئی اور موثر ذریعہ باقی نہیں ہے ۔ اخباری کالموں کو اس کے لیے استعمال کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔"

(مغربی تہذیب کا مسئلہ: اسلامی نظام، مسائل اور تجزیے)

اسی لیے انہوں نے سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی مسائل کے علاوہ ادبی مسائل کو بھی اپنے کالموں کا موضوع بنایا۔ وہ عام قاری کو اپنا مخاطب بنانا چاہتے تھے اور جانتے تھے کہ ادبی رسائل اپنا عام قاری کھو چکے ہیں

یہ عام قاری سے گفتگو کی خواہش تھی کہ انھوں نے "حریت" کے ابتدائی کالموں میں یہ توقع ظاہر کی کہ ان کے چھیڑے گئے مباحث میں دوسرے بھی شریک ہوں گے" تاکہ گفتگو آگے بڑھے اور زیر بحث مسائل کے نئے پہلو سامنے آئیں اور اسی طرح اجتماعی سطح پر قلب و ذہن کی کشادگی اور فراخی کے ساتھ تبادلۂ خیال کی صحت مند روایت قائم ہو۔ انہوں نے ایک سے زاید مرتبہ اپنے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں قارئین کو خطوط لکھنے کی دعوت دی۔ کیونکہ اسی طرح دو طرفہ ابلاغ اور اس ابلاغ کے نتیجے میں اس مقصد کی تکمیل ممکن تھی جس کے لیے انہوں نے کالم نگاری کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔

سلیم احمد ان ادیبوں اور تخلیقی فنکاروں سے بالکل مختلف واقع ہوئے تھے جو اجتماعی زندگی کے مرکزی دھارے سے کٹ کر خود کو گنبدِ بے در میں قید کر لیتے ہیں۔ اپنی ذات کے خول میں سمٹنے کا یہ عمل ان میں سے اکثر کو نرگسی بنا دیتا ہے، ذاتی زندگی میں بھی اور ادب میں بھی۔ سلیم احمد کی ذرائع ابلاغ سے وابستگی اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے مسائل، معاشرے کے بناؤ بگاڑ اور لوگوں کے دکھ سکھ ان کے نزدیک کتنی اہمیت کے حامل تھے اور ان پر سوچ بچار کرتے ہوئے خیالات کی ان گنت سطحیں، گوشے اور زاویے ایسے تھے جن کا اظہار کسی ادبی صنف کے ذریعے کم از کم اس طریقے سے ممکن نہیں تھا جس طریقے سے کالم کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ اجتماعی زندگی سے ایسا پرخلوص اور دردمندانہ رشتہ ہی دراصل ان کی کالم نویسی کا محرک بنا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی عوامی اور مقبول عام کالم نویس بننا چاہتے تھے اور جیسا کہ اکثر کالم نویسوں کا طریقہ ہے کہ وہ مقبولیت یا اخباری ضرورت کے پیشِ نظر اپنے کالم کے موضوعات اور اسلوبِ بیان کو قارئین کی عمومی سطح پر لے آتے ہیں اور اس طرح اپنے قاری کے سلسلے میں حد درجہ حساس ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے سلیم احمد نے قارئین کی پسند ناپسند کا پابند ہو کر کبھی کالم نویسی نہیں کی بلکہ ہمیشہ وہی کچھ لکھا جو وہ لکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی پروا کیے بغیر کالم نویسی کی کہ قارئین کا حلقہ ان کے منتخب کردہ سنجیدہ موضوعات میں دلچسپی لیتا ہے یا نہیں۔ بلاشبہ "قاری" ان کے نزدیک اہم تھا لیکن "خیال" سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ وہ قاری کو اپنی فکر کے دھارے میں شریک رکھنے کے متمنی رہتے تھے بلکہ اپنی شرائط پر۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنے کالموں کے موضوعات، معیار اور سطح کو بعض اعتراضات کے باوجود یکسانیت سے برقرار رکھا اور اس معاملے میں ہمیشہ یکسو رہے۔

بات یہ ہے کہ سلیم احمد اس نوعیت کے کالم نگار تھے ہی نہیں جن سے قارئین اپنے لیے سامان دلبستگی کی فراہمی کی توقع رکھتے ہیں۔ قارئین کو خوش کرنا، انہیں کتابی خیالات کی ذہنی غذا بہم پہنچانا، پرلطف

فقروں اور لفظی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنا غرضیکہ اس قسم کی فکاہیہ کالم نگاری سے (ہر چند کہ ان کی اپنی اہمیت و افادیت ہے) سلیم احمد کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس قسم کی کالم نویسی کے چلن کو کچھ زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے بھی نہیں تھے ـــــ ان کی رائے میں فکاہیہ کالم نگاری کے بڑھتے ہوئے رجحان کے زیر اثر قارئین کے مزاج کی تشکیل کچھ اس نہج پر ہو گئی ہے کہ اب وہ سنجیدہ مسائل میں بھی اسی وقت دلچسپی محسوس کرتے ہیں جب انہیں طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا جائے۔ وہ کالم کو لائق مطالعہ Readable بنانے کے خلاف نہیں تھے البتہ Readability کے لیے تحریر کو بے مغز بنا دینا انہیں سخت ناپسند تھا۔ اگر کالموں میں دلچسپی پیدا کرنا ان کا اصل مقصود ہوتا تو یہ کام ان کے لیے انتہائی آسان تھا کیونکہ انھیں کاٹ دار نثر لکھنے پر کمال کی قدرت حاصل تھی بلکہ وہ تو اپنے تند و تیز اور نوکیلے فقروں ہی کی وجہ سے ایک طناز ادیب کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ اس ہنر کا جا بجا ان کے سنجیدہ کالموں میں بھی ہوا ہے لیکن بس اسی قدر کہ قاری کا ذائقہ تبدیل ہو جائے یا پھر بیان میں زور پیدا ہو جائے۔ مثال کے طور پر مولانا شاہ احمد نورانی نے اسلامی نظام کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر نفاذ کا مطالبہ کیا تو سلیم احمد نے "ایک جذباتی تقریر کا تجزیہ" کے عنوان سے ان کے مطالبے کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔ انہوں نے لکھا:

"سوال یہ ہے کہ مولانا نورانی معاشی نظام کے مسئلے کو اسلامی نظام کا جزو سمجھتے ہیں یا نہیں اور سمجھتے ہیں تو موجودہ معاشی نظام کو ایک دم پھونک مار کر بدل دینے کا کون سا طریقہ ان کے ذہن میں ہے؟ کیا مولانا ایک دم سرمایہ کاری کو بند کر دیں گے یا بینکوں میں تالے ڈلوا دیں گے یا انشورنس اور دیگر اسکیموں میں جو سودی منافع چل رہا ہے اس کو ایک دم ختم کر کے اس سے متعلق معاشرے کے تمام لوگوں کو توپ سے اڑا دیں گے؟

پھر ایک سوال یہ ہے کہ ملکی سودی مسائل کو حل کر کے بین الاقوامی سودی قرضوں کا معاملہ کس طرح ختم کیا جائے گا؟ آخر مولانا نے ان سب باتوں کو فی الفور ختم کر دینے اور اس کی جگہ اسلامی معاشی نظام کے بلا تاخیر نفاذ کے بارے میں کچھ تو سوچا ہوگا۔ سوچا ہوگا تو بتاتے کیوں نہیں۔ اور نہیں سوچا تو سوچتے کیوں نہیں؟"

(اسلامی نظام، مسائل اور تجزیے)

ایک اور کالم میں انھوں نے قومی ذرائع ابلاغ کے داخلی تضادات کو اس طرح واضح کیا:

"ایوب خان کے دور حکومت سے لیکر بھٹو کے زمانۂ اقتدار تک ذرائع ابلاغ اپنے ممدوحین

کو بدنام کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ بھٹو نے اپنے عہد اقتدار کی ابتدا میں ایک دفعہ کہہ دیا کہ ریڈیو اور ٹی وی والے بار بار میرا نام نہ دہرائیں۔ ریڈیو اور ٹی وی والوں نے اس پر اس طرح عمل کیا کہ دن میں بے شمار بار اس فقرے کو دہرایا کہ قائد عوام ریڈیو اور ٹی وی پر اپنا نام لیا جانا پسند نہیں کرتے ——— یہاں تک کہ لوگ تنگ آگئے۔"

(ہم اور ہمارے ذرائع ابلاغ: اسلامی نظام مسائل اور تجربے)

ان کالموں میں طنز و مزاح، پھبتی، فقرے بازی اور استہزائی انداز کی مثالیں کثرت سے بکھری ہوئی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی قومی مقصد سے وابستہ ہیں۔ طنز کو وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن صرف ضرورت پڑنے پر۔ فکاہیہ کالم نویسوں کی طرح وہ اس ہتھیار پر مکمل انحصار نہیں کرتے۔

سلیم احمد کے کالم بنیادی طور پر فکری کالم تھے۔ ان کے موضوعات سنجیدہ، گہرے اور مستقل اہمیت کے حامل ہوتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے ان کے کالموں کو بار بار "کالم" کے بجائے علمی اور ادبی مضامین قرار دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ ان کے کالم، کالم کی مروجہ تعریف، معیار اور تقاضوں پر پورے نہیں اترتے۔ معترضین کے خیال میں کالم روزمرہ کے واقعات کے ردعمل میں لکھا جاتا ہے اور جب تک اس کا تعلق حالات حاضرہ Current Affairs سے نہ ہو اسے کالم کہنا درست نہ ہوگا۔ اس اعتراض سے کئی درسی نوعیت کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کالم کتنے قسم کے ہیں؟ کالم کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ اور سلیم احمد کے کالم کا شمار کس قسم کے کالموں میں کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ کہ ان کے کالم، کالم نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟ وغیرہ۔ چونکہ ہمارے ہاں یہ صنف مغرب سے آئی ہے اس لیے اس سلسلے میں وہیں کے ماہرین کی رائے مستند سمجھی جائے گی۔ مغرب میں کالم نویسی کے فن پر خاصا کچھ لکھا گیا ہے۔ لکھنے والوں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ کالم کی اقسام کا تعین عملاً ناممکن ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سہولت کے لیے کالم کی مختلف قسمیں بنا دی گئی ہیں لیکن انہیں حتمی کہنا مشکل ہے۔ کالم کی نوعیت کا انحصار بڑی حد تک خود کالم نویس پر ہے۔ ایک تخلیقی ذہن رکھنے والا کالم نویس اپنا اسلوب اور اپنے موضوعات کا تعین خود کرتا ہے اور اس کا کوئی بندھا ٹکا طریقہ کار نہیں ہے اور یہ کہ کسی ایسی تحریر کو جو روزانہ اخبار میں کالم کے نام پر چھپتی ہو اور جس کے قارئین بھی موجود ہوں (خواہ کم یا زیادہ) محض اس کے مواد و موضوع اور اسلوب و مزاج کی بنا پر اسے کالم نویسی کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں امریکی روزنامے "ایسٹر پوسٹ" کے مینجنگ ایڈیٹر اور کالم نگار ولیم ایل میکار تھی کی یہ رائے لائق توجہ ہے:

"کالم کی اقسام نہیں بنائی جاسکتیں۔ مختلف کالموں کا اسلوب ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور موضوع و مواد کے لحاظ سے بھی ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔" کم و بیش یہی بات ابلاغیات کے ایک ماہر کینتھ آر باٹرے نے دوسرے لفظوں میں اس طرح کہی ہے کہ "کالموں کی اتنی ہی اقسام ہیں جتنے کالم لکھنے والے ہوں گے۔" غرضیکہ کالم کی جتنی معروف اور غیر معروف تعریفیں ہمیں ملتی ہیں ان میں کوئی بھی تعریف ایسی نہیں جس کی روشنی میں سلیم احمد کی کالم نویسی کو کالم کے بجائے کچھ اور قرار دیا جائے۔ "ایکسپلورنگ جرنلزم" کے مصنف آر۔ای والزلے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "کالم کسی ذاتی خیال پر بھی مبنی ہو سکتا ہے اور دوسروں کے خیالات پر بھی۔ اس میں طب، سائنس اور فیشن وغیرہ کے تخصیصی موضوعات پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ کالم کی اپنی کوئی ہیئت نہیں ہوتی۔"

سلیم احمد کے کالموں کو "کالم" تسلیم نہ کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ اور سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے جن تہذیبی اور اخلاقی مسائل پر بحث کا آغاز کیا انہیں اس سے قبل اخباری کالموں کا موضوع نہیں بنایا گیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی ان کے کالموں کی علمی اور فکری سطح اتنی بلند ہو جاتی تھی کہ ان پر فکر انگیز مقالے کا گمان گزرتا تھا اور اس کا احساس خود سلیم احمد کو بھی تھا، جس کا انہوں نے کئی مواقع پر اظہار بھی کیا۔ مثلاً انہوں نے ایک بار لکھا:

> "میں جانتا ہوں کہ 'حریت' کے کالموں میں یہ بحث ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہیے۔ پڑھنے والوں پر اتنا بوجھ ڈال دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس لیے اس کی صحیح جگہ تو رسالے اور کتابیں ہی ہیں۔ لیکن چونکہ میں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ان کی زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتا رہتا ہوں اس لیے یہ ضرور چاہتا ہوں کہ انہیں تھوڑی بہت بات بتاتا چلوں۔"
>
> ("حریت" ۱۳ اپریل ۱۹۸۱ء)

اس کے باوجود ان کے موضوعات کا سرسری جائزہ ہی اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ سلیم احمد نے خالص فکری مسائل کو کالموں کا موضوع بنا کر اس صنف کے منظر نامے کو وسیع کیا۔ اردو کالم نویسی میں نئی جہات کا اضافہ کیا، نئے خیال، نئے تصورات، نئی تحقیق کے لیے راستہ ہموار کیا اور اس امکان کا در وا کیا کہ سنجیدہ ادیب ادبی انحطاط کے زمانے میں اخبار کو ایک "میڈیم" کے طور پر استعمال کر کے مطلوبہ نتائج پیدا کرنے کی جانب کس طرح پیش رفت کر سکتے ہیں۔

سلیم احمد کے کالموں کے موضوع و مواد اور اسلوب و مزاج کے حوالے سے ہم پوری اردو کالم نویسی

کی روایت کو کھنگال ڈالیں اور اس مقصد کے لیے چاہے کالم کی جتنی اقسام مقرر و متعین کر لیں، یہ بات نہایت اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اردو صحافت کے منفرد ترین کالم نویس ہیں ــــ ان کی انفرادیت ناقابلِ تردید ہے۔ اور یہ انفرادیت جو انہیں ان کے معاصر کالم نویسوں پر فوقیت بخشتی ہے، ذرا تفصیل طلب ہے۔

ان کے کالموں کا نمایاں ترین وصف ان کے نہایت ادبی اور علمی اسلوب بیان میں مضمر ہے جو ان کی نثر نگاری کو صحافتی نثر نگاری سے بلند کر دیتی ہے۔ ادبی اور صحافتی نثر نگاری میں بس اتنا ہی فرق ہے جو چٹان اور ریت پر کھینچی جانے والی لکیروں میں ہوتا ہے۔ سلیم احمد مزاجاً ادیب تھے اور میدان صحافت میں آکر بھی ادیب ہی رہے اور یہی ان کی شناخت رہی۔ انہوں نے اسی طرز پر صحافتی ذمہ داریوں کی انجام دہی کی جس کی روایت اٹھارویں صدی کی برطانوی صحافت میں ڈینیل ڈیفو، رچرڈ اسٹیل اور جوزف ایڈیسن جیسے عظیم صحافیوں نے قائم کی تھی۔ بلکہ مقصد کی ہم آہنگی و یکسانیت کے لحاظ سے وہ ایڈیسن کے مماثل نظر آتے ہیں جس نے کہا تھا کہ سقراط کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اٹھایا اور دھرتی کے انسانوں میں پھیلا دیا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں یہ کہا جائے کہ میں نے فلسفے کو بند کمروں، کتب خانوں، اسکولوں اور کالجوں سے اٹھایا اور کلبوں، محفلوں، قہوہ خانوں اور ریستورانوں میں عام کر دیا۔ یہی بات سلیم احمد کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

سلیم احمد کا علمی اسلوب غور و فکر، ضبط و تحمل، اور تلاش و جستجو سے عبارت ہے۔ وہ اپنی بات مرتب ذہن کی مدد سے نہایت سلیقے، شائستگی اور سادگی سے کہتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ، انداز بیان الجھاؤ سے پاک اور اس قدر واضح اور شفاف ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلے کو جانچنے اور پرکھنے کا نیا پیمانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس طرح جہاں وہ خالص ادبی اسلوب بیان اپناتے ہیں تو اس میں تخیل اور احساس کی شدت ان کے کالم کو متاثر کن ادبی نثر پارہ بنا دیتی ہے۔ مثلاً ذیل میں ان کے تین مختلف کالموں سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں تین مختلف احساسات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے کالم میں دکھ، دوسرے میں خوف اور تیسرے میں غصے کا۔ اور ہر جگہ ان کا اسلوب ان کے بیان کردہ احساس سے اس طرح گندھ گیا ہے کہ قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے دوست اصغر گورکھپوری کی موت پر لکھا:

"دکھ دینے والی بے شمار باتیں ہوتی رہتی ہیں اور ہو کر گزر جاتی ہیں۔ پچھلی بہاروں کے کتنے پھول مرجھا گئے اور بیتی راتوں کے دامن میں راکھ کے سوا کیا ہے؟ مگر ستارے اب بھی نکلتے ہیں، چاند اب بھی چمکتا ہے اور محبت کرنے والے اب بھی محبت کرتے ہیں۔ میرے

شعور کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ دل اتنا خالی خالی رہتا ہے کہ اس میں کوئی آواز مشکل سے سنائی دیتی ہے۔ اصغر گورکھپوری کو مرے ہوئے اب کتنے دن ہو گئے ہیں ان کی موت کی خبر سن کر ان کے گھر گیا تھا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آگیا تھا۔ میں نے کانوں سے سنا تھا کہ وہ مر گئے ہیں۔ لیکن یہ خبر دل کی اندرونی تہوں تک نہیں پہنچی تھی۔ مرنا ایک لفظ تو تھا مگر یہ لفظ احساس نہیں بنا تھا۔ آج شام اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اصغر کی موت کی خبر میرے اندر پہنچ گئی۔ دکھ کی ایک تیز لہر نشتر کی طرح دل میں اتر گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔"

("حریت" جھلکیاں، ۲ فروری ۱۹۸۲ء)

آندرے ژید نے کہا تھا: "اپنے خیالات چھوڑ دو، اپنا ملک چھوڑ دو اور کچھ نہیں تو اپنا کمرہ چھوڑ دو" ـــــ لیکن منزل ترک کا یہ سفر آسان نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے کمرے کے باہر دھوپ بہت تیز ہے اور جھلسا دینے والی لُو کے جھونکے چل رہے ہیں۔ میں اپنا کمرہ نہیں چھوڑ سکتا۔ نہ اپنا ملک کو چھوڑ سکتا ہوں، نہ اپنے خیالات چھوڑ سکتا ہوں۔ کیونکہ جو یہ سب کچھ چھوڑتا ہے ـ وہ یا تو مہاتما بدھ بن جاتا ہے یا پھر کسی سڑک کے کنارے گر کر مر جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں مہاتما بدھ نہیں بن سکتا اور سڑک کے کنارے مرنے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔

("حریت" ۲۲ ستمبر ۱۹۸۱ء)

"ایک روز میں نے ایک بچے کو دیکھا۔ وہ دیوار پر اپنا نام لکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "تم یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ سہم گیا۔ وہ سمجھا میں اسے دیوار پر کچھ لکھنے سے روک رہا ہوں لیکن میں ان نادانوں میں نہیں تھا جو بچوں کو دیواروں پر اپنا نام لکھنے سے روکتے ہیں۔ کیونکہ دیواریں تو ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ بچے ان پر اپنا نام لکھیں۔ اب یہ بات الگ ہے کہ بچے جب دیواروں پر اپنا نام نہیں لکھتے تو گالیاں لکھتے ہیں، گالیاں، نعرے اور دھمکیاں۔ دیواریں سب کے لیے کام آتی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں آج کل میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنی گلی کی دیوار پر ایک گالی لکھ دوں اور اس کے نیچے اگر اپنا نام نہ لکھ سکوں تو یہ ضرور لکھ دوں کہ یہ گالی اس شخص نے لکھی ہے جسے دعا دینے کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔"

("حریت" ۲۵ ستمبر ۱۹۸۲ء)

سلیم احمد کے کالموں کا دوسرا نمایاں امتیازی وصف متنوع اور مستقل دلچسپی کے حامل موضوعات ہیں جن کا دائرہ بے حد وسیع ہے —— کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی بھر جن سوالوں سے دوچار رہے اور جو فکری مسائل انہیں مجبوب و مرغوب رہے ان سب پہ انہوں نے قلم اٹھایا ہے۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ ان کے موضوعات ان کے معاصر کالم نگاروں سے کس طرح مختلف ہیں:

آپ اخبارات میں چھپنے والے سنجیدہ اور تجزیاتی کالم نگاروں کے کالم پڑھیں تو محسوس کریں گے کہ یہ خصوصی شعبوں کے ماہرین کی تحریریں ہیں۔ ان میں کوئی میدان سیاست کا شہسوار ہے، کوئی اقتصادیات کا، کوئی عسکری مسائل کا اور کوئی بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ امور کا اور جن کالم نگار صاحب کو ان میں سے کسی موضوع پر عبور حاصل نہیں ہے وہ اپنی یادداشتیں قلمبند کرنے بیٹھ گئے ہیں۔ ان کالموں کا عمومی مزاج اطلاعاتی Informative ہے۔ یہ بزرگ اسی کو کافی تصور کرتے ہیں کہ قارئین کے سامنے حالاتِ حاضرہ اور واقعاتِ عامہ کے حوالے سے نئی اطلاعات و معلومات اور نت نئے تجزیے پیش کرتے رہیں۔ غرضیکہ اطلاع اور پیش بینی ان کالموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ سلیم احمد کا قصہ عجب ہے وہ اپنے کالموں میں نہ اطلاع فراہم کرتے ہیں، نہ پیش بینی کرتے ہیں اور نہ ہی واقعات کی کھتونی میں پڑتے ہیں۔ ان کا طریقۂ کار سب سے جدا ہے۔ ان کے تمام کالم بنیادی طور پر فکر انگیز Thought Provoking ہوتے ہیں۔ وہ جس مسئلے کو بھی اپنے کالم کا موضوع بناتے ہیں اس کے کسی ایسے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں جس سے فکر مہمیز ہوتی ہو —— وہ قاری کو سوچنے پر اکساتے ہیں، سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ جمے جمائے نظریات و اصول، مروج خیالات و عقائد کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کے بجائے انہیں شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ —— پھر وہ ان پر ازسرِ نو غور کرنے، ان کی چھان پھٹک کرنے، ان کی تعریف متعین کرنے اور اکثر ان میں نئے معنی تلاش کرنے کی جتن کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ان نظریات و عقائد کو رد کرنے ہی کی نیت سے ایسا کرتے ہوں —— وہ ان کا اثبات بھی کرتے ہیں تو دلیل اپنی لاتے ہیں —— آپ انہیں چبے چبائے دلائل کو چباتے اور پٹے پٹائے فقروں کو دہراتے ہوئے کبھی نہیں پائیں گے۔ وہ حقیقت کے سراغ میں خود نکل کھڑے ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی پڑھنے والے کو لے جانا نہیں بھولتا اور یہی

اتنی تیز رفتاری سے چلتے ہیں کہ ساتھ چلنے والا تھک کر پیچھے بکھر! انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہے۔ وہ زیرِ بحث مسئلے کو کریدتے ہوئے متضاد و مخالف عناصر کو یکجا کر کے نئے اصول اور نئے کلیے وضع کرتے ہیں۔ ان کے کمزور سے کمزور کالم میں بھی کوئی نہ کوئی بصیرت افروز بات ضرور ملتی ہے۔ چونکہ ان کا مزاج منطقی اور طریقۂ کار تجزیاتی ہے اس لیے مسائل کا خوب گہرائی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ چیزوں کو سطح پر رہ کر دیکھنے سے ان کی طبیعت اوب جاتی تھی۔ اس لیے فکری مسائل کو وہ بار بار نئے نئے زاویوں سے دیکھتے، ان کی تہہ میں اترتے اور ہر بار زیرِ بحث مسئلے کے حوالے سے کوئی نہ کوئی نیا نکتہ دریافت کر لاتے اور اسے سوال کی صورت میں اس طرح پیش کرتے کہ جواب بھی اس کا سوال ہی میں پنہاں ہوتا۔ ان جیسی نکتہ رسی اور نکتہ شناسی اس عہد کے کسی دوسرے کالم نویس کے یہاں مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔

○

ہماری موجودہ صحافت بوجوہ موضوعات کی یکسانیت کا شکار ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخباری صفحات وقتی، ہنگامی اور سیاسی مسائل کے لیے جیسے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ اداریے ہوں یا مضامین، فیچرز ہوں یا توضیحی خبریں۔ ان سب میں سلیم احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کے کالموں میں نہ صرف تعلیم، پیغام، نیا تصور اور نیا خیال موجود ہوتا ہے بلکہ ان کی سطروں میں ایک انقلاب بھی کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے موضوعات میں تنوع

پیدا کیا اور کالم نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی جس میں تاحال ان کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا۔ ان کے کالموں کے موضوعات کے جائزے سے جو فہرست مبنی ہے ان میں ذیل کے موضوعات قابلِ ذکر ہیں :

۱۔ اسلامی نظام، ۲۔ ادب ۳۔ کلچر اور زبان کے مسائل۔ ۴۔ جمہوریت۔ ۵۔ تعلیمی نظام کا مسئلہ ۶۔ فحاشی و عریانی کا مسئلہ ۷۔ انقلابِ ایران۔ ۸۔ روزمرہ کے سماجی مسائل۔ ۹۔ بعض حکومتی فیصلوں کے ردِ عمل میں لکھے گئے کالم۔ ۱۰۔ کتابوں پر تبصرہ

ان موضوعات پر انہوں نے مسلسل و متواتر کالم لکھے ہیں۔ ان میں ان علمائے کرام مفکروں اور ادیبوں کے حوالے بھی ملتے ہیں جنہوں نے سلیم احمد کی فکر کو کسی نہ کسی طور متاثر کیا۔ جیسے شاہ ولی اللہؒ، مجدد الف ثانیؒ، سر سید، مولانا حالی، اقبال، محمد حسین آزاد، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا مودودیؒ، فراق گورکھپوری، پروفیسر کرار حسین، محمد حسن عسکری، اور مغربی ادیبوں میں ڈی۔ ایچ لارنس، ایمرسن اوسپنسکی، ایلیٹ، آندرے ژید، ٹالسٹائی، آلڈس ہکسلے وغیرہ

مذکورہ موضوعات میں سے بیشتر پر اخباری مضامین اور ادارتی کالموں میں اظہارِ خیال کیا جاتا رہا ہے لیکن سلیم احمد کے کالم اپنی اپروچ کی ندرت Originality کی وجہ سے ان سے مختلف و ممیز ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کالموں کی تہہ میں موجود شدتِ احساس کالم نگار کی ان مسائل سے کمٹ منٹ کو ظاہر کرتا ہے کہ ان مسائل سے اس کی ذہنی اور جذباتی وابستگی کی نوعیت کیا ہے؟ جیسا کہ عرض کیا گیا بحیثیت کالم نویس ان موضوعات کو برتنے میں سلیم احمد کی کامیابی اور انفرادیت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ برسہا برس تک کالم نویسی کرنے کے باوجود انہوں نے اپنی ادیب کی حیثیت اور شناخت متاثر نہیں ہونے دی —— وہ صحافت کے میدان میں رہ کر بھی ادیب ہی رہے اور صحافی نہیں کہلائے۔ اور اس طرح ان کا معاملہ ان ادیبوں سے مختلف رہا جنہیں قصرِ صحافت میں داخلے کی اجازت اس وقت ملی جب انہوں نے ادب کی عطا کردہ دستارِ فضیلت اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

ادب اور صحافت کے فرق کی بحث بڑی حد تک طے شدہ بلکہ اب تو پیش پا افتادہ ہو چکی ہے لیکن سلیم احمد کی کالم نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ صحافت میں آ کر بھی سلیم احمد کا رویہ ادیب کا رویہ رہا تو خاص سے ہماری مراد کیا ہے؟ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے خیال میں ذہن کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو لکھنے یا اپنی بہترین تحریر پیش کرنے کی طرف کسی فوری واقعہ کے دباؤ کے زیرِ اثر ہی مائل ہو سکتا ہے اور ذہن کی یہی وہ قسم ہے، جسے ایلیٹ صحافی کا ذہن قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سلیم احمد کی کالم نگاری ایک حیرت انگیز

واقعہ ہے کہ انھوں نے صدور واقعات سے اپنے موضوعات کو کبھی متاثر و مغلوب نہیں ہونے دیا۔ بیشتر کالم نویسوں کا اولین اور بعض اوقات سنگین ترین مسئلہ موضوع کی تلاش و جستجو اور اس کا انتخاب ہوتا ہے۔ اور یہی تلاش انہیں اخبار کے صفحات پر بکھری ہوئی خبروں اور تصویروں میں سے کسی ایک کو موضوع کے طور پر چننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سلیم احمد کے سارے کالم پڑھ جایئے ان کے گنتی کے کالم ایسے ملیں گے جس میں انھوں نے کسی خبر کو موضوع کی بنیاد بنایا ہوگا۔ ان کے کالموں کی برائے نام تعداد کو چھوڑ کر ان کے تمام کالم ان کے فکری مسائل کے تار و پود سے تیار کردہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب لکھنے والا متحرک فکر کا مالک ہو اور اس کے عقائد و نظریات کسی مخصوص فریم میں منجمد نہ ہو گئے ہوں۔ انھوں نے انہی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کا مواد ان کے ذہن میں پہلے سے یکتا رہا ہو اور یہ موضوعات و مسائل اخبار کے باسی ہوتے ہی پرانے اور از کار رفتہ نہیں ہوتے ان کی تازگی اور حرارت باقی رہتی ہے۔ اسی کی بیحد دلچسپ مثال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ۱۹۶۶ء کے زمانے کے دو ایک کالم ۱۹۸۰ء کے بعد بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے دوبارہ شائع کیے تو پڑھنے والوں نے اسے نئے کالم کے طور پر پڑھا اور ان میں سے کسی کو بھی ان کالموں کی کہنگی کا شائبہ تک نہیں ہو سکا۔ علاوہ ازیں یہ موضوعات و مسائل ذاتی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ ان کا ہماری تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی زندگی سے نہایت گہرا اور دور رس تعلق ہے یہ وہ مسائل ہیں جو بحیثیت قوم و ملت کے ہماری موت و زیست کے سوال سے پیوست ہیں۔

سلیم احمد ان کالموں میں پوچھتے ہیں: فرد کے نفس باطن کی اصلاح کس طرح ہو؟ قوم کے اخلاقی وجود کو لاحق امراض سے نجات کیسے ممکن ہے؟ حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ موجودہ ہیئت اجتماعیہ میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں انہیں کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ پرانے نظام کی بیخ کنی اور نئے نظام کے نفاذ کے کیا امکانات ہیں؟ ہمارا تعلیمی نظام کس قسم کی نسل تیار کر رہا ہے؟ مجرد اصول و نظریات اور ٹھوس حقائق میں ہم آہنگی کی عدم موجودگی میں تعلیم کا مقصد و منصب کیا ہونا چاہیئے؟ کیا اسلامی نظام میں ہمارے لیے راہ نجات ہے؟ اس نظام کو کیسے اور کون نافذ کرے گا؟ جمہوریت اور ہمارے قومی مزاج میں باہم کتنا تطابق پایا جاتا ہے؟ قول و عمل کا تضاد کیوں ہے؟ منافقت و ریاکاری ہماری رگوں میں کیوں سرایت کر گئی ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ جدید تہذیب کے پیدا کردہ مسائل کیا ہیں؟ ہم کس طرح اس تہذیب کی نعمتوں سے فائدے اٹھا سکتے ہیں اور کیونکر اس کی لعنتوں سے دامن بچا سکتے ہیں اسی تہذیب کے تخریبی اور تعمیری عناصر کون کون سے ہیں؟ سرسید کا کہا مان کر ہمیں کیا ملا؟ اب ہم کہاں جائیں؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے بارے میں انھوں نے لکھا:

"عزیزو! میرے سوال نجانے مجھے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں سوالوں کو ٹھیک ٹھیک کر سلانے کا قائل نہیں ہوں، میں ان کا جواب چاہتا ہوں۔"

(حریت ۱۴ ستمبر ۱۹۸۰ء)

ان کے پے در پے سوالات سے جسارت کے قارئین کا ایک محدود حلقہ نالاں بھی رہتا تھا۔ اس کے نزدیک سلیم احمد سوال کر کر کے لوگوں میں ذہنی انتشار پھیلا رہے تھے۔ درحقیقت یہ وہ لوگ تھے جو بیٹھے بیٹھے خیالات ہی کو فکر و فلسفہ سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ سلیم احمد کے مخاطب تھے ہی نہیں اس لیے انہوں نے اپنے ان معترضین سے کہا کہ میں آپ کے لیے نہیں لکھتا آپ کے لیے لکھنے والے اور بہت سے لوگ ہیں جن کے خیالات آپ کے لیے ذہنی تفریح کا باعث ہوں گے۔ سلیم احمد سوال کرتے رہے۔ ان گنت سوالات جن کی ضرورت و اہمیت خود ان سوالوں سے ظاہر ہے۔ انہیں نہ صرف سلیم احمد نے اٹھایا بلکہ ان کا تجزیہ کر کے عوام اور اس سے زیادہ اس طبقے کی فکری رہنمائی کی جو رائے ساز طبقہ کہلاتا ہے۔ ان کالموں میں کہیں فکری الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا۔ پیچیدہ دقیق سے دقیق اور متنازعہ ترین مسائل کو بھی وہ راست طریقے سے بیان کرتے ہیں اور اس میں ان کا طرز استدلال محکم اور دلنشین ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے ذہن جتنا واضح اور صاف ہوگا، تحریر بھی اس کی عکاسی کرے گی۔ پھر چونکہ سلیم احمد اس حقیقت سے خوب آشنا تھے۔ کہ وہ اخبار کے لیے لکھ رہے ہیں اور اس کے قارئین میں مختلف ذہنی سطح کے لوگ شامل ہوتے ہیں اس لیے ان کالموں میں موضوع کے تقاضے کے باوجود علمی اصطلاحات اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ ان کے مسلسلے میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ ہماری قومی و ملی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر اتنے فکر انگیز کالم کسی نے نہیں لکھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ کالم بالعموم محدود تر اشاعت کے حامل اخبارات میں شائع ہوئے جن کی وجہ سے ان کا دائرہ اثر محدود رہا۔

مناسب ہوگا کہ یہاں متفرق موضوعات پر لکھے گئے کالموں سے چند اقتباسات نقل کر دیئے جائیں تاکہ سلیم احمد کے کالموں کا اسلوب و مزاج اور موضوعات و مسائل کی پیش کش اور اس کے طریقہ کار کے بارے اندازہ ہو سکے۔

اسلامی نظام

"ہمارے نزدیک کوئی بھی اسلامی حکومت تین کام نہیں کر سکتی اور تین کام ہیں جو وہ کر سکتی

ہے — جو تین کام وہ نہیں کر سکتی وہ یہ ہیں:

(۱) سائنس اور ٹیکنالوجی کا اخراج کرنا
(۲) معاشیات کے جدید تقاضوں کو نظر انداز کر دینا
(۳) مغرب سے جو مختلف قسم کے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی رجحانات پہنچتے ہیں ان کی روک تھام کرنا۔

جو تین کام وہ کر سکتی ہے وہ یہ ہے:

(۱) اسلامی قانون: مثلاً قانون تعزیرات، قانون وراثت اور قانون زکوٰۃ کا نفاذ۔
(۲) اسلامی روح کے مطابق نئے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اداروں کا قیام
(۳) اسلام کے تصور عدل و احسان کے مطابق ایک اسلامی فلاحی ریاست کی تشکیل کی طرف پیش قدمی۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی اسلامی ریاست موجودہ حالت میں یہ تین کام بھی کر سکے تو یہ اس کی قابل تعریف کارکردگی ہوگی۔"

(اسلامی نظام اور اس کا تضاد — اسلامی نظام، مسائل اور تجربے)

"اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں دوسری بڑی رکاوٹ مراعات یافتہ طبقات ہیں۔ ان میں جاگیردار، سرمایہ دار اور بیوروکریسی من حیثیت الطبقہ شامل ہیں ... ہمارے معاشرے میں ان طبقات کو جو قوت اور مقام حاصل ہے، وہ اسلام کے عدل اجتماعی کے منافی ہے ...... مجھے احساس ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس خیال سے اتفاق نہیں کریں گے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اب ان طبقات کو برقرار رکھنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ اور اگر ان کا کوئی نام نہاد اسلامی جواز پیش کیا گیا تو اس سے اسلام کو تو نقصان پہنچ جائے گا لیکن ان طبقات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔" (طبقاتی معاشرہ اور اسلامی نظام — اسلامی نظام، مسائل اور تجربے)

جمہوریت

جمہوریت کی روح کیا ہے؟ یہ کہ میرے مخالف کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ میں اس

کی رائے کا احترام کرتا ہوں بلکہ بقول والٹیئر اپنے مخالف کو اپنی رائے دینے کا حق دلانے کے لیے لڑنے کے لیے تیار رہوں۔ جمہوریت اگر مخالف رائے کا احترام نہیں کر سکتی تو وہ جمہوریت نہیں ہے۔ کیا آپ کو اپنے چاروں طرف اور خود اپنے دل میں مخالف رائے کا احترام ملتا ہے ؟ جمہوریت کے دوسرے معنی ہیں ذمہ داری، میری رائے اتنی اہم ہے کہ پورے قوم کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ کیا ہم اہمیت کے اس احساس کے ساتھ اپنی رائے کا استعمال کر سکتے ہیں۔ پیسے کے لیے برادری کے لیے، چند عارضی مفادات کے حاصل کرنے کے لیے اپنی رائے کو فروخت تو نہیں کرتے ؟ جمہوریت کے آخری معنی ہیں آزادی اور آزادی کے معنی میرے نزدیک صرف ایک ہیں۔ مجھے اپنی جیب میں ماچس رکھنے کا حق ہے مگر ماچس سے غیروں کے گھر میں آگ لگانے کا حق نہیں ہے ...... کیا ہم ماچس رکھنے کی اس آزادی اور ذمہ داری کے اہل ہیں ؟

("حریت" ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ء)

"میرا یقین نظام حکومت میں نہیں۔ میں افراد میں یقین رکھتا ہوں۔ اس لیے جس جمہوریت پر میں یقین رکھتا ہوں۔ وہ سیاسی جمہوریت نہیں انسانی جمہوریت ہے اس جمہوریت کے معنی ہیں فرد کا احترام۔"

("حریت" ۱۶۔ دسمبر ۱۹۸۲)

تبدیلی و انقلاب

"جمود اور زندگی دو متضاد چیزیں ہیں۔ زندگی میں کبھی جمود نہیں ہو سکتا۔ جمود صرف موت میں ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف کافر کی موت میں۔ مومن کی موت بھی زندگی کا صرف ایک وقفہ ہوتی ہے جس میں وہ دم لے کر آگے چلتا ہے۔ زندگی مسلسل حرکت و مسلسل تبدیلی کا نام ہے۔ وہ ہمیشہ ماضی سے مستقبل کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ ہم زندگی کو تبدیلی سے نہیں روک سکتے۔ انقلاب زندگی کا مقدر ہے ہم انقلاب کے بارے میں منفی یا مثبت رویہ رکھ سکتے ہیں۔ مگر انقلاب کو وجود میں آنے سے روک نہیں سکتے۔"

("حریت" ۷۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

"حکومت اور قانون زبردست قوت ہوتی ہے لیکن صرف حکومت اور قانون سے معاشرے کو بدلنا ایک جھوٹا خواب ہے۔ جو انجام کار مایوسی پیدا کرتا ہے۔"

("حریت" ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

"جو حکومت تبدیلی لانے کی خواہش کرے گی اس کو سب سے پہلے اس تضاد کو سمجھنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سب سے پہلے قوم کے نفس باطن کا علم حاصل کرے اور پھر اس کے اندر خیر کی طرف جو رغبت موجود ہے اسے ابھارے قوم کے نفس باطن کا علم کہاں سے حاصل ہوگا۔ اہل حکمت سے، اہل بصیرت سے۔ دوسرے لفظوں میں ایسی حکومت کو سب سے پہلے اپنے اہل دانش کا تعاون حاصل کرنا ہوگا اور انہیں آزادی دینی ہوگی کہ وہ سچائی کے ساتھ اپنے تجربے اور تجاویز پیش کرسکیں۔

("حریت" ۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

نظام تعلیم

"ہمیں اپنے طلبا کو صرف یہ درس نہیں دینا چاہیئے کہ مثالی کردار ہونے کی صورت میں دنیا ان کے لیے جنت ہوگی۔ ہمیں انہیں یہ بھی سکھانا چاہیئے کہ دنیا کو جنت بنانے کے لیے ہمیں کن کن جھنجھٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

("حریت" ۹ دسمبر ۱۹۸۱ء)

"ہمارے ماہرین تعلیم کو صرف اس بات پر زور نہیں دینا چاہیئے کہ بچے کی ابتدائی تربیت پسندیدہ خطوط پر کی جائے۔ انہیں یہ بھی کوشش کرنا چاہیئے کہ بچے کا شعور جوں جوں ترقی کرتا جائے اس میں ماحول سے مطابقت کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا ہوتی جائے۔"

"ضرورت اس بات کی ہے کہ ارباب تعلیم ایک طرف تو ان خالی خولی آدرشوں سے بچیں جن کی جڑیں زمین میں مضبوط نہیں ہیں۔ کیونکہ غیر حقیقی آدرش پرستی انسان کو انجام کار مایوسی سے دوچار کرتی ہے جس کا اثر پوری شخصیت ہی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے دوسری طرف انہیں ایسی حقیقت پسندی سے بھی بچنا ہے جو کسی قسم کے اعلیٰ

خیال ہی کو پروان نہ چڑھنے دے کیونکہ اعلیٰ خیال سے محروم رہ کر ہم انسان ہی نہیں رہتے۔ انسان سے گر کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔"

("حریت" ۵/۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء)

قومی اور شہری مسائل

"حکومت اصلاح معاشرہ کا کام صرف اس وقت کر سکتی ہے جب ایک طرف خود اس کے عمال اصلاح یافتہ ہوں۔ دوسری طرف معاشرہ کے اصلاح یافتہ لوگوں کا تعاون اسے حاصل ہو۔ اور وہ انہیں اپنا معاون بنانے کی کوشش کرے جب تک یہ نہیں ہوگا اصلاح اصلاح کا شور تو بہت مچے گا کام کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے گا۔"

("حریت" ۴ دسمبر ۱۹۸۲ء)

"کراچی ایک ایسا شہر ہے جہاں روزگار کے ہزاروں مواقع موجود ہیں۔ یہاں آدمی رکشہ چلا سکتا ہے، ٹیکسی چلا سکتا ہے، بوٹ پالش کر سکتا ہے۔ کارخانے، فیکٹریاں، مل مزدوروں کے لیے ہر وقت کھلے ہوتے ہیں۔ بازاروں میں ٹھیلے، خوانچے، ریڑھیاں موجود ہیں لیکن سفید پوش طبقہ کے لیے روزگار کے یہ سارے ذریعے بند ہیں۔ کراچی ہر ایک کے دکھ کی دوا ہے مگر اس طبقے کے درد کا درماں کراچی کے پاس نہیں۔ کچھ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ دنوں میں یہ شہر یا تو کوٹھیوں کا رہ جائے گا یا جھگیوں والوں کا۔ ہمارے جیسے کوارٹروں اور فلیٹوں والوں کی اس شہر میں کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ کراچی سے متوسط طبقہ غائب ہو جائے گا۔"

("حریت" ۱۵ دسمبر ۱۹۸۱ء)

سنسر شپ

"میں صدر ضیاء کے حامیوں اور مداحوں میں ہوں لیکن تنقید کا حق محفوظ رکھتا ہوں معذور یوں کہ سنسر کی موجودگی میں اگر تنقید ظاہر ہونے کا خطرہ مول بھی لے لوں تو اخبار کے صفحہ پر کالے حروف کی جگہ خالی جگہ کی سفیدی رہ جائے گی۔ لیکن اگر احمد مقصود حمیدی

(ایکریری اطلاعات سندھ) اجازت دیں تو میں ان کی وساطت سے صدر ضیا سے پوچھ لوں کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ کو یہ پوچھنے سے نہیں روکا کہ نماز کے کرتے کا کپڑا کہاں سے آیا؟ تو صدر ضیا دبلا شبہ مجھے یہ کیوں نہیں پوچھنے دیتے کہ آپ کی شیروانی میری شیروانی سے قیمتی کیوں ہے؟ اے بھائی حمیدی! سوال کو نہ روکیے، سوال کو روک دینے سے تو قوم کو انتشار خیال کی بدہضمی ہو جاتی ہے۔"

("حریت" ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء)

ہم اپنے اس مضمون کو سمیٹنے سے پہلے سلیم احمد کے ان کالموں کو موضوع بحث بنانا چاہتے ہیں جس میں انہوں نے اپنی شدید واردات قلبی کا اظہار کیا ہے۔ گو ان کالموں کی تعداد چند کالموں سے زیادہ نہیں لیکن انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سلیم احمد نے یہ کالم اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل تحریر کیے تھے اور ان کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمر کے آخری حصے میں شدید مایوسی اذیت ناکی اور متغیر ذہنی کیفیت سے دوچار رہے جس کی توقع ان کی ذات سے کم ہی کی جا سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک مرنجاں مرنج اور تجزیاتی دل و دماغ کے مالک تھے اور مایوس کن حالات میں بھی ان کی فکری قوت و صلاحیت نہ مضمحل ہوتی تھی اور نہ ہی احساس شکست سے دوچار ہوتی تھی۔ لیکن ان کالموں کو دیکھیے تو اس خیال کی واضح طور پر تردید ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"اب تجزیوں اور عقلی باتوں سے اور ہر اس چیز سے جس کا تعلق شعور سے ہے، میری طبیعت اچاٹ ہو گئی ہے۔ اس معاشرے میں شعور ایک بن بلائے مہمان کی طرح ہے جس کو کوئی سیدھے منہ بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اب ہماری قسمت کا فیصلہ عقل اور شعور سے نہیں ہوگا۔ وہ کچھ اور ہی قوتیں ہوں گی جو ہماری قسمت کا فیصلہ کریں گی۔"

اپنی شدید مایوسی کا اظہار اس کالم میں آگے چل کر انہوں نے اور شدت کے ساتھ کیا:

"اب سے بیس سال پہلے میں نے کہا تھا کہ میں صحرا میں اذان دے رہا ہوں لیکن یہ امر واقعہ نہیں تھا۔ زندگی نے ثابت کیا ہے کہ یہ صرف ایک پیش گوئی تھی۔ میں صحرا میں نہیں بستیوں میں اذان دے رہا تھا۔ صحرا میں تو اب آیا ہوں۔ اس وقت کچھ لوگ سن رہے تھے۔ ان کی قوت عمل شل تھی۔ مگر قوت سماعت کام کر رہی تھی۔ اب قوت سماعت مکمل طور پر جواب دے گئی ہے۔"

یہاں سے ان کی مایوسی بے پناہ غصے، اور جلال میں تبدیل ہو جاتی ہے، لہجہ خطابیہ ہو جاتا ہے۔

"اے لوگو! میں تمہیں انتشار کی بشارت دیتا ہوں۔ یہ لفظ میں تمہاری لوح تقدیر پہ لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اور تمہارے شہر اور تمہاری بستیاں اور تمہاری اونچی اونچی بلڈنگیں اور تمہارے چمکتے دمکتے بینک اور تمہاری تفریح گاہیں اور تمہارے شبستان سب انتشار کی آندھیوں میں اڑنے والے ہیں ــــــ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی ساری بے حسی اور شقاوت کے ساتھ خزاں کے زرد پتوں کی طرح تیز ہواؤں میں اڑ رہے ہو اور تمہارے گھروں کی بنیادوں اور دیواروں میں بگولے رقص کر رہے ہیں۔ میں خدا سے ایک ایسی آواز چاہتا ہوں جو انتشار کی زبان بول سکے۔ ہمارا وجود اب صرف انتشار ہی کی زبان سمجھ سکتا ہے۔"

("حریت" ۲۰ ستمبر ۱۹۸۲ء)

سلیم احمد کے ان احساسات کا تجزیہ دشوار نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ بشری تقاضوں کے تحت کبھی کبھی ان پہ حالات سے مایوسی کا شدید غلبہ ہو جاتا تھا اور یہ مایوسی تنہائی کے بے پناہ غم انگیز احساس سے جنم لیتی تھی جب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ جس درد و کرب کے ساتھ معاشرے کی زبوں حالی پہ لوگوں کو سوچنے کی طرف بلاتے ہیں لیکن دوسروں کا ان مسائل پر سوچنا اور ان کے خیالات میں شریک ہونا تو دور کی بات انہیں سننے والا اور ان کے احساسات میں شریک کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے حقیر مفادات کے لئے اسیر ہو چکے ہیں کہ سنجیدہ مسائل سے ان کی دلچسپی ختم ہو چلی ہے اور وہ اپنی تنگ و تاریک دنیا سے ایک ساعت کے لیے بھی نکلنے کو تیار نہیں ہیں تو ایسے میں ان پہ کیا گزرتی تھی اس کا اندازہ ان کے ایک اور کالم کے اس پیراگراف سے لگایئے۔

"اور کبھی کبھی میں اپنی تنہائیوں میں خود سے کہتا ہوں: "اندھوں کے شہر میں آنکھوں کا عذاب کون برداشت کر سکتا ہے۔" دیکھنا" کبھی ایک رحمت تھا۔ میرے لیے وہ ایک لعنت بن گیا ہے۔ یہ کیسا زخم ہے کہ پتھروں کے درمیان اگر کوئی آدمی زندہ بھی تھا تو اب وہ پتھر بن جانے کی دعا میں مانگ رہا ہے، کیونکہ پتھر کو کم از کم کوئی اذیت تو نہیں ہوتی۔ کبھی میں اپنی اذیتوں کو اپنی زندگی کا نشان سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ چونکہ میں تکلیف میں ہوں اس لیے زندہ ہوں لیکن اس تکلیف سے کیا فائدہ جو ایک گونگے کرب کے سوا اپنے ہونے کا کوئی ثبوت نہ دے سکے۔"

سلیم احمد اپنی جنگ خود لڑنے کے قائل اور عادی تھے اور ان کی ساری زندگی اپنے مؤقف کو منوانے اور اسے برحق ثابت کرنے کے جدل و پیکار سے عبارت ہے انہوں نے اس کے لیے کبھی کوئی بیرونی سہارا

نہیں ڈھونڈا کسی سے مدد و تعاون کی توقع نہیں رکھی لیکن ان کی یہ ساری علمی لڑائیاں ادب کے دائرے کے اندر رہنے کی وجہ سے اپنے مطلوبہ نتائج پیدا کرتی رہیں۔ اس کے برعکس ان کی کالم نویسی جو اجتماعیت سے ایک زندہ رشتہ استوار کرنے کی کوشش تھی، عمر کے آخری حصے میں شدید احساس زیاں میں بدل گئی تھی جس کی وہ اپنی گفتگوؤں میں بار بار ذکر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہیئت اجتماعیہ میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لیے ہماری کوششوں کے طریقۂ کار میں شاید کوئی خامی رہ گئی ہے ـــــ انہوں نے اپنے کالم میں یہ بھی لکھا کہ اسلام کے حوالے سے وہ ایک بڑا علمی کام کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انہیں کتابوں کی ضرورت ہے اور ان کتابوں کے حصول کے لیے ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔

سلیم احمد اگر مایوس و ملول تھے تو بقول نظیر صدیقی یہ مایوسی اجتماعی حالات کا بدیہی نتیجہ تھی۔ یہ احساس تنہائی اور مایوسی ذاتی نہ تھی، معاشرے سے کٹے ہوئے اپنی داخلیت میں گم کسی فرد کی تنہائی نہ تھی ـــــ یہ ایک ایسے آدمی کی مایوسی تھی جس نے ایک عظیم نصب العین کو پانے کا خواب دیکھا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس خواب اور تعبیر میں جس قدر بُعد پیدا ہوتا گیا وہ سلیم احمد جیسے بے ریا اور مخلص دانشور کے دل میں تاریکی اور اکیلے پن کا احساس پیدا کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس احساس کی شدت ایک آدھ کالم میں تو ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئی ہے۔

> "کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک بجھے ہوئے چراغ کی طرح ہوں جس میں جلنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ ایک تھکن، ایک بیزاری، ایک نامعلوم کی سی انتشار کی کیفیت میرے دل و دماغ پر مسلط رہتی ہے اور لکھنا پڑھنا ایسا عذاب معلوم ہوتا ہے جس کے سہار کی تاب مجھ میں باقی نہیں رہی۔ وہ کتابیں جو مجھے بچوں کی طرح عزیز تھیں مجھے اتنی بے مصرف معلوم ہونے لگتی ہیں کہ میں اپنے سرہانے رکھا ہوا دیکھ کر سوچنے لگتا ہوں کہ وہ نہ جانے کون سا وقت تھا جب میں نے انہیں اپنی زندگی کا سب سے عزیز سرمایہ سمجھا۔ لکھنے سے طبیعت اتنی اچاٹ ہو گئی ہے کہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھنے کے تصور ہی سے الجھن ہونے لگتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ کاش میں قلم کی گھسائی کے اس تھکا دینے والے کام سے ہمیشہ کے لیے نجات پا جاؤں۔"
>
> ("حریت" : ۸، اکتوبر ۱۹۸۳ء)

یہ بیزاری اور اذیت ناکی ایک حساس نوجوان کی نہیں ایک پختہ کار ادیب کی ہے جس نے کم و بیش تیس سال زندگی کے سنجیدہ ترین امور و مسائل پر غور و فکر میں صرف کیے تھے، جس نے اپنے جذبات کی

کی تہذیب کی تھی اور انہیں ضبط و تحمل اور شائستگی، اظہار کا سلیقہ سکھایا تھا۔ جب ایسا تحمل پسند آدمی ایک مقام پر آکر اس نتیجے پر پہنچے کہ :

"میرے اندر ایک لکھنے والا تھا، ایک پڑھنے والا تھا، ایک سوچنے والا تھا۔

آپ اسے ادیب کہہ لیجئے ـــــ وہ ادیب میرے اندر مر رہا ہے۔"

تو پھر سوچنا چاہیے کہ کیا یہ محض اجتماعی حالات سے مایوسی کا شاخسانہ ہے؟ بقول خود ان کے "یہ صرف مایوسی نہیں ہے، صرف تھکن نہیں ہے، صرف بڑھتی ہوئی عمر کا بوجھ نہیں ہے۔ کچھ اس سے زیادہ ہے۔

"کچھ اس سے زیادہ کیا ہے؟" یہ ہے الجھا ہوا مسئلہ

یہ مایوسی فنکار، شاعر اور نقاد کی مایوسی نہیں ہے۔ یہ ایک ریفارمر، ملک و ملت کا درد رکھنے والے ایک مفکر کی مایوسی ہے جو عمل میں انقلاب پیدا کرنے کا خواب تو دیکھ سکتا ہے لیکن اس انقلاب کو برپا کرنے پر قادر نہیں ہے۔

انہوں نے لکھا :

"میں نے لکھا تھا کہ میں صفر بن جانا چاہتا ہوں۔ میں نے غلط کہا تھا۔ میں صفر نہیں بننا چاہتا، صفر بن رہا ہوں۔"

سلیم احمد نے صحافت، ادب اور تنقید میں اپنی فکر سے جو نقوش مرتب و مترسم کیے ہیں وہ ہماری صحافتی اور ادبی تاریخ کا روشن باب ہے جس کی تابنا کی گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اصل مسئلہ تو ہمارے اجتماعی و ملّی وجود کی بقا کا ہے جو ایک سوالیہ نشان ہے اور جو آہستہ آہستہ صفر بنتا جا رہا ہے۔

ترتیب و تہذیب : جمال پانی پتی

حلقۂ سلیم احمد میں پروفیسر کرار حسین کی ایک گفتگو

سلیم احمد مرحوم کا ایک مضمون "گڈ بائی ٹو مسٹر سید" روایت کے سلیم احمد نمبر میں شامل ہے۔ یہ مضمون پچھلے دنوں حلقۂ سلیم احمد کراچی کی ایک تنقیدی نشست میں برائے تنقید پیش کیا گیا۔ نشست کی صدارت کے فرائض پروفیسر کرار حسین صاحب نے انجام دیئے۔

(ادارہ)

○

حلقۂ سلیم احمد کی ہفتہ وار تنقیدی نشست گزشتہ ہفتے بروز سنیچر بتاریخ ۱۲ اپریل ۹۶ء بوقت ۶ بجے بمقام بہادر یار جنگ لائبریری ... منعقد ہوئی۔ اس نشست میں سلیم احمد مرحوم کا ایک مضمون "گڈ بائی ٹو مسٹر سید" جمال احسانی نے پڑھ کر سنایا۔ جناب صدر نے حاضرین کو مضمون پر اظہار رائے کی دعوت دی۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے شبنم صدیقی نے کہا:

شبنم صدیقی: جناب صدر! اس مقالے میں، بلکہ مقالہ تو اسے نہیں کہنا چاہیے، یہ مضمون ہے اور مضمون ہی کہہ کر پیش کیا گیا ہے ــــــ بلکہ میں تو کہوں گا کہ یا تو اسے ایک تنقیدی انشائیہ کہا جا سکتا ہے یا ایک تخلیقی مضمون ــــــ تو اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر بات کرنے سے پہلے ہمیں چند باتیں پیش نظر رکھنی پڑیں گی ــــــ ایک تو یہ کہ سلیم احمد کے بارے میں بھی یہ بات جانتے

ہیں کہ ان کا طرزِ فکر سر سیّد احمد خاں کے طرزِ فکر سے مختلف تھا، بلکہ متخلف بھی گیا، اصل میں تو دونوں کے طرزِ فکر میں نا تھیوں اور ساؤتھ پولی والا تضاد کا رشتہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سر سیّد احمد خاں کی منجور اثر انداز عظیم شخصیت کا جو Impact ہماری تہذیب پر اور ہماری تاریخ پر پڑا ہے، اس سے سلیم احمد نے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ اس کو ہمیشہ تسلیم کیا۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہماری تہذیبی زندگی کے جتنے شعبے ہیں ان سب پر سر سیّد کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ اور ہماری کتاب تہذیب کے ایک ایک ورق پر ان کی مہر ثبت ہے۔ سر سیّد سے نہ ہم بچ سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں —— لیکن وہ کہتے تھے کہ میرا جو اختلاف سر سیّد سے ہے وہ نہ تو کسی ذاتی بنیاد پر ہے اور نہ اس میں کوئی غیر علمی، غیر فکری یا غیر ادبی محرک شامل ہے —— اچھا اب ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلیم احمد "بابائے جدیدیت" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ اور وہ کہتے تھے کہ ان کا کینوس بڑا وسیع ہے اور یہ کام بہت زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے معلوم نہیں اس کام کو مکمل بھی کر سکوں گا یا نہیں —— اب یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ انہوں یہ کتاب مکمل نہیں کی، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے کتنے ابواب انہوں نے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے دوسرے احباب یا اعزہ اس بارے میں کچھ جانتے ہوں، لیکن میں ذاتی طور پر کچھ نہیں جانتا بہرحال جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے۔ تو اس مضمون سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہے کہ سر سیّد کی فکر سے سلیم احمد کا اختلاف بہت بنیادی تھا۔ اتنا بنیادی کہ یہ اختلاف کی حد سے آگے بڑھ کر تضاد کے درجے تک پہنچ گیا تھا، مثال کے طور پر ایک یہی بات دیکھیے کہ اس مضمون میں ایک مکتبہ فکر کو "زہر" کہا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں جو دوسرا مکتبہ فکر پہلے سے موجود تھا دیو بند کا، اسے "آبِ حیات" قرار دیا ہے —— تو یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان دونوں میں تضاد کا رشتہ دیکھتے تھے۔ سلیم احمد اپنے اندازِ فکر کے اعتبار سے سر سیّد سے بہت دور اور دیو بند کے بہت قریب تھے۔ سر سیّد کی تمام عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود سلیم احمد کی مختلف تحریروں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ سر سیّد احمد خاں نے جو اندازِ فکر پیدا کیا ہمارے معاشرے میں وہ اصل میں ایک متوازیت کا رشتہ رکھتا تھا اس طرزِ فکر سے جو Renaisssance کے دور میں مغرب میں پیدا ہوئی۔ یورپ میں جب نشاۃِ ثانیہ کا دور آیا تو سب سے بنیادی چیز

ہوئی کہ جس کرسی پر اللہ تعالیٰ بیٹھا ہوا تھا اس کرسی پر سے اسے اتار کر اس کی جگہ انسان کو بٹھا دیا گیا۔ اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ جو ایک ڈوائن فکر تھی کہ جس کو ہم روائتی فکر یا ٹریڈیشن Tradition بھی کہتے ہیں تو اس فکر کا Degeneration شروع ہو گیا اور وہ Degreneration اس طرح سے ہوا کہ سب سے پہلے مرحلہ پر خدا کی جگہ انسان کو بٹھا یا گیا جس سے ایک Humanism وجود میں آئی اور جب بات ڈوائن فکر سے Humanism تک پہنچی تو یہ سلسلہ رکا نہیں اب یہ ہوا کہ صاحب! Human being کیوں؟ Human being تو ایک نوع ہے ایک Individual کیوں نہیں۔ ایک فرد کیوں نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ ہیومن ازم سے Individualism تک آگیا اور جب بات Individualism تک پہنچی تو یہ سوال ہوا کہ صاحب! کس Human Individual میں سب سے زیادہ نمایاں اور توانا فیکلٹی کون سی ہے؟ معلوم ہوا کہ وہ فیکلٹی ہے Reason چنانچہ Reason کو اتھارٹی مان لیا گیا اور بات پہنچ گئی Rationalism تک۔ اس کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ نہیں صاحب! یہ ریشنل ازم بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے کہ Reason جو ہے تو وہ جبلت کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسے گنا ہڑی کی ٹوکے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اسی طرح Reason بھی جبلت کے پیچھے پیچھے جاتا ہے لہٰذا اب معاملہ جو تھا تو وہ Instinctualism تک آگیا اور اسی طرح سے بڑھتے بڑھتے بالآخر انحطاط تک اور وہاں سے Pragmatism تک جا پہنچا اور Pragmatism کے بارے میں بہت سے مفکرین کہہ چکے ہیں کہ Pragmatism پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب فلسفہ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تو اب یہ سارا Degeneration جو نشاۃ ثانیہ کے دور سے شروع ہوا اور اس کے بعد مسلسل آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے اثرات سرسید کے وقت ہندوستان کے معاشرے تک بھی پہنچے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید احمد کے بعد ہمارے ہاں بھی مادی اقدار پر زور دینے، افکار و اقدار کو اپنانے اور افادیت کو مادی افادیت کے مترادف سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اور قرآن کریم کی تفسیر، عقل پرستی کے تابع رہ کر کی گئی اور اس طرح سے دین کی تعبیر بالکل ریشنل

نقطۂ نظر سے گرنے کا رجحان پیدا ہوا ـــــ تو یہ افادیت اور یہ مادیت اور یہ عقلیت
اور اس کے نتیجہ میں جو اضافیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اضافیت، اور وہ عملیت یا استنتاجیت
جس کو ابھی Pragmatism کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ تو یہ تمام چیزیں
جو ہیں تو وہ سرسید کے بعد سے ہمارے ہاں بھی آ گئیں۔ سرسید سے پہلے جو ہماری فکر
تھی وہ ایک روایتی فکر تھی۔ ایک ٹریڈیشنل فکر تھی اور اس میں کچھ مستقل اور مطلق اقدار تھیں
جن پر کہ وہ فکر Based تھی۔ اور وہ مدتوں سے چلی آ رہی تھی۔ اس فکر کی بنیاد پر
ایک بڑا منظم اور بڑا Established معاشرہ قائم تھا۔ ایک بڑی منظم اور
بڑی مضبوط تہذیب قائم تھی۔ اور یہ تہذیب ایک اکائی تھی۔ وہ معاشرہ ابھی بکھرا نہیں تھا
ٹوٹا نہیں تھا۔ اقدار منتشر نہیں ہوئی تھیں لیکن سرسید کے بعد انتشار کا عمل اس معاشرے
میں شروع ہو گیا اور اس کے بعد آگے بڑھتا چلا گیا۔ تو جناب صدر! یہ اصل میں بنیادی
چیز تھی جس کی بنا پر سرسید سے اختلاف ہوا سلیم احمد کا۔ اور انہوں نے اسی بات کی وضاحت
اس مضمون میں کی ہے کہ میرا جو اختلاف ہے وہ ایک فکری بنیاد پر ہے۔ بصیرت کی بنیاد
پر ہے۔ علم کی بنیاد پر ہے۔ ایک اپروچ کی بنیاد پر ہے۔ وہ اختلاف کسی غیر ادبی محرک کی بنا
پر نہیں ہے نہ کسی ذاتی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت بڑے خوبصورت انداز میں
اور بڑی تخلیقی اور بڑی توانا نثر میں سلیم احمد صاحب نے کی ہے۔ ایسی نثر میں جسے نثر کا ایک
شہ پارہ کہنا چاہیے۔

جمال احسانی: جناب صدر! میں آپ کے توسط سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں شبنم صاحب سے کہ
جو باتیں انہوں نے فرمائی ہیں وہ تو سب اس مضمون میں تھیں۔ تو اتنا وقت ہمارا کیوں لیا
گیا۔ یعنی اس مضمون پر کوئی بات نہیں کی گئی بلکہ اس مضمون میں جو بات تھی اس کو
Elaborate کیا گیا۔ اسی کی وضاحت کی گئی۔ حالانکہ وہ تو میرے خیال میں
سبھی سمجھ رہے ہیں۔

شہزاد منظر: صاحب دیکھئے! سرسید کے بارے میں کافی اختلافات ہیں۔ ایک خیال تو سرسید
کے بارے میں یہ ہے کہ اگر سرسید پیدا نہیں ہوتے تو ہم یعنی انڈیا اور پاکستان کے
مسلمان کہاں ہوتے۔ یہ ایک طبقہ ہے۔ اور دوسرا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ساری برائیوں کی
جڑ ہی سرسید احمد خاں ہیں ـــــ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں فیصلے جو ہیں وہ کس

حد تک انتہا پسندانہ ہیں۔ سرسید کو آپ ان کے اپنے دور کے پس منظر میں رکھیں اور سوچیں کہ مسلمان اس دور میں کس عالم میں تھے۔ سرسید سے قبل راجہ رام موہن رائے پہلے شخص ہیں متحدہ ہندوستان کے جنہوں نے مغرب کی ابھرتی ہوئی تہذیب، جا جسے آج "تاجرانہ تہذیب کہتے ہیں۔ اس کا انہوں نے خیر مقدم کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ انڈیا کے ہندو معاشرے میں جو پسماندگی پیدا ہوئی ہے اسے دور کریں۔ سرسید کی طرح اس دور میں ان کی بھی مخالفت ہوئی۔ ایک طبقہ پیدا ہوا جو ان کی مخالفت کرتا تھا اور ان ساری اصلاحات کے خلاف تھا جو راجہ رام موہن رائے کرنا چاہتے تھے۔ سرسید تو کافی بعد میں پیدا ہوئے اور وہ بھی مسلمانوں کے لیے وہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو آج ہم کہاں ہوتے۔ اور یہ پاکستان جو قائم ہوا ہے جس کو آپ کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی ایک الگ ریاست ہے آج ۔۔۔ تو یہ کہاں ہوتی؟ اور مسلمان کتنی پستی میں جا چکے ہوتے؟ تو میرے خیال میں اس تناظر میں سرسید کو یا حالی کو یا سرسید تحریک کو دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ سرسید کو الگ کر کے تو ہم دیکھ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ سرسید تحریک جو تھی وہ اُردو ادب کے لیے بھی بہت اہم ہے اور مسلمانوں کے لیے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے تو ادب اور معاشرے دونوں میں سرسید کو Minus کر کے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سرسید سے سو فیصدی اتفاق تو ضروری نہیں ہے کیونکہ سرسید کی ساری باتیں اچھی تھیں، ایسی بات نہیں ہے۔ ان سے کہیں اختلاف ہوگا، کہیں اتفاق ہوگا چنانچہ میرے خیال میں تو Objectively دیکھنا چاہیے سرسید اور حالی کی تحریک کو۔ کیونکہ سلیم احمد صاحب جو تھے تو وہ ایک خاص اسکول کے آدمی تھے۔ ایک خاص مکتب فکر کے ماننے والے تھے۔ اور ایک خاص Out-look کے ساتھ انہوں نے اس مضمون میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کو مانا بھی ہے کہ سرسید نے جو حوض بنایا تھا وہ خشک ہونے کے بعد از سر نو جب ایک بار پھر اُبلے گا تب ہم بات کریں گے۔ یہ مضمون مکمل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ تو اس سلسلے میں وہ حضرات جو ان کے زیادہ قریب تھے بات کریں۔

جناب صدر! اچھا بھئی۔ ایک بات کی طرف میں توجہ دلاؤں۔ اس مضمون کے اندر اتنی بات سرسید احمد

خاں کی مخالفت یا موافقت کی نہیں ہے اجنبی کہ اس بات کی ہے کہ سر سید احمد خاں نے جو ڈور ڈالا تھا کیا اب بھی اسی طرح سے اس کے اوپر قائم رہا جائے۔ تو زیادہ توجہ ہے تو سر سید احمد خاں پر بات اتنی نہیں جتنی کہ سر سید احمد خاں کی نسل پر ہے۔ اور اسی کے متعلق انہوں نے اس میں بات کی ہے۔

جمال پانی پتی: جناب صدر! گزارش یہ ہے کہ اس مضمون کے بارے میں کہا گیا کہ یہ کوئی مکمل مضمون نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے شبنم صدیقی صاحب نے کہا کہ سلیم احمد صاحب ایک کتاب لکھ رہے تھے "بابائے جدیدیت" کے نام سے۔ اب مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ انہوں نے سر سید پر الگ سے اس مضمون کے علاوہ اور کتنے مضامین لکھے لیکن ان کی تحریروں میں سر سید اور حالی کے حوالے اتنی کثرت سے آتے ہیں کہ لگتا ہے وہ سر سید اور حالی کے بغیر تو لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے۔ حالانکہ اس مضمون میں انہوں نے کہا بھی ہے کہ میں نے ایک آدھ کالم اور جہاں تہاں ایک آدھ فقرے کے سوا سر سید پر کچھ نہیں لکھا۔ لیکن ان کی تحریریں کے شواہد اس بات کے خلاف ہیں۔ پچھلے دنوں میں ان کے کالم دیکھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سر سید اور حالی کا ذکر کرتے ان میں۔ وہ ادب کا کوئی مسئلہ ہو یا معاشرے کا کوئی Trend وہ جب اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیشہ حالی یا سر سید ہی سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ تو ایسی مثالیں بہت ہیں ان کے کالموں میں۔ ہاں الگ سے یہ صحیح ہے کہ مستقل مضامین غالباً وہ سر سید پر نہیں لکھ پائے اور اسی لیے وہ کتاب بھی نہیں لکھی جا سکی جو وہ "بابائے جدیدیت" کے نام سے لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے تو یہ مضمون میں سمجھتا ہوں کہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ سر سید کے بارے میں ان کی پوری فکر اس میں موجود ہے۔ ہر فقرے اور ہر جملے کے پیچھے۔ اور بہت سی باتیں خود اپنے بارے میں بھی انہوں نے بتائی ہیں اس میں۔ انہیں عام طور پر سر سید کا مخالف ہی سمجھا جاتا ہے لیکن اس مضمون میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ادب میں مخالفت یا موافقت کے تصور سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر انہوں نے مخالفت اور اختلاف میں بھی فرق کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ سر سید سے انہیں اختلاف تو ضرور ہے لیکن یہ اختلاف بھی ذاتی نہیں، اس لیے کہ وہ کچھ بھی لکھتے ہیں سر سید کے بارے میں وہ سر سید بحیثیت ایک فرد کے نہیں لکھتے۔ بلکہ وہ ان کے رویے کی علامت ہیں کچھ رجحانات کی جن کا آغاز ہمارے ہاں سر سید کے وقت سے

ہوا، اور ایک سرسید ہی کیا، وہ تو کہتے ہیں کہ مجھے تو اپنی بچی میں بھی علامتی معنی نظر آتے ہیں۔ تو گویا سرسید سے ان کا کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ وہ انہیں کچھ رجحانات کی علامت سمجھ کر بات کرتے تھے اور ان رجحانات ہی کا وہ تجزیہ کرتے تھے۔ ان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ ان کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے، اور وہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے سرسید کے بارے میں اسے ہم کو اسی اعتبار سے دیکھنا چاہیئے ـــــ شہزاد منظر صاحب نے بہت اچھی بات کہی کہ سرسید نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ تو واقعی ہمیں غور کرنا چاہیئے اس بات پر کہ ہماری قومی زندگی کے ایک خاص موڑ پر سرسید کی پیدائش کے کیا معنی ہیں؟ دو تہذیبوں کے تصادم کے درمیان ان کا ظہور اور جو طرزِ عمل انہوں نے اختیار کیا وہ ہمارے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے واضح طور پر ـــــ یعنی یا تو آپ ٹکرا جائیں اس قوت سے جس کی سیاسی اور فوجی برتری مسلّم تھی۔ سو ٹکرانے والے اس سے ٹکرائے اور فنا ہوئے۔ یہ راستہ گویا ایک ہلاکت کا راستہ تھا جسے ہم نے آزما کر دیکھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ جو تبدیلی حالات میں انگریزوں کے آنے سے آئی ہے اور نئے علوم و فنون کے آنے سے آئی ہے۔ ریل گاڑی کے آنے سے اور تار برقی کے آنے سے آئی ہے اسے تسلیم کیا جائے اور حقیقت پسندی کے ساتھ حالات کا جائزہ لے کر کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، جو ہماری بقا کا بھی ضامن ہو اور ہمارے قومی تشخص کی حفاظت کا بھی۔ اب سرسید نے بدلے ہوئے حالات کو جس طور پر دیکھا اور ان سے ٹکرانے کی بجائے ان سے مطابقت پیدا کر کے قوم کی بقا کا جو راستہ سوچا اس میں یہ بات تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے غلط دیکھا یا صحیح دیکھا لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے جو بھی راہِ عمل تجویز کی وہ نیک نیتی کے ساتھ قوم کی بھلائی اور بہتری کے پیشِ نظر کی۔ وہ ایک انتہائی مخلص اور قوم کا درد اپنے دل میں رکھنے والے آدمی تھے۔ یہ بات سلیم احمد بھی مانتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے اکا دکا ان کی نیت پر شبہ کا اظہار کیا ہے سلیم احمد ان سے اتفاق نہیں رکھتے اور ان کے بارے میں انہوں نے بہت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ غرض کہ ان کی نیت سے اور ان کے مقصد سے تو کسی کو کم ہی اختلاف ہو سکتا ہے۔ سلیم احمد کو بھی نہیں تھا۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا، اس طریقہ کار سے اور جو حدود تھیں ان کے کام کی ان حدود سے، اور جو ذرائع اختیار کیے، ان ذرائع سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور کچھ ایسا ہی اختلاف ان سے سلیم احمد کو بھی تھا۔ لیکن ایک چیز ہے تاریخی طور پر کسی بات کا ناگزیر ہونا۔ یعنی سر سیّد نے جو فیصلہ ایک وقت میں کیا وہ تاریخی طور پر تو بے شک ناگزیر تھا اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے، اور سلیم احمد بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن جو نتائج سر سیّد کے عمل نے پیدا کیے، ان کی نیت اور مقصد سے آزاد ہو کر ان سے بھی اختلاف تھا سلیم احمد کو۔ یعنی سلیم احمد کا خیال یہ تھا کہ سر سیّد نے جس کام کا آغاز کیا تھا، اس کا ایک دائرہ پاکستان بننے کے ساتھ مکمل ہو گیا اور پاکستان بننے کے بعد اب ہمیں نئے سرے سے حالات کا جائزہ لینا چاہیئے اور اس کے بعد حالات کے نئے تقاضوں کے مطابق اپنی راہ عمل متعین کرنی چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مضمون میں انھوں نے محض چند اشارے ہی کیے ہیں۔ کوئی بات تفصیل سے تو کی نہیں۔ بس اشارتاً کہہ دیا سر سیّد کے بارے میں کہ پہلے وہ ہمیں راستہ دکھاتے تھے۔ اب ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں اس سنگ میل کو اکھاڑ کر پھینک دینا چاہیئے۔ یعنی سلیم احمد چاہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد جو دائرہ مکمل ہو گیا اب ہم اس کو چھوڑ کر اپنی راہ عمل از سر نو متعین کریں۔ میرے خیال میں یہی بات کہی ہے اس مضمون میں سلیم احمد نے۔

باسط عظیم: جناب صدر! میں سمجھتا ہوں کہ سلیم احمد صاحب نے جیسا کہ جمال صاحب نے فرمایا، سر سیّد اور حالی پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن سلیم احمد صاحب کا سر سیّد سے اختلاف کیا ہے، اس پر ابھی تک کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلیم احمد صاحب ایک اسلامی تہذیب کے نمائندہ تھے۔ اور سر سیّد پر ان کا اعتراض ہی یہ تھا کہ سر سیّد نے اس معاشرے کو روحانی اقدار سے کاٹ دیا۔ اس میں جہاں تک کہ سر سیّد کی تحریک اور تعلیم کا تعلق ہے تو وہ تو ٹھیک کام ہوا۔ لیکن وہ ہماری پرانی روایتی اقدار جو تھیں ان سے کٹ کر رہ گئے۔ یہیں سے سلیم احمد کا اختلاف شروع ہوتا ہے سر سیّد سے۔ اور اس اختلاف کی وجہ سے وہ سر سیّد کو کبھی معاف نہیں کرتے۔

جاوید صبا: جناب صدر ..... کچھ کہنا چاہتا ہوں ..... مضمون سنا گیا ..... میں نے بھی سنا

جمال احسانی نے........ اس مضمون میں ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور بات مضمون کے دائرے سے باہر نہیں ہونی چاہیے........ لیکن اگر اس مضمون کو..... اس میں سلیم احمد کی........ مکمل طور سے......... Religious Essence جو اس برصغیر کا...... ہے اور خاص طور سے مسلمانوں کے اندر......... اچھا اختلاف وہ کرنا کچھ اور چاہ رہے تھے۔ یعنی اپنی اسلامی تہذیب جو ہے اس کا Defence کرنے کا تاثر........ اور اس میں جو سرسیّد کی مخالفت...... تو وہ دراصل اس میں شدید تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ ان کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں قطعی یہ تاثر نہیں ہے کہ وہ ان کا احترام کرتے تھے۔ اور اعتراف بھی ان کا جو ہے..... ..... اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دیوبند کے........ ہیں اور سرسیّد احمد خاں کی جو تحریک تھی اس میں واضح طور پر تضاد پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ سرسیّد احمد خاں جو تھے تو وہ ایک سائنٹیفک نظریات کے........ تھے۔ تو یہ Clash جو ہے وہ یہ بناتا ہے کہ سلیم احمد کا یہ جو مضمون ہے اور ان کا اپنا جو Thought ہے اس مضمون کے حوالے سے وہ Pure Religious essence کے دائرے میں........ (شور اور دوری کے باعث گفتگو کا سلسلہ بار بار منقطع ہوتا رہا)

احمد علی سیّد: اصل میں سلیم احمد صاحب نے اپنی پوری زندگی کا بیشتر حصہ حالی اور سرسیّد کے حوالے سے دورِ جدید پر تنقید کرنے میں گزارا۔ ان کا اعتراض ان شخصیات پر نہیں تھا بلکہ نیچر پرستی۔ افادیت پرستی اور ایک ڈھکے چھپے ہوئے انداز کی مادیت پرستی جو علی گڑھ تحریک کے ساتھ آئی تھی، اس پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جدید مغربی علوم و فنون کے ذریعے جو کچھ ہمارے ہاں آ رہا تھا اور پیروی مغرب کے نتیجہ میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہماری روایت سے ہرگز لگا نہیں کھاتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سرسیّد تحریک نے اس زمانے میں جو کچھ کیا، کیا اس کے ذریعہ وہ ہمیشہ کے لیے ہمارا رُخ موڑ دینا چاہتے تھے۔ یا یہ بات تھی کہ سرسیّد نے وقتی ضرورت کے تحت یہ مناسب سمجھا تھا کہ ہمیں ایک خاص رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور علی گڑھ تحریک کا پورا مزاج یہ نہیں ہے کہ وہ روایت کو کلیتہً Negate کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ سرسیّد یہ چاہتے تھے کہ مغرب سے جو یہ نظریات آئے تھے نیچر پرستی کے، افادیت پرستی کے اور مادیت پرستی کے، تو

کچھ ذرا یہ بھی چاہیں، لیکن وہ پوری طرح روایت کے مخالف نہیں تھے۔ بہر حال اب جبکہ سرسید
کا زمانہ گزر گیا اور حالات بدل گئے اور سلیم احمد صاحب نے جہاں تک بات کی تھی وہاں سے
بات بہت آگے بڑھ گئی تو ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ کسی دور میں جو بات کی گئی اس بات کی کیا وجہ
تھی۔ اب یہاں سارے حضرات موجود ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں ان سے، کہ دیوبند کی تحریک
تھی علی گڑھ تحریک کے مقابلہ میں۔ تو کیا دورِ جدید میں کوئی Relevance اس
بات کی ہے۔ اور کیا مسلمانوں کو دنیا کی ایک باعزت قوم بنانے کے لیے اور دورِ جدید میں
قوموں کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے دیوبند نے کوئی کردار ادا کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس
نے صرف یہ کردار ادا کیا کہ ہمارے مذہبی علوم جو تھے انہیں محفوظ کیا اور منتقل کیا اگلی نسل تک
اور ہماری قدیم تاریخ جو تھی اسے جاری رکھا۔ اسے ہم مانتے ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ
جو کہ مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اور سلیم احمد صاحب نے بھی آخری عمر میں بہت کچھ اس مسئلہ پر
لکھا کہ کیا نفاذِ اسلام ممکن ہے اور کیا دورِ جدید میں ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کو ساتھ لے کر
چل سکتے ہیں۔ یعنی کیا اپنی روایت میں رہتے ہوئے ہمارے لیے کوئی ایسی صورت حال ممکن
ہے۔ اب جہاں تک روایت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اپنی روایت سے کٹ کر تو کوئی
بھی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس سائنٹیفک اور ٹکنالوجیکل عہد میں جو کہ خالصتاً ایک
مادی Sphere سے Life کے تعلق رکھتا ہے۔ تو اس عہد میں ساری قوموں
سے الگ ہو کر جس طرح کا رویہ ہم اختیار کر رہے ہیں۔ کیا وہ درست ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ
دوسرے مسلمان ممالک میں بھی سرسید جیسے کچھ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے مغرب کو
Accept تو ضرور کیا مگر for the time being کیا۔ اور
اس کے بعد انہوں نے پھر اپنی روایت سے دوبارہ تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام
ایران میں بھی ہوا اور مصر میں بھی۔ لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا، نہ ایران میں اور نہ ہی
مصر میں، کہ دورِ جدید کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنا Defence کرنا
کہاں تک ممکن ہے اگر سائنس اور ٹیکنالوجی سے واقف ہوئے بغیر اپنا Defence
نہیں کر سکتے ——— تو پھر سوال وہی ہے علامہ
اقبال والا کہ پس چہ باید کرد۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سوال پر ہم غور کریں تو شاید سرسید
کے کام کی بھی ایک اہمیت بنتی ہے۔ اور روایت اور ٹریڈیشن کی کچھ معنویت واضح ہوتی ہے

لیکن اس سوال سے قطع نظر کر کے ہم روایت پر کوئی بات نہیں کر سکتے۔

شہزاد منظر: حضور والا! عرض یہ ہے کہ بات بہت پھیلتی جا رہی ہے۔

جمال پانی پتی: اچھا ہے، پھیلے!

شہزاد منظر: بات یہ ہے کہ یہ مضمون مکمل بھی نہیں ہے۔ یہ ایک کتاب کا ابتدایہ ہے تو اس پر آپ بات کریں گے تو پھر بات آگے نہیں بڑھے گی۔

جمال پانی پتی: جناب صدر! سید صاحب نے جو بات کی ہے، اس سے ایک آدھ بات میرے ذہن میں اور آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ سرسید ہمارے یہاں جس چیز کی علامت ہیں اسے اگر ہم ایک لفظ میں ظاہر کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ وہ "پیروی مغربی" کی علامت ہیں۔

احمد علی سید: جی ہاں، جی ہاں!

جمال پانی پتی: تو سرسید نے ایک وقت میں قوم کی بقا پیروی مغربی میں دیکھی اور اس کی ترویج و تبلیغ پورے زور و شور سے شروع کر دی۔ ابتدا میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی مخالفت بھی ہوئی اکبر کی طرف سے اور علماء کی طرف سے۔ لیکن یہ ردعمل رفتہ رفتہ دبتا چلا گیا اور مغربیت کا رجحان ہمارے ہاں جڑ پکڑتا چلا گیا۔ اب جس قدر مغربیت ہمارے اندر سرایت کرتی گئی، ایک بات یہ بھی ہوئی کہ ہم اتنے ہی اپنی روایت سے اپنے مذہب سے، اخلاق سے، اور اقدار سے حتیٰ کہ اپنی زبان اور لباس تک سے دور ہوتے چلے گئے۔ اور نتیجہ بالآخر یہ کہ ہم آج جو کچھ بھی ہیں وہ گویا اسی پیروی مغربی کی اور سرسید تحریک کی پیداوار ہیں۔ لیکن اب جبکہ آج اتنی مدت گزرنے کے بعد جبکہ ایک دائرہ پورا ہو چکا ہے۔ تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ خود مغرب کیا ہے، اور اس کے ہماری زندگی میں کیا معنی ہیں، جس مغرب کو سرسید نے دیکھا تھا وہ کیا تھا، اور جو مغرب اپنا ایک سفر پورا کر کے آج ہمارے سامنے موجود ہے، وہ کیا ہے۔ اور ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آج خود مغرب والے جس طرح مغرب کو دیکھ رہے ہیں اور ایک ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں وہ کیا ہے اور ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ دوسری طرف خود مشرق میں بھی ایک ردعمل کا اظہار ہو رہا ہے۔ سرسید صاحب نے ایران اور مصر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تو ایران میں ہم دیکھتے ہیں کہ جلال آل احمد، علی شریعتی اور حسین نصر ہیں، اور مصر میں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود ہیں۔ اور پاکستان میں محمد حسن عسکری ہیں۔ تو یہاں سے لے کر مصر تک بلکہ ملائیشیا کے عثمان بکر کو بھی نظر میں رکھا جائے تو کہنا چاہیے کہ ملائیشیا

سے لے کر مصر تک یہ سب کے سب اسی ردِ عمل کی علامت ہیں جو آج مشرق میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ہمیں اسے بھی سمجھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ مغرب آج اپنے سارے امکانات ظاہر کر چکا ہے لہٰذا آج ہم اس کے کھوٹے کھرے کو بھی اچھی طرح دیکھ کر پرکھ سکتے ہیں اور خود اپنے اچھے بُرے کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ مغربی تہذیب سے جب ہمارا تصادم ہوا پہلی بار تو اس وقت بے شک ہماری تہذیب ایک جمود کے عالم میں تھی۔ اور ایک انحطاط کا دور تھا وہ ہمارا۔ اور بے شک اس میں ایک تحرک، بیداری مغرب سے پیدا ہوا۔ چنانچہ مغرب سے ہم نے بہت کچھ سیکھا بھی ہے لیکن ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ جہاں ہم نے ان سے کچھ حاصل کیا ہے وہاں اپنے پاس سے گنوایا بھی ہے بہت کچھ۔ مغرب کے خلاف اکبر نے جو آواز اٹھائی تھی، وہ کیا تھی۔ وہ انگریزی تعلیم کے خلاف نہیں تھے۔ وہ خود جج تھے اور اپنے بیٹے کو انہوں نے انگریزی تعلیم دلائی تھی ولایت بھیج کے۔ تو اس کے خلاف نہیں تھے وہ۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ ہمیں مغرب کی تقلید میں اپنے تہذیبی تشخص کو نہیں کھونا چاہیئے۔ اپنی روایت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ ہاں ان چیزوں کو برقرار رکھتے ہوئے اگر ہم ان سے کچھ سیکھ لیں اور آگے بڑھ سکیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن انہیں پرانی لکیر کا فقیر سمجھ کر ان کی بات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور سرسید کی بات جو تھی تو وہ چل نکلی۔ لیکن غلط یا صحیح سے قطع نظر، اب یہ دائرہ بھی مکمل ہو گیا۔ اب سلیم احمد کہتے یہ ہیں کہ سرسید کے حوض اور دیوبند کے چشمے کو ملا کر ایک دریا بنا دیں۔ اور حوض کو تو سے اس دریا کا سوتا پھوٹنا چاہیئے۔ تو یہ کام اگر کر لیا جائے تو شاید ہم اپنے ماضی کو، حال کو اور مستقبل کو ایک تسلسل میں رکھتے ہوئے اپنے لیے کوئی راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں۔

شہزاد منظر: اصل میں آپ ہی کی تائید میں بات کرنا چاہ رہا تھا میں بھی۔ لیکن سید صاحب نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔ دیکھئے نا جیسے کہ انہوں نے کہا، ہم تو اس قدر مجبور ہیں کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بغیر۔ مغرب کو رد کرنے کی بات تو خیر الگ ہے۔ لیکن میں یہ کہہ رہا تھا کہ سرسید صرف انڈیا یعنی برصغیر ہی میں نہیں پیدا ہوئے بلکہ پورے اسلامک ورلڈ میں ایسی کئی عظیم شخصیات پیدا ہوئیں۔ مثال کے طور پر جمال الدین افغانی، عبدہٗ وغیرہ۔ آپ دیکھیں گے کہ پوری اسلامی دنیا میں پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ سوال اٹھا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی روایت کو قائم بھی رکھنا ہے

اور جدید دور کے تقاضوں کو اپنانا بھی ہے۔ یہ کشمکش صرف انڈیا اور پاکستان یعنی برصغیر ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ پورے اسلامک ورلڈ میں ہے۔ اور تھرڈ ورلڈ میں بھی یہ سوال پہنچ چکا ہے African countries میں بھی تہذیبی بیداری کی ایک لہر اٹھی ہے۔ اور امریکہ کے لوگ بھی اپنی قومی Identity کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کہ بھئی ہم جو اس قدر پسماندہ ہیں تو اس پسماندگی کو بھی ہمیں دور کرنا ہے اور مغرب کی طرف سے جو ایک تہذیبی حملہ ہم پر ہوا ہے، اور اقتصادی حملہ تو خیر پہلے ہی سے تھا، اس کو سوچنا ہے کہ کس طرح روکا جائے۔ اور اپنی شناخت کس طرح منوائی جائے۔ تو صرف انڈیا اور پاکستان ہی کی بات نہیں۔ یہ مسئلہ پورے اسلامک ورلڈ کا بھی ہے اور تھرڈ ورلڈ کا بھی مصر اور ایران سے لے کر انڈونیشیا تک ہر جگہ کے Thinkers جو ہیں تو وہ اپنے اپنے انداز میں اس کا حل سوچ رہے ہیں۔ تو مراد یہ ہے کہ آپ سائنس اور ٹیکنالوجی کو Minus کر کے صرف اپنی روایت کے سہارے نہ تو اپنا تحفظ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی تہذیبی شناخت کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ تو سید صاحب کا جو سوال ہے وہ بہت اہم ہے۔ اور سب سے بڑا مسئلہ جو ہمارے سامنے ہے تو وہ یہی ہے کہ جب ہم اس قدر مجبور ہیں کہ اپنا دفاع تک نہیں کر سکتے سائنس اور ٹیکنالوجی کے بغیر، اور کسی بات میں ہم خود مختار نہیں ہیں تو پھر کیا کریں۔ یہ صحیح ہے کہ جدیدیت اور اپنی روایت کے درمیان ایک Synthesis کرنا ہے ہمیں۔ اور یہی بات علامہ اقبال بھی کہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب آپ سرسید کی بات کرتے ہیں تو اقبال کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ آخر وہ بھی تو اسلام کا احیاء چاہتے تھے، اور دورِ جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہتے تھے۔ تو سلیم احمد کی Thesis سے اختلاف نہیں ہے۔ وہ بھی علی گڑھ اور دیوبند دونوں کو علامت سمجھتے ہیں اور رجحانات کی بات کرتے ہیں، اداروں کی نہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان Synthesis ہونا چاہیے۔ تاکہ ہم اپنی تہذیب کو Revive کر سکیں۔ تو اصل میں بات یہ ہے کہ یہیں اگر Confusion پیدا ہوتا ہے۔ اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کو رد کر کے آپ کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس بارے میں طے کریں پہلے۔ اس کے بعد آگے بڑھیں۔ آخر راجہ رام موہن رائے بھی تو تھے تو جو کہتے تھے کہ ہم انگریز کو انگریز کے ہتھیار سے بھگائیں گے

ہم ان سے تہذیب سیکھیں گے ۔ انگریزی سیکھیں گے ۔ اور سائنس اور ٹیکنالوجی سیکھیں گے اور پھر ان کا مقابلہ کریں گے ۔ اور آپ دیکھئے کہ چین اور جاپان کی مثالیں بھی تو ہیں ہمارے سامنے ہیں جاپان میں تو سولہویں صدی تک مغرب کا ایک فرد بھی نہیں پہنچ سکتا تھا جبکہ آپ کے یہاں بہت پہلے سے مغرب کے لوگ آ رہے تھے ۔ اور کس قدر Conservative تھا جاپان ۔ لیکن آج دیکھئے کہ اس نے اپنی روایت کو بھی قائم رکھا ہے ۔ اور جدیدیت کو بھی اختیار کیا ہے ۔ تو ہم جو تھرڈ ورلڈ کے لوگ ہیں تو ہمارے سامنے یہ مثال ہے جاپان کی مغرب کو لاکھ Condemn کریں آپ ۔ لیکن Aid بھی اس سے مانگیں گے اور تعلیمی ماہرین بھی انہیں کے ہاں سے منگوائیں گے ۔ تو جناب والا ! اس کا فیصلہ کریں کہ کس حد تک قبول کرنا ہے اسے ۔

جمال پانی پتی : آپ نے جس سوال کی طرف توجہ دلائی ہے یقیناً ۔ .... (احمد علی سید صاحب بات کاٹ کر خود بولنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جمال پانی پتی ان کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں) سید صاحب ! چونکہ شہزاد منظر نے آپ ہی کے سوال کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ اس لیے میں اسی سلسلے میں ایک مختصر سی بات عرض کروں گا جناب صدر کی وساطت سے کہ جہاں تک مغرب کو رد کرنے کی بات ہے ، تو بے شک مغرب کو رد کرنا ایک فقرے میں تو بہت آسان ہے ، یہ جانے بغیر کہ مغرب کیا ہے اور کس چیز کا نام ہے ۔ لیکن ایسا اگر کوئی کرتا ہے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے ۔ مگر دیکھئے نا ۔ کئی طرح کے رویے ہیں ہمارے سامنے مغرب کے بارے میں ۔ ایک رویہ تو مثلاً ان مجاہدین آزادی کا ہے جو مغرب کی طاقت سے ٹکرائے اور فنا ہو گئے ۔ دوسرا رویہ سر سید کا ہے جس پر ہم بات کر رہے ہیں ۔ ایک اور رویہ اکبر کا تھا اور علماء کا تھا ۔ وہ بھی ہمیں معلوم ہے ۔ پھر علامہ اقبال کا رویہ بھی ہے جس کی طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے آپ نے اشارہ کیا ۔ اب ویسے تو علامہ اقبال نے بھی اکبر ہی کی آواز میں آواز ملائی تھی ۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں انہوں نے بھی وہی بات کہی جو آپ کہہ رہے ہیں ۔ یعنی یہ کہ ہمارے لیے سائنس کو اپنانا بہت ضروری ہے ۔ اچھا تو اب ہم بھی یہ نہیں کہتے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو چھوڑ کر اس عہد میں آپ زندہ رہ سکتے ہیں ۔ لیکن ایک بات ضرور ہے شہزاد منظر صاحب ! اور وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی جو مغرب سے آ رہی ہے ہمارے ہاں ۔ تو اس کے ساتھ وہاں سے کچھ اور چیزیں بھی آ رہی ہیں اور مغرب کی سائنس

اور ٹیکنالوجی ان چیزوں سے الگ نہیں بلکہ ان کے ساتھ وابستہ ہے۔ جن تصورات سے اور جن خیالات سے اس کا بیج پھوٹتا ہے اور پھر خود یہ جن چیزوں کو پیدا کر رہی ہے وہ تمام چیزیں بھی تو آتی ہیں اس کے ساتھ لگی ہوئی۔ اچھا۔ اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سائنس ہماری اپنی چیز تھی، اور مغرب نے اسے ہم سے لے کر آگے بڑھا دیا تو یہ صحیح ہے لیکن یہ بھی تو ہے کہ ہم نے جو سائنس پیدا کی تو وہ ہمارے تصورِ حقیقت اور ہمارے تصورِ کائنات کے تابع تھی اور ہماری تہذیبی اقدار اور ہمارے تصورِ حیات کی مطابقت میں تھی اور ایک Totality میں اس پورے نظام کا حصہ تھی، لہذا اس سے الگ ہو کر ہمارے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی معنی نہیں۔ چنانچہ آج بھی اگر ہمیں اس کی ضرورت ہے اور ہم اسے اپنی بقائے حیات کا ایک وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔ تو ضروری ہے کہ ہم اسے اپنی اقدارِ حیات سے مربوط کریں۔ ہم اس سے کام لیں اور وہ ہماری بقائے حیات کا ایک وسیلہ بنے تو ہماری اقدارِ حیات کے ساتھ بنے۔ اس Concept of life کے ساتھ بنے جو ہمارا دین ہمیں دیتا ہے اور جس سے ہماری تہذیب اور ہماری اقدار پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ یقیناً وہ ہماری چیز ہے۔ لیکن اس سے الگ ہو کر ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بس یہی لڑائی ہماری ہے اس سے۔ اور یہی بات سلیم احمد بھی کہتے تھے کہ ہمارے concept of life سے الگ ہو کر وہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں

شبنم صدیقی: بالکل یہی بات میں بھی عرض کر رہا تھا جنابِ صدر۔ اس سلسلے میں، میں ایک مثال دوں گا یہاں پر۔ حسین نصر نے اپنی کتاب *Science & Civilization in Islam* میں ایک بہت اہم بات کہی ہے۔۔۔۔۔۔

ایک آواز: (بات کاٹ کر) آپ سے پہلے سہیل صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے۔

شبنم صدیقی: میں جنابِ صدر کی اجازت سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی بات مکمل کرنے دیں پہلے آپ۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہاں پر سب سے بنیادی سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وقتی حکمتِ عملی کے طور پر اپنے Survival کے لیے تو ٹھیک ہے آپ کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک بالکل دوسری بات ہے جس طرح سے کہ جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ تو یہ بالکل ایسی ہی

بات ہے۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ دو ایسے مکتبہ ہائے فکر جو اپنی بنیاد میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یعنی ایک کی بنیاد مابعد الطبیعیات پر ہے اور دوسرے کی طبیعیات پر، تو ان دونوں میں Synthesis کیسے ممکن ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ ایک فکری نظام آپ کے پاس ہے اور آپ بعض مصلحتوں کے تحت نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے کچھ طریقے، کچھ Method اس طرح اپنا لیں کہ آپ کی اپنی اقدار بھی قائم رہیں۔ لیکن دو ایسے فکری نظام جن کی بنیادیں متضاد ہوں ان میں Synthesis نہیں ہو سکتا۔ اپنے Survival کے لیے وقتی طور پر تو سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے بعد پھر ہمیں واپس اپنی اقدار پر اور اپنے طریقوں پر آجانا چاہیئے۔

سہیل احمد: جناب والا۔ آپ نے یہ جو کہا کہ سمجھوتہ۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ سمجھوتہ ایک منافقانہ رویہ ہے اور مضبوط قومیں جو ہوتی ہیں وہ کبھی منافقانہ رویوں کے ساتھ زندہ نہیں رہتیں۔

ایک آواز: (بات کاٹ کر) جناب سمجھوتہ کا لفظ تو استعمال نہیں ہوا۔

سہیل احمد: نہیں، سمجھوتہ ہی کہا تھا انہوں نے۔

دوسری آواز: نہیں Synthesis کا لفظ استعمال کیا تھا۔

سہیل احمد: اصل میں یہی تو اثر ہے انگریزی تہذیب کا کہ جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو انگریزی کے لفظ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ سمجھوتہ ایک منافقانہ رویہ ہے اور مضبوط قومیں کبھی منافقانہ رویہ اختیار نہیں کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو مسترد کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ پہلے آپ اس چیز کو جانیں۔ لیکن جاننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اس کے Method پر عمل کرنا شروع کر دیں اس کے بنیادی نظریہ کو لے کر۔ میرے خیال میں تو یہی وہ غلطی تھی جو سرسید کے زمانے میں ہوئی۔ ان کے زمانے میں جو Method اختیار کیا گیا، اس کا Product ہم لوگ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ جس طریقے سے ہمیں تعلیم دی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم انگریزی زبان کی جانب اتنا جھکتے چلے گئے کہ .... بہرحال یہ بات طے ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی جو ہے وہ جہاں بھی Infiltrate کرتی ہے، جہاں بھی جاتی ہے تو اس کے ساتھ تہذیب بھی اندر آتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک بار جب آپ نے راستہ کھول دیا کسی کے لیے تو پھر وہ تہذیب بھی ضرور آئے گی۔ اور جب تہذیب اندر آنا شروع ہو جاتی

ہے تو پھر وہ آپ کی تہذیب کے اوپر اثر انداز بھی ضرور ہوگی۔ تو جناب والا ! کرنا یہ ہے کہ اس تہذیب کے Infiltration کو کس طرح سے روکا جائے۔ یہ ایک بہت بنیادی سوال ہے۔

احمد علی سیّد: میں عرض یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ جمال پانی پتی صاحب نے بھی اور شبنم صدیقی صاحب نے بھی بہت اچھی بات کہی کہ ہمیں الگ نہیں ہونا چاہیئے روایت سے۔ اس سے الگ ہوئے اور ہمارا سب کچھ گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس کائنات کا سب سے بڑا تصور حقیقت ہے، کیا اس تصور حقیقت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی جگہ ہے یا نہیں۔ یہ ایک بہت سوچنے والا سوال ہے اور ہمارے لیے بڑا relevant ہے یہ صحیح ہے کہ ہمارا Concept of reality جو تھا تو اس میں Sciences کی جگہ تھی۔ لیکن اس کے بعد ایسا ہوا کہ مسلمانوں پر زوال آیا اور ہم اس حالت سے گزرے اور غلامی سے بھی گزرے۔ اور پھر آزاد ہو گئے، تو اب پھر وہی بات ہے علامہ اقبال کی کہ پس چہ باید کرد؟ یعنی اب پھر وہی سوال ہے کہ ہمارا جو Basic تصور ہے اس تصور حقیقت میں ایسی چیزوں کے لیے بھی کوئی جگہ ہے یا نہیں جو اس دور میں ہمارے Defence کے لیے بہت ضروری ہیں اور ہماری بقا کے لیے بھی بہت ضروری ہیں۔ یہ بات اگر Clear ہو جائے تو پھر بات ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہمارے Concept of reality میں ان چیزوں کی جگہ نہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ مکمل کیسے ہوا۔ یہ بھی تو سوال ہوگا نا پھر۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اگر جناب صدر اس بات پر روشنی ڈالیں تو مناسب ہے۔

شبنم صدیقی: جی ہاں۔ مناسب یہی ہے جناب صدر! کہ اب آپ کچھ ارشاد فرمائیں۔

جناب صدر: بھئی دیکھو نا۔ اب یہ بات جو ہے تو اس مضمون سے بہت آگے بڑھ گئی۔ اب تو ایک Issue ہے جس پر سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ سلیم احمد نے بھی جو اپنے خیالات تھے اس Issue کے اوپر ان کا اظہار کیا۔ یہاں بھی سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بہرحال ایک بات میں آپ سے عرض کروں۔ سر سیّد احمد خاں کے متعلق اکثر لوگوں کا Attitude مختلف اوقات میں مختلف رہا ہے خود ہم بھی ایک زمانے میں یہ بات کہا کرتے تھے کہ اس شخص نے اسلام کا ستیاناس کر دیا۔ اور مسلمانوں

کا توصلہ جو ہے تو وہ کھو دیا، اور کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ اچھا۔ اب یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ پختگی آتی ہے آدمی میں، کچھ Maturity پیدا ہوتی ہے۔ تو اب سرسیّد احمد خاں کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سے پہلے ہمیں یہ بات ضرور سوچنی چاہیے کہ خود ہمارے مسلمان معاشرے کی کیا کیفیت تھی۔ یعنی انگریزوں کا آنا اور مغربی اقوام کا آنا کوئی حادثہ نہیں تھا۔ وہ تو ایک لازمی بات تھی۔ اور ہماری کیفیت جو تھی تو وہ یہ تھی کہ ہم تنگ نظر ہو چکے تھے۔ اور ہمارا ذہنی افق جو تھا تو وہ بھی تنگ ہو چکا تھا۔ یعنی اس بات کو یوں دیکھو کہ ہندوستان کے اندر تمام کے تمام لوگ آتے رہے۔ سرٹامس رو آئے اور ڈاکٹر برنیئر آئے اور دوسرے لوگ آئے۔ مگر ہمارے کسی بادشاہ کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ یہ سوچتا کہ بھئی یہ لوگ جہاں سے اور جس ملک سے آرہے ہیں، اس کو بھی تو دیکھیں کہ وہاں کیا طور طریقے ہیں اور کیسے لوگ رہتے ہیں۔ یا ایک موٹی سی بات تو دیکھو کہ یہ جو بحرِ عرب کا راستہ تھا تو اس راستے سے جو حج کرنے کے لیے مسلمان جایا کرتے تھے ہندوستان سے۔ تو ڈچ اور پرتگالی Pirates انہیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ اور ہمارا شہنشاہ جو تھا تو وہ یہ کرتا تھا کہ خشکی کے اوپر ان کی جو کوٹھیاں تھیں وہ تو برباد کر دیتا تھا۔ لیکن کبھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ یہ جو ملک کے چاروں طرف اتنی لمبی کوسٹ لائن ہے تو اس میں کوئی نیوی بھی ہونی چاہیے۔ کوئی بحری طاقت بھی ہونی چاہیے۔ اور ہمارے جو رسالے تھے تو ان رسالوں کے کمانڈر، خاص طور پہ توپ خانے کے، وہ فرانسیسی ہوا کرتے تھے جنہیں ملازم رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ کسی کی طرف سے فرانسیسی لڑ رہا ہے کسی کی طرف سے ڈچ لڑ رہا ہے اور کسی کی طرف سے انگریز جو ہے تو وہ لڑ رہا ہے۔ اس طریقے سے لڑتی تھیں فوجیں ہماری۔ تو ان حالات میں یہ بات کہنا کہ مسلمانوں سے انگریزوں نے سلطنت چھینی۔ یہ بجائے خود ایک غلط بات ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا وہ دور جو تھا تو وہ مادی اور سیاسی اعتبار سے تباہی کا دور تھا۔ اور دوسری قوم جو تھی یعنی ہندوؤں کی تو اس کے بڑھنے کا دور تھا۔ اور یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ ہماری تہذیب جو تھی اور ہمارا کلچر جو تھا تو وہ ایک Superior کلچر تھا اور راجپوتوں اور مرہٹوں میں بھی وہی فارسی کا رواج تھا اور وہی شاعری تھی۔ اس کے باوجود صورتِ حالات جو تھی تو وہ یہ تھی۔ اچھا اب ایک بات جو سمجھنے کی ہے تو وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں آپ کے ہاں بڑے بڑے مفکرین اور بڑے بڑے اولیاء اللہ تھے تو وہ

اپنے زمانے کے علوم کے منتہی تھے اور گہری بصیرت رکھنے والے لوگ تھے جو اپنے زمانے کے علوم وفنون میں Vanguard کے طور پر آگے آگے ہوتے تھے۔ آپ اب بھی ان لوگوں کی کتابیں اگر دیکھیں، جیسے کہ کشف المحجوب ہے تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک بڑا Fine Analytic brain ہے، ایک تجزیہ کرنے والا دماغ اور ایک Concept کے اندر فرق کرنے والا آدمی ہے جس کے ساتھ آپ بیٹھے ہیں اور وہ آپ کو کچھ بتا رہا ہے۔ اور روایت کو قائم رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کچھ رسوم ہیں جن کو نبھانا ہے۔ بلکہ رسوم کو نبھانا اور رسوم پرستی، یہ تو خود روایت کی موت کی علامت ہوتی ہیں۔ اور روایت چلتی اس طرح سے ہے کہ جو معروضی حالات ہیں اور جو Challenges درپیش ہیں ان حالات کے اندر توازن کے ساتھ اس کا ایکشن اور ری ایکشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب اگر انگریز یا مغربی قومیں مسلط ہوئیں تو وہ اس وجہ سے کہ ایک تو وہ قوت کے اندر بڑی تھیں اور دوسرے علمی اعتبار سے بھی ایک خاص قسم کا علم لے کر ہمارے ہاں آئی تھیں۔ اب ایسی صورت میں سرسید احمد خاں نے ایک تو مغرب کی تعلیم کی طرف رجوع کیا اور دوسرے انہوں نے قرآن شریف کی اور دین اسلام کی تفسیر بھی ایک دوسری کرنی شروع کی۔ تو یہ دو باتیں جو ہیں تو انہوں نے کیں۔ اور انگریزوں کی طرف انہوں نے جو رویہ رکھا تو اس کی وجہ بھی ایک دوسرا Factor تھا کہ جو موجود تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندو جو تھے تو وہ زمانہ ان کے بڑھنے کا تھا اور مسلمانوں کے گھٹنے کا تھا۔ اور یہ جو دو ہمعصر تھے یعنی سید جمال الدین افغانی اور سرسید احمد خاں تو ان کے خیالات کے اندر جو فرق تھا تو یہ بھی ایک دلچسپ Study ہے جو سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ سید جمال الدین افغانی تو بہت زیادہ ناراض تھے سرسید احمد خاں سے اور اس لیے انہوں نے بہت سخت زبان استعمال کی ہے ان کے خلاف۔ اب اس کے پیچھے بھی ایک ایمان کا جوش اور مسلمانوں کا درد تھا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن سرسید احمد خاں بھی مسلمانوں کے درد میں ان سے کم نہیں تھے مگر فرق کی وجہ جو تھی تو وہ یہ تھی کہ سرسید احمد خاں ایک ایسے ملک میں رہ رہے تھے جہاں ان کی قوم گرتی چلی جا رہی تھی اور ایک دوسری قوم بڑھتی چلی جا رہی تھی مثلاً انگریزی کا رائج ہونا اور فارسی کا رخصت ہونا جو ہے تو وہ دیکھو۔ ادھر راجہ رام موہن رائے یہ

بات کہہ رہے ہیں کہ سنسکرت اور فارسی کب تک چلے گی۔ انگریزی ہونی چاہیئے۔ اور انگریزوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ انگریزی کو رائج کریں۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ ان کے لیے تو انگریزی Replace کر رہی تھی فارسی کو۔ اب یوں تو فارسی بھی ان کے لیے ایک دوسری زبان تھی اور انگریزی بھی دوسری زبان تھی۔ مگر بات یہ تھی کہ پہلے فارسی سیکھ کر وہ دفتروں کے اوپر چھا گئے تھے اور اب انگریزی سیکھ کر بھی چھا جانا چاہتے تھے لیکن مسلمانوں کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی تمام ثقافتی روایات جو تھیں تو وہ عربی اور فارسی زبانوں کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اور اسی لیے وہ مخالفت کر رہے تھے انگریزی زبان کی۔ اچھا اب جہاں تک قوموں کی زندگی کا سوال ہے تو ایک بات یہ بھی دیکھیں کہ مسلمانوں کو یعنی ملت اسلامیہ کو کتنے مقابلے کرنے پڑے۔ پہلا ہی مقابلہ جو تھا ان کا تو وہ اس وقت ہوا جس وقت کہ وہ عرب دیس سے نکل کے قدیم تہذیبی مراکز کی طرف بڑھے اور ایران اور سیریا تک پہنچے۔ اور یونان سے ان کا تعلق پیدا ہونا شروع ہوا۔ تو اب جو علوم تھے مشرق و مغرب کے، پہلا مقابلہ اسلام کی فکر کا ان سے ہوا۔ ادھر یونانی اور ایرانی علوم تھے اور ادھر ہندوستان کے علوم تھے۔ تو ان سب علوم کا چیلنج تھا جو سب سے پہلے مسلمانوں کو درپیش ہوا۔ مگر ایک بات جو ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ باہر کے اثرات کے بارے میں اس طریقے سے باتیں کرنا کہ جیسے یہ بڑے خارجی اثرات ہیں لہذا ان کو نکال کر باہر پھینک دینا چاہیئے۔ تو یہ رویہ جو ہے تو بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ آپ کسی چیز کو ایک Stimulus کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یا اس کے اندر اپنے آپ کو submerge کر دیتے ہیں۔ اور یہ جو انگریزوں کی بات ہوئی تو یہی اس میں بھی ہے کہ انگریزوں نے تو بیدار کیا ہمیں خواب غفلت سے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اسے ہم ایک محرک اور Stimulus کے طور پر استعمال کریں یا اس کے اندر بالکل Submerge ہو جائیں۔ تو بات یہ تھی کہ مسلمان جب عرب سے باہر نکل کر پرانے تہذیبی مراکز کی طرف بڑھے تو ان تہذیبوں کے علوم سے اسلام کی فکر کا ایک تعلق پیدا ہوا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین اسلام کی تعلیم کے نئے Perspective ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ چنانچہ تصوف کو اور علم الٰہی کو دیکھو کہ اتنا elaborate ہونا اور پھیلنا شروع ہوا اور

اس کے اندر اتنے مسئلے پیدا ہوئے کہ جن کا کوئی شمار نہیں۔ یہاں تک کہ ابن عربی تک پہنچا تو دماغ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ کون کون سے راستے کہاں کہاں سے کھل رہے ہیں۔ اب ذرا کلام پاک کی جو عبارت ہے تو اسے اپنے سامنے رکھیں جو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے اپنے ظرف اور ضرورت کے مطابق۔ اور ابن عربی کی کتاب بھی سامنے رکھیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ تو ایک بالکل دوسری دنیا ہے۔ مگر ہمارے دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ بیچ رہی ہے کہ جو چلتا چلا آ رہا ہے۔ اور روایت جو ہے تو دہی وہی چلتی چلی آ رہی ہے۔ اور یہ نئے Perspective جو ہیں تو یہ بھی اسی سے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ جو تھا تو وہ یہ ہوا کہ مسلمان تمام پچھلے علوم کے وارث بن گئے۔ اور ایک ٹرانسمیٹر بن گئے ان علوم کا تمام دنیا کے لیے۔ وہ تمام باتیں اور Perennial خصوصیات جو بدھ ازم کے اندر تھیں یا ویدازم کے اندر تھیں یا Zoroastrianism کے اندر تھیں تو اگر آپ اپنے تصوف کا مطالعہ کریں تو وہ سب آپ کو اس میں نظر آ جاتی ہیں۔ اسی طرح کلام اور فلسفے کو اگر آپ دیکھیں تو یونان کے جتنے بھی علوم ہیں وہ سب اس کے اندر آپ کو نظر آ جائیں گے۔ غرض اسی طور پر آپ تمام پچھلے علوم کے Inheritor بن گئے۔ اور دوسرا بڑا حملہ جو ہم پر ہوا تو وہ تاتاریوں کی طرف سے ہوا۔ یہ ایک اور چیلنج تھا جو ہمیں درپیش ہوا ویسے تو بہت کشت و خون اس کے اندر ہوا۔ لیکن ظاہر ہے یہ ایک مقابلہ تھا Barbarianism اور Civilization کے درمیان۔ اور اس مقابلہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ نیا خون جو ہے تو وہ ہمارے اندر پیدا ہو گیا۔ اور بالآخر یہ ہوا کہ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔ تو اس اعتبار سے یہ کوئی زیادہ بڑا چیلنج نہیں تھا۔ لیکن اب یہ چیلنج جو آیا ہے مغرب کی طرف سے تو یہ چیلنج یقیناً بڑے طمطراق کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کلام پاک کی جو تفسیر سر سید احمد خاں نے کی اور مذہب کے متعلق جو Attitude انہوں نے اختیار کیا۔ اور انگریزوں کی اطاعت کو جس طرح انہوں نے ایک دینی فریضہ بنا کے ہمارے سامنے پیش کیا تو اس کو ہم حالات کے پیش نظر معاف تو کر سکتے ہیں لیکن Justify نہیں کر سکتے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ راستہ جو تھا تو بالکل ٹھیک تھا۔ پھر ایک مسئلہ ہمارے سامنے

اور بھی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ جو ہماری پرانی روایت تھی اور جس کے اندر اس تمام کائنات کا Interpretation جو تھا تو وہ روحانی Interpretation تھا۔ اور اس Interpretation میں یہ تمام کی تمام کائنات ایک Manifestation تھی۔ اور وجود کے اندر مختلف مراتب تھے اور اس میں یہ بھی تھا کہ گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ تمام کی تمام باتیں ہمارے World view کا اب بھی حصہ ہیں یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ تمام باتیں ہمارے لیے اب بالکل ایسی ہو گئیں جیسے کہ ایک باہر کی بات ہوتی ہے۔ اور اس باہر کی بات کو ہم بیان کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جب تک کوئی روایت خون کے اندر نہ تیرتی ہوئی ہو اس وقت تک وہ روایت نہیں ہوتی۔ اور عام طور سے دیکھا یہی گیا ہے کہ جب کسی روایت کے متعلق زیادہ باتیں ہونی شروع ہوتی ہیں تو وہ وقت اس روایت کی کمزوری کا ہوتا ہے۔ اور جس وقت کہ وہ روایت جاندار ہوتی ہے تو اس وقت اس کو Taken for granted کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہمارے لیے اور تمہارے لیے بیک گراؤنڈ وہی ایک ہوتا ہے اس لیے کوئی ضرورت اس کے ذکر کرنے کی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بالکل وہی بات ہے کہ جس وقت آپ کو کوئی عشق ہوتا ہے تو اس کا زیادہ چرچا نہیں کرتے اور جس وقت وہ عشق گھٹنے لگتا ہے تو کہتے ہیں کہ میں تو تمہارے اوپر مرتا ہوں۔ (واہ، واہ سبحان اللہ کی آوازیں) تو اب یہ بات کہ ہم اتنی باتیں کر رہے ہیں روایت کے بارے میں، یہ خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس وقت ہماری حالت کیا ہے۔ اور جہاں تک مغرب والوں کی بات ہے تو وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز حقیقت (حقیقی) نہیں ہے کہ جس کو تم دیکھتے نہیں ہو۔ اور جو چیزیں تمہارے محسوسات کے عالم کے اندر نہیں ہیں وہ تمام کی تمام چیزیں بالکل Myth ہیں۔ اور Metaphysics جتنی بھی ہے اسے physics میں تبدیل کرو۔ جتنا حصہ Metaphysics کا physics میں تبدیل کر سکتے ہو، وہ تو ٹھیک ہے اور باقی سب بیکار ہے۔ ان کا کہنا کہ تم جو علم حاصل کرتے ہو اس کو طاقت کے لیے اور اپنی زندگی میں آسائش پیدا کرنے کے لیے استعمال کرو۔ اور سب سے بڑی بات یہی ہے کہ تمہارے اندر طاقت ہونی چاہیے

اور تمہارے لیے آسائش ہونی چاہیئے۔ اور Higher standard of living ہونا چاہیئے۔ اور تمہیں سب کے اوپر غالب آنا چاہیئے۔ سب کو مغلوب کرنا چاہیئے۔ اچھا، اب اس بات کو یوں سمجھو کہ ایک تو جیسے میں ہوں۔ اور میرے علاوہ دوسری چیز یہ دنیا ہے اور باقی سب لوگ ہیں۔ تو جب تک کہ اللہ میاں ایک Vertex کے طور پر اوپر اس Triangle کے تھا۔ اس وقت تک تو ایک تعلق تھا مگر جب اللہ میاں کو علیحدہ کر دیا تو چیز تو یہ ہے کہ میرا اور باقی دنیا کا ایک Confrontation ہے۔ ایک مقابلہ ہے۔ وہ Vertex جو تھا ملانے والا دونوں کو، جب اسی کو ختم کر دیا تو چھوٹی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ جیسے کہ میرے ایک عزیز نے یہ بات کہی کہ کیا کریں Progress کا سوال ہے اور Defence کا سوال ہے۔ اچھا تو اس میں بھی ایک Attitude اسلام کا مجھے پسند آیا۔ اور وہ یہ پسند آیا کہ ایک اپنی تقریر کے اندر امام خمینی نے امریکہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم ہمیں کس چیز سے ڈراتے ہو۔ اور تم ہمیں کس طرح ڈرا سکتے ہو۔ تمہارے پاس دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو شاید تم یہ کر سکتے ہو کہ محاصرہ کر لو ہمارے ملک کا اور کھانے پینے کی چیزوں کے آنے کا راستہ بند کر دو باہر سے۔ تاکہ ہمارے پاس کھانے کی قلت ہو جائے۔ تو ہم یہ بات تمہیں بتاتے ہیں کہ ہم تمہاری طرح سے اپنے پیٹ کے غلام نہیں ہیں۔ ہم تو روکھی سوکھی کھا کے بھی زندگی بسر کر لیں گے بلکہ ہمارے جتنے بزرگ تھے تو وہ سب ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں ہوگی ہمارے لیے۔ اور اتنا کھانے کے لیے تو ہمیں اللہ میاں دے ہی دے گا جتنا گزارہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اب اس کے علاوہ دوسری بات جو تم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمہارے پاس جو بڑے بڑے بم ہیں تم وہ لے کر آؤ اور ہمارے اوپر پھینک دو۔ اور ہمیں ختم کر دو۔ تو اس میں بھی ہم تم سے یہ بات کہہ دیں کہ تمہارے نزدیک تو یہ سب سے بڑی سزا ہے جو تم ہمیں دے سکتے ہو۔ لیکن ہمارے لیے یہ سب سے بڑا کرم ہے۔ اس لیے کہ اگر ہم مظلوم موت مریں گے تو اس سے زیادہ تو کوئی شرف ہی ہمارے ہاں نہیں ہے۔ تو تم موت سے بھی ہمیں نہیں ڈرا سکتے۔ تم بھوک سے بھی ہمیں نہیں ڈرا سکتے۔ تو پھر تم ہمیں اور کس بات سے ڈراؤ گے؟ تو یہ بات کہی انہوں نے اور اتنی

میری طبیعت خوش ہوئی اس بات سے کہ دیکھو واقعی یہ ایک آواز آئی ار ام کی۔ مگر عزیزو
میں ایک بات آپ سے کہنا ہوں اور وہ یہ ہے کہ سب سے بدترین چیز جو ہے تو وہ
ہے مرعوبیت۔ اور Defence کی بات جو ہے تو وہ یہ ہے کہ باہر کی قوم آپ
کو شکست تو دے سکتی ہے لیکن وہ آپ کو ختم نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کے اندر واقعی حوصلہ
ہے تو۔ اور جہاد کا اصول بھی یہی ہے کہ فرد کے اور معاشرے کے درمیان ایک ایسی
ہم آہنگی ہو اور اتنا close relationship ہو کہ فرد یہ سمجھے کہ میری
تو زندگی کا مقصد ہی کا اس معاشرے کو قائم رکھنا ہے جس کے اندر عدل ہے اور احسان
ہے۔ اور اگر اس معاشرے پر کوئی آفت آتی ہے۔ اس پر کوئی ضرب پڑتی ہے تو میری
زندگی کا Consummation ہی یہ ہے کہ میں اس کی حفاظت کرتے ہیں
اپنی جان دے دوں۔ تو یہ بات جس وقت کسی معاشرے میں پیدا ہو جاتی ہے تو یہی اس
معاشرے کا سب سے بڑا Defence اور سب سے بڑا دفاع ہوتا ہے۔
لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جس وقت کہ آپ خوف اور مرعوبیت کو دل سے نکال
دیں۔ اور جس وقت کہ خوف اور مرعوبیت آپ کے دل سے نکل جائے تو پھر آپ اپنے
علم کے اندر ترقی کریں اور جتنی بھی استطاعت آپ کے اندر ہے اتنی آپ تیاری کریں
اس لیے کہ کوئی اللہ میاں نے ایک انہیں کو دماغ نہیں دیا۔ بلکہ آپ کو بھی دیا ہے۔ تو
اگر آپ بھی اس سے کام لیں اور جو بھی استطاعت آپ کی ہے اس کے مطابق کام کریں
تو اللہ میاں اس کی Capacity بھی بڑھا دیتا ہے۔ لیکن اس سائنس اور
ٹیکنالوجی کے ساتھ تو ظاہر ہے کہ وہی تمام کی تمام ذہنیت آرہی ہے (جو مغرب کی
ہے) اور وہی تمام کی تمام باتیں اس کے ساتھ ہیں۔ اب ہماری کیفیت جو یہ ہے تو وہ
یہ ہے کہ وہاں کی یعنی مغرب کی زندگی کو ہم گالیاں بھی دیتے جاتے ہیں اور اسی کو ایک
جنت ارضی بھی سمجھتے ہیں۔ اور اسی قسم کی جو زندگی جو ہے تو وہ ہم اپنے لیے بھی چاہتے
ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہمارے لیے بھی آسائش جو ہے تو وہ ہونی چاہیئے اور طاقت جو
ہے تو وہ ہونی چاہیئے۔ یعنی ہمارا Criterian بھی وہی ہے جو ان کے
World view کا نتیجہ ہے۔ اور کیفیت یہ ہے کہ خود ہمارے دل کے اندر
اور تمام معاشرے میں Values جو ہیں تو وہ بھی وہی نظر آتی ہیں۔ مگر باتیں جو ہم

کرتے ہیں تو وہ اپنی روحانیت کی اور وحدت الوجود کی اور Metaphysics کی کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو عزیزو اس کے اندر مجھے ترس آتا ہے۔ اور ترس مجھے یہ آتا ہے کہ مغرب کے اندر تو ایک دائرہ دنیاوی طاقت کا اور دنیاوی تمول کا جو ہے تو وہ چلنا شروع ہوا۔ اور وہ پورا Circle ابتدا سے شروع ہو کر اپنی انتہا تک پہنچ کر مکمل ہو گیا اور جس وقت کہ وہ اپنی انتہا تک پہنچ کر مکمل ہو گیا تو اس کے بعد انہوں نے اس بات کو Discover کیا کہ یہ تمام کی تمام قوت جو ہے اور تمام کا تمام تمول جو ہے تو یہ سب کھوکھلا ہے۔ اب انہوں نے یہ دریافت کیا کہ جتنی طاقت ہم بڑھاتے جاتے ہیں اتنا ہی خوف بڑھتا چلا جاتا ہے اور اتنے ہی موت سے نزدیک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ جتنا ہم بھوک کو دور کرتے چلے جاتے ہیں اتنی ہی بھوک اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور ہوس بھی اتنی ہی زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تو اب اس طریقے سے انہوں نے خود اپنی برائیاں اور اپنی خرابیاں جو ہیں تو وہ دیکھنی شروع کیں۔ چنانچہ ہم لوگ جو مغربی اقوام کی برائیاں بتاتے ہیں کہ ان میں یہ خرابی ہے وہ خرابی ہے تو زیادہ تر آپ دیکھیں گے کہ ان کا source بھی کوئی مغرب ہی کا مفکر ہوتا ہے جس نے اپنے معاشرے کی برائیاں بتائی ہیں۔ بہرحال اب اس معاشرے کے اندر مغرب کی ایک تلاش شروع ہوئی۔ اور وہ تلاش جو شروع ہوئی تو وہ فقیری کی اور درویشی کی تلاش تھی۔ چنانچہ اب انہوں نے ویدانزم یا بدھ ازم یا اسلام، اور اسلام میں بھی خاص طور پر تصوف کی روایت کو دیکھنا شروع کیا۔ تو اب یہاں سے ایک دوسرا سفر شروع ہوا ان کے ہاں۔ اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ہم تو ابھی اس Circle میں داخل ہی ہوئے ہیں۔ اور ہمارے لیے مادی ترقی، طاقت اور آسائش وغیرہ کی باتیں جو ہیں تو وہ بہت ہی زیادہ ہمیں اپنی طرف کھینچنے والی ہیں۔ اور ہمارا Circle جو ہے تو وہ ابھی پورا ہی نہیں ہوا اور نہ وہ کبھی پورا ہو گا اس لیے کہ مرعوبیت اور خوف سے تو اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ تو پھر وہ تو بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ بس اس الجھاؤ کے اندر ہم پڑے ہوئے ہیں۔ اور ہم اس بات کو بھی بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے دین کے متعلق جو بصیرت حاصل کی ہے تو وہ بھی بہت کچھ اسی Trend کی بدولت حاصل کی کہ جو Trend مغرب کے اندر پیدا ہوا ہے ہمارے علوم کو

سمجھنے کا۔ ورنہ ہمیں تو اکثر و بیشتر یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ہاں کیا کیا چیزیں ہیں۔ تو یہ بھی بہت کچھ انھوں نے ہی بتایا کہ ہمارے ہاں یہ تمام کی تمام باتیں ہیں۔ تو میں تو یہی سمجھتا ہوں عزیز بندا کہ جو بھی ہماری روایت ہے۔ ہمیں اس کے متعلق ایک ——— Critical Appreciation کی ضرورت ہے۔ ہمیں اسے Romanticize نہیں کرنا ہے۔ بلکہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اسے اچھی طرح سے سمجھنا ہے۔ ہمیں سمجھنا ہے کہ جو Problem ہماری ہے اور جو الجھاؤ کہ پڑ رہا ہے ہمارے ہاں، تو وہ کیا الجھاؤ ہے۔ اور جو ہمارے اندر ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے بیچ میں، ان Values کا اور جس چیز کو کہ روایت کہتے ہیں ہم اپنی اور جو ہماری زندگی کی aspiration ہیں اور تمنائیں ہیں تو ان کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ World View تو ہمارا بالکل وہی ہے کہ جو مذہب کا ہے مگر.......... اب لاکھ کوئی یہ بات کہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہے تو وہ پیدا کرنے والا ہے اور وہی حفاظت کرنے والا ہے مگر ہم سمجھتے یہی ہیں کہ بیمار پڑتے ہیں تو ڈاکٹر ٹھیک کرتا ہے اور مقابلہ ہوتا ہے تو توپیں جس کے پاس بڑی ہوں، وہ غالب آتا ہے۔ اور اسی بنا کے اوپر تمام معاشرہ اور تمام ملک، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ تو جب تک کہ کچھ Intelligent آدمی واقعی اپنے اندر غور کر کے، اور اپنی روایت میں اتر کے اس Problem کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک میں تو بالکل یہی سمجھتا ہوں کہ ہم اس الجھاؤ کا شکار رہیں گے........

بلکہ میں نے تو ایک موقع پر کہا بھی تھا کہ اس وقت اس معاشرے کے لیے ———: Relevant Attitude دو ہی ہیں تیسرا کوئی نہیں۔ یا تو آدمی کمیونسٹ بنے یا صوفی۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ مگر صوفی جو بنے تو ایسا بنے جیسے کہ ہمارے صوفیہ ہوتے تھے جو تمام علوم حاضرہ میں اور علوم متداولہ میں گہری بصیرت رکھنے والے اور اپنے زمانے کو اچھی طرح سمجھنے والے لوگ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمانہ جو ہے تو وہ کیا ہے اور اس کے Trends جو ہیں تو وہ کیا ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ساتھ اب یہ ہو رہا ہے کہ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے، ہم اپنے اندر اور اپنے زمانے کے اندر ایک بُعد اور ایک Gulf محسوس کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسلام کے ساتھ جو کھیل ہو رہا ہے تو اس کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ مثلاً ایک مختصر

سی بات میں آپ سے کہوں جس سے ہماری سوچ کے Trends جو ہیں تو وہ معلوم ہوں گے۔ مثلاً ہمیں یہ خوشخبری دی گئی کہ سود جو ہے تو وہ اڑ گیا۔ اور ہم سود کو حرام سمجھتے ہیں۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ ہم کسی زمانے میں ریڈیو سے ایک پروگرام کیا کرتے تھے قرآن اور زندگی کا۔ وہ کچھ Economic حالات سے متعلق تھا۔ تو.......
صاحب جو تھے تو انہوں نے ہم سے چپکے سے کہا کہ صاحب! سود کے متعلق کچھ نہ کہیئے گا نہیں، ذرا خیال رکھیے گا۔ تو ہم نے ان کو جواب دیا کہ جناب والا! بہت ممکن ہے کہ ہماری نظر بر ہی کہیں اس کا ذکر نہ آتا۔ لیکن ہمیں حکم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے یا اس کے رسولؐ کے کسی حکم کو مٹایا جائے تو پھر ہمارا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ہم چھت کے اوپر کھڑے ہو کر بہانگ دہل اعلان کریں کہ لوگو اللہ کا اور اس کے رسول کا یہ حکم ہے۔ چاہے موقع ہو یا نہ ہو، لیکن اس وقت ہمارا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ہم کہیں کہ اب تو یہ بات ہم لازماً کریں گے۔ اچھا اب یہ ہوا کہ صاحب سود جو ہے تو وہ اڑ گیا۔ اب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ ہر ریفارم کی ایک Criterian ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کونسی برائی تھی جو آپ نے دور کی۔ کس کلاس کو اور کن لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچ رہا تھا جو اب نہیں پہنچ رہا ہے۔ اور کن لوگوں کا استحصال ہو رہا تھا جو اب نہیں ہو رہا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم تو تاریخ اسلام کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ لیکن ہم سے اگر آپ پوچھیں تو ہم بھی بتا سکتے ہیں کہ جس وقت یہ سود کی حرمت کا حکم آیا تو وہ استحصال کرنے والے کون لوگ تھے کہ جن کا استحصال اور ظلم سے ہاتھ رُکا۔ اور وہ کون لوگ تھے کہ جو لٹے جا رہے تھے۔ اور ان کی حالت بدلی۔ اب خدا کے لیے یہ جو سود تم نے اڑایا ہے تو ہمیں یہ بات بتا دو کہ وہ کون سی کلاس تھی کہ جس کا استحصال ہو رہا تھا اور وہ اب اس سے محفوظ ہو گئی۔ اور جب یہ بات نہیں تو اپنے ریفارم کو تم اپنے ہی پاس رکھو۔ یہ ریفارم یا اصلاح یا تجدید، یہ کوئی لفظ کے الفاظ سے کھیلنے کی ضرورت نہیں۔

مگر وہ جو مسئلہ سر سید احمد خان کے زمانے میں تھا تو وہ مسئلہ ہمارے زمانے میں بھی ہے بالکل اسی طریقے سے۔ حالانکہ وہ حل کہ جو انہوں نے اس مسئلہ کا تجویز کیا اسے ہم بالکل غلط سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ زمانہ جو ہے تو

وہ چلا گیا۔ اب ذرا آگے بڑھنا ہے۔ ہمارے سلیم احمد مرحوم نے یہ بات کہی کہ پہلے یہ سنگ میل تھا، اب راستے کا پتھر ہو گیا ہے لہٰذا اسے اکھاڑ کے پھینک دو۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اکھاڑ کے پھینکنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس سے آگے بڑھ جائیں وہ اپنے آپ پیچھے رہ جائے گا۔ تو اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اور جو لوگ اب بھی The Tribe of Sir Syed Ahmad Khan کو........ کر کے ادراسی بات کرتے ہیں تو وہ سرسید احمد خاں کے بارے میں کسی اچھی فہم کا یا بصیرت کا ثبوت نہیں دیتے تو یہ مختصر سی بات میں نے عرض کی۔

روایت ۳

اغلاط نامہ

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	درست
۱۶۴	۱۱	پھپسی	پھسپھسی
۱۶۵	۱۵	تمہارے جیسا	تم جیسے
〃	۲۴	سیدھا سادھا	سیدھا سادا
۱۶۶	۲	خطرہ نہ ہے	خطرہ ہے
۱۶۷	۸	دے رہا ہو	دے رہا ہوں
۱۶۹	۱۵	والے بھی یہ	والے ہیں یہ
۱۷۰	۱	مُیں تمہاری ادبی	مَیں تمہارے ادبی
〃	۱۵	دوبارا	دوبارہ
۱۷۱	۶	جذبات زندہ رکھے	جذبات اوڑھ رکھے
۱۷۲	۲۱	کرلینا ہے	کرلیتا ہے
۱۷۳	۹	شکوہ جُور ہے	شکوۂ جور ہے
۱۷۵	۵-۶	موجود رہا ہے	موجود رہے ہیں
〃	۹	لگی تھی	لگتی تھی
〃	۱۲	دریافت کرتی	دریافت کرتا
〃	۱۳	دے دیتی ہے	دے دیتا ہے۔
۱۷۶	۷	ازسر تعمیر	از سرِ نو تعمیر
۱۷۷	۲۰	یاسکول قلب	یا سکونِ قلب
۱۷۸	۳	وقت نہیں	وقت تک نہیں
〃	۵	درمیان کیونکہ	درمیان سے کیونکہ
〃	۱۵	سیدھی سادھی	سیدھی سادی
۱۸۲	۵	تم جیب	تم جب

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	درست
۱۸۳	۱۴	بڑی یہ	بڑی وجہ یہ
۱۸۴	۵	مذہب کے خلاف کے خلاف ہے	مذہب کے خلاف ہے
۱۸۴	۱۵	جواس کی	حواس کی
۱۸۶	۱	بارے میں کچھ	بارے میں جو کچھ
〃	۲	ربط دتیا	ربط دیتا
۱۸۷	۲۲	لازمی جزو	جزو
۱۸۸	۱۵	کرنا جاتا	کرنا چاہتا
۱۸۹	۱۳	کھینچ لاتے ہیں	کھینچ لاتی ہیں
〃	۱۴	بنا دیتے ہیں	بنا دیتی ہیں
۱۹۰	۸	نئی نظم پورا آدمی	نئی نظم اور پورا آدمی
〃	۱۸	میں حمافت میں صحافت کے لیے	میں صحافت میں حماقت کے لیے
۱۹۲	۱۶	علت العمل	علت العلل
〃	۱۸	نہیں سکتا	نہیں ہو سکتا
۱۹۴	۸	لکھو چکا	لکھ چکا
۱۹۶	۱۱	غم دزد	غم دزدے
〃	۲۲	خودکو	خدا کو
۱۹۷	۱۷	میرا خیال میں کہ	میرا خیال ہے کہ
۱۹۹	۱	البتہ ہم سب کو	اللہ ہم سب کو
〃	۸	موقع آئیں گے	مواقع آئیں گے
〃	۱۱	موسیلنی	مسولینی
〃	۲۰	بے دل	بیدل
〃	۲۲	زوردں	نوروں
〃	۲۴	مکبتی	مکتبی
۲۰۰	۳	تک بھی پہنچ سکتے	تک بھی نہ پہنچ سکتے

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	درست
۲۰۰	۶	مضمل	مضمحل
"	۱۲	دوستوں میں ہیں	دوستوں میں سے ہیں
"	آخری سطر سے پہلی سطر	غدیر ہاشمی	عزیز ہاشمی
۲۰۱	۱۲	پہنچ جاؤ	پہنچ جاؤں
۲۰۴	۲۳	میرے بیٹے	میرے بیٹے
۲۰۵	۱۰	انہیں صداقت کو دکھلنے	انہیں صداقت دکھانے
۲۰۶	۱۸	پہنچا دتیا ہے	پہنچا دیتا ہے
"	۲۰	کی تنقید	کی تنقید
۲۰۸	آخری سطر	بہت سی تعبیروں	بہت سی تعبیریں
۲۰۹	۳	حق ہیں	حق پر ہیں
"	۱۸	ثاتوی	ثانوی
۲۲۶	۵	گھمبیر	گمبھیر
۲۳۲	۱۳	خاموشی لی	خاموشی ملی
۳۷۶	۱۲	گپھلا	گھپلا
۳۹۴	۱۴	جہان تازہ	جہانِ تازہ

سلیم احمد

مسکن عزیز - ۱۰۳۲۳ اے - بلاک ۱۷، انچولی سوسائٹی

فیڈرل بی ایریا - کراچی نمبر ۳۸ - فون:- ۹۸۱۵۸۸

پیارے جاوید - وعلیکم - ابھی سو کر اٹھا ہوں - [illegible]

[illegible]

تمہارا

سلیم احمد